خواتین اور دوشیزاؤں کے لیے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

اگست 2018

عید مبارک



الف

عمیرہ احمد

بانیِ و مدیرِ اعلیٰ ـــــ محمود ریاض

مدیرہ ـــــ شادرہ خاتون

مدیر ـــــ آذر ریاض

نائب مدیرہ ـــــ رضیہ جمیل

مدیرہ خصوصی ـــــ امت الصبور

بلقیس بھٹی

نفسیات ـــــ عدنان

اشتہارات ـــــ خالدہ جیلانی

قانونی مشیر
نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈوکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

خواتین ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے

subscriptions@khawateendigest.com



آپ سے کیا پردہ

خاتون کی ڈائری

مجھ سے ملیے

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے



نظمیں غزلیں

رنگا رنگ پھول

میری بیاض سے

پکوان

بیوٹی بکس

نفسیات

اگست 2018

جلد 46 شمارہ 4

قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com



خواتین ڈائجسٹ کا اگست کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

پاکستان ایک نظریہ، ایک تہذیب کا تسلسل۔

ہر تعصب، ظلم اور نفرت سے آزاد ایک خطۂ زمین، ایک مثالی ریاست جہاں ہر بولنے، لکھنے کی آزادی ہو۔ جہاں حرفِ صداقت پر پابندی نہ ہو۔

پاکستان کی بنیاد اسی نظریہ پر رکھی گئی۔ انگریزوں کی غلامی اور ہندوؤں کے جبر اور تسلط کی فضا میں جہاں مسلمانوں کے لیے معاشی لحاظ سے مواقع نہ ہونے کے برابر تھے۔ وہاں انہیں اپنے مذہب اور عقیدے پر عمل کی آزادی بھی حاصل نہ تھی۔ تعصب اور نفرت کے نتیجے ان کے لیے ترقی کی راہیں مسدود اور آگے بڑھنے کے سارے دروازے بند تھے۔

ان حالات میں قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں ایک شاعر کا خواب حقیقت میں ڈھلا اور اسلامی جمہوریہ پاکستان وجود میں آیا۔ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد خطۂ زمین۔ قدرت کا سب سے بڑا انعام آزادی۔

پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے بہت نوازا۔ یہاں کے باسی اور ہجرت کر کے آنے والے سب ہی ہر طرح سے فیض یاب ہوئے۔ آزادی کی نعمت ملی۔ معاشی ترقی اور خوش حالی نصیب ہوئی۔

۱۴ اگست وہ تاریخی دن جب پاکستان وجود میں آیا۔ آج 70 سال بعد اگست کے مہینے میں الیکشن کے بعد پاکستان میں نئی حکومت بن رہی ہے۔ بہت سے لوگ الیکشن کے نتائج سے مطمئن نہیں ہیں۔ انہیں کچھ جائز شکایات بھی ہوں گی۔ ایسے موقع پر ہم منفی جذبات کی لپیٹ میں بھی آ سکتے ہیں۔ لیکن ہمیں ایک بڑے مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے عداوت و نفرت کے بجائے صلح جوئی اور مصالحت سے کام لینا چاہیے۔ یہی وقت کا تقاضا ہے۔

قارئین کو جشنِ آزادی مبارک ہو۔

اللہ تعالیٰ ہمارے وطن کو تا قیامت خوش حال اور سلامت رکھے۔ آمین۔

اگست کے مہینے میں عیدالاضحی بھی ہے جو قربانی کے ایک بڑے واقعے کی یاد میں منائی جاتی ہے۔ ہماری دعا ہے عید آپ کے لیے ڈھیر ساری خوشیاں لے کر آئے۔ آمین۔

عمیرہ احمد کا ناول،

اس ماہ آپ کی پسندیدہ مصنفہ عمیرہ احمد کا ناول "الف" شروع کیا جا رہا ہے۔

عمیرہ احمد جب لکھتی ہیں تو لکھنے کا عمل "ساحری" کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ عمیرہ احمد کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں زندگی کی جمالیاتی قدروں کے ساتھ ساتھ شعور و آگہی، سوچ اور جذبوں کے نئے زاویے سامنے آتے ہیں۔

انہوں نے اپنی تحریروں میں اللہ اور بندے کے تعلق کو محبت کے رنگ میں ڈھالا ہے اور اسے بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے اور یہی ان کی سب سے بڑی خوبی اور انفرادیت ہے۔

عمیرہ احمد نے آج تک جو لکھا ہے، قارئین نے اسے بے حد پسند کیا ہے۔ ہمیں یقین ہے ان کا یہ ناول بھی قارئین کو پسند آئے گا۔

محمود خاور،

ہوائے مرگ ان روشن دلوں کو کیوں بجھا دیتی ہے آخر... ؟ اگست کے مہینے میں محمود خاور ہمیں چھوڑ گئے تھے۔ ان کی باتیں، ان کی محبت بھلائی نہیں جا سکتی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- عمیرہ احمد کا ناول "الف"، ٭ نفیسہ ناز کے ناول "نسخہ ہائے وفا" کی آخری قسط،
- فائزہ جبیں کا ناول "یہ قرینے اہلِ محبت کے"، ٭ "دشتِ جنوں" آمنہ ریاض کا ناول، ٭ ثمینہ قربان کا ناولٹ،
- نفیسہ سعید، قرۃ العین خرم ہاشمی، لائبہ اعوان اور سویرا فلک کے افسانے، ٭ اینکر پرسن عمران خان سے ملاقات،
- ارسلان فیصل سے باتیں، ٭ "کرن کرن روشنی" احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

یہ شمارہ پڑھ کر اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔ ہم منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دینِ اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امتِ مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگانِ دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

قربانی کی لغوی و اصطلاحی تعریف اور بعض اہم احکام و مسائل

لغوی معنی: الاضحیۃ، لغت میں اس سے مراد وہ جانور ہے جسے ایامِ عید میں ذبح کیا جاتا ہے۔

اصطلاحی تعریف: "قربانی سے مراد، قربِ الٰہی کے حصول کے لیے ایک خاص وقت پر ایک مخصوص جانور کو ذبح کرنا ہے۔"

قربانی کی مشروعیت: قربانی کا حکم ۲ ہجری میں نازل ہوا۔ اس کی مشروعیت قرآن و سنت اور اجماعِ امت سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"اپنے رب کے لیے نماز پڑھیے اور قربانی کیجیے۔" (الکوثر)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو چتکبرے سینگوں والے مینڈھے ذبح کیے۔"

مشروعیتِ قربانی کی حکمت

(1) قربانی سے قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: (فصل لربک وانحر) (الکوثر ۱۰۸:۲) "اپنے رب کے لیے نماز پڑھ اور قربانی کر۔"

(2) قربانی ہمارے جدِ امجد حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی سنت کا احیاء ہے۔

(3) قربانی سے فقراء اور مساکین کی مدد ہو جاتی ہے۔

(4) اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو ہمارے تابع کر دیا ہے۔ اس نعمت کا شکر ادا کرنے کے لیے قربانی کی جاتی چاہیے۔

قربانی کے بعض اہم احکام:

(1) قربانی کے لیے جانور کا دو دانت ہونا افضل ہے، یعنی جس کے دودھ کے دانت گر کر نئے دانت آ گئے ہوں۔ (صحیح مسلم)

(2) قربانی میں عیب دار، مثلاً: کانا، بیمار، لنگڑا، نہایت لاغر اور کان میں نقص والے جانور کو ذبح نہیں کرنا چاہیے۔ (سنن ابی داود)

(3) قربانی کا جانور نماز عید کے بعد ذبح کرنا چاہیے ورنہ قربانی نہیں ہوگی۔

(4) جانور کو ذبح کرتے وقت اسے قبلہ رخ کرنا چاہیے۔

(5) قربانی کے جانور کو خود ذبح کرنا افضل ہے۔

(6) قربانی کا گوشت خود کھانا، غرباء میں تقسیم کرنا اور اقرباء کو ہدیہ کرنا مستحب (پسندیدہ) ہے۔

(7) قصاب کو گوشت اور کھال وغیرہ کی شکل میں اجرت نہیں دی جاسکتی۔

(8) ایک بکرا یا دنبہ پورے گھر والوں کی طرف سے کافی ہوتا ہے۔ (سنن ابن ماجہ)

البتہ حصول ثواب کے لیے مزید جانور ذبح کرنا افضل ہے۔

(9) قربانی کی نیت کرنے والا ذوالحجہ کا چاند نظر آنے کے بعد بال اور ناخن نہ اُتروائے بلکہ قربانی والے دن جانور ذبح کرنے کے بعد اتروائے۔ (صحیح مسلم، الاضاحی)

قربانی سے متعلق احکام ومسائل

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی کا بیان

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو چتکبرے اور سینگوں والے مینڈھوں کی قربانی دیا کرتے تھے، اور (ذبح کرتے وقت) بسم اللہ اور تکبیر پڑھتے تھے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو، ان کی گردن پر قدم مبارک رکھ کر اپنے ہاتھ سے انہیں ذبح کرتے دیکھا۔ (صحیح بخاری)

فوائد ومسائل:

1- عیدالاضحیٰ کے موقع پر صاحب استطاعت کو کم از کم ایک بکرا، مینڈھا، گائے یا اونٹ کے ایک حصے کی قربانی کرنا ضروری ہے۔

2- ایک سے زیادہ جانوروں کی قربانی بھی جائز بلکہ افضل ہے۔

3- گھر کے فرد کو اپنے ہاتھ سے قربانی کا جانور ذبح کرنا چاہیے، تاہم کوئی دوسرا شخص بھی ذبح کرسکتا ہے۔

4- قربانی کا جانور عمدہ اور خوب صورت ہونا چاہیے۔

5- قربانی کے جانور کو ذبح کرتے وقت دعا پڑھنا مسنون ہے۔

6- ذبح کرتے وقت جانور کے جسم پر پاؤں رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ جانور قابو میں رہے اور بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے دن دو مینڈھے قربان کیے۔ جب انہیں قبلہ رخ کیا تو فرمایا: ''میں نے یکسو ہو کر اپنا

چہرہ اس اللہ کی طرف کرلیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکین میں سے نہیں۔ بے شک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا مالک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اسی بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا فرماں بردار ہوں۔ اے اللہ! یہ جانور تجھ ہی سے ملا اور تیرے ہی لیے قربان کیا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کی امت کی طرف سے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی

حضرت عائشہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب قربانی کرنا چاہتے تو وہ بڑے بڑے، موٹے تازے، سینگوں والے، چتکبرے اور خصی مینڈھے خریدتے۔ ایک اپنی امت کی طرف سے ذبح فرماتے، یعنی امت کے ہر اس فرد کی طرف سے جو اللہ کی توحید کی گواہی دیتا ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام پہنچانے (اور رسول ہونے) کی گواہی دیتا ہو۔ اور دوسرا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آل کی طرف سے ذبح کرتے۔ (مسند احمد)

فوائد ومسائل:

1- قربانی کے جانور عمدہ ہونے چاہئیں۔

2- جانور ظاہری شکل وصورت میں بھی اچھا ہونا چاہیے اور موٹا تازہ اور صحت مند بھی۔

3- خصی جانور کی قربانی درست ہے۔ اسے عیب شمار نہیں کیا جاتا۔

4- گھر کے تمام افراد کی طرف سے ایک جانور کی قربانی کافی ہے۔

5- کسی اور کی طرف سے قربانی کرنا درست

6- میت کی طرف سے قربانی کرنا کسی حدیث سے ثابت نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمومی عمل

... استدلال اس لیے صحیح نہیں کہ بعض علماء کے نزدیک وہ آپ کا خاصہ ہے۔ جس میں امت کے لیے آپ کی اقتدا جائز نہیں۔ خیر القرون (صحابہ وتابعین کے بہترین ادوار) میں بھی میت کی طرف سے قربانی کرنے کا ثبوت نہیں ملتا۔ صرف ایک نقطہ نظر سے اس کا جواز ہوسکتا ہے کہ میت کی طرف سے صدقہ کرنا جائز ہے، یعنی ایصال ثواب کے طور پر اس کا انکار کرنا ممکن نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

قربانی واجب ہے یا نہیں؟

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس کے پاس (قربانی کرنے کی) گنجائش ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو اسے چاہیے کہ ہماری عیدگاہ کے قریب بھی نہ آئے۔'' (مسند احمد)

فوائد ومسائل:

1- اس حدیث سے بظاہر قربانی کا واجب ہونا ثابت ہوتا ہے لیکن دوسرے دلائل سے اس کا استحباب واستنان معلوم ہوتا ہے، اس لیے محدثین نے ان سارے دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ قربانی سنت موکدہ ہے، یعنی ایک اہم اور موکد حکم ہے، فرض نہیں، تاہم استطاعت کے باوجود اس سنت موکدہ سے گریز کسی طرح بھی صحیح نہیں۔

2- قربانی مسلمانوں کی اجتماعیت کا مظہر ہے اور اس سے آپس کے تعلقات بہتر ہوتے ہیں۔

3- قربانی نہ کرنے والا مسلمانوں کی خوشیوں میں شریک ہونے کا حق نہیں رکھتا، تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے نماز عید پڑھنے کی ضرورت نہیں بلکہ مقصد اسے تنبیہ کرنا ہے تاکہ وہ قربانی ترک نہ کرے۔

کون سی قربانی مستحب ہے؟

حضرت یونس بن میسرہ بن حلبس رحمۃ اللہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا۔

''میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت ابوسعید زرقی رضی اللہ عنہ کے ساتھ قربانی کے جانور خریدنے گیا۔''

یونس بن میسرہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے ایک ایسے مینڈھے کی طرف اشارہ کیا جس کے کانوں اور گلے کا کچھ حصہ سیاہ تھا۔ وہ جسمانی طور پر نہ زیادہ اونچا تھا نہ زیادہ پست تھا۔ انہوں نے فرمایا۔

''میرے لیے یہ خرید لو۔'' گویا انہوں نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مینڈھے کے مشابہ قرار دیا۔

فوائد ومسائل:

1- بزرگ آدمی کے ساتھ اس کی ضروریات

کے سلسلے میں جانا اس کی خدمت اور احترام میں شامل اور باعث ثواب ہے۔

2- قربانی کا جانور نکما نہیں ہونا چاہیے، ہاں، البتہ بہت زیادہ قیمتی اور نمایاں نہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔

3- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ کوشش کرتے تھے کہ ان کا ہر عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ممکن حد تک مشابہ ہو، اسی لیے امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ نے باب کے عنوان میں اسے مستحب قرار دیا ہے۔

حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بہترین کفن وہ ہے جو ایک رنگ کی دو چادروں پر مشتمل ہو اور بہترین قربانی سینگوں والا مینڈھا ہے۔"

اونٹ اور گائے (کی قربانی) کتنے افراد کی طرف سے کفایت کر سکتی ہے؟

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

"ہم لوگ ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے کہ عید الاضحیٰ آ گئی، چنانچہ ہم نے دس دس آدمیوں کی طرف سے ایک ایک اونٹ اور سات سات آدمیوں کی طرف سے ایک ایک گائے مشترکہ طور پر ذبح کی۔" (ترمذی)

امت کی طرف سے قربانی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک گائے ذبح کی۔ (ابوداؤد)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"دو دانتے کے سوا کوئی جانور (قربانی میں) ذبح نہ کرو، سوائے اس کے کہ تمہارے لیے (دو دانتا جانور تلاش کرنا) مشکل ہو جائے تو بھیڑ کا جذعہ ایک سال کا بچہ جس کے دودھ کے دانت نہ ٹوٹے ہوں ذبح کر دو۔" (مسلم)

فائدہ:

حضرت ابوبردہ رضی اللہ عنہ نے نماز عید سے پہلے قربانی کا جانور ذبح کر لیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ گوشت کی بکری ہے۔ (قربانی کی نہیں)۔" انہوں نے کہا:

"اے اللہ کے رسول! میرے پاس ایک بکری کا جذعہ ہے۔ (کیا میں اس کی قربانی دے دوں؟)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"قربان کر دو لیکن تمہارے سوا کسی اور کے لیے درست نہیں۔" (صحیح البخاری)

جس جانور کی قربانی دینا مکروہ ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جانور کو ذبح کرنے سے منع فرمایا ہے، جس کا کان آگے سے کٹا ہوا ہو، یا جس کا کان پیچھے سے کٹا ہوا ہو، یا جس کا کان چرا ہوا ہو، یا جس کے کان میں (گول) سوراخ ہو، یا اس کا ہونٹ کٹا ہوا ہو۔" (ابوداؤد)

آنکھیں اور کان

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: "ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم (قربانی کے جانور کی) آنکھیں اور کان اچھی طرح دیکھ لیا کریں۔ (ترمذی)

فوائد و مسائل:

1- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانور کے کان سلامت ہونے چاہئیں۔

2- آنکھیں دیکھ لینے کا مقصد یہ ہے کہ جانور کی دونوں آنکھیں سلامت ہوں۔ جس کو ایک آنکھ سے نظر نہ آتا ہو، اس کی قربانی درست نہیں۔

3- قربانی کا اصل مقصد اللہ کے لیے اچھی چیز قربان کرنا ہے، اس لیے بے عیب جانور ذبح کرنا چاہیے۔ گوشت کھانا، غریبوں کو کھلانا ایک اضافی فائدہ ہے، اصل مقصد نہیں۔ ورنہ آنکھ یا کان کا عیب گوشت کھانے کے مقصد میں رکاوٹ نہیں بنتا۔

حضرت عبید بن فیروز رحمۃ اللہ ——— سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے کہا۔

"مجھے بتائیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے کس جانور کو ناپسند کیا ہے یا اس سے منع فرمایا ہے؟" انہوں نے فرمایا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھوں سے اس طرح اشارہ کیا۔ اور میرا ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے کوتاہ ہے۔ (اور فرمایا:)

"قربانی میں چار جانور جائز نہیں: وہ کانا جانور جس کا کانا پن واضح ہو، بیمار جانور جس کی بیماری واضح ہو، لنگڑا جانور جس کا لنگڑا پن ظاہر ہو اور دبلا جانور جس کی ہڈیوں میں گودا نہ ہو۔"

عبید نے کہا:

"میں تو پسند نہیں کرتا کہ اس کے کان میں نقص ہو۔"

حضرت براء رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "جو چیز تمہیں پسند نہیں، اسے چھوڑ دو لیکن اسے کسی پر حرام نہ کرو۔" (ابوداؤد)

فوائد و مسائل:

1- معمولی عیب جو گہری نظر سے دیکھے بغیر محسوس نہ ہو، قربانی میں رکاوٹ نہیں۔

2- وہ جانور ——— جس کی ٹانگ ٹوٹی ہو اور وہ چلنے سے عاجز ہو، (حاشیہ سنن ابن ماجہ) لیکن یہ صورت لنگڑا ہونے میں شامل ہے۔

"وہ ہڈی جس پر زیادہ گوشت نہ ہو۔" (النہایۃ، مادہ کسر) اس مناسبت سے کسیرۃ کا مطلب "دبلی پتلی (بکری)" زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

3- حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی رائے میں کان کٹا یا پھٹا ہوا ہونا ایسا عیب نہیں جو قربانی سے مانع ہو۔

حضرت علی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جانور کی قربانی دینے سے منع فرمایا: جس کا سینگ ٹوٹا ہوا یا کان کٹا ہوا ہو۔ (ابوداؤد)

گھر والوں کی طرف سے ایک بکری کی قربانی کرنا

حضرت عطاء بن یسار رحمۃ اللہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے سوال کیا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں تم لوگوں میں قربانیاں کس طرح ہوتی تھیں؟"

انہوں نے فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں آدمی اپنی طرف سے اور اپنے گھر والوں کی طرف سے ایک بکری کی قربانی کر دیا کرتا تھا۔ (اس میں سے) وہ خود بھی کھاتے، اور دوسروں کو بھی کھلاتے۔ بعد میں لوگ فخر (کے طور پر) زیادہ جانور ذبح کرنے لگے تو وہ حال ہو گیا جو آپ (آج کل) دیکھ رہے ہیں۔ (ترمذی)

فوائد و مسائل:

1- جن لوگوں کا کھانا پینا اور خرچ وغیرہ مشترک ہو، وہ ایک گھر کے افراد ہیں۔ ان کی طرف سے ایک بکری کی قربانی دینا، یا گائے یا اونٹ کا ایک حصہ قربانی دینا کافی ہے۔

2- ایک سے زیادہ قربانیاں کرنا جائز ہیں لیکن تفاخر اور مقابلہ بازی کے انداز سے زیادہ جانور یا قیمتی جانور قربان کرنا قربانی کے اصل مقصد کو ختم کر دیتا ہے، اس صورت میں کوئی ثواب نہیں ہوتا۔



طریقہ محفل میں بات کرنے کا

انشاؔ جی

محفل میں اجنبیوں سے کیسے بات کی جائے، ہمسائیوں پر خوش اخلاقی کا کیسے سکہ جمایا جائے، اس کے گر یا تو بخشندِ خدائے بخشندہ ورنہ ڈیل کارنیگی کی کتابوں کا مطالعہ کیجیے اور کسب کمال کر کے عزیزِ جہاں ہونے کی کوشش کیجیے۔

مختصر لفظوں میں مقبولیت کا نسخۂ زرّیں یہ ہے کہ مخاطب کے ڈھب اور دلچسپی کی بات کرو۔ اپنے ذوق یا دلچسپی سے علاقہ مت رکھو۔

شروع میں ہمیں بھی یہ بھید معلوم نہ تھا۔ ہمارے محلے میں سامنے کے گھر میں غلے اور تیل کے بیجوں کے مشہور آڑھتی روپیہ بھائی، پیسہ بھائی جام نگر والے رہتے تھے۔ ہم جب اس مکان میں آئے تو انہوں نے بڑے خلوص سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ ان کی بی بی بھی محلے میں ہمارے گھر والوں ہی کو پسند کرتی تھیں اور جب بھی دونی چونی مانگنی ہو یا گھر میں گھی تیل ختم ہو یا سلائی کی مشین چاہیے ہو تو ہم ہی سے رجوع کرتی تھیں۔

ہم بھی سیٹھ صاحب کی خوشنودی کے لیے اپنی سی ہر کوشش کرتے تھے۔ پہلی اتوار آئی تو ان کو دو غزلیں سنائیں، دوسرے اتوار ایک قصیدہ گوش گزار کیا۔ تیسرے اتوار ہم نے ان کے لیے ایک طویل مختصر افسانہ تیار کر رکھا تھا جو ایک طرح سے نفسیاتی تحلیل کا شاہکار تھا لیکن سیٹھ صاحب نہ آئے۔ آخر ہم ان کے گھر جا کر سنا کر آئے۔ اس کے بعد جانے کیا ہوا کہ انہوں نے نہ صرف ہمارے ہاں آنا بند کر دیا بلکہ ہم جب میں اپنے ایک عزیز کی شادی کا سہرا رکھ کر ان سے ملنے گئے تو انہوں نے اندر سے کہلوا دیا کہ نہیں ہیں سیٹھ صاحب، لاڑکانہ گئے ہیں۔

کچھ اسی قسم کی واردات ہمارے دوسرے پڑوسی کے ساتھ ہوئی۔ وہ ٹریکٹروں کی ایک کمپنی میں ملیکنکل انجینئر ہیں یا شاید فورمین ہیں، معلوم ہوا جالندھر کے ہیں جس کو علمی ادبی ذوق کی بنا پر شیراز ہند کہا جاتا تھا۔ اسی رعایت سے ہم نے علیک سلیک کے بعد پہلے تو جالندھر کے ہندوستان میں رہ جانے پر ان سے تعزیت کی۔ اس کے بعد اپنا تازہ فارسی کلام سنایا۔

ہمارے تعلقات میں سرد مہری تو اسی روز آ گئی، لیکن دوسری بار جو ہم نے اقبال کے فلسفۂ خودی کے ماخذ پر بحث چھیڑی تو نہ جانے کیا ہوا کہ اٹھ کے اندر چلے گئے اور پھر سڑک پر ملتے بھی تو دوسرے فٹ پاتھ پر ہو لیتے۔ ہم نے اپنے اقبال پرست دوستوں سے پوچھا بھی کہ یارو فلسفہ میں ایسی کیا بات ہے، لیکن کوئی ہمیں مطمئن نہ کر سکا۔ اس کے بعد ہم نے ڈیل کارنیگی کی کتابیں پڑھیں۔

یہ قباحت، موضوعات گفتگو کی، اصل میں ہم مردوں کے ساتھ زیادہ ہے۔ خواتین میں تو امیر ہوں، یا غریب، پی ایچ ڈی یا ان پڑھ، پنجابی کہ دکنی، گفتگو کے بندھے ٹکے اصول' آداب اور موضوعات ہیں۔

☆ اے بہن، یہ ٹیکہ بہت خوب صورت ہے، کتنے کا بنا۔

☆ اے آپا! یہ کپڑا کتنے کا ہے، لنڈی کوتل سے منگایا ہوگا۔

☆ ماشاء اللہ کتنے بچے ہیں؟

☆ آپ بالوں میں کون سا تیل لگاتی ہیں؟

☆ یہ نیل پالش کون سی ہے باجی؟

☆ اری رضیہ! تم نے "مسٹر اللہ دتہ" دیکھی۔ اس میں نیلو کا کام پسند آیا۔

☆ ہائے اللہ، کتنے اچھے سلیپر ہیں، کہاں سے لیے؟

کاش مردوں میں بھی کچھ اسی قسم کی مفاہمت ہوتی۔ اب تک تو بالعموم یہی دیکھا کہ دو بھلے مانسوں میں تعارف ہوا اور وہ مزاج شریف کہہ کر رہ گئے۔ پھر سگریٹ پینے لگے، وہ بھی یوں کہ یہ اپنا دھواں مشرق کی طرف منہ کر کے چھوڑتے ہیں' وہ مغرب کی طرف۔ اس کے بعد اخبار دیکھنے لگے۔ یہ بھی ہو چکا اور خاموشی زیادہ ہی ناگوار معلوم ہوئی تو ذہن پر زور ڈال کر کوئی سوال پوچھا۔

"آپ کہاں کام کرتے ہیں؟"

"پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں۔"

"یہی جو سڑکیں کھودنے والا محکمہ ہے۔"

"جی ہاں۔"

پھر طویل خاموشی۔ یہ کم آمیزی اور کم گوئی مشرقی نہیں بلکہ انگریزی اثر کا نتیجہ ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی تباہ شدہ جہاز سے جان بچا کر دو انگریز کسی خالی جزیرے میں جا نکلیں تب بھی ایک دوسرے سے کلام نہ کریں گے۔ تاآنکہ باقاعدہ تعارف کی رسم ادا نہ ہو جائے۔ وہاں کی ریل گاڑیوں میں بھی جس کو دیکھیے اپنی جگہ دوسرے سے بے تعلق اور بےزار بیٹھا ہے۔ آنکھیں نہیں ملاتا۔ ہمسائے کے اخبار کے بیچ کے ورق تک نہیں پہنچتا۔ اس سے بال بچوں کی تعداد، نام اور کام نہیں پوچھتا، اپنے نہیں بتاتا۔ ہم نے یہ کیفیت دیکھی تو وطن عزیز بہت یاد آیا جہاں کراچی سے ٹنڈو آدم تک دو بھلے مانس جائیں تو ایک دوسرے کے شجرۂ نسب سے کماحقہ آگاہ ہو چکے ہوتے ہیں بلکہ باہم رشتے بھی طے پا جاتے ہیں۔

تقریب اس ساری تمہید کی یہ ہے کہ کل رات مسز جمیل نے جو ہماری بھابی ہیں، اپنی ایک سہیلی کو کھانے پر بلایا، ساتھ ان کے میاں کو بھی۔ خاتون تو آرٹسٹ ہیں لیکن میاں ان کے تاجر اور زمیندار قسم کے آدمی ہیں۔ مظفر گڑھ میں ان کی ایک شوگر مل ہے۔ [illegible] میں کھالوں کی رنگائی کا کارخانہ ہے۔ ملتان میں ولائتی کھاد سول ایجنسی ہے اور اس کے علاوہ



بی ڈی کے چیئرمین ہیں۔ گویا حیثیات بزرگ ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہمارے دوست میاں جمیل نرے شاعر اور صحافی ہیں۔ انہوں نے اپنی بیگم سے پوچھا کہ تمہاری سہیلی کے میاں کوئی شاعر واعر ہیں کیا؟

"نہیں۔"

"فلسفے سے ذوق ہے؟"

"خدانخواستہ۔"

"تاریخ، علم الکلام اور سیاست مدن میں درک ہے؟"

"تاریخ...... میرے خیال میں جیسی صاف تاریخ بغیر تعمے اور تحرجے کے تم کہتے ہو ویسی وہ نہیں کہہ سکتے۔ علم الکلام کو بھی اگر پڑھا ہو تو مجھے معلوم نہیں۔ مدن بھائی کو وہ نہیں جانتے۔ باقی رہی سیاست تو درک کیا معنی؟ اپنی تحصیل کے چوٹی کے سیاست دان ہیں۔ میں نے بتایا نہیں کہ بی ڈی کے چیئرمین ہیں۔"

ان پر جمیل میاں نے کہا۔

"پھر تو بھاگوان تم ہی ان سے گفتگو کرنا۔ مجھے تو

رات کو مشاعرے میں جانا ہے۔ زیادہ سے زیادہ انشاء صاحب کو بلا لیتا، وہ ہر قسم کی گفتگو پر قادر ہیں۔''

ہماری بھابی نے کھانے کا تکلف بہت کیا تھا۔

ہم ذرا دیر سے پہنچے۔ مہمانوں سے تعارف بھی نہ ہوا۔ اس کے بعد بھابھی تو اپنی آرٹسٹ سہیلی کو ایک طرف لے گئیں اور ان کے جھمکوں کی تعریف سے گفتگو کا آغاز کیا۔ ہم مردوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آبیٹھے۔ ہم نے قیافے سے دریافت کیا کہ ہماری داہنی طرف جو بزرگ لانبی مونچھوں والے بیٹھے ہیں، یہی چوہدری خیر دین جنجوعہ ہیں، ان کی سہیلی کے میاں۔ ان کا تفصیلی تعارف بھابھی نے فون پر ہی کرادیا تھا، لہٰذا ہم نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''اب کے گنے کی فصل تو آپ کے ہاں خوب ہوئی؟''

وہ بھونچکے سے ہو کر بولے۔

''جی...... کیا فرمایا؟''

ہم نے دوسرا سوال داغا۔

''البتہ کھالوں پر جنگ کی وجہ سے اثر پڑا ہوگا؟''

اس پر وہ چپ رہے۔ ہم نے جانا کہ اپنے تجارتی بھید کو بھید ہی رکھنا چاہتے ہیں، لہٰذا ہم نے موضوع نمبر تین لیا۔

''شلجموں کے لیے کون سی ولایتی کھاد موزوں رہتی ہے۔ ہم نے اپنے لان میں شلجم بوئے ہیں۔''

اس گفتگو کی بھنک بھابھی کے کان میں پڑی تو وہ بھاگی آئیں اور بولیں۔

''یہ آپ کن سے بات کر رہے ہیں۔ یہ تو مشہور مرثیہ نگار شعلہ بنارسی ہیں، میرے بھانجے کے ہم زلف۔ یہ دوسرے میرے تایا زاد بھائی کرنل حبیب اللہ اور یہ میری سہیلی کے میاں چوہدری خیر...... ارے یہ تو سوگئے۔ ابھی اٹھیں گے تو ان سے بات کرنا۔''

اس روز کی محفل میں چوہدری خیر دین کے خراٹوں کی گونج میں ہم نے دو غزلیں شعلہ صاحب کو سنائیں، تین قصیدے اور ایک شہر آشوب سے انہوں نے یہ قرض اتارا۔ کرنل صاحب کو ہم نے کچھ دیر بکتر بند گاڑیوں کے اسرار و رموز میں الجھایا۔ اس کے بعد ان کا ہاتھ دیکھ کر ان کے گھوڑے کے اگلی ریس جیتنے کی خوش خبری دی اور جب چوہدری خیر دین جنجوعہ استراحت سے فارغ ہوئے تو سلسلۂ کلام کو یوں مربوط کیا کہ ولایتی کھاد سے ٹینکر کی اقسام جدید تک آنے اور بی۔ڈی کے تازہ ترین الیکشنوں سے بدیں عنوان گریز کیا کہ رشوت خوری اور بدعنوانی کرنے والوں کی کھال میں بھس بھروا دینا چاہیے۔ یہاں سے سررشتہ گفتگو چوہدری صاحب کے ہاتھ میں آیا اور انہوں نے پہلے تو کھالوں کے مسئلے پر تقریر کی۔ پھر بھس کی کمیابی کے اسباب بیان کیے۔ آخر میں کچھ ذکر افریقہ اور مشرق وسطیٰ کے حالیہ انقلابوں اور ویت نام کا بھی ہوا۔ گفتگو کے خاتمے تک وہ ہمیں اپنے ہاں سے کھانڈ کی بوری ریویو کے لیے بھجوانے کا وعدہ کر چکے تھے اور کھالوں کی رنگائی کے سلسلے میں ہم ان کا مشیر اعزازی بننے کی ہامی بھر چکے تھے۔

یہاں ہم گزارش کریں گے کہ اس تحریر کو خودستائی پر محمول نہ کیا جائے۔ من آنم کہ من دانم۔ جس طرح پرانے زمانے میں علوم مجلسی میں یہ شامل تھا کہ ہر شریف زادے کو ہزار دو ہزار اشعار اساتذہ کے ازبر ہونے چاہئیں۔ کچھ اسی قسم کی یہ سائنس ہے جن صاحبوں کو مزید معلومات درکار ہوں، ہمارے ادارہ علوم مجلسی (رجسٹرڈ) میں داخلہ لے سکتے ہیں۔ دس روپے کا منی آرڈر آنے پر پراسپکٹس مفت بھیجا جاتا ہے۔





ٹی وی فنکار

ارسلان فیصل سے باتیں

شاہین رشید

1۔ ''اصلی نام؟''

''ارسلان فیصل۔''

2۔ ''پیار سے پکارتے ہیں؟''

''میرے اپنے مجھے ''آشی'' کہہ کر بلاتے ہیں۔''

3۔ ''آپ کو کیا پکارا جانا اچھا لگتا ہے؟''

''میرا دل چاہتا ہے کہ لوگ مجھے میرے نام ''فیصل'' سے ہی پکارا کریں۔''

4۔ ''تاریخ پیدائش؟''

''3 ستمبر 1991ء۔''

5۔ ''شہر؟''

''لاہور۔''

6۔ ''آپ کا قد؟''

''چھ فٹ ایک انچ۔''

7۔ ''ستارہ؟''

''ورگو۔'' (سنبلہ)

8۔ ''بہن بھائی/آپ کا نمبر......؟''

''ایک بہن...... ہم دو بھائی۔ میں سب سے چھوٹا ہوں۔''

9۔ ''بہن بھائیوں کے نام؟''

''سعدیہ فیصل، سلمان فیصل اور میں ارسلان فیصل۔''

10۔ ''گھر کا لاڈلا کون ہے؟''

''جی...... میں کیوں کہ سب سے چھوٹا ہوں۔''

11۔ ''آپ کی ایکسٹرا صلاحیت؟''

''میں بنیادی طور پر گلوکار ہوں۔''

12۔ ''شادی ہوئی؟''

''نہیں فی الحال تو نہیں ہوئی......مگر جلد

ہوجائے گی۔''

13۔''پسند سے ہوگی؟''

''جی...... بہت جلدی ان شاء اللہ منگنی کی خبر آپ سنیں گی۔''

14۔''شوبز میں کیسے آئے؟''

''اتفاقیہ۔''

15۔''کیسے؟''

''وہ ایسے کہ میں اپنے تھیسس پر کام کر رہا تھا اور میرا کوئی ارادہ نہیں تھا اس فیلڈ میں آنے کا......بس ایک گانا سوشل میڈیا پہ ہٹ ہوگیا اور ڈرامے کے لیے آفر آگئی۔''

16۔''وہ گانا کس کے ساتھ کیا تھا؟''

''میں اپنے گانے اکثر انسٹا گرام میں، سوشل میڈیا پہ اور ایف بی پہ لگاتا رہتا تھا۔ میرا گانا جو ہٹ ہوا وہ میں نے اپنی بڑی بہن سعدیہ فیصل کے ساتھ کیا تھا جو کافی ہٹ ہوا۔''

17۔''ڈرامے کے لیے پہلی کال کس کی آئی؟''

''پہلی کال ''قربت'' کی آئی...... سکس سگما پروڈکشن ہاؤس سے۔''

18۔''پہلا ڈرامہ؟''

''بے خودی جس میں میرے ساتھ نور حسن، سارہ خان جو کہ انڈیا سے آئی تھی......زویا جن کا یہ پہلا ڈرامہ تھا۔''

19۔''شہرت کس نے دی؟''

''اسی نے بہت شہرت دی۔''

20۔''گھر والوں کا رد عمل؟''

''میرے والدین ہمیشہ سے ہی میرے لیے بہت سپورٹیو رہے ہیں۔ میرے والد بہت زیادہ سپورٹیو ہیں۔ میری امی بھی اور دیگر بہن بھائی بھی۔''

21۔''ڈرامہ میں آنے کا کبھی سوچا تھا؟''

''نہیں کبھی نہیں......کیونکہ میں اپنا تھیسس مکمل کرنے میں لگا ہوا تھا۔ اس جانب آنے کا نہیں سوچا تھا۔''

22۔''کیا بننا چاہتے تھے؟''

''میں ایک اچھا گلوکار بننا چاہتا تھا۔''

23۔''کیا گلوکاری کو خیرباد کہہ دیں گے؟''

''نہیں، نہیں......کبھی نہیں۔''

24۔''اب تک کا بہترین ڈرامہ؟''

''میں نے کم کام کیا ہے اور سب ہی پسند کیا گیا ہے مگر جو بہت زیادہ مقبول ہوا آج کل میں وہ ''آنگن'' تھا بلاشبہ آنگن بہترین ڈرامہ تھا اور بے دردی بھی بہت عمدہ ہے۔''

25۔''آپ خوش قسمت ہیں کہ......؟''

''بہت اچھے والدین اللہ نے عطا کیے جو بہت زیادہ پیار تو کرتے ہی ہیں۔ ہر کام کو سراہتے بھی ہیں۔''

26۔''آپ کے تینوں ڈرامے اے آر وائی سے آن ایئر ہوئے۔ وجہ؟''

''اتفاق ہے۔ اصل بات پروڈکشن ہاؤس کی ہوتی ہے وہ اپنا ڈرامہ کس کو دیں گے۔ ہمیں نہیں معلوم ہوتا۔''

27۔''پہلی کمائی کہاں خرچ کی؟''

''میں نے تو کہیں نہیں کی...... کیونکہ میں نے اپنا پہلا چیک اپنی ماں کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔''

28۔''میری عادت ہے کہ؟''

''میں اپنی کمائی کا ہر چیک اپنی ماں اور اپنے باپ کے ہاتھ میں دیتا ہوں...... کیونکہ میرا خیال ہے کہ میری کمائی پہ پہلا حق میرے والدین کا ہے۔''

29۔''چیک کے بعد والدین کا رد عمل؟''

''وہ اس چیک کو دوبارہ میرے ہاتھوں میں دے دیتے ہیں...... آج تک انہوں نے نہیں لیے۔''

30۔''آپ چیک کا کیا کرتے ہیں؟ کیش یا جمع؟''

''آپ یقین کریں میرا کوئی اکاؤنٹ نہیں تھا...... ڈرامے میں آنے کے بعد میں نے اپنا اکاؤنٹ کھلوایا...... اور اب سارے چیک میرے اکاؤنٹ میں جاتے ہیں۔''

31۔''شوبز میں کیا برائی ہے؟''

''میرے نزدیک تو کوئی برائی نہیں ہے۔ بچے بڑے جوان سب ہی اپنا کام بڑی خوش اسلوبی سے کر رہے ہیں۔''

32۔''شوبز کے اعلیٰ حکام سے کوئی شکایت؟''

''شوبز سے منسلک لوگوں سے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ہمارے پاکستانی چینلز پہ جو انڈین (کانٹینٹ) چلتے ہیں وہ نہ چلائے جائیں، کیونکہ ان کی وجہ سے ہمارا اپنا کام بہت متاثر ہوتا ہے۔ اس لیے انہیں بند کیا جائے۔''

33۔''آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟''

''بہت جلدی...... کیونکہ میرا شوٹ پہ جانا ضروری ہوتا ہے۔''

34۔''چھٹی کے دن کب بستر چھوڑتے ہیں؟''

''عموماً گیارہ بجے کے قریب۔ اس سے زیادہ لمبا نہیں سوسکتا۔''

35۔''ایک محاورہ جو میں اکثر لوگوں سے کہتا ہوں؟''

''جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے......اور واقعی ایسا ہوتا ہے۔''

36۔''میری عادت ہے کہ......؟''

''کہ جم ضرور جاتا ہوں، ورنہ جم کھلتا نہیں ہے۔''

37۔''میں فریش ہوتا ہوں؟''

''ایکسر سائز کرکے اور تقریباً چار پانچ سال سے میری یہ روٹین ہے کہ میں ایکسر سائز ضرور کرتا ہوں۔''

38۔''مجھے نشہ ہے؟''

''اپنے آپ کو فٹ فاٹ رکھنے کا۔''

39۔''میں نہیں رہ سکتا؟''

''اپنی فیملی کو دیکھے بغیر۔''

40۔''دعا کرتا ہوں کہ......؟''

''کہ اللہ تعالیٰ میری فیملی کو صحت و تندرستی کے ساتھ سلامت رکھے اور میں کبھی ان سے جدا نہ ہوں۔''

41۔''گھر آتے ہی پہلی خواہش؟''

"کہ فوراً مجھے میری "ماں" نظر آجائے۔ ماں کے بغیر گھر بہت برا لگتا ہے۔"

42۔ "اچھی یا بری خبر سب سے پہلے کسے سناتے ہیں؟"

"اپنے بڑے بھائی سلمان فیصل کو۔"

43۔ "آپ اپنے میں کیا تبدیلی لانا چاہتے ہیں؟"

"میں جلدی ٹمپر لوز کر لیتا ہوں...... مجھے اس پر قابو پانا ہے۔"

44۔ "غصے میں ردعمل؟"

"برا ہی ہوتا ہے اس لیے کنٹرول کرنا چاہتا ہوں۔"

45۔ "مسائل شیئر کرتا ہوں؟"

"اپنے بڑے بھائی سلمان فیصل سے۔"

45۔ "فخر کا کوئی لمحہ؟"

"جب لوگ میرے کام کی تعریف کرتے ہیں۔"

47۔ "کھیل سے لگاؤ؟"

"جی ہے......اور کرکٹ پسندیدہ کھیل ہے۔"

48۔ "دل کی دھڑکن کب تیز ہوتی ہے؟"

"جب بہت اونچائی پر چڑھتا ہوں ...... ہاہاہا......ویسے ہر نیا سین کرتے وقت۔"

49۔ "جھوٹ کب بولتے ہیں؟"

"جب ضرورت محسوس ہو...... یہ نہیں کہوں گا کہ جھوٹ نہیں بولتا......جھوٹ صرف فرشتے نہیں بولتے......اور میں فرشتہ نہیں انسان ہوں۔"

50۔ "بیماری کو سنجیدہ لیتے ہیں؟"

"بہت زیادہ نہیں......لیکن مجھے بیماری سے ڈر لگتا ہے۔ صحت بہت بڑی نعمت ہے۔"

51۔ "پہلی بار کیمرے کا سامنا ہوا تو؟"

"کچھ خاص نہیں ہوا ، کیونکہ بچپن سے ان چیزوں کا عادی ہوں۔"

52۔ "شوبز میں جگہ بنانے کے لیے کیا ضروری ہے؟"

"پرچی تو بالکل بھی نہیں ، صرف محنت اور ٹیلنٹ۔"

53۔ "خواہش ہے کہ ایسی فلم میں کام کروں جو؟"

"جو فیملی کے ساتھ بلا جھجک دیکھی جا سکے۔"

54۔ "ماں کے ہاتھ کا کیا پکا پسند ہے؟"

"ماں نے بہت کم پکایا ہے...... کیونکہ مصروف بہت رہیں، ہمارے بچپن سے اور اب تک......تو جو بھی پکاتی ہیں اچھا پکاتی ہیں۔"

55۔ "کیا محبت کا اظہار ضروری ہے؟"

"بے حد ضروری ہے کیونکہ اظہار نہیں کریں گے تو پتہ کیسے چلے گا کہ محبت ہے۔"

56۔ "وعدہ پورا کرتے ہیں؟"

"ہاہاہا......وعدہ...... وعدہ کر لیتا ہوں۔ مگر پورا کرنا بہت مشکل ہوتا ہے...... کوشش جاری رہتی ہے۔"

57۔ "بچپن کی کوئی شرارت جو ابھی بھی یاد ہو؟"

"جی...... بہت شرارتیں کی ہیں۔ جھوٹ بہت بولے ہیں بچپن میں۔"

58۔ "ایک تھپڑ جو ڈرامے میں کھایا ہو؟"

"ڈرامے میں تو تھپڑ نہیں کھایا...... مگر وہ مار کبھی نہیں بھولوں گا جب میں کلاس تھرڈ میں فیل ہوا تھا اور ماں نے مجھے مارا تھا۔"

59۔ "ایک کردار جو آپ کرنا چاہتے ہیں؟"

"میں ایک سیاست دان کا کردار کرنا چاہتا ہوں۔"

60۔ "اگر موقع ملے تو کس سیاست دان کا کردار کریں گے؟"

"شہباز شریف کا۔"

61۔ "ایک کردار جو مقبول ہوا؟"

"ایک نہیں ...... میں نے جو کیا مقبول ہوا۔ آنگن کا "سادان" کا کردار اور اب "بے دردی" کا "خلیل" بہت مقبول ہو رہا ہے۔ یہ سب میگا پروجیکٹس ہیں۔"

62۔ "ایک کردار جو کر کے پچھتائے ہوں؟"

"نہیں......ایسا کوئی کردار نہیں ہے، میں بہت سوچ سمجھ کر کردار سائن کرتا ہوں۔"

63۔ "اسکرپٹ کا مطالعہ کرتے ہیں؟"

"جی...... پہلے پورے اسکرپٹ کا مطالعہ کرتا ہوں۔ جو کردار مجھے دیا جا رہا ہے اس کا بغور جائزہ لیتا ہوں اور پھر ہاں کرتا ہوں۔"

64۔ "عورت حسین ہونی چاہیے یا ذہین؟"

"میرے خیال میں حسین سے زیادہ ذہین ہونی چاہیے۔"

65۔ "ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟"

"ہمارے گھر میں ایک کک ہے "خلیل"۔ مجھے اسی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا اور ناشتہ پسند ہے۔"

66۔ "آج جو کچھ ہوں آپ کی وجہ سے ہوں، کس کے لیے کہیں گے؟"

"اپنی ماں کے لیے کہوں گا۔ انہوں نے ہمارے لیے بہت جدوجہد کی، یہ مقام ان ہی کی وجہ سے ہے۔"

67۔ "شادی میں پسندیدہ رسم؟"

"ابھی شادی نہیں ہوئی تو کیا بتاؤں...... ہنستے ہوئے۔"

68۔ "شادی میں گفٹ دینا چاہیے یا کیش؟"

"میرا خیال ہے کہ کیش دینا چاہیے۔ کیونکہ پھر سامنے والا اپنی پسند کی کوئی بھی چیز لے سکتا ہے۔"

69۔ "تحفے تحائف دیتے ہیں؟"

"میں تحفے تحائف کی جگہ نقد رقم دیتا ہوں۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہو سکتا ہے کہ میری چیزیں پسند نہ آئیں...... میں تو عید کے موقع پر بھی کیش ہی دیتا ہوں۔"

70۔ "آنکھ کھلتے ہی اٹھ جاتے ہیں یا ٹائم لیتے ہیں؟"

"تھوڑا ٹائم لیتا ہوں۔ فوراً بستر چھوڑنا مشکل ہوتا ہے۔"

71۔ "خدا کی حسین تخلیق؟"

"یہ دنیا اور دنیا میں "ماں"......"

72۔ "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟"

"فون، چارجر اور اس طرح کی ضروری چیزیں جن کے بغیر گزارہ نہیں۔"

73۔ "زندگی کب بری لگتی ہے؟"

"کبھی نہیں......زندگی خدا کا تحفہ ہے۔"

74۔ "محنت سے پیسہ ملتا ہے یا قسمت سے؟"

"دونوں سے ......محنت بہت ضروری ہے۔ باقی کام قسمت کا ہے۔"

75۔ "دل کی سنتے ہیں یا دماغ کی؟"

"دونوں کی......"

76۔ "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"

"سنا تو یہی ہے ......آزمانے کا موقع نہیں ملا۔"

77۔ "لوگ ملتے ہیں تو کیا فرمائش کرتے ہیں؟"

"سیلفی پلیز۔"

78۔ "بدلہ لیتے ہیں؟"

"نہیں......فطرت میں نہیں ہے۔"

79۔ "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"

"اللہ نہ کرے۔"



عمران خان سے ملاقات

ایکسپریس نیوز کے اینکر پرسن

شاہین رشید

چینلز بے شمار اور اینکرز بے حساب، مگر ریموٹ اسی اینکر کے پروگرام پہ رکتا ہے جو بہترین پروگرام پیش کرتا ہے۔ اگر علیحدہ علیحدہ چینل کا موازنہ نہ کیا جائے تو ایکسپریس چینل کے تین اینکرز ایسے ہیں جن کے پروگرام نہ دیکھو تو تشنگی سی محسوس ہوتی ہے، ان میں جاوید چوہدری، منصور علی خان اور عمران خان صاحب شامل ہیں...... آج آپ کی ملاقات عمران خان صاحب سے کروا رہے ہیں۔ ہم مشکور ہیں ان کے کہ انہوں نے اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر ہمیں انٹرویو دیا۔

"کیسے ہیں عمران خان صاحب......؟"

"الحمدللہ۔"

"کچھ اپنے اور اپنی فیملی کے بارے میں بتائیں؟"

"جی ضرور...... میرا پورا نام "محمد عمران ریاض خان" ہے۔ میرے نانا اور میرے دادا دونوں سگے بھائی تھے اور یہ جموں کشمیر سے ٹریول (ہجرت) کر کے "سری نگر" کے قریب ایک علاقہ ہے پرانی پورہ آئے وہاں سے یہ پاکستان بننے سے کچھ عرصے پہلے پاکستان آئے تھے...... ان دو بھائیوں کی اولاد میں سے ایک میں بھی ہوں۔

میں کراچی میں 29 دسمبر 1983ء میں پیدا ہوا اور میری پیدائش کے بعد میرے والدین لاہور آ گئے اور تب سے اب تک ہم لاہور میں ہی رہتے ہیں اور ہمارے یہاں پشتو، اردو، ہندکو بولی جاتی ہے۔ میرے دادا کشمیری زبان بھی بہت روانی سے بولتے تھے۔

میری پرورش لاہور میں ہی ہوئی۔ ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کیا ہے میں نے...... میرے والد ایک بینک میں کام کرتے تھے، پھر وہ پاکستان سے باہر چلے گئے، درحقیقت میرے والد انجینئر تھے، (آٹوموبائل انجینئر) تو انہوں نے کئی ملکوں میں کام کیا ہے۔ اور جو آخری پروجیکٹ انہوں نے کیا۔ وہ سعودی عرب میں کیا۔ اب وہ کافی عرصے سے پاکستان میں ہیں۔ اور ابھی بھی ماشاءاللہ وہ بہت ایکٹو ہیں اور کام کرتے رہتے ہیں۔

2009ء میں میری شادی ہوئی اور ماشاءاللہ چار بچے ہیں، دو بیٹے اور دو بیٹیاں...... اور آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ میں نے ابتدائی اور سیکنڈری تعلیم اور پھر کالج کی تعلیم سرکاری اسکول و کالج سے ہی حاصل کی۔

"آپ کا نام عمران خان ہے...... اور ایک تحریک انصاف کے عمران خان ہیں تو کبھی زندگی میں کوئی مسئلہ ہوا...... کیا ان سے متاثر ہو کر آپ کا نام رکھا گیا؟"

"جی...... میں کراچی کے ایک اسپتال میں پیدا ہوا، اس زمانے میں عمران خان صاحب بہت مشہور کرکٹر تھے۔ امی کی لیڈی ڈاکٹر نے میری والدہ سے کہا کہ آپ کے شوہر کا نام "ریاض خان" ہے تو آپ اپنے بیٹے کا نام عمران رکھیں تو یہ عمران خان کہلائیں گے، تو ان کی خواہش پہ میرا نام رکھا گیا تھا۔

اور جہاں تک ایک نام کی کنفیوژن کی بات ہے تو ایک بار فون آیا کہ خان صاحب آپ کو پتا نہیں آپ کی پارٹی کے اندر کیا ہو رہا ہے، ہم آپ کو بتانا چاہتے ہیں۔ تو میں نے ہنس کر کہا کہ یہ بات آپ تحریک انصاف کے عمران خان کو بتائیں...... ابھی الیکشن کے ٹکٹ کے معاملے میں کچھ لوگوں کے فون آئے کہ خان صاحب بڑی زیادتی ہوئی ہے اور ہم آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں...... تو میں نے کلیئر کر دیا۔ تو ایسا دو چار مرتبہ ہوا ہے...... زیادہ نہیں۔"

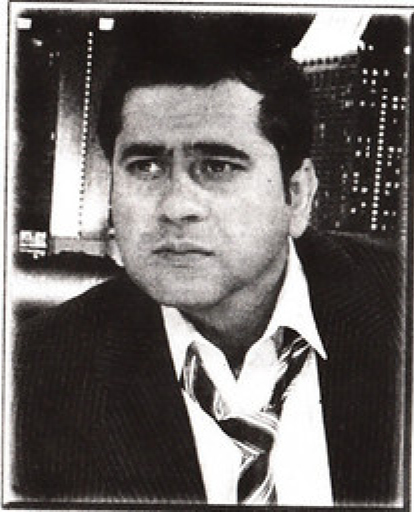
"بچپن میں کیسے بچے تھے اور طالب علم کیسے تھے؟"

"جی...... بچپن میں بہت شرارتی تھا اور میرے والدین بتاتے ہیں کہ بچپن میں جتنا شرارتی عمران تھا کوئی بھی نہیں تھا...... جھگڑالو بہت تھا میں، سب سے جھگڑا ایک منٹ میں کرتا تھا۔ اسکول میں زیادہ تر کھیلوں اور دیگر غیر نصابی سرگرمیوں کی طرف رجحان تھا مگر طالب علم بھی بہت اچھا تھا، کبھی بُرے نمبروں سے پاس نہیں ہوا، ہمیشہ فرسٹ ڈویژن ہی آئی الحمدللہ......

اور میرا یہ ماننا ہے کہ اگر آپ غیر نصابی سرگرمیوں میں ایکٹو ہیں تو آپ دماغی طور پر بھی بہت ایکٹو ہیں یعنی جسمانی اور دماغی طور پر ایکٹو ہونا بہت ضروری ہے۔ میں تو بزم ادب کے تحت اسکول میں نعتیں بھی پڑھتا تھا اور تقاریر بھی کرتا تھا...... اور شکر کہ تعلیمی میدان میں کسی چیلنج کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا کیونکہ میں پڑھائی میں کافی اچھا تھا...... اور سب سے بڑی بات یہ کہ وقت کا بہت پابند تھا اور ہوں۔ مجھے اس بات سے بہت نفرت تھی کہ میں کہیں لیٹ نہ ہو جاؤں۔"

"آپ کے کیا خواب تھے، کیا بننا چاہتے تھے اور والدین کی کیا خواہش تھی آپ کے لیے؟"

"زندگی بھی کسی ایک ڈگر پہ آ کر رک نہیں جاتی



اور خاص طور پر جب انسان بچپن سے ٹین ایج میں آتا ہے تو اس کی ترجیحات اور پسند ناپسند بدلتی رہتی ہے۔ انسان کے مقاصد بدلتے رہتے ہیں، جب میں چھوٹا تھا تو مجھے سب سے زیادہ اچھا شعبہ جہاز اڑانے کا لگتا تھا مجھے لگتا تھا کہ میں پائلٹ بنوں گا، تھوڑا سا بڑا ہوا تو معلوم ہوا کہ اور بھی بہت کچھ ہے کرنے کے لیے...... ایک دور ایسا آیا کہ جب میں ویڈیو گیم کھیلنے جاتا تھا تو مجھے لگتا تھا کہ دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان ویڈیو گیم کا مالک ہے، تو میں بھی یہ کاروبار کروں گا اور ویڈیو گیم کی دکان کھولوں گا اور پھر میں جتنی مرضی ویڈیو گیمز کھیلوں۔

ایک وقت ایسا آیا کہ جب میں دیکھتا تھا کہ حالات بہت خراب ہیں۔ ملک میں جرائم بہت ہیں، تو میں پولیس والا بن کے لوگوں کو پکڑوں گا، تو ان سارے مراحل سے گزرتے گزرتے آپ پالش ہوتے رہتے ہیں، وقت کے ساتھ ساتھ آپ سیکھتے رہتے ہیں...... تو جہاں آپ نے پہنچنا ہوتا ہے قدرت آپ کو وہاں لے جاتی ہے......

جرنلسٹ بننے کے لیے میں نے باقاعدہ پلاننگ کے تحت اس شعبے کو جوائن کیا اور ایک خاص عمر کے بعد میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ میرے کرنے کے لیے بھی

بہترین کام ہے......تو میں نے پلان کیا، محنت کی اور کامیاب ہو گیا اور جہاں تک والدین کی بات ہے تو میں کہتا تھا کہ ڈاکٹر بنوں گا تو وہ کہتے تھے کہ ہاں یہ بن جائے گا۔ میں پائلٹ بنوں گا تو وہ کہتے ٹھیک ہے پائلٹ بن جاؤ......ایک دور میں پولیس والا بننا چاہتا تھا تو وہ کہتے تھے کہ ہاں یہ پولیس والا بن جائے گا۔ تو مجھ میں

تبدیلیاں آئیں تو میرے والدین میں بھی تبدیلیاں آئیں۔ وہ میرے شوق اور لگن کے ساتھ ساتھ رہے۔"

"دیگر شعبوں کی طرح جرنلسٹ بننے کا بھی شوق ہوا، پھر اسے فائنل شکل کس سے متاثر ہو کر دی؟"

"صحافت میں، میں بائے چوائس آیا ہوں۔ 2005ء، 2004ء میں صحافیوں کو کام کرتا ہوا دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ مجھے بھی صحافی بننا چاہیے۔ پھر میں نے کچھ صحافیوں سے ملاقاتیں کیں، میں اس زمانے میں امریکن مرکنٹائل کمپنی میں کام کرتا تھا اور سیلری بھی بہت اچھی تھی۔ اس کمپنی کو چھوڑ کر صحافت میں آنا بے وقوفی سمجھا جا رہا تھا کیونکہ اس فیلڈ میں تو فوری طور پر پیسے بھی نہیں ملتے تھے، مگر فیلڈ سے خوامخواہ لگاؤ پیدا ہو گیا اور میں نے یہ ٹھان لی کہ سب کو دکھا دوں گا کہ مجھ میں صحافی بننے کے گُر ہیں......میں نے اپنی ایک سی ڈی بنائی اپنے ایک کیمرہ مین دوست کے تعاون سے، پھر اسے ایڈٹ کروایا......میں یہ دکھانا چاہتا تھا کہ مجھ میں صحافی بننے کی صلاحیت ہے......وہ ویڈیو میں نے سارے چینلز کو بھیجی، مجھے کسی نے نوکری نہیں دی نہ ہی بلایا......

تقریباً سات، آٹھ ماہ کے بعد ایکسپریس نیوز نے اپنا پروجیکٹ لانچ کیا تو میں نے انہیں اپنی ویڈیو بھیجی ......انہوں نے مجھے بلایا اور تجرباتی طور پر مجھے بھرتی کیا۔ کیونکہ اس وقت تک میں نے ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز نہیں کیا تھا......ماسٹرز میں نے بعد میں کیا۔

تو جناب تجرباتی طور پر انہوں نے مجھے رکھا اور مزے کی بات یہ کہ میں جس کمپنی میں جاب کرتا تھا اس سے تقریباً چار پانچ گنا کم پیسوں پہ میں اس چینل پہ بہ حیثیت ٹرینی رپورٹر آیا تھا......اور لاہور میں بطور ٹرینی رپورٹر ڈیڑھ سال جاب کی......

اس کے بعد مجھے رپورٹر کا عہدہ مل گیا، چار سال رپورٹر رہا، پھر سینئر رپورٹر ہوا......

2012ء میں مجھے موقعہ ملا پروگرام کرنے کا اور میں نے دو تین پروگرام کیے ایک اینکر کی کمی کی وجہ سے ــ مجھے کہا گیا کہ کرنٹ افیئرز پہ کام کرنا ہے۔ میں

جب کام کرنے کے بعد دوبارہ اپنی سیٹ پہ جاتا تھا تو مجھے بتایا گیا کہ آپ کے کام کا فیڈ بیک بہت اچھا آیا اور مجھے بہ ذاتِ خود بھی اچھا فیڈ بیک ملا اور میری خواہش بھی تھی کہ میں بطور اینکر کام کروں اور میں نے اپنی خواہش کا اظہار بھی کیا......تو مجھے ایک پروجیکٹ دیا گیا جو رات کو دس بجے کرنا تھا۔ اتوار کے دن۔ پھر مجھے آٹھ بجے کا پروگرام دیا گیا۔ اب ویک ڈیز پہ......پیر، منگل اور بدھ کے دن پروگرام کرتا ہوں......یہ وہ تمام مراحل ہیں جن کو عبور کرتا ہوا اس مقام تک پہنچا ہوں......اور اپنے بارے میں ایک بات میں آپ کو ضرور بتانا چاہوں گا اور وہ یہ کہ آج سے دس بارہ سال پہلے میں ہکلا کر بولتا تھا، بہت سے الفاظ کی ادائیگی میں مجھے پرابلم ہوتی تھی اور بغیر کسی ڈاکٹر کے علاج کے، میں نے خود بہت کوشش کی کہ اپنی اس خامی پر قابو پا لوں، میں انٹرنیٹ پہ دیکھ دیکھ کر پریکٹس کرتا تھا......اور میں نے بڑی مشکل سے اپنی اس خامی کو دور کیا کہ ہکلائے بغیر الفاظ کو کس طرح بولنا ہے ان کی ادائیگی کیسے کرنی ہے۔ ان کا تلفظ کیسا ہو گا۔ تو بہت محنت کے بعد میں اس میں کامیاب ہوا ہوں۔ میرے اس سارے کیریئر میں میری یہ سب سے بڑی کامیابی ہے۔"

"اس وقت کیا کیفیت ہوتی ہے جب آپ کو کوئی نہیں بولنے دے رہا ہوتا اور بحث عروج پہ ہوتی ہے؟"

"شروع شروع میں بہت پرابلم ہوتی تھی، کیونکہ اتنی قوت برداشت نہیں تھی اور جب آپ رپورٹر ہوتے ہیں، تو آپ کو پتا ہوتا ہے کہ کون سچ بول رہا ہے اور کون جھوٹ، آپ فیلڈ کے آدمی ہوتے ہیں

آپ سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہوتی، تو جب منہ پہ بیٹھ کر لوگ جھوٹ بولتے ہیں تو بہت تکلیف ہوتی ہے، غصہ آتا ہے، لڑائی کرنے کو دل چاہتا ہے......

شروع میں ایسا ہی ہوتا تھا...... پھر وقت کے ساتھ ساتھ غصے پہ قابو پانا آجاتا ہے۔ برداشت کرنا بھی آجاتا ہے...... پھر آپ یہ سوچتے ہیں کہ بجائے اس کے کہ میں غصہ کروں، میں اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو ایکسپوز کروں، اگر مجھے پتا چل رہا ہے کہ یہ آدمی جھوٹ بول رہا ہے تو سب کو پتا چلنا چاہیے...... اب اس کو ایکسپوز کیسے کرنا ہے اس کے لیے آپ کو تھوڑا سا ہوشیاری سے کام لینا ہوتا ہے، دماغ سے کام لینا پڑتا ہے۔ کیونکہ جذبات یہاں چلتے نہیں ہیں...... تو میں اس معاملے میں کوئی اتنا اچھا اینکر مشہور نہیں ہوں، کیونکہ مہمانوں کے ساتھ میری ہلکی پھلکی جھڑپ ہو جاتی ہے لیکن اچھی بات یہ ہے کہ لوگ مجھے برداشت کر لیتے ہیں اور کچھ میری برداشت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ مگر لوگوں پہ تھوڑا بہت سچ اور جھوٹ عیاں ضرور ہو جاتا ہے۔"

"کبھی کوئی آپ کا پروگرام چھوڑ کر گیا؟"

"دیکھیے ایسا اکثر ہو جاتا ہے۔ لیکن حتی الامکان کوشش یہ ہوتی ہے کہ کوئی آپ کا پروگرام چھوڑ کر جائے نہیں، کیونکہ وہ آپ کا مہمان ہے، آپ کے ذہن میں یہ بات ہونی چاہیے، کسی کو زیادہ دیوار کے ساتھ نہیں لگانا چاہیے۔ کسی کی سبکی نہیں کرنی چاہیے...... سوال پوچھنا چاہیے کہ اینکر سوال پوچھ رہا ہے اس کا کوئی ایجنڈا نہیں ہے...... پھر بھی چھوٹے موٹے معاملات ہو بھی جاتے ہیں تو میں کسی کو جانے نہیں دیتا۔"

"انٹرویوز بھی آپ نے کافی کیے، اپنے تجربات بتایئے کس نے کس طرح انٹرویو دیا اور کہا کہ سوال کیا ہوں گے؟ اور یہ کہ کس کا انٹرویو کرنا چاہتے ہیں؟"

"میں نے پاکستان کے سب بڑے لوگوں کا انٹرویو کیا ہے، زرداری صاحب کا آن دی کیمرہ انٹرویو نہیں کیا، لیکن ان کے ساتھ گپ شپ خوب لگائی، بلاول کا بھی کیا، بے نظیر بھٹو صاحبہ سے میں نے سوالات پوچھے، وہ ایک شاندار قسم کی خاتون تھیں بدقسمتی سے وہ ہمارے درمیان نہیں رہیں اور میں جب بھی "ون او ون" پروگرام کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اگر ان کا انٹرویو کرتا تو بڑا شاندار انٹرویو ہوتا......

پاکستان میں لیڈر انٹرویو دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے سب کے اپنے اپنے مسائل ہیں...... لیکن دو لوگ پاکستان میں ایسے ہیں جنہوں نے انٹرویو دیتے وقت یہ نہیں کہا کہ یہ پوچھو یہ نہ پوچھو یا مجھے پہلے سے سوالات بتا دو...... ان میں ایک پرویز مشرف صاحب ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جو آپ کا دل چاہے آپ پوچھیں، وہ انڈین چینل کو بھی اسی اعتماد کے ساتھ انٹرویو دیتے ہیں۔ دوسرے تحریک انصاف کے عمران خان صاحب...... اب میں افتخار چوہدری صاحب اور آصف زرداری صاحب سے انٹرویو کرنے کی کوشش کر رہا ہوں...... دیکھیں کہ یہ کب انٹرویو دیتے ہیں۔"

"کیا اینکرز کی فیلڈ میں بھی پروفیشنل جیلسی ہے؟ جیسا کہ ہر شعبے میں ہے؟"

"ہاں جی...... کافی زیادہ ہے۔ پروفیشنل جیلسی ہر شعبے میں ہے...... کھلے عام لڑائیاں ہو رہی ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کو اپنے پلیٹ فارم پہ ڈیل کر رہے ہوتے ہیں...... ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ انسانی جبلت ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ دوسرے کو نیچا کریں گے تو خود اوپر ہو جائیں گے، حالانکہ بڑا سادا سا فارمولا ہے کہ اپنے آپ کو اوپر کریں گے تو دوسرے خود بخود نیچے ہو جائیں گے...... تو اپنے اپنے سوچنے کا انداز ہے...... میں بلاوجہ یہ نہیں کہوں گا کہ میں بڑا پارسا ہوں، میں ایسا ہوں، میں ویسا ہوں، نہیں...... میں بہتر بننا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے راستہ آپ کو خود چننا ہوگا کہ کون سا پوزیٹو ہے کون سا نگیٹو ہے۔ آپ پرابلم کریٹر ہیں یا پرابلم سولور ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ کسی کے لیے مشکل پیدا کرتے ہیں تو آپ کے لیے بھی آسانیاں پیدا نہیں ہوتیں۔"

"پاکستان کا فیوچر کیسا دیکھتے ہیں آپ؟"

"پاکستان کا فیوچر برائیٹ ہے...... بس اس ملک کو ایک اچھی لیڈر شپ چاہیے اور تھوڑی سی مساوات چاہیے۔ لوگوں کے لیے میرٹ ہو جائے جس کا جو حق ہے اسے مل جائے تو پھر آپ دیکھیں کہ اس ملک کی گاڑی ایسے گیئر میں ڈلے گی کہ سب دیکھتے رہ جائیں گے۔"

"سیاست دانوں سے کچھ کہنا چاہیں گے؟"

"میں پاکستان کے تمام سیاست دانوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں سے ووٹ مانگنے جاتے ہیں۔ لوگوں کے کام کرنے کے لیے لوگوں کے کام آنے کے لیے، اس ملک کی حفاظت کے لیے، اس ملک کے نظام کو چلانے کے لیے، قانون سازی کرنے کے لیے...... آپ کسی کے سیاسی غلام بن کے رہنے کے لیے نہیں آتے اقتدار میں...... مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے جب ہمارے پروگرام میں بیٹھ کر، یا اخبارات میں یا پریس کانفرنس، کسی فورم میں یا پارلیمنٹ میں، جب اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ، جو دو، دو، چار، چار الیکشن جیت کر آتے ہیں۔ جنہوں نے لاکھوں ووٹ لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ کھڑے ہو کر کسی کی کرپشن کا دفاع کرتے ہیں، کسی کی غلط بیانی کا دفاع کرتے ہیں، کسی کے برے کردار کا دفاع کرتے ہیں...... آپ ان کا دفاع نہ کریں وہ اپنا دفاع خود کر لیں گے، آپ کسی کے غلام نہیں ہیں۔ لوگوں نے آپ کو ووٹ دے کر بھیجا ہے، کم سے کم اپنے ووٹر کا تو احترام کریں...... اور ملک کے لیے کام کریں، سیاسی شخصیات یا سیاسی خاندانوں کے لیے کام نہ کریں...... بس یہی گزارش ہے سب سے۔"

"بہت اچھی بات کی آپ نے، کاش اس پہ کوئی عمل بھی کرے...... اور کیا ایکٹویٹیز ہیں آپ کی؟"

"جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ مجھے اسپورٹس سے بہت لگاؤ ہے، میں شکار بڑا اچھا کھیلتا ہوں۔ شکار کے سیزن میں، میں پورے پاکستان میں



جاتا ہوں شکار کھیلنے کے لیے، ہائی کنگ کا مجھے بہت شوق ہے، کیمپنگ کا بہت شوق ہے۔ ہر طرح کی آؤٹ ڈور ایکٹوٹیز مجھے پسند ہیں ......کرکٹ اور بیڈمنٹن ابھی بھی کھیلتا رہتا ہوں، باکسنگ میں نے چھ سال تک کھیلی ہے۔ جمناسٹک کا شوق رہا ہے مجھے، میری عادت ہے کہ میں کسی نہ کسی ایکٹوٹی میں اپنے آپ کو انوالو رکھتا ہوں ......اور یہ کرنٹ افیئر ہے جس کے ساتھ چوبیس گھنٹے جڑے رہتے ہیں۔"

"کھانا پکانے سے لگاؤ ہے یا کھانے سے زیادہ لگاؤ ہے؟"

"میں نے آپ کو بتایا کہ مجھے کیمپنگ کا بہت شوق ہے تو میں کھانا بھی بہت اچھا پکا لیتا ہوں۔ اور میرے دوست کہتے ہیں کہ میں کھانا بہت اچھا پکاتا ہوں۔ خاص طور پر شکار کیا ہوا گوشت پکانا بہت مشکل ہوتا ہے، وہ میں بہت اچھا پکاتا ہوں اور اپنے گھر والوں کو بھی پکا کر دیتا ہوں......سردیوں میں میرے گھر میں دعوت ہوتی ہے تو کھانا میں ہی پکاتا ہوں۔ پاکستان سے باہر تین چار ملکوں میں میرا جانا ہوا ہے اور اب ان شاء اللہ الیکشن کے بعد ملک سے باہر ٹور کا پلان ہے......دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

"کبھی کسی اور چینل سے آفر آئی؟"

"جی......بہت بار آفرز آئیں......ڈبل پیسے، اس سے زیادہ پیسے......ابھی بھی آتی رہتی ہیں، کچھ آفرز پینڈنگ ہیں کہ جب دل چاہے آجاؤ، چینل کے دروازے کھلے ہیں۔ لیکن مجھے نہیں لگتا کہ میں ایکسپریس نیوز کو اتنی آسانی سے چھوڑ سکوں گا، میں یہاں ٹرینی رپورٹر کے طور پر آیا تھا اور تب سے اب تک یہیں کام کر رہا ہوں، میں بہت خوش ہوں اور فرینکلی بتاؤں کہ پیسوں کا کوئی معاملہ بھی نہیں ہے اور مجھے پیسوں کا کوئی خاص شوق بھی نہیں ہے......نہ گاڑیوں کا، نہ پراپرٹیز کا، بس جو ضرورت ہے وہ اللہ تعالٰی پوری کرتا رہے، اور آپ کو حیرت ہوگی کہ میں ابھی بھی اپنے گھر والوں سے پیسے لیتا ہوں، مجھے پتا بھی نہیں ہوتا کہ میرے پیسے کہاں ہیں، حساب کتاب کا مجھے آئیڈیا نہیں ہے نہ میں پیسے سنبھال سکتا ہوں نہ ہی بچا سکتا ہوں اور نہ ہی مجھے بہت سارے پیسے چاہیے ہوتے ہیں۔ شروع سے اب تک پیسہ میرا مسئلہ رہا ہی نہیں ہے۔ پیسے کی ضرورت سب کو ہوتی ہے مگر میں نے اس کو اپنی مجبوری نہیں بننے دیا۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے عمران خان صاحب سے اجازت چاہی۔ باتیں بہت تھیں مگر جگہ کی کمی آڑے آگئی۔

☆

عمیرہ احمد

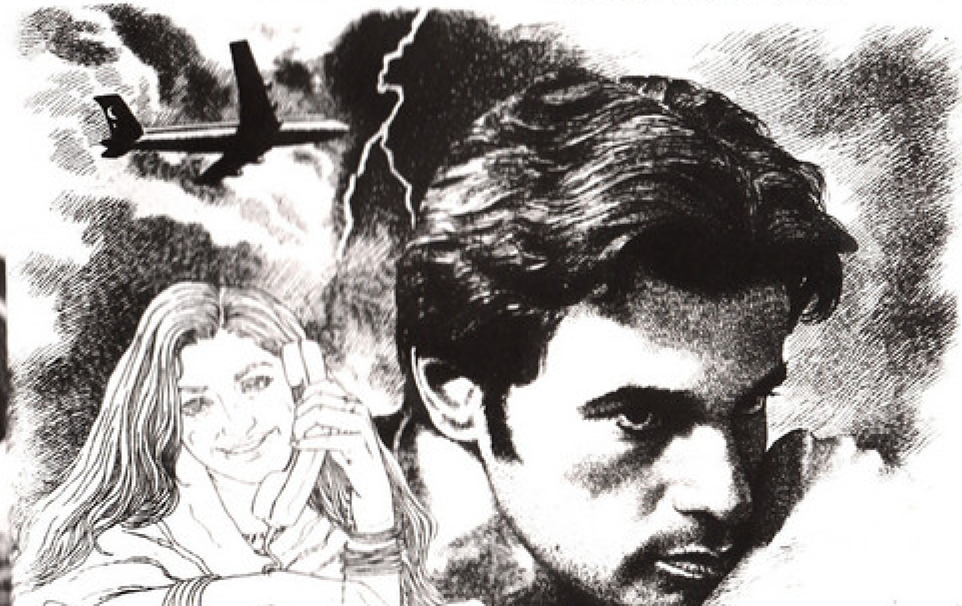
الف

جان جہاں! تمہیں گئے 423 دن ہو گئے۔ 423 دن نہیں، ایسا لگتا ہے 423 سال ہو گئے۔ تم نے میری زند
کے ان دنوں کو جو تمہارے ساتھ لمحوں کی طرح گزرتے تھے، سال بنا دیا ہے۔ مجھے کئی بار لگتا ہے میں ریت
گھڑی ہو گئی ہوں جو پچھلے 423 دنوں سے تمہاری واپسی کے دنوں کو منٹوں، گھنٹوں کی طرح گنتے ہوئے اسی ریت
طرح گرتی بکھرتی جا رہی ہوں۔

تمہیں یاد ہے جب ہم پہلی بار ملے تھے تو دوسری ملاقات میں یہ ساری باتیں تم نے کہی تھیں۔ وقت
منٹوں، گھنٹوں کو گننے کی، نہ گزرنے کی...... لمحوں کی سست رفتاری کی...... سالوں جیسا لگنے کی اور تب ہماری
اور دوسری ملاقات میں بس ایک دن ہی تو آیا تھا۔

آج میں 423 پہاڑ سر کر کے بیٹھی ہوں، تم نے مجھے موم کا بنا دیا ہے۔ اپنے ہی شعلے کی تپش سے پگھلنے
موم، پر نہ ختم ہونے والا۔ جو پگھل پگھل کر ڈھیر ہوتا رہتا ہے، راکھ نہیں بنتا۔ تم جو سزا دے کے گئے ہو، وہ بہ
لمبی ہو گئی ہے۔ یہ سزا تم نے دی ہے اس لیے اسے کاٹوں گی۔

آج چھت کی بیل میں پہلا پھول کھلا، تمہارے ہاتھ کی اگائی ہوئی بیل میں کاسنی رنگ کا پہلا پھول......
تین کلیاں اور بھی ہیں جو کل صبح میرے جاگنے تک پھول بن چکی ہوں گی۔ بہار آ رہی ہے، ہر بار تم مجھے چھت



اس بیل میں پہلا پھول کھلنے کی خبر دیا کرتے تھے۔ بہار بھی سب سے پہلے تم کو اپنے آنے کی نوید دیتی تھی......اور
تم مجھے سفید گلاب لا کر پیش کرتے تھے، یہ سبز بہار ان سفید گلابوں کے بغیر بھی بہار نہیں لگتی تھی مجھے۔ تمہارے
ہاتھ کا لگایا ہر پودا، ہر پیڑ مجھ سے تمہاری باتیں کرتا ہے۔ تمہارا پوچھتا ہے، پچھلے سال تمہیں پوچھتے پوچھتے وہ خزاں
کی لپیٹ میں آئے تھے۔ اس بار پھر تمہیں یاد کرتے ہرے ہو رہے ہیں، صرف ایک میں ہوں جس پر ایک ہی
موسم ہے۔ خزاں کا موسم، پتے جھڑنے، ٹوٹنے، بکھرنے کا موسم۔

وہ سارے پرندے پھر سے آنے لگے ہیں، جن کی بولیوں اور چہچہاہٹوں کے معنی تم مجھے بتایا کرتے تھے
وہ کب کیا مانگ رہے تھے، کیا کہہ رہے تھے۔ کیا چاہ رہے تھے، کون خوش تھا، کون اداس، کون اپنے ساتھی کے
ساتھ کی خوشی میں چہچہا رہا تھا۔ کون اپنے ساتھی کی جدائی کے غم میں اداس تھا۔ کون گیت گا رہا تھا، کون نوحہ
سب صرف تمہیں بوجھنا آتا تھا مجھے نہیں اور مجھے لگتا تھا۔ مجھے بھی آ بھی نہیں سکتا، پر جان جہاں تمہارے بغیر
گزارے ان 423 دنوں میں یہ بولی بھی جاننے لگی ہوں میں۔

ان میں سے ہر ایک مجھ سے صرف تمہارا پوچھتا ہے کہ وہ جو اس پہاڑ کے دامن میں، اس گھر کے پھولوں
کے بیچ و بیچ چاندنی راتوں میں اور خنک سویروں میں اپنے سفید لباس میں رقصاں ہوا کرتا تھا، وہ کہاں ہے۔
جس کے پاؤں کی گردش میں رومی کے مصرعوں جیسا وجد تھا۔ وہ اب کہاں ہے اور جس کے بازوؤں کی جنبش پرندوں
کی طرح ہواؤں میں اپنا راستہ بناتی تھی، وہ خود اس گھر کا راستہ کیوں بھول گیا ہے۔

میرے پاس ان کے سوالوں کے جواب میں خاموشی کے سوا کچھ نہیں۔ ان سے کیا بات کروں،
بتاؤں...... ان میں سے کوئی کچھ نہیں سمجھ پائے گا...... نہ میری تاویلوں کو، نہ مجبوریوں کو، نہ بہانوں کو،
میرے غم کو...... پر تم تو سمجھ سکتے تھے نا...... تم تو ساتھی تھے میرے۔ زندگی بھر کے ساتھ کا وعدہ کر کے لائے تھے
مجھے...... پھر تم اس طرح چھوڑ کر کیسے چلے گئے۔

ان لفظوں کی سیاہی کو جو دھندلا رہا ہے، وہ میری آنکھوں کا پانی ہے۔ آنسو نہیں ہیں...... یہ پانی ہے۔
میرا پچھتاوا...... میری ندامت...... میری خطا کو مٹا دینے، بہا دینے کے لیے آنکھوں میں امڈ آنے والا پانی۔
وقت گزرتا جا رہا ہے، زندگی گزرتی جا رہی ہے۔ پر نہ میرا پچھتاوا کم ہو رہا ہے نہ تمہاری جدائی کا غم۔
تمہارا غصہ...... زندگی میں ایک غلطی کی میں نے۔ تم نے وہ بھی معاف نہیں کی۔ تم جو رومی کے عالم وجد میں
گھومتے درویش تھے، اس کے باوجود...... تم ساری دنیا کے لیے رحم اور درگزر تھے، میرے لیے کیوں نہیں
ہوئے۔ میں نہیں رہوں گی، تب آؤ گے تو کیا آؤ گے۔

اتنے خط، اتنی منتیں میں نے کہاں، کبھی کسی کی، کی ہیں مگر تمہاری کی ہیں تو مجھے اس کا بھی رنج نہیں۔ تمہارا
ساتھ زیادتی بھی تو بہت بڑی کی تھی نا میں نے۔

یہ سارے خط جو میں نے تمہیں لکھے ہیں، یہ میرے پچھتاوے کے گواہ ہیں۔ صرف یہ کاغذ ہی ہیں جن
میں اپنا دل کھول کر رکھ سکتی ہوں اور یہ میرا غم جھیل لیتے ہیں۔ جو میں کر بیٹھی ہوں، وہ کس کو سنا سکتی ہوں میں۔
کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ وہ میری اور تمہاری محبت کا قصہ سنے اور پھر جدائی کی داستان...... محبت کی ہر کہانی
کو لوگ جھوٹا کہتے ہیں یا پھر نادانی۔ بس ایک میں ہوں جو اب بھی اس پر یقین رکھے بیٹھی ہوں۔
پتا نہیں یہ صحیح ہے یا غلط...... پتا نہیں نادانی ہے یا حماقت...... پر جو بھی ہے، یہ میری زندگی لے گئی۔
تمہاری خطا...

☆☆☆

پانی کی پہلی بوند اس کے سر پر گری تو اس نے سائیکل چلاتے ہوئے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ وہاں بادل
اس کی سائیکل کے پہیوں ہی کی رفتار سے رواں دواں تھے...... سیاہ جنوں بھوتوں جیسا رنگ اور شکلیں بناتے
بادل...... دوسری بوند ٹھیک اس کی ناک کی نوک پر گری تھی اور وہاں سے اس کے ہونٹوں اور ہونٹوں سے ٹھوڑی
اور ٹھوڑی سے اس کی گردن کا سفر اس نے سیکنڈز میں کیا تھا۔

اس نے سر جھکا کر پیڈلز کو پوری قوت سے گھمانا شروع کر دیا تھا۔ یوں جیسے وہ ان بادلوں اور ان پر سوار
بوندوں کو ہرانا چاہتا ہو۔ ہرکولیس کی طرح...... تیز، تیز اور تیز...... ہوا سے تیز...... بادلوں سے طاقت ور......

اس کی سائیکل اس پگڈنڈی پر ہچکولے کھا رہی تھی، پر چلتی جا رہی تھی۔ سرسبز کھیتوں کے بیچ و بیچ سے
گزرتی، اس وسیع علاقے پر پھیلے درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو رہی تھی جہاں وہ جانا چاہتا تھا۔ بادل اور بارش
اس کا تعاقب کر رہے تھے یا کم از کم اسے ایسا ہی لگ رہا تھا۔ وسیع و عریض علاقے پر پھیلے ہوئے بلند درختوں کے
اس جنگل میں داخل ہوتے ہی اسے لگا تھا جیسے وہ بادلوں کو شکست دے آیا تھا۔

وہ اس جنگل کے سامنے سے روز گزر کر اسکول جایا کرتا تھا بلکہ اس کے ساتھی، اسکول کے سارے بچے، روز
ہی وہاں سے گزرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ جنگل بیر ڈھونڈنے اندر گھس جاتے تھے مگر کبھی بھی اس جنگل میں بہت
اندر تک جانے کی ان کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی لیکن آج وہ اکیلا ہی اس جنگل میں گھس آیا تھا۔ بلند و بالا گھنے
درختوں کے تنوں نے بہت بلندی پر جیسے اپنی شاخوں سے اس سارے جنگل پر ہی چھت تان دی تھی، جس میں
سے سورج کی روشنی اور ہوا چھن چھن کر آتی لیکن اس وقت جب سورج بادلوں کی اوٹ میں تھا تو جنگل دن میں
بھی تاریکی میں ڈوبا ہوا لگ رہا تھا۔

وہ آٹھ نو سالہ بچہ جنگل میں آگے، بہت آگے جانا چاہتا تھا لیکن اس تاریکی نے یک دم جیسے اس کی ہمت
پسپا کر دی تھی۔ اپنی سائیکل روک کر اس نے اپنا دل مضبوط کرنے کی کوشش کی، جو تیز ہوا سے ہلتے درختوں کے
پتوں اور ٹوٹنے والی شاخوں کی آوازوں سے دہل رہا تھا۔

اس نے سائیکل سے اتر کر اسے زمین پر لٹا دیا اور جنگل میں چلنے لگا۔ ہوا چند لمحوں کے لیے تھمی، یوں جیسے
جنگل اس کے اندر کا خوف بھانپ کر اسے دلاسا دینے کے لیے سانس روک کے بیٹھا تھا۔ وہ اب ایک عجیب
سناٹے کے عالم میں کھڑا تھا۔ پتوں کی سرسراہٹیں اور پرندوں کا ہلکا شور...... وہاں اس وقت کوئی تیسری آواز نہیں
تھی۔ وہ چند قدم اور آگے بڑھا اور اس نے اپنے جوتوں کے نیچے سوکھے پتوں کے چرمرانے کی آوازیں
سنیں...... وہ رکا، جیسے وہ آواز بھی اسے خوف زدہ کر رہی تھی۔ اس نے پلٹ کر اس جگہ کو دیکھا جہاں اس نے
سائیکل زمین پر لٹائی تھی اور پھر درختوں سے پار نظر آنے والے کھلے کھیتوں کو...... یوں جیسے وہ اپنے آپ کو یہ
حوصلہ دینا چاہتا تھا کہ وہ جب چاہتا وہاں سے بڑی آسانی سے بھاگ سکتا تھا۔

وہ دوبارہ پلٹ کر وہ چند قدم اور آگے چلا پھر اسے یک دم ایک سوکھے ہوئے درخت کا گرا ہوا تنا نظر آیا۔ وہ
بے اختیار خوش ہوا تھا، اپنی پشت پر لٹکا ہوا بیگ کچھ دقت سے اتار کر وہ اب بڑی تیزی سے اس تنے تک گیا جو اتنا
بڑا اور موٹا تھا کہ وہ اس کے قد کے برابر آ رہا تھا۔ اپنے بیگ کو اس نے اس سوکھے ہوئے تنے کی ایک زمین بوس
شاخ پر رکھ کر اس کی زپ کھولی اور اس کے اندر سے کچھ جدوجہد کے بعد اس نے لکڑی کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا لیٹر
باکس نکالا جو لکڑی کے غیر ہموار ٹکڑوں سے بنایا گیا تھا۔ اس نے اس لیٹر باکس کو اس تنے کے ساتھ زمین پر رکھ کر
ٹکایا۔ اس کے پاس کوئی کیل اور ہتھوڑی ہوتی تو شاید وہ اس لیٹر باکس کو اس تنے پر ٹھوک دیتا لیکن ان دو

چیزوں کی عدم موجودگی میں اس نے اسے تنے کے ساتھ ٹکانا ہی کافی سمجھا۔

ہوا ایک بار پھر چلنے لگی تھی، اس نے تیزی سے اپنا بیگ کھول کر اب اس میں سے ایک لفافہ نکالا تھا اور اس لفافے کو اس نے لیٹر باکس کے بنائے ہوئے چھوٹے سے لیکن لمبے سوراخ سے اندر ڈال دیا۔ اس لفافے کو اندر ڈالتے ہی اس کے چہرے پر عجیب اطمینان ابھرا تھا۔ ہوا اب زمین پر گرے خشک پتوں کو اڑانے لگی تھی اور وہ بچہ اب برق رفتاری سے اپنے بیگ کی زپ بند کرنے کے بعد اسے اپنی پشت پر چڑھائے ہوئے اس طرف جا رہا تھا جہاں اس کی سائیکل زمین پر پڑی تھی اور تب ہی اس نے اپنے سر پر بارش کی تیسری بوند گرتی محسوس کی۔

ایک، دو، تین...... بوندوں کا وہ نہ رکنے والا سلسلہ اب اس جنگل کے درختوں کے پتوں کو شکست دیتے ہوئے راستہ بناتے جیسے ایک بار پھر اس کے تعاقب میں آ رہا تھا وہ بیگ پشت پر چڑھا کر زمین پر گری چھوٹی موٹی شاخوں کو پھلانگتا اور اوپر سے گرنے والے لکڑی کے ٹکڑوں سے بچتا اپنی سائیکل کی طرف بھاگ رہا تھا مگر اس بار بارش اور بادل اس کو شکست دینے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

وہ سائیکل پر سوار ہونے تک بارش میں بھیگ چکا تھا اور سائیکل کو دوڑاتے وہ جب تک اس جنگل سے باہر نکلا وہ تیز طوفانی بارش کی لپیٹ میں تھا...... اور کھیتوں کے درمیان اس پگڈنڈی پر اب اس گاؤں کے بہت سے بچے سائیکلوں اور پیدل بارش میں بھیگتے اٹھکیلیاں کرتے بھاگ رہے تھے۔ وہ آٹھ سالہ بچہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا تھا...... اور وہ بے پناہ خوش تھا۔ بری طرح دھڑکتے ہوئے دل اور بے ترتیب سانسوں کے ساتھ......

اس نے اس دن اپنی ماں کے لیے بہت بڑا کام کیا تھا اور اپنی اس خوشی سے بے قابو ہو رہا تھا۔ بہت تیزی سے سائیکل چلاتا بارش میں بھیگتا، شور مچاتا اور سر پر اڑتے سیاہ بادلوں کے ساتھ ریس لگاتا' ہر کولیس ساری رکاوٹیں عبور کر کے سونے کا وہ سکہ جیت گیا تھا جو سب سے زیادہ بہادر کے لیے تھا۔

☆☆☆

اس کینوس پر وہ آیت ایک عجیب روشنی میں گھری ہوئی تھی۔ لفظ جیسے نور تھے' حروف جیسے موتی اور اطراف ان پر بادلوں کی طرح سایہ فگن......

اللہ نور السموات والارض

وہ بوڑھا ہاتھ اس کینوس پر اس آیت کی خطاطی میں مصروف تھا۔ وہ روشنی جو اس آیت کے گرد ہالہ بنائے ہوئے تھی، وہی اس ہاتھ کو بھی گھیرے ہوئے تھی پر ہاتھ رک نہیں رہا تھا۔ جھریوں زدہ جلد پر ابھری ہوئی نیلی رگیں اس روشنی میں ایکسرے کی مانند نظر آ رہی تھیں اور ہاتھ رکے بغیر چلتا ہی جا رہا تھا اس شخص کی طرح جسے اپنے کام میں پوری مہارت ہو۔

فضا میں اب کوئی اپنی بے حد خوب صورت آواز میں اس آیت کی تلاوت کرنے لگا تھا۔ بے حد دل کش 'بھاری' صاف مگر میٹھی مردانہ آواز دل کے تاروں کو بربط کے تاروں کی طرح چھیڑے، وہ آواز صرف وہ آیت نہیں پڑھ رہی تھی جو کینوس پر تھی۔

"اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے کہ گویا ایک طاق ہے۔ جس میں چراغ ہے اور چراغ ایک قندیل میں ہے اور قندیل (ایسی صاف شفاف ہے) کہ گویا موتی کا سا چمکتا ہوا تارا ہے، اس میں ایک مبارک درخت کا تیل جلایا جاتا ہے (یعنی) زیتون کہ نہ مشرق کی طرف ہے نہ مغرب کی طرف (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) اس کا تیل خواہ آگ اسے نہ بھی چھوئے جلنے کو تیار ہے (بڑی) روشنی ہی روشنی (ہو رہی ہے) اللہ

اپنے نور سے جس کو چاہتا ہے، سیدھی راہ دکھاتا ہے اور اللہ جو مثالیں بیان فرماتا ہے تو لوگوں کی (سمجھانے کے لیے) اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔"

(سورۃ النور 35)

تلاوت کرنے والی وہ آواز یک دم خاموش ہو گئی تھی۔ فضا میں اب بھی اس آیت کی گونج تھی۔ وہ ہاتھ اب بھی کینوس پر اسی آیت کو خوش خطی سے سجا رہا تھا۔

اور پھر ایک دم بہت دور سے ہلکی موسیقی کی آواز آنے لگی۔ نور کا وہ ہالہ جو اس ہاتھ اور کینوس کو فوکس کیے ہوئے تھا، دور جانے لگا تھا اور پرے آسمان میں...... اور نیچے اب اس کینوس کے سامنے ایک کھلے میدان میں جو ویسی ہی روشنی سے نہایا ہوا تھا۔ ایک شخص درویش کا لباس پہنے بازو پھیلائے دائرے میں چکر لگا رہا تھا، بے حد آہستہ یوں جیسے اسے کسی نے ہوا کے دوش پر رکھ دیا ہو۔ پھر وہ موسیقی بلند ہونا شروع ہوئی اس شخص کا وجود تیزی سے گھومنا شروع ہوا تھا۔ اس کا سفید لباس اب ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا اور اس کے سر پر موجود اونچی ٹوپی اس کے چہرے کا کچھ حصہ ڈھکے ہوئے تھی اس کی رفتار اب تیز سے تیز ہوتی جا رہی تھی۔

فضا میں گونجنے والی اس بلند اور مسحور کن بانسری کی آواز کے ساتھ جو اب ہر چیز پر حاوی ہوتی جا رہی تھی وہ ہالہ اب اتنا چھوٹا ہو چکا تھا کہ اوپر سے نظر آنا بھی بند ہو چکا تھا اور وہ ہاتھ اب غائب تھا۔ نیچے اس میدان میں روشنی کے اس ہالے میں اب صرف اس درویش کا رقص کرتا ہوا وجود تھا۔ جس کا رقص تیز سے تیز ہوتا جا رہا تھا۔ اتنا تیز کہ اس کا سفید لباس اور اس کے سر پر موجود ٹوپی اب ایک پھول اور اس کے مرکز کی طرح لگنے لگے' پھر اس رقص میں اور تیزی آتی گئی۔ اتنی تیزی کہ انسانی آنکھ کا اس پر نظر جمانا اور اسے شناخت کرنا مشکل ہونے لگا' پھر یک دم اس وجود میں آگ لگی اور وہ شعلے کی طرح بھڑکا' پھر پلک جھپکتے میں جل کر بجھا' اس کے ساتھ ہی جیسے وہ اس ساری روشنی کو لے کر اندھیرے میں تبدیل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

نو سال کا وہ بچہ ہڑبڑا کر اٹھ کر اپنے بستر میں بیٹھا۔ اس کا سانس تیز چل رہا تھا اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا، یوں جیسے وہ کسی خوف ناک خواب میں سے نکلا ہو۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی اور اس کے بستر میں اس کی ماں اس کی طرف پشت کیے ہوئے سو رہی تھی۔ اپنے جسم سے چادر ہٹا کر اس نے بلی کی طرح بڑی احتیاط سے پاؤں زمین پر اتارے اور بے قدموں چلتا ہوا وہ سیدھا کمرے کے اس کونے میں گیا جہاں اسٹڈی ٹیبل تھی۔ اسٹڈی ٹیبل پر ایک لیمپ تھا جسے اگر وہ روشن کرتا تو اس کی ماں کی آنکھ کھل جاتی۔ اس نے پلٹ کر بستر پر لیٹی ماں کو دیکھا، اس کی پشت ٹیبل کی طرف تھی۔ وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ روشنی اس تک جائے گی یا نہیں۔ اور اس نے اندازہ لگا لیا تھا، گردن واپس موڑ کر اس نے ٹیبل لیمپ پر وہ اسکارف چڑھایا' جو اس کی ماں کا تھا اسٹڈی ٹیبل کی کرسی کی پشت پر لٹک رہا تھا۔ بے حد ہلکے ہاتھ کے ساتھ اس نے لیمپ کا بٹن دبایا کہ بٹن دبنے کی آواز بھی اس کی ماں کے کانوں تک نہ پہنچے۔ لیمپ روشن ہوا اور اس نے برق رفتاری سے پلٹ کر ماں کو دیکھا، روشنی اس تک نہیں گئی تھی، اس کا "ٹوٹکا" کام کر گیا تھا۔ اس کی ماں کے وجود میں حرکت نہیں ہوئی۔ وہ فاتحانہ اور مطمئن انداز میں مسکرایا پھر اس کرسی پر بیٹھ گیا جس پر اب اسکارف سے چھنتی روشنی میز کی سطح پر پڑ رہی تھی۔ اسٹڈی ٹیبل کے ایک کونے میں سجی اپنی کتابوں اور نوٹ بکس میں سے ایک نوٹ بک اس نے اٹھا کر کھولی، میز پر رکھتے ہوئے اس نے پین ہولڈر میں رکھے۔ رنگین مارکرز میں سے ایک گہرے نیلے رنگ کا مارکر اٹھا لیا تھا۔

"کیا کر رہے ہو تم؟" اندھیرے کمرے میں اس کی ماں کی آواز گونجتے ہی اس نے برق رفتاری سے لیمپ کا بٹن آف کیا۔ اور جیسے اپنا سانس بھی روک لیا۔

"مجھے پتا ہے تم اسٹڈی ٹیبل کے سامنے بیٹھے ہو۔ کیا کر رہے ہو؟" اس کی ماں نے دوبارہ غنودگی بھری آواز میں کہا۔

"ہوم ورک...... تھوڑا سا رہ گیا تھا، بس دو صفحے۔" اس نے بے اختیار کہا اور لیمپ دوبارہ آن کر دیا۔ چھپنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، پتا نہیں اس کی ماں اندھیرے میں بھی کیسے دیکھ لیتی تھی۔

"ٹھیک ہے، جلدی سے کرو اور آ کر سو جاؤ۔"

"او کے۔" وہ بے اختیار خوش ہوا اس نے ایک نظر پلٹ کر ماں کو دیکھنے کے بعد جیسے سکون کا سانس لیتے ہوئے دوبارہ اس کاغذ پر تیزی سے ہاتھ چلانا شروع کیا تھا۔

اس نے خط کے نیچے اپنا نام لکھا، جلدی سے خط والے کاغذ کو احتیاط سے پھاڑا، تہہ کیا اور دراز میں سے ایک لفافہ نکال کر اس میں ڈال دیا۔ لفافے کے باہر اس نے ایک بار پھر ایڈریس والی لائنز پر ایڈریس لکھا اور پھر لفافے کے اس فلیپ کو زبان پر پھیرتے ہوئے گیلا کیا جو چپک کر بند ہوتا تھا۔

لفافے کو چپکا کر بند کرتے ہی اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ ابھری تھی۔ اس کا کام مکمل ہو گیا تھا، اس نے پلٹ کر اپنی ماں کو دیکھا جو اب بھی کروٹ کے بل اس کی طرف پشت کیے ــــــ لیٹی ہوئی تھی۔

☆☆☆

اپنے کاٹیج کے برآمدے میں کھڑے اس نے ڈاکیے کو بہت دور سے اس کی سائیکل پر سوار گھروں کی اس لین میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا جس کے تقریباً آخر میں اس کا گھر بھی تھا۔ اس کا دل بے اختیار کسی تتلی کی طرح پھڑ پھڑایا تھا۔

ڈاکیہ مختلف گھروں کے باہر لگے لیٹر باکسز میں ان گھروں کی ڈاک رک رک کر ڈالتا اس کے گھر کی طرف آ رہا تھا۔

یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ اسے ڈاکیے کے آنے کے اوقات کا پتا تھا اور وہ اسکول سے آنے کے بعد اپنے کاٹیج کے برآمدے میں کھڑا ہو جاتا تھا۔ روز ڈاکیہ آتا۔ روز ڈاکیہ اس کے گھر کے سامنے سے گزر جاتا۔ روز اس کا دل تتلی کی طرح پھڑ پھڑانا شروع کرتا پھر ڈوب جاتا مگر جس عمر میں وہ تھا اس عمر میں خواب اور انتظار دونوں آسانی سے ختم نہیں ہوتے۔

اور آج بالآخر اس کا تتلی کی طرح پھڑ پھڑاتا دل ڈوبا نہیں تھا۔ ڈاکیہ اس کے گھر کے باہر لگے ہوئے میل باکس کی طرف آنے لگا تو اس نے برآمدے سے نیچے دوڑ لگائی تھی۔

"کیا ہمارا خط آیا ہے؟" اس نے ڈاکیے کے پاس پہنچتے ہوئے کہا۔

ڈاکیہ مسکرایا۔ ہاتھ میں پکڑے ہوئے لفافوں میں سے ایک لفافہ نکالتے ہوئے اس نے سر ہلایا اور اس بچے کے ہاتھ میں تھما دیا اور آگے بڑھ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس لفافے پر نظر ڈالتا، پیچھے سے اس کی ماں نے آ کر اس سے وہ خط لے لیا، وہ کہہ رہی تھی۔

"میں کب سے تمہیں کھانے کے لیے آوازیں دے رہی ہوں اور تم یہاں کھڑے ہو۔"

"ممی! یہ میرا خط ہے۔" اس نے احتجاج کرتے ہوئے ماں سے لفافہ دوبارہ لینا چاہا۔ ماں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"تمہارا کہاں سے آئے گا، یہ تو میرا ہے۔ دیکھو، پاکستان سے آیا ہے۔" اس نے لفافہ پر لگے ہوئے ٹکٹ اسے دکھائے۔ اس کا دل ڈوبا، سانس رکا پھر اس نے سر جھکا لیا۔

"تم کو ٹکٹ چاہیے نا اس کا؟" وہ اندر جا رہا تھا جب اس نے اپنے عقب میں اپنی ماں کی آواز سنی۔ وہ ٹکٹ جمع کیا کرتا تھا اور گھر میں آنے والے ہر خط پر لگی ہوئی ڈاک کی ٹکٹ پر اس کا استحقاق ہوتا تھا مگر اس وقت اسے اس لفافے اور اس ٹکٹ میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

آج تیسویں خط کا بھی جواب نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

وہ سائیکل پر اسکول سے گھر آتے ہوئے اسی پگڈنڈی میں اسی جنگل نما جگہ کے سامنے سے گزر رہا تھا اور اس نے ایک بار بھی گردن موڑ کر اس طرف نہیں دیکھا تھا۔ ایک عجیب سی خفگی تھی جو وہ دل میں پالے ہوئے تھا۔

"ایسا بھی کیا کہ اتنے خط لکھوا اور کوئی جواب نہیں۔"

اس نے تیزی سے سائیکل چلا کر اس جنگل کے سامنے سے گزرتے ہوئے سوچا۔

"سب کے خطوں کے جواب ملتے ہیں اور میرا...... جب کہ میرا خط سب سے خوب صورت تھا۔ میں نے اس پر پھول اور ستارے بھی بنائے تھے، وہ بھی رنگین مارکرز سے اور ہر جملے کے بعد فل اسٹاپ بھی لگایا تھا اور کاغذ بھی صاف ستھرا...... مار کر بھی اچھا تھا۔ کہیں سیاہی کے دھبے بھی نہیں لگے تھے۔" وہ دل ہی دل میں اپنے خط کی خوبیاں اور خصوصیات گن رہا تھا جو ہر لحاظ سے اسے ایک جوابی خط کا حق دار کر رہے تھے...... مگر جوابی خط......

وہ اب کئی دنوں سے صبح اسکول جاتے اور واپس آتے اس جنگل کے سامنے سے گزرتے بے حد خفگی سے اس کی طرف دیکھے بغیر گزرتا تھا۔ یہ اس کی ناراضی کا اظہار تھا، وہ اپنے خط کا جواب نہ ملنے پر زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا۔

اس نے اب ڈاکیے کے انتظار میں گھر کے برآمدے میں کھڑا ہونا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ کبھی اس کے گھر نہیں آتا تھا۔ آتا بھی تو صرف اس کی ماں کی ڈاک لاتا۔

سائیکل گھر کے باہر ہی کھڑی کر کے وہ بڑی اداسی کے عالم میں دروازے کو دھکیلتا گھر میں داخل ہوا تھا یقیناً اس کی ماں بیرونی احاطے میں تھی۔ اسی لیے وہ اس کے لیے دروازہ کھول گئی تھی ورنہ وہاں دروازہ بجانے کی آواز آتی نہ گھنٹی کی۔

اپنے کمرے میں آ کر اس نے اسکول بیگ رکھا اور پھر بستر پر رکھے اپنے کپڑے دیکھے۔ وہ بھی اس کی ماں ہی کے رکھے ہوئے تھے، خفا سے انداز میں اس نے اپنا یونیفارم تبدیل کرنا شروع کیا حالانکہ وہ تبدیل کرنے کے موڈ میں نہیں تھا لیکن وہ ماں کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بیرونی دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز پر بھی اس نے اپنی قمیص کو اتارنے کی کوشش میں نوٹس نہیں کیا مگر ابھی وہ یونیفارم کی شرٹ اتار کر سیدھا ہی ہوا تھا جب اس نے باہر سے اپنی ماں کی آواز سنی۔

"تمہارا خط آیا ہے۔" یونیفارم کی شرٹ ہاتھ میں پکڑے اس کا دل ایک بار پھر تتلی کی طرح پھڑ پھڑایا۔

"کس کا؟" اس نے وہیں کھڑے بے یقینی سے چلا کر پوچھا۔

"تمہارا۔" اس کی ماں نے جیسے اس کی بے یقینی ختم کی۔

"کس نے بھیجا ہے؟" اس نے اپنے بے قابو ہوتے ہوئے دل کے ساتھ ایک بار پھر پوچھا۔

"اللہ تعالیٰ نے۔" وہ سانس لینا بھول گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بے یقینی سے گول ہوئی تھیں۔

☆☆☆

اس گلاس پینٹ ہاؤس کی سب سے خاص چیز سٹنگ ایریا میں لگی ہوئی بہت بڑے سائز کی وہ خطاطی تھی جس پر اھدنا الصراط المستقیم لکھا ہوا تھا۔ آسمانی رنگ کے شیڈز میں اور خطاطی کے محقق اسٹائل میں، اس خطاطی کے علاوہ سٹنگ ایریا میں اگر کوئی اور پینٹنگز تھیں تو وہ تجریدی نیوڈ تھیں۔ سٹنگ ایریا میں جگہ جگہ چھوٹے بڑے سنگی مجسمے بھی تھے اور وہ بھی تقریباً تمام یونانی دیومالا کی دیویاں تھیں جو بے لباس تھیں یا پھر نامکمل لباس میں

وہ گلاس پینٹ ہاؤس جیسے قبل اسلام کے کعبہ جیسا منظر پیش کر رہا تھا جہاں اھدنا الصراط المستقیم کی اس خطاطی کے نیچے اور ارد گرد ہر طرف بُت ہی بُت تھے۔ پہلی نظر میں کوئی بھی اس پینٹ ہاؤس کو سراہے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ ڈیزائن کرنے والے کے بہترین ہنر اور عمدہ ذوق کا عکاس تھا اور پہلی بار وہاں آنے والے کو کچھ دیر کے لیے مسحور کر دینے کی خصوصیت رکھتا تھا۔

سٹنگ ایریا کے باہر اوپن ٹیرس اور روف گارڈن تھا اور اس سے پرے بہت پرے پس منظر میں سمندر کا ٹھاٹھیں مارتا پانی اور اس میں چلتی پھرتی کشتیاں۔ سٹنگ ایریا کو ٹیرس سے الگ کرنے والی دیوار شیشے کی تھی جس میں چند ایک لکڑی کے پینل تھے اور جو بھی سٹنگ ایریا میں کھڑا ہوتا۔ وہ ٹیرس اور وہاں سے دور سمندر کی لکیر بنا کسی دقت کے دیکھ سکتا۔

اس پینٹ ہاؤس کے سٹنگ ایریا میں اس کیلی گرافی، مجسموں اور پینٹنگز کے علاوہ دوسری نمایاں چیز اس کی ایک دیوار کے ساتھ رکھے ایک شیلف میں ایوارڈ، ٹرافیز اور شیلڈز کا ایک انبار تھا اور اسی شیلف کے اوپر دیوار پر لگے ہوئے بہت سے فوٹو فریمز جن میں ایک مرد بہت سے فنکشنز اور ایونٹس میں بہت سے نامور اداکاروں اور اداکاراؤں کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ کچھ فریمز میں وہ مختلف میگزینز کے سرورق پر مختلف ہیڈنگز کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ ایوارڈز اور ان فوٹو فریمز کی وہ دیوار اس کیلی گرافی کی دیوار کے بالکل سامنے تھی اور دونوں دیواروں کے درمیان موجود سٹنگ ایریا میں بیٹھنے کے لیے مختلف شکلوں اور قسموں کا فرنیچر پڑا ہوا تھا۔

وہ گلاس پینٹ ہاؤس قلب مومن کی وہ جنت تھی، جس کے عشق میں وہ مبتلا رہتا تھا اور وہاں ہونے والی پارٹیز میں شریک ہونے والے اس کے دوست بھی۔ وہ انڈسٹری کا نامور فلم ڈائریکٹر تھا جو ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی بھی چلاتا تھا اور کمرشل فلمز کرنے سے پہلے وہ پاکستان کی چند بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کے ساتھ آرٹ ڈائریکٹر کے طور پر کام کر چکا تھا، اس وقت وہ پاکستان کے چند بہترین نوجوان آرٹ اور کمرشل فلم ڈائریکٹرز میں سے ایک مانا جاتا تھا اور اس شیلف پر موجود شیلڈز، ایوارڈز اور ٹرافیز کی تعداد جیسے اس کے اس اسٹیٹس میں اضافہ کرنے کے لیے کافی تھیں۔

رشنا قدوائی اس وقت اپنے ٹی وی شو کے لیے قلب مومن کا ایک انٹرویو کے لیے اس کے اس پینٹ ہاؤس پر اپنے عملے کے ساتھ موجود تھی اور اس جگہ کو دیکھ کر ویسے ہی مرعوب ہوئی تھی جیسے وہاں پہلی بار آنے والا کوئی بھی نووارد ہو جاتا۔ اس نے قلب مومن کے بارے میں جتنا سن رکھا تھا اتنی ہی شہرت اس نے اس پینٹ ہاؤس کی نائٹ پارٹیز کی بھی سن رکھی تھی اور آج وہ بالآخر مہینوں بعد قلب مومن سے انٹرویو کے لیے وقت لینے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

اس کا عملہ اس وقت سٹنگ ایریا کے ایک حصے کو اس انٹرویو کے لیے منتخب کر کے وہاں لائٹنگ وغیرہ کرنے اور کیمرہ ایڈجسٹ کرنے میں مصروف تھا اور رشنا قدوائی قلب مومن کے اسسٹنٹ کے ساتھ گپ شپ کرنے میں، جس نے یہاں ان کا استقبال کیا تھا۔ اسی نے انٹرویو کے لیے قلب مومن سے معاملات طے کیے تھے۔

''اگلی فلم کے لیے آڈیشن کب سے اسٹارٹ کر رہے ہو تم لوگ؟'' رشنا قدوائی نے مومن کے اسسٹنٹ داؤد سے پوچھا۔ وہ عمومی سی بات چیت تھی۔

''اگلے ہفتے سے شروع کر رہے ہیں۔'' داؤد نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مومن عام طور پر ہمیشہ وقت پر آتا تھا۔ آج وہ دس منٹ لیٹ تھا، غیر معمولی بات تھی۔

''اچھا تو ساری ہی کاسٹ نئی اٹھاؤ گے تم لوگ؟'' رشنا نے مزید کریدا۔

''ہاں وہ تو ظاہر ہے، مومن نے اپنی تینوں فلموں میں ابھی تک مین کاسٹ میں کسی کو ریپیٹ نہیں کیا۔'' داؤد نے اپنے موبائل پر مومن کو ٹیکسٹ کرتے ہوئے کہا اور پھر یک دم پرجوش انداز میں رشنا سے کہا۔

''He Is Here (وہ یہیں ہیں)۔'' داؤد نے پلٹ کر کسی کو سلام کیا تھا۔ رشنا قدوائی نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا۔ اس پینٹ ہاؤس کا مالک جتنا پرفیکٹ ہونا چاہیے تھا، قلب مومن ویسا ہی نظر آ رہا تھا۔ وہ دھاری دار سلیو اور بلو سلم فٹ کاٹن شرٹ اور ڈوکرز کی کھدی جینز میں اسٹائلش ٹام فورڈ کے جوتے پہنے ہوئے تھا، وہ بہت خاص لگ رہا تھا۔ رشنا قدوائی قلب مومن سے پہلے کبھی نہیں ملی تھی لیکن اس کے باوجود اس کا چہرہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ درجنوں پارٹیز اور ایوارڈ شوز میں اسے دیکھ چکی تھی مگر اس کے گھر پر اس طرح روبرو وہ پہلی بار اسے دیکھ رہی تھی۔ پہلی بار دونوں کا آمنا سامنا ہو رہا تھا۔ قلب مومن مقناطیسی شخصیت کا مالک تھا۔ یہ اس نے کئی لوگوں سے سنا تھا مگر وہاں اس کے روبرو اس سے ملتے ہوئے پہلی بار اس کی ''مقناطیسیت'' محسوس بھی کی تھی۔

''میں لیٹ تو نہیں ہوا۔'' رشنا کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے خوش گوار لہجے میں پوچھا تھا۔

''بہت زیادہ نہیں۔'' وہ جواباً ہنسی۔ وہ اسے نروس کر رہا تھا اور اپنے صحافتی کیریئر میں یہ رشنا کے ساتھ کم کم ہی ہوا تھا۔

''لائٹنگ ٹھیک نہیں۔'' وہ رشنا کو وہیں کھڑا چھوڑ کر آگے بڑھا۔ اب وہ اس جگہ کو دیکھ رہا تھا جہاں انٹرویو کے لیے لائٹس اور کیمرہ لگایا گیا تھا۔

وہ رشنا کے جوابی ردعمل کا انتظار کیے بغیر ڈی او پی کے مانیٹر پر فریم دیکھنے لگا تھا اور اس سے پہلے کہ رشنا یا اس کی ٹیم میں سے کوئی بھی کچھ اور کہتا۔ وہ لائٹ مین کو ہدایات دینے لگا۔ پانچ، سات منٹ کے بعد اس نے مومن کو دوبارہ مانیٹر پر جھکتے دیکھا اور پھر ایک لمحہ بعد ہی وہ سیدھا ہو گیا اور اس نے رشنا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اب یہ بالکل ٹھیک ہے۔''

وہ مسٹر پرفیکٹ تھا، وہ لوگ جو اس کے ساتھ اس کے اشتہارات اور فلموں میں کام کر چکے تھے۔ اس کے بارے میں کہتے تھے۔ اس کا عملی مظاہرہ اس نے قلب مومن سے اپنی پہلی ملاقات میں ہی دیکھ لیا تھا۔ رشنا کچھ ندامت سے مانیٹر کی طرف جھکی تھی۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو اسی کیفیت کا شکار ہوتا کیونکہ وہ یہ توقع نہیں کر رہی تھی کہ جس سے وہ انٹرویو لینے جائے گی۔ وہ اس کے عملہ کا کوئی نقص پکڑ کر اس کے سامنے رکھ دے گا۔ مانیٹر کے فریم پر پہلی نظر ڈالتے ہی رشنا مومن کو داد دیے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ یہ وہ فریم ہی نہیں لگ رہا تھا جو وہ چند لمحے پہلے اس مانیٹر پر دیکھ رہی تھی۔ کیمرہ کے اینگل اور لینز کی معمولی ایڈجسٹمنٹ اور ایک دو جگہ لائٹس کی تبدیلی نے اس فریم کو بالکل بدل دیا تھا۔

مومن اپنے کام کا ماہر تھا۔ اسے یہ بات تسلیم کرنے میں اس لمحہ کوئی عار محسوس نہیں ہوا — وہ فریم دیکھ کر اس سے بات کرنا چاہتی تھی۔ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی مگر پلٹنے پر اس نے اسے قدرے فاصلے پر کھڑے داؤد

کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے پایا' یوں جیسے وہ جانتا تھا کہ اس کے فریم میں کوئی بھی خامی ہوگی ہی نہیں اور وہ اس کے تعریفی ریمارکس سے بھی بے نیاز تھا۔ وہ قابل رشک حد تک پُر اعتماد تھا۔

رشنا کو ہاتھ میں پکڑے انٹرویو کے لیے تیار کیے گئے سوال نامہ کو دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی، وہ اس میں سے بھی کسی سوال پر کوئی اعتراض کرتا۔

''قلب مومن فلم انڈسٹری میں آپ کا کیریئر ...... He Came ,he saw, he conjured (وہ آیا، اس نے دیکھا، اس نے فتح کرلیا) کی بہترین مثال قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیا آپ کے لیے سب کچھ اتنا ہی آسان رہا ہے؟''

وہ بالآخر انٹرویو کے لیے بیٹھ گئے تھے اور ابتدائی رسمی بات چیت کے بعد رشنا قدوائی نے اس سے پہلا اہم سوال کیا' سوال کرتے ہوئے اس سے نظر ملنے پر رشنا قدوائی کو احساس ہوا کہ قلب مومن کی آنکھیں بے حد تیز اور چمک دار ہیں' اس سے نظر ملا کر بات کرنا کسی کے لیے بھی مشکل ہوسکتا ہے۔

قلب مومن کو وہ اگر ایک لفظ میں کہیں بیٹھ کر بیان کرتی تو وہ لفظ ''اعتماد'' ہوتا۔ اس نے انڈسٹری کے بہت کم لوگوں میں اتنا اعتماد دیکھا تھا' اس کے سامنے بیٹھا بندہ گڑبڑا جاتا تھا۔

ٹانگ پر ٹانگ رکھے کرسی کے دونوں بازوؤں پر ہاتھ رکھے اس نے رشنا کا سوال سنا، مسکرایا اور پھر بولا۔

''اس سے بھی زیادہ آسان رہا ہے میرا سفر...... میں مانتا ہوں۔ میں خوش قسمت رہا ہوں اس فیلڈ میں آنے کے لیے مجھے کسی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔''

اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ رشنا نے اس کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا اس میں ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ فلرٹ ہے مگر اب تک مومن کے ساتھ بات چیت میں اس کے فلرٹ ہونے کا اشارہ نہیں ملا تھا۔ وہ اس سے بے حد مہذب طریقے سے مخاطب ہو رہا تھا۔ اس کے جواب کے دوران رشنا قدوائی کا ذہن کہیں اور مصروف تھا۔ اس کے خاموش ہونے پر بھی وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی تھی یوں جیسے اس کی جانب سے مزید کچھ کہنے کی منتظر ہو لیکن اس کی خاموشی پر اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ جواب دے چکا تھا اور اس کے اگلے سوال کا منتظر تھا۔

''آپ کی فیملی میں سے کوئی اور بھی اس فیلڈ میں ہے؟'' رشنا کو اگلا سوال ویسے ہی یاد تھا۔

''کوئی نہیں۔'' کھٹاک سے جواب آیا' اس سوال کے ساتھ ہی رشنا قدوائی کے لیے انٹرویو کے سب سے دلچسپ حصے کا آغاز ہوگیا تھا۔

''اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں بتائیں، کہاں پیدائش ہوئی؟ کون کون ہے آپ کی فیملی میں؟''

رشنا نے جتنی دلچسپی سے یہ سوال پوچھا تھا۔ جواب کا آغاز اتنی ہی غیر دلچسپی سے ہوا تھا۔

''میری پیدائش ترکی میں ہوئی، فادر کا تعلق ترکی سے تھا اور مدر کا پاکستان سے۔ دونوں کی ڈیتھ ہوچکی ہے۔ بہن بھائی کوئی نہیں ہے۔'' رشنا اس کے جواب پر بے اختیار چونکی۔

''اوہ، اسی لیے آپ کے فیچرز (نقوش) اتنے دیسی نہیں ہیں۔ غالباً میڈیا میں بھی زیادہ لوگوں کو یہ علم نہیں ہوگا کہ آپ کے پیرنٹس کا تعلق ترکی سے ہے۔ کتنا عرصہ ہے آپ ترکی میں؟''

''بچپن تقریباً سارا ہی وہاں گزرا۔ نوجوانی کا کچھ حصہ' اس کے بعد میں امریکہ چلا گیا تھا۔ ہائی اسکول کے بعد...... تقریباً چھ سات سال وہاں رہا اور سات آٹھ سال سے اب پاکستان میں ہوں۔'' وہ بے حد سنجیدگی سے بتا رہا تھا۔

رشنا کو اس کی سنجیدگی کی وجہ — سمجھ میں نہیں آئی تھی' اس نے اگلا سوال کیا۔

''پیرنٹس میں سے کوئی اور میڈیا یا فائن آرٹس سے منسلک رہا؟''

وہ اس بار چند لمحوں کے لیے اس کے سوال پر خاموش رہا اور پھر اس نے کہا۔

''میرے فادر ایک Caligrapher (خطاط) تھے۔''

''ویری انٹرسٹنگ۔'' رشنا کہے بغیر نہیں رہ سکی۔

''مگر میں بہت چھوٹا تھا جب ان کی ڈیتھ ہوگئی۔''

''اور آپ کی مدر؟'' رشنا نے بے ساختہ پوچھا۔

مومن بے ساختہ چونکا پھر اس نے اسی روانی سے کہا۔

''وہ ہاؤس وائف تھیں۔''

''مجھے بڑا انٹرسٹنگ لگ رہا ہے کہ آپ کے فادر ٹرکش تھے اور مدر پاکستانی اور ان کی شادی ہوئی۔ کیا یہ لو میرج تھی؟'' رشنا پوچھے بغیر نہیں رہ سکی اور اس نے پہلی بار مومن کے ماتھے پر بل دیکھے پھر اسے کہتے سنا۔

''انٹرویو میرا ہے نا؟''

''جی' جی آپ ہی کا ہے۔'' رشنا گڑبڑائی۔

''تو میرے بارے میں ہی بات کرتے ہیں۔'' مومن نے اگلا جملہ کہا۔ رشنا نے اس کی صاف گوئی کے بارے میں بھی سنا تھا مگر اتنے برملا اظہار کی توقع نہیں کررہی تھی۔

''کیلی گرافی سے کمرشل فلم میکنگ تک منتقلی یا سفر آپ اسے جو بھی کہیں۔ یہ کچھ عجیب نہیں ہے؟''

وہ مومن سے پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔ مومن کے ماتھے پر وہ بل دوبارہ نمودار ہوئے تھے۔

''کیلی گرافی سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ وہ میرے فادر کرتے تھے۔ میں امریکہ سے فلم میکنگ ہی پڑھ کر آیا ہوں اور شروع سے فلم میکنگ ہی کررہا ہوں، فرق صرف یہ ہے کہ پہلے وہ ایڈ فلمز تھیں اب کمرشل۔'' اس نے تفصیل سے بتایا۔

''میں نے یہ سوال اس لیے پوچھا کہ اگر آپ کے فادر کیلی گرافی کرتے تھے تو یقیناً مذہبی ماحول ہوگا آپ کی فیملی میں اور......''

اس نے پہلی بار رشنا کو سوال کے دوران ہی ٹوک دیا۔

''میں نے آپ سے پہلے بھی کہا ہے کہ یہ انٹرویو میرے بارے میں ہے تو آپ سوالوں کا فوکس مجھ پر ہی رکھیں۔ میرے پیرنٹس کیا کرتے تھے اور کیا نہیں۔ انٹرویو اس بارے میں نہیں ہے۔''

رشنا کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ کس بات کی وجہ سے جھنجلایا ہوا تھا۔ اس نے اس کے ماں باپ کے حوالے سے کوئی قابل اعتراض سوال نہیں کیا تھا مگر وہ اس وقت قلب مومن سے کوئی بحث نہیں چاہتی تھی۔ اس کے پاس وقت محدود تھا اور سوال لامحدود......

''آپ کی فلمز میں گلیمر کی بھرمار ہوتی ہے...... عورت کو ایک آبجیکٹ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ زیادہ تر کریٹکس (نقاد) کا کہنا ہے کہ اگرچہ آپ کی فلم دیکھنے میں ایک ماسٹر پیس ہوتی ہے اور جتنی خوب صورتی سے آپ اپنی ہیروئن کو فلم اسکرین پر ایک دیوا کے طور پر ایکسپوز کرتے ہیں' انڈسٹری کا کوئی اور ڈائریکٹر نہیں کرسکتا۔ آپ اپنی ہیروئن کو —— تصوراتی شے بنا دیتے ہیں۔'' اس نے رشنا کو دوبارہ ٹوکا اور کہا۔

''آپ کا سوال کیا ہے؟ کریٹکس کیا کہتے ہیں وہ میں جانتا ہوں۔'' رشنا کا چہرہ سرخ ہوا۔ اسے اندازہ

نہیں تھا وہ اسے اس طرح ٹوکے گا۔

''میرا سوال یہ ہے کہ آپ کی فلمز کریٹکس کی نظر میں چیپ انٹرٹینمنٹ کے سوا کچھ نہیں' وہ آپ کی نظر میں کیا ہیں؟'' رشنا نہ چاہتے ہوئے بھی اس بار تلخ ہوئی تھی۔

''اور یہ کریٹکس وہ لوگ ہیں جو دوسروں کی ہٹ فلمز پر اپنے فلاپ ریویوز لکھ لکھ کر پانچ منٹ کے لیے نمایاں ہونا چاہتے ہیں۔'' اس کا دوٹوک جواب آیا تھا۔

''میری نظر میں میری فلمز میرے لیے آبجیکٹ آف فینٹسی (تصورات کی تجسیم) ہیں۔ میں وہ بناتا ہوں جو مجھے انٹرٹین کرتا ہے اور وہ اچھی ہیں یا بری اس کا فیصلہ باکس آفس کرتا ہے۔ کریٹکس کے ٹو اور تھری اسٹار ریویوز نہیں۔'' اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ جو بھی کہیں، یہ بات تو ایک فیکٹ ہے۔ آپ اپنی فلمز میں عورت کو ایک آبجیکٹ (شے) کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ وہ ایک باربی ڈول سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی، گلیمر...... گلیمر...... گلیمر......'' رشنا نے اپنی بات پر اصرار کرتے ہوئے کہا۔ قلب مومن کی صاف گوئی نے یک دم جیسے اسے بھی بے حد منہ پھٹ بنا دیا تھا۔

''یہ قلب مومن نہیں کرتا، یہ پوری دنیا کی فلم انڈسٹری کرتی ہے۔ اسی فی صد فلمز عورت ہی کے گرد گھومتی ہیں۔ اس کے جسم، اس کی خوب صورتی، اس کے گلیمر کے گرد...... میں آرٹ فلمز بنانا نہیں چاہتا جن کو دیکھنے کے لیے وہ کریٹکس بھی سینما نہیں جاتے اور صرف ٹریلر دیکھ کر ورلڈ کلاسک قرار دیتے ہیں۔''

''آپ بہت بلنٹ (منہ پھٹ) ہیں۔'' رشنا کہے بغیر نہیں رہ سکی۔

''یہ خامی ہے کیا؟'' اس نے فوراً پوچھا۔

''نہیں...... میں جانتی ہوں، یہ آپ کی کامیابی کی عنایت ہے۔ کامیابی میں ہر شخص بلنٹ ہوتا ہے۔'' رشنا نے کہا۔ وہ اس بار مسکرایا اور اس نے کہا۔

''میں ناکامی میں اس سے زیادہ بلنٹ ہوں گا، ڈونٹ وری۔'' رشنا بھی مسکرا دی تھی۔

''اب اگر کامیابی کے بارے میں بات شروع ہو ہی گئی ہے تو آپ بتائیں، آپ کے نزدیک کامیابی کیا ہے؟''

''کامیابی وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے، جس کے بارے میں آپ خود نہیں دنیا بات کرے۔ لوگ آپ جیسا بننے کے لیے آپ سے جیلس ہوں۔ میں اینوی (رشک) کی بات نہیں کر رہا جیلسی (حسد) کی بات کر رہا ہوں۔ اسٹیج پر آپ کھڑے ہوں اور نیچے دنیا کا ہر شخص آپ کا دشمن۔''

رشنا کو لگا وہ مذاق کر رہا تھا مگر اس کے چہرے کا اطمینان رشنا کے اس اندازے کی نفی کر رہا تھا۔

''کامیابی دائمی نہیں ہوتی۔ اس کا ایک وقت ہوتا ہے اور وہ وقت گزر جاتا ہے۔'' رشنا نے جیسے اسے یاد دہانی کرائی۔ ''پھر دشمنوں اور حاسدین کے اس گروہ کا آپ کیا کریں گے۔''

''پھر یہ میرے ساتھ نہیں ہوں گے، اگلے کامیاب آدمی کے پیچھے ہوں گے۔'' وہ اسی طرح اطمینان سے مسکرایا۔ رشنا اس کی حاضر جوابی سے محظوظ ہوئی۔

''آج ایوارڈز ہو رہے ہیں آپ اور آپ کی فلم کو نامزد کیا گیا ہے۔ کیا توقعات ہیں؟'' رشنا نے آخری سوال کیا۔

''آئی ول ون آل۔'' قلب مومن نے اسی پُراعتماد لہجے اور گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا جو رشنا کو اس کا شناختی نشان لگی تھی۔

''اور اگر نہ جیت سکے تو؟'' وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

''تو ایوارڈ کا بائیکاٹ کر دوں گا۔'' اسی روانی اور اطمینان سے جواب آیا۔

''یہ فیئر پلے تو نہیں ہے۔'' رشنا کہے بغیر نہیں رہ سکی۔

''میں فیئر پلے پر یقین کبھی نہیں رکھتا۔''

قلب مومن نے مسکراتے ہوئے اپنے کالر سے مائیک اتارتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

''بیسٹ ڈائریکٹر کا ایوارڈ دیا جاتا ہے قلب مومن کو ''میری جان کے لیے۔''

ہال تالیوں سے گونج اٹھا تھا۔

چھت میں لگی اسپاٹ لائٹس نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھے بے حد تیکھے نین نقش اور سفید رنگ والے چھ فٹ سے نکلتے قد کے مالک قلب مومن کو فوکس کیا۔ جواب نشست سے کھڑا ہوتے ہوئے اپنی بلیک ڈنر جیکٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے اپنی دائیں بائیں بیٹھی اپنی فلم کی کاسٹ سے ہاتھ ملاتے' گلے لگاتے۔ اسٹیج کی سیڑھیوں کی طرف جا رہا تھا اور اس کے عقب میں اس ہال میں بیٹھی ہر عمر کی اداکارہ کی نظریں مقناطیس کی طرح اس کے وجود کے ساتھ کھنچتی جا رہی تھیں۔

یہ ناممکن تھا کہ قلب مومن ان سب کی توجہ کا مرکز نہ بنتا۔ وہاں اس ہال میں بیٹھی ہر وہ ایکٹرس جو اس کے ساتھ کام کر چکی تھی، وہ اس کے لیے تالیاں بجاتی اسے داد دیتی انڈسٹری کے سب سے کامیاب نوجوان فلم ڈائریکٹر کو اپنی سپورٹ کا یقین دلا رہی تھی اور اس کے ساتھ کام کرنے کی خواہش مند ہر نوجوان اداکارہ اس کے لیے تالیاں پیٹتے جیسے اس کی مرکز نگاہ بننا چاہتی تھی۔

وہ اب اسٹیج پر پہنچ کر ایوارڈ وصول کرنے کے بعد روسٹرم کے پیچھے کھڑا تالیوں کے رکنے کے انتظار میں تھا۔ جو بجتی ہی جا رہی تھیں اور وہ کچھ محظوظ مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ میں پکڑا ایوارڈ روسٹرم پر دھرے اپنے منہ کے سامنے مائیک درست کرنے میں مصروف تھا۔

وہ رات قلب مومن کی رات تھی اور پچھلے تین سال سے پاکستان کے اس سب سے بڑے فلم ایوارڈ شو کی ہر رات قلب مومن ہی کے نام ٹھہر رہی تھی' وہاں بیٹھے کسی فرد کے لیے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

تالیوں کی گونج بالآخر تھمی تو قلب مومن نے بات شروع کی۔ امریکن لب و لہجے میں بولی جانے والی انگلش میں اس نے وہاں بیٹھے لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔ اپنے لیے اور اپنی فلم کے لیے پاپولر ووٹ دینے والے لوگوں اور اپنی کاسٹ کا شکریہ ادا کیا اور اس کے بعد اس نے اس ایوارڈ شو کی انتظامیہ پر بجلی گراتے ہوئے ایوارڈز کی جیوری کو بری طرح رگیدا تھا کیونکہ اس سال پہلی بار اس کی فلم تمام نامزدگیاں نہیں جیت سکی تھی۔

بیسٹ ٹائٹل ٹریک قلب مومن کے دیرینہ حریف احسن ملک کی فلم کو دے دیا گیا تھا، نہ صرف یہ بلکہ بیسٹ سینماٹوگرافی کا ایوارڈ بھی اسی کی فلم کو دیا گیا تھا اور قلب مومن یہ ہضم نہیں کر سکا تھا۔ اس کے لیے جیتنے والے چھ ایوارڈ سے زیادہ اہم ہارنے والے دو ایوارڈز تھے۔

اسٹیج پر کھڑا وہ ایوارڈ شو کی انتظامیہ اور جیوری دونوں کی بری ججمنٹ پر اعتراض بھی کر رہا تھا اور ہال کو اس وقت سانپ سونگھا ہوا تھا۔ وہ ایوارڈ شو لائیو نہیں جا رہا تھا ورنہ اس شو کی انتظامیہ جو ایک ملٹی نیشنل کمپنی سے منسلک تھی ورنہ اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے، وہ بڑی آسانی سے ایوارڈ شو کو ایڈیٹ کر کے قلب مومن کی تنقید والا حصہ حذف کر سکتے تھے مگر قلب مومن کی اتنی کھلی تنقید اور وہ بھی اس پوری انڈسٹری کے سامنے جس میں سے کوئی بھی

اس ایوارڈ شو کی انتظامیہ کے سامنے منہ تو کیا زبان بھی ہلا نہیں سکتا تھا۔ اس کمپنی کی بیک اسٹیج اور فرنٹ رو میں بیٹھی ہوئی انتظامیہ کو ہضم نہیں ہوئی تھی۔ مگر کوئی مائی کا لعل انڈسٹری کے سب سے تگڑے اور کامیاب ڈائریکٹر کو چپ کروانے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا۔

قلب مومن اپنی تقریر ختم کرنے کے بعد اپنا ایوارڈ اٹھا کر اسٹیج کی سیڑھیوں کی طرف واپس جانے لگا تو نہ صرف ہال میں ایک بار پھر تالیوں کا شور گونجنے لگا بلکہ انتظامیہ کی بھی جان میں جان آئی تھی۔

اسپاٹ لائٹس اسٹیج سے اس کی سیٹ تک کے سفر کو تب تک کور کرتی رہیں جب تک وہ دوبارہ اپنی کرسی پر نہ بیٹھ گیا اور تالیاں تب تک بجتی رہیں جب تک اسٹیج پر اگلی کیٹگری کی اناؤنسمنٹ نہ شروع ہو گئی تھی۔

وہ سب جو قلب مومن اسٹیج پر کہہ کر آیا تھا صرف قلب مومن ہی کہہ سکتا تھا اور وہ انتظامیہ صرف قلب مومن سے ہی سن سکتی تھی۔

قلب مومن اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھا تو ہال میں بیٹھے ہوئے بہت سے اداکار اور اداکارائیں اپنی سیٹوں سے اٹھ اٹھ کر اس کے قریب آ کر اسے مبارک بادیں دینے لگے۔ وہ اس وقت وہاں بادشاہ کی طرح بیٹھا ہوا تھا اور یہ ممکن نہیں تھا کہ بادشاہ کو کورنش نہ بجالائی جائے۔

''مومن...... مومن...... کوئی مسئلہ ہو گیا؟''

اس ملٹی نیشنل کمپنی کی اہم خاتون عہدے دار تقریباً بھاگتی ہوئی پھولے سانس کے ساتھ مومن کی سیٹ پر پہنچی تھی۔ وہ بے حد معذرت خواہانہ اور مدافعانہ انداز اپنائے ہوئے تھی اور ان دو ایوارڈ کو جو قلب مومن کی فلم کے بجائے ایک دوسری فلم کو دے دیے گئے تھے اس کے لیے وضاحتوں پر وضاحتیں دے رہی تھی۔ اسٹیج پر اگلی کیٹگری سے پہلے ایک پرفارمنس کا اعلان ہو رہا تھا اور فرنٹ رو میں قلب مومن کو صفائیاں اور وضاحتیں دیتے ہوئے اس برانڈ سے منسلک لوگوں کا حال برا ہو رہا تھا۔

آخری ایوارڈ بیسٹ فلم کا تھا اور وہ ایوارڈ اگر قلب مومن کے علاوہ کسی دوسرے کی فلم کو ملتا تو قلب مومن وہاں کھڑے کھڑے انتظامیہ کو سولی پر لٹکا دیتا۔

وہ متکبر تھا...... متکبر چھوٹا لفظ تھا...... منتقم مزاج تھا اور اسے جائز سمجھتا تھا۔ زود رنج تھا اور اسے اپنا حق سمجھتا تھا۔ اپنے آرٹ کو سب سے برتر سمجھتا تھا اور اپنے ٹیلنٹ کو لاثانی...... وہ اس انڈسٹری کے لوگوں کے ساتھ وہی کرتا تھا جو اس انڈسٹری کے لوگ کم کامیاب لوگوں کے ساتھ کرتے تھے۔

فلم انڈسٹری نام کی پوجا کرتی ہے اور قلب مومن کا نام ہی کافی تھا۔ فلم انڈسٹری کامیابی کے سکّے کے علاوہ کسی اور سکے کو نہیں مانتی' اس سکے پر آج کل قلب مومن کا نام اور شبیہ کھدی ہوئی تھی فلم انڈسٹری اگر ستارہ پرست تھی تو قلب مومن کے علاوہ پچھلے تین سال میں آسمان فلم پر کسی ڈائریکٹر کا ستارہ نہیں چمکا تھا۔

تو قلب مومن کو اگر گھمنڈ ہوتا تو کیوں نہ ہوتا۔ وہ اگر ہر ایوارڈ کو چھین کر بھی لے جاتا تو کیوں نہ لے جاتا وہ ناز نخرے نہ دکھاتا تو کیوں نہ دکھاتا جب اس کی ہر فلم باکس آفس پر بزنس کے نئے ریکارڈ بنا رہی تھی اور ہر پروڈیوسر اس کے ساتھ فلم فنانس کرنے کے لیے پاگل ہو رہا تھا۔ ہر اداکار اور اداکارہ اس کے ساتھ کام کرنے کے لیے اس کے آفس کے چکر کاٹ رہی تھی۔ اگر عروج ہما تھا تو یہ ہما قلب مومن کے سر پر بیٹھا ہوا تھا۔

☆☆☆

وہ اپنی لائنز کب سے یاد کیے اب سیٹ پر ہیروئن کے انتظار میں ٹیم کے دوسرے لوگوں کی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ اس سیٹ پر تقریباً روز کا معمول تھا۔ ثانوی کرداروں میں کام کرنے والے وقت سے بھی بہت پہلے سیٹ پر موجود ہوتے اور مرکزی کردار کرنے والوں میں سے کوئی نہ کوئی ڈائریکٹر اور پروڈیوسر کو اپنی عدم موجودگی سے

کھا رہا ہوتا۔

سیٹ کے ایک کونے میں وہ ثانوی کردار کرنے والی چند دوسری لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ سیٹ پر چائے دی جا رہی تھی اور وہ سب بھی اپنا اپنا چائے کا کپ پکڑے اس کونے میں گپ شپ میں مصروف تھیں۔ ان کی گپ شپ اپنے کیریئر کے بارے میں' ان کی پلاننگ' ان کے آنے والے پروجیکٹس اور حال میں مختلف سیٹس پر ہونے والے تجربات کے علاوہ بڑے اسٹارز کے بارے میں سنی سنائی افواہوں کو چشم دید رپورٹ میں تبدیل کر کے پیش کرنا ہوتا تھا۔ مسالا دار چٹ پٹی خبریں جنہیں سنا کر انہیں یہ تسلی رہتی تھی کہ سب ''انسان'' ہی ہیں اور سب گڑھے کھودتے اور ان میں گرتے رہتے ہیں۔ اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔

اس وقت ایسا ہی ایک گوسپ سیشن ہو رہا تھا۔ مومنہ چپ چاپ بیٹھی چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ سب خبریں سن رہی تھی جو اس کے کانوں سے کہیں آگے دماغ میں رجسٹر ہی نہیں ہو رہی تھیں۔ دماغ میں اپنے ہی بکھیڑے تھے، اپنے ہی مسئلے۔ وہاں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے اور ان کی باتیں سنتے ہوئے وہ پورے مہینے کے بجٹ کے بارے میں جوڑ توڑ کر رہی تھی اور جہانگیر کے اخراجات......

اس نے کچھ فاصلے پر کھڑے ڈائریکٹر کو فون پر اس سیریل کی ہیروئن سے بات کرتے سنا جو ''عادتاً'' لیٹ تھی اور جس کے ساتھ مومنہ کا اگلا سین تھا اور اس ایک سین کے لیے مومنہ سلطان صبح سے آ کر بیٹھی ہوئی تھی اور ہیروئن ندارد۔

''نشا تم ایک اور گھنٹہ لیٹ ہوئیں نا تو پورا دن ضائع ہو جائے گا ہمارا۔ چار گھنٹے کے لیے آؤ گی تو کتنے سینز نکالیں گے ہم...... پلیز آ جاؤ اب۔ پروڈیوسر نے مجھے پاگل کر رکھا ہے یہاں' پلیز۔''

مومنہ نے ڈائریکٹر کو تقریباً بے چارگی کے عالم میں گڑگڑاتے سنا تھا، وہ اب فون بند کر کے اسسٹنٹ سے کہہ رہا تھا۔

''آ رہی ہے نشا! تم ریہرسلز کرواؤ۔'' اسسٹنٹ نے کچھ جھنجلا کر ڈائریکٹر سے کہا تھا۔

''کتنی ریہرسلز کرواؤں، صبح سے ریہرسلز ہی ہو رہی ہیں۔'' مومنہ نے اسسٹنٹ کو بھی جھنجلاتے دیکھا اور چائے کا کپ ایک گھونٹ میں خالی کر کے اسپاٹ بوائے کو تھما دیا۔

''بس ہمیں بٹھا چھوڑتے ہیں، تین تین گھنٹے کے لیے۔'' اس نے اپنے برابر بیٹھی ایک ایکسٹرا لڑکی کو کہتے سنا۔

''قسمت کہتے ہیں اسے۔'' دوسری نے جواباً کہا تھا۔ وہ ایک خاموش تماشائی تھی اور ایسے موقعوں پر تو جیسے اس کے سارے لفظ ہی کہیں گم ہو جاتے تھے۔ کسی بھی سیٹ پر سب سے بے ضرر وجود مومنہ سلطان ہی کا ہوتا تھا۔ اس کی کسی چیز کے بارے میں کوئی رائے نہیں ہوتی تھی...... ہوتی بھی تھی تو وہ اس کے لب پر نہیں آتی تھی۔ اسے شکایت کرنے کی عادت بھی رہی ہی نہیں تھی اور اب ان حالات میں شکایت کرنا تو وہ افورڈ بھی نہیں کر سکتی تھی...... وقت اس کے پاس بہت تھا۔

آج کا دن ان دنوں میں سے ایک تھا جب اسے ایک سیٹ سے دوسرے سیٹ پر پہنچنے کے لیے بھاگنا نہیں تھا۔ یہ پہلا سیریل تھا جو وہ کر رہی تھی اور اسے سیریل کہنا شاید کچھ لفاظی ہوتی...... وہ ہیروئن کی ایک دوست کا رول کر رہی تھی۔ جس کے پاس صرف بارہ سین تھے، چوبیس اقساط کے اس سیریل میں۔

سیٹ پر ایک دم کھلبلی مچ گئی۔ وہ ہیروئن بالآخر آن پہنچی جس کا انتظار ہو رہا تھا۔ مومنہ نے بھی سکون کا سانس لیا، اب بالآخر وہ سین کروا کے گھر جا سکتی تھی۔

''مومنہ! آ کر ریہرسل کرو۔ تمہارا سین ہو گا پہلے۔'' اسسٹنٹ نے اسے پکارتے ہوئے کہا۔ وہ برق

رفتاری سے اٹھی اور سیٹ کے اس حصے میں چلی گئی جہاں نشا اپنے بال بنوا رہی تھی۔ وہ میک اپ کروا کر آئی تھی اس لیے ڈائریکٹر خوش تھا کہ وہ وقت بچ گیا تھا۔

''ہائے۔'' اس نے مومنہ کے سلام کے جواب میں ایک ہلکی مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور ساتھ جمائی لیتے ہوئے اسسٹنٹ سے کہا۔

''چائے پلواؤ تا کہ آنکھیں تو کھلیں میری۔'' اسسٹنٹ نے بجلی کی رفتار سے سپاٹ بوائے کو دوڑایا تھا۔

''ہاں بال ٹھیک ہیں اب میرے...... بائیں کندھے پر ڈالو۔''

نشا اب میک اپ آرٹسٹ سے مخاطب تھی اور آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے ساتھ لپ اسٹک بھی دیکھ رہی تھی۔

''ڈائیلاگز یاد ہیں آپ کو؟'' اسسٹنٹ کو مومنہ کو کھڑے دیکھ کر اچانک یاد آیا کہ اسے کس لیے بلوایا گیا تھا۔

''ڈائیلاگز کیا گھر سے یاد کر کے نکلوں گی میں؟ میں نے تو اسکرپٹ دیکھا تک نہیں ابھی۔ بس یہ پتا ہے کہ رول کیا ہے میرا۔''

نشا نے اسی بے زار اور تیکھے انداز میں جمائی لیتے ہوئے کہا۔ وہ پچھلی رات ہی بیرون ملک چھٹیاں گزار کر آئی تھی اور اب اگلی صبح ہی سیٹ پر آ کر شوٹنگ کروانا، وہ اپنی بے زاری کو بالکل حق بجانب سمجھ رہی تھی۔

''مومنہ! تم ذرا لائنز دہراؤ اپنی۔ میں میڈم کی دہراتا ہوں۔'' اسسٹنٹ نے مومنہ سے کہا تھا۔ نشا اسسٹنٹ پر تپی۔

''چائے تو پینے دو مجھے...... آرٹسٹ ہوں میں اور وہ بھی سیریل کی مین لیڈ۔ مزدوروں کی طرح ٹریٹ مت کرو مجھے۔''

مومنہ اور اسسٹنٹ ایک دوسرے کو دیکھ کر چند لمحوں کے لیے ہکا بکا ہو گئے۔ پھر اسسٹنٹ نے فوری طور پر نشا سے معذرت کرنا شروع کر دی۔ وہ اس فیلڈ میں بغیر غلطی کے ان معذرتوں کا اتنا عادی ہو چکا تھا جیسے کسی جھگڑالو سسرال میں آنے والی غریب خاندان کی بہو جس کی زبان پر سلام کے بعد پہلا جملہ معاف کر دیں ہوتا ہے۔

نشا کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا، وہ اب چائے کی چسکیاں لے رہی تھی۔ مومنہ اب بھی کھڑی تھی اسکرپٹ ہاتھ میں لیے۔

''اچھا ذرا دہراؤ میری لائنز۔'' اس نے بالآخر چائے کا کپ خالی کر کے اسپاٹ بوائے کو تھمایا۔ میک اپ آرٹسٹ سے ایک بار پھر برش اور پاؤڈر لگوایا اور پھر اسسٹنٹ سے کہا، جو توتے کی طرح اس کے جملے دہرانے لگا تھا۔ پندرہ منٹ وہ اسے جملے یاد کرواتا رہا اور مومنہ وہیں کھڑی دیکھتی رہی۔ وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے بلا مقصد وہاں کھڑی تھی لیکن وہ کسی سے نشا کی طرح یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ اسے بلاوجہ کیوں وہاں کھڑا کیا گیا ہے جبکہ سین ابھی تیار ہی نہیں ہے۔ وہ ثانوی کردار تھی، اپنی حیثیت اور اوقات جانتی تھی۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ ڈائریکٹر اور اسسٹنٹ نشا کی ساری فرسٹریشن اس پر اتاریں۔

پندرہ منٹ بعد بالآخر نشا کو ڈائیلاگ یاد ہو گئے وہ اب سین کے لیے تیار تھی۔

ایکشن کی کیو کے ساتھ ہی مومنہ نے اپنی لائنز بولنا شروع کر دیں۔

''میں تمہاری دوست ہوں، تم اس طرح کے الزامات نہیں لگا سکتیں مجھ پر، وہ بھی صفائی کا موقع دیے بغیر۔'' اس نے نشا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اپنے ڈائیلاگز بولے۔ وہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑی تھیں۔

''میرے بس میں ہو تو تمہیں جان سے مار دوں۔'' نشا نے جواباً غصے میں کہا۔

مومنہ نے یک دم اس کے ہاتھ پکڑے اور اپنی گردن تک لاتے ہوئے بے حد جذباتی انداز میں کہا۔

''مار دو...... اگر میرے مر جانے سے دوستی بچ جاتی ہے تو مجھے یہ بھی قبول ہے۔''

نشا نے اس سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی...... اتنا بڑا راز...... کٹ کریں......''

نشا اپنے ڈائیلاگز آخری منٹ میں بھول گئی تھی اور اس نے یک دم سین کٹ کروایا تھا۔ ڈائریکٹر اور ڈی او پی بے اختیار جھنجلائے تھے، سین ختم ہوتے ہوتے خراب ہو گیا تھا۔

''ڈائیلاگ دہراؤ میڈم کے۔'' ڈائریکٹر نے اسسٹنٹ سے کہا مگر اس سے پہلے کہ اسسٹنٹ کچھ کہتا نشا نے بے حد خفگی سے کہا۔

''ڈائیلاگز ہیں ہی بکواس میرے...... ساری لائنز اس کو دی ہوئی ہیں۔ مجھے بس ''اتنا بڑا راز'' دے کر بٹھایا ہوا ہے۔ ڈائیلاگ کم کریں اس کے ڈائریکٹر صاحب! وہ میرا سین کھا رہی ہے، آپ کو نظر نہیں آ رہا۔''

مومنہ ہکا بکا کھڑی تھی اور ایسا ہی حال عملے اور ڈائریکٹر کا تھا۔ مومنہ کا خیال تھا وہ اپنے ڈائیلاگز بھولنے کی وجہ سے شرمندگی میں یہ سب کہہ رہی ہے، اسے یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ اس کی پرفارمنس اور ایکسپریشنز سے پریشان ہوئی تھی۔

نشا سیریلز کرتے کرتے نئی نئی دو فلمیں کر کے آئی تھی اور فلم کی طرح وہ بھی آتے ہی مقابل کے ڈائیلاگ کٹوانے بیٹھ گئی تھی۔ وہ اسٹار پاور تھی اور مومنہ بے چارگی کے عالم میں سین فریم کے اندر ویسے ہی کھڑی تھی۔

تھوڑی دور ڈی او پی مانیٹر پر اسی فریم کی فوٹیج ڈائریکٹر کو دکھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''میں آپ کی جگہ ہوتا تو مومنہ ہی کو کاسٹ کر لیتا۔ نشا ٹھیک کہہ رہی ہے۔ وہ اس کا سین کھا رہی ہے، وہ سب کا سین کھا جاتی ہے۔ چاہے بہن بنا کر کھڑا کر دو، چاہے نوکرانی۔ مومنہ کے ایکسپریشن کے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔''

ڈی او پی اسے داد دے رہا تھا اور بہت کھلے دل سے دے رہا تھا جبکہ ڈائریکٹر پریشانی سے اس سے کہہ رہا تھا۔

''پتا ہے مجھے پرفارمر ہے وہ مگر نشا برانڈ ہے۔ سیریل برانڈ نیم سے بکتا ہے پرفارمنس سے نہیں۔ میں لاتا ہوں منا کر نشا کو...... طاہر تم اسکرپٹ دیکھو...... مومنہ کی لائنز کم کر دو بلکہ نشا میڈم کے پاس لے آؤ وہ خود ہی کم کر دیں گی۔''

مومنہ نے اتنی دور سے بھی ڈائریکٹر اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے درمیان بلند آواز سے ہونے والی گفتگو سن لی تھی، گفتگو کو اس کے کانوں تک نہ پہنچنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی تھی۔

''انڈسٹری میں عزت، نخرا اور انا صرف مین لیڈ کی دیکھی جاتی ہے۔ باقی سب یہ چیزیں گھر چھوڑ کر سیٹ پر آتے ہیں۔''

کسی سینئر ایکٹر نے ایک بار مومنہ سے کہا تھا اور مومنہ کو وہ بات یاد آئی تھی۔

☆☆☆

اس کے گھر کی گلی بہت لمبی تھی اور تنگ بھی، ٹوٹی پھوٹی بھی اور بے حد گندی بھی۔ نہ وہاں کوئی کوڑا اٹھانے

آتا تھا نہ نالی صاف کرنے، یہ کام اس دن ہوتا جب محلے کے لوگوں کا میونسپلٹی کے جمعداروں کے ساتھ لڑائی جھگڑا گالم گلوچ ہوتی اور پھر محلے والے مل کر محلے کے جمعدار کے خلاف ایک درخواست دیتے اور اس دن میونسپلٹی کسی نہ کسی کو صفائی کے لیے وہاں بھیج دیتی۔ یہ سالوں سے ہو رہا تھا...... نہ جمعدار کی ڈھٹائی میں تبدیلی آئی تھی نہ محلے والوں کی ثابت قدمی اور بے نیازی میں۔

وہ آٹھ گھنٹے کی شفٹ میں صرف دو سین کروا کر اور تین ڈریس بدل کر تھکی ہاری اپنی گلی میں شام سے کچھ پہلے داخل ہوئی تھی۔ نیند سے اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں اور ایک لحہ کو اس کا دل چاہا تھا وہ اسی گلی میں سونے کے لیے لیٹ جائے...... گلی کی زمین پر اگر جگہ جگہ اسے گندگی نظر نہ آ رہی ہوتی تو وہ شاید یہ کر بھی بیٹھتی۔ اس کی ذہنی حالت کچھ ایسی ہی تھی آج۔

سامنے سے آتے جھومر نے اسے دیکھتے ہی تالیاں پیٹ کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

''ہماری ہیروئن آ گئی۔''

وہ مسکرا بھی نہ سکی۔ اس محلے میں فی الحال اس کے علاوہ کوئی ٹی وی میں کام کرنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس لیے جھومر اسے بلاوجہ محلے کی شان بنائے بیٹھا ہوا تھا۔

''السلام علیکم مومنہ باجی! میں کیسی لگ رہی ہوں؟'' اس نے مومنہ کو سلام کرتے ہی جیسے اس سے اپنی ''تیاریوں'' کی داد لینا چاہی۔

''ہمیشہ اچھی لگتی ہو جھومر!'' اس نے غور کیے بغیر کہا۔ وہ رک کر مزید بات چیت نہیں کرنا چاہتی تھی جو جھومر کی خواہش رہتی تھی۔

''بس مومنہ باجی! آپ اسٹار ہیں تو نظر بھی آپ کی اسٹاروں والی ہے۔ باقی اس محلے میں تو کوئی آپ جیسا ہے ہی نہیں، اسی لیے تو آپ پر اتنا بھروسا کرتی ہے جھومر۔''

جھومر بولے جا رہی تھی۔ اپنا دوپٹہ گلے میں سیدھا کرتے اور اپنے بالوں میں انگلیاں چلاتے اسے یہ دیکھنا یاد نہیں رہا تھا کہ مومنہ اس کے پاس کھڑی بھی تھی یا نہیں اور جب تک اسے خیال آیا مومنہ اس کے پاس سے غائب ہو چکی تھی۔

''مومنہ...... مومنہ......!'' وہ اپنے گھر کے دروازے سے ابھی بہت فاصلے پر تھی جب اس نے اپنے عقب میں کسی کو اپنا نام پکارتے سنا۔ وہ بے اختیار پلٹی۔ ایک مڈل ایجڈ چھوٹے قد اور بھاری وجود کی عورت پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ اس کی طرف آ رہی تھی وہ یقیناً بہت دیر سے اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ وہ اس کی مالک مکان تھی اور اس کے چہرے پر پہلی نگاہ ڈالتے ہی مومنہ کو یاد آیا کہ انہوں نے ابھی اس مہینے کا کرایہ دینا تھا۔ ذہن میں کوئی مناسب بہانا ڈھونڈتے ہوئے اس نے اس عورت کو سلام کیا جو اب اس کے قریب آ گئی تھی۔

''السلام علیکم عذرا خالہ۔''

''وعلیکم السلام...... اف تم نے تو دوڑ لگوا دی۔ کب سے آوازیں لگا رہی ہوں تمہیں...... پر مجال ہے تم نے پیچھے پلٹ کر دیکھا ہو۔'' اس عورت نے بڑی خوش دلی کے ساتھ اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس سے گلہ کیا۔

''بہت معذرت، میں نے آواز سنی نہیں آپ کی۔'' مومنہ نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں بھئی، اسٹار ہو تم کیا سنو گی ہمارے جیسوں کی آوازیں...... ثریا سے کہہ رہی تھی کیا ایکٹنگ کرتی ہے۔ تمہاری بیٹی ماشاءاللہ، سوپ دیکھ رہی ہوں تمہارا۔''

عذرا نے پھولے ہوئے سانس کو بحال کرنے کا انتظار کیے بغیر اسی سانس میں اس کی تعریفیں شروع کر دی

تھیں۔ مومنہ کچھ پرسکون ہوئی۔ اس کا مطلب تھا فی الحال کرایہ کے لیے کچھ دن اور مل سکتے تھے۔

''بہت شکریہ خالہ! بس آپ کا پیار ہے۔'' اس نے انکساری سے کہا۔

''بس اب سوپ وغیرہ چھوڑو اور کوئی سیریل کرو...... کوئی بڑا رول۔'' انہوں نے ساتھ ہی مشورہ دیا۔

''جی ایک سیریل بھی کر رہی ہوں آج کل۔'' اس نے ان پر انکشاف کیا اگر ان کو مرعوب کرنے سے کچھ اور دن مل جاتے کرایہ دینے کے لیے تو کیا برا تھا۔

''ارے واہ...... یہ تو بڑی خبر ہے۔ کون کون ہے سیریل میں؟'' انہوں نے فوراً پوچھا۔

''نشا ہے......''

''اور تمہارا کیا رول ہے؟''

''چھوٹا رول ہے خالہ۔''

''چلو کوئی بات نہیں، بڑا بھی ملے گا۔ نشا کو میرا بتانا کہ میں فین ہوں اس کی۔''

''جی ضرور۔'' مومنہ نے ہامی بھری۔

''ارے ہاں جس بات کے لیے تمہیں روکا تھا وہ تو بھول ہی گئی۔'' وہ بالآخر مدعا پر آ گئیں۔ ''تمہارے گھر گئی تھی۔ جہانگیر کو دیکھا تو بڑا افسوس ہوا...... جہانگیر سامنے تھا تو ثریا سے کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔'' ان کے چہرے پر اب ہمدردی کے تاثرات تھے۔

''مجھے پتا ہے خالہ! کرایہ لیٹ ہو گیا ہے اس بار بھی۔ لیکن میں ایک ہفتے تک دے دیتی ہوں آپ کو، سیریل کا چیک مل جائے گا اس ہفتہ میں۔'' اس نے بڑے نادم انداز میں ان سے کہنا شروع کیا۔

''نہیں نہیں۔ کرائے کی تو کوئی بات نہیں ہے وہ دے دینا تم...... مجھے اصل میں ''گھر خالی کروانا ہے۔'' وہ بڑا عجیب کر بولیں۔ ایک لحہ کے لیے مومنہ کی سانس رکی۔

''گھر خالی کروانا ہے؟'' وہ بے یقینی سے بولی۔

''ہاں بیٹا! وہ بس میرا بیٹا اپنا گھر بنوا رہا ہے تو پیسے کم پڑ گئے ہیں، اس لیے اب یہ والا گھر بیچنا پڑے گا۔'' انہوں نے وضاحت دی۔

''لیکن خالہ اتنا اچانک......'' وہ بے حد پریشان ہوئی تھی۔

''نہیں...... نہیں وقت تو دیں گے تمہیں۔ مہینہ دو مہینہ...... آرام سے گھر ڈھونڈو۔ آخر میں فین ہوں تمہاری۔ چلو پھر چلتی ہوں، درزی کے پاس بھی جانا ہے مجھے اور سیریل جب چلنا شروع ہو تو ضرور بتانا...... اوکے اللہ حافظ۔''

وہ اسی طرح تیز تیز کہتی ہوئی چلی گئیں اور مومنہ وہیں کھڑی رہ گئی۔ وہ ہوں ہاں بھی نہیں کر سکی تھی۔ وہ واقعی ایک خراب دن تھا مگر اس کی زندگی میں خراب دنوں کی اتنی بھرمار تھی کہ اسے اب ان کی گنتی بھی بھول گئی تھی۔

''تو اب یہ ایک اور مسئلہ ہوگا...... نیا گھر ڈھونڈنا......'' اس نے چلنا شروع کر دیا۔ اپنے گھر کے کھلے دروازے کے آگے لٹکتا پردہ ہٹا کر اس کا دل چاہا وہ وہیں گر جائے، کسی میراتھن میں حصہ لینے والے رنر کی طرح جو فنشنگ لائن تک پہنچتے پہنچتے ڈھے جانے کی خواہش جیتنے کی خواہش سے زیادہ کرنے لگتا ہے۔ اپنا بیگ صحن میں پڑی چارپائی پر پھینکتے ہوئے اس نے صحن کے کونے میں لگے ہوئے بیسن کا نلکا کھول کر چہرے پر چھینٹے مارنا چاہے اور نلکے سے پانی کے قطروں کے علاوہ کچھ برآمد نہیں ہوا تھا۔ اس کا دل عجیب طرح سے ڈوبا، وہ اس وقت پسینے سے شرابور تھی اور منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے کے بعد غسل خانے میں جا کر نہانا چاہتی تھی...... جبکہ یہاں پانی ہی نہیں تھا۔

اس نے صحن میں کپڑے دھونے والی جگہ پر پڑی بالٹی دیکھی اور پھر اس بالٹی میں پڑے پانی سے وہ اپنے منہ پر چھینٹے مارنے لگی۔

"پانی کی پائپ لائن پھٹ گئی ہے۔ وہاں سڑک پر پورے محلے والے جمع ہیں وہیں سے پانی لا رہے ہیں صبح سے۔ اب دیکھو کب ٹھیک کرتے ہیں میونسپلٹی والے۔"

اس نے اپنے عقب میں اچانک ثریا کی آواز سنی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی اس نے اپنے چھوٹے بھائی جہانگیر کی بھی آواز سنی تھی۔

"آپا! تم آ گئیں......؟" یہ جملہ وہ ہر روز اس کے آنے پر بولتا تھا۔ اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی وہ اس کی چاپ سن کر اندر کمرے سے باہر آ جاتا تھا اس سے اس کے دن کی داستان سننے کے لیے۔ شوٹنگ پر ہونے والے واقعات، کس نے کس سے کیا کہا...... کون کس سے لڑا، کون کس کے ساتھ افیئر چلا رہا ہے، کون فلرٹ کر رہا ہے۔ اس کی پرفارمنس نے کتنوں کو متاثر کیا۔ سین میں کس کس نے اسے داد دی۔ اس کا سوال نامہ روز ایک جیسا ہوتا تھا مگر مومنہ کو روز نئے سرے سے اس کی تیاری کرنا پڑتی تھی۔ باہر اور شوبز کی دنیا کے ساتھ وہ جہانگیر کے رابطے کا واحد ذریعہ رہ گئی تھی اور وہ اسے قائم رکھنا چاہتی تھی۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" اس کا جواب بھی جہانگیر کو یقیناً رٹا ہوا ہوگا۔ وہ اس کے سوال کا جواب ہمیشہ اس سوال سے دیا کرتی تھی اور پھر اس کا جواب جہانگیر کی زبان پر ڈھونڈنے کے بجائے اس کے چہرے اور انداز سے ڈھونڈتی تھی کیونکہ جہانگیر کی زبان پر ہمیشہ جھوٹ ہوتا تھا۔

"میں تو ٹھیک ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا اور وہ اس کا چہرہ کھوجنے لگی۔ وہ ویسا ہی تھا جیسا روز ہوتا تھا۔ وہی حلقے، وہی پیلی پھیکی رنگت، وہی سیاہ ہونٹ، وہی آنکھوں کے گرد سوجن، وہی آنکھوں کی غائب ہوتی ہوئی چمک اور وہی کھڑے رہ پانے کی جدوجہد...... وہ گردوں کی بیماری میں مبتلا تھا اور ڈائیلاسس کروا رہا تھا...... اور مومنہ سلطان رقم جمع کرنے میں مصروف تھی جس سے وہ اس کا گردہ تبدیل کروا لیتی۔ وہ بہت سے محاذوں پر بہت سی جنگیں ایک ہی وقت پر لڑ رہی تھی اور ہر جنگ ہار رہی تھی۔

"وہ آپا پھر آج کیسا گیا سیریل کے سیٹ پر تمہارا پہلا دن؟" جہانگیر اس کی کھوجتی آنکھوں کو خود پر سے ہٹانا چاہتا تھا۔"

"میں تھوڑی دیر سو جاؤں پھر اٹھ کے —— بتاؤں گی۔" اس نے اندرونی کمرے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کھانا تو کھا لو۔" ثریا نے اس سے کہا۔

"وہ بھی بعد میں۔"

اس نے پلٹے بغیر ماں سے کہا تھا یہ پوچھے بغیر کہ پکا کیا ہے۔ دال، آلو، گوبھی، چاول...... وہ مینیو کی فہرست اور ترتیب سے واقف تھی اور اسے یہ بھی پتا تھا کہ جب تک کرایہ ادا نہ ہو جاتا اس مینو میں گوشت کی انٹری نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ گوشت کی شوقین تھی بھی نہیں...... ڈراموں کے سیٹس پر اسے سب کچھ مل جاتا تھا...... ثانوی کرداروں میں بھی اچھا کھانا یا کم از کم وہ کھانا جو اس کے اپنے گھر سے بہتر ہوتا تھا اور کھانے کے بارے میں اب سوچتا بھی کون تھا...... زیادہ سے زیادہ جو وہ سوچتی تھی وہ کھانا کھانے کے بارے میں تھا...... کیا کھایا جائے اس بارے میں نہیں۔

چادر کو چہرے پر کھینچتے ہی وہ جیسے سکون کی کسی وادی میں اتر گئی۔ یہ اس کی عادت تھی وہ سر سے پاؤں تک چادر خود پر تان کر چت سویا کرتی تھی۔ وہ چادر نما خیمہ جیسے اس کی حفاظتی باڑ تھی جو کچھ لمحوں کے لیے اسے ہر چیز سے بے نیاز کر دیتا تھا۔ اس چادر کے اندر اس کے اپنے وجود کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ نہ گھر کی دیواروں سے اکھڑا پلستر، نہ برسات میں چھت سے ٹپکتا پانی، نہ گھر کا مرمت طلب فرنیچر، نہ جہانگیر کا بیمار چہرہ، نہ ثریا کی کھوجتی نظریں، نہ سلطان کی اداس آنکھیں۔

اس چادر کے اندر مومنہ سلطان کو صرف مومنہ سلطان نظر آتی تھی جو صرف اپنے ساتھ ہوتی تھی۔ کچھ دیر کے لیے نیند کی آغوش میں جانے سے پہلے وہ چادر کے اندر آنکھیں کھولے اس چادر کی چھت کی دیکھتی رہتی اور اس خالی پن میں سکون محسوس کرتی جیسے کسی نے سلیٹ پر لکھی گڈمڈ تحریریں کچھ دیر کے لیے ڈسٹر سے مٹا دی ہوں اور سلیٹ بالکل خالی ہو۔

پنکھے کی گھرر گھرر کی آواز اس کی چادر کو ہلانے میں مصروف تھی۔ باہر صحن میں ثریا اور جہانگیر آپس میں باتیں کر رہے تھے اس چادر کے اندر وہ بند آنکھوں سے ان کی آوازیں سن رہی تھی۔

"مجھے پتا ہے، پہلا سین دیکھتے ہی ڈائریکٹر اور سارے ایکٹر متاثر ہو گئے ہوں گے آپا سے شاید تالیاں بھی بجائی ہوں...... ہو سکتا ہے اگلا سیریل بھی دینے کی بات کر رہے ہوں۔"

جہانگیر خواب دیکھنے کا عادی تھا اور اون سلائیوں کے ساتھ ایک خواب کے اُدھڑے دھاگوں کے ساتھ دوسرا خواب بننے کا عادی بھی۔ وہ آنکھیں بند کیے چادر کے اندر سوچ رہی تھی۔

"ہاں سیریل مل جائے کوئی بڑا تو تمہارا گردہ ٹرانسپلانٹ کروا لیں گے فوراً...... سیریل کے پیسے بھی تو بہت ملتے ہیں ہیرو ہیروئن کو۔"

اس نے ثریا کی آواز سنی۔ مومنہ کی ہر کامیابی ثریا اور سلطان کے نزدیک جہانگیر کی زندگی بچانے کے قدموں کے طور پر گنی جاتی تھی۔ اب مومنہ یہ کرے گی تو جہانگیر کو یہ مل سکتا ہے۔ یہ کرے گی تو جہانگیر کے ساتھ یہ ہو جائے گا...... اور یہ ہوگا تو وہ سانپ سیڑھی کا پورا بورڈ کسی سانپ کے زہر کا شکار ہوئے بغیر اپنے بھائی کے ساتھ پار کر جائے گی...... وہ اس سے آگے کچھ سوچ نہیں پائی۔ نیند مہربان تھی اور زندگی نامہربان۔

☆☆☆

اس نے آنکھیں کھول دیں اور پہلا احساس جو اسے ہوا تھا وہ سر میں دھمک کا تھا۔ یہ رات کا ہینگ اوور، آفٹر پارٹی ایفیکٹس تھا۔ وہ کچھ دیر اسی طرح اپنے بیڈ پر ٹانگیں کھولے چت لیٹا رہا۔ آنکھیں کھولتا بند کرتا رہا۔ اس کے کانوں میں رات کی پارٹی کے ڈی جے کا بجایا ہوا میوزک اب بھی گونج رہا تھا۔ ڈرم کی بلند بیٹ...... اس نے سر کو بے اختیار جھٹکا یوں جیسے شور کو بھی سر سے جھٹک دینا چاہتا تھا۔ پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے گلاس پینٹ ہاؤس کی دیواروں اور کھڑکیوں سے اس وقت روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ وال کلاک دس بجا رہا تھا اور عام طور پر اس کے جاگنے کا وقت تھا چاہے وہ ساری رات ہی کسی پارٹی میں رہتا لیکن دس بجے اس کا باڈی کلاک اسے کسی الارم کی طرح اٹھا دیتا تھا

بستر پر اٹھ کر بیٹھا وہ چند لمحے پینٹ ہاؤس کی شیشے کی دیواروں سے نظر آتا منظر دیکھتا رہا۔ تیس منزلہ عمارت کی اس آخری منزل پر موجود پینٹ ہاؤس میں صبح آنکھ کھلنے کے بعد وہ اسی طرح ہر روز بستر پر بیٹھا رہتا تھا۔ یہ وقت انجانے میں زندگی کی بے معنویت کو محسوس کرنے کے چند لمحے تھے جو ہر روز قلبِ مومن کی زندگی میں اسی وقت آتے تھے۔

ساری رات پارٹیز میں وقت گزارنے کے بعد صبح سوتی جاگتی کیفیت میں آنکھ کھلنے کے بعد بستر پر بیٹھ کر پینٹ ہاؤس کی شیشے کی دیوار سے نظر آنے والا سمندر اور اس کے اوپر اڑتے پرندے دیکھنا۔ وہ منظر اس کے پینٹ ہاؤس سے بہت دور کا تھا۔ وہ وہاں بیٹھے سمندر کی آواز نہیں سن سکتا تھا اس کے باوجود اس کے اندر اس منظر کو دیکھتے ہوئے سمندر کی موجوں اور لہروں کی حرکت کے ساتھ وہ شور بھی سنائی دیتا تھا جو اس وقت سمندر میں ہوتا۔

بستر سے اتر کر وہ لڑکھڑایا۔ یہ لڑکھڑاہٹ بھی معمول کا حصہ تھی۔ دو تین قدموں میں وہ سنبھل جاتا تھا آج بھی سنبھل گیا۔

واش روم میں واش بیسن پر سر جھکائے وہ اپنے چہرے اور آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مارتا ہی چلا گیا تھا۔ یوں جیسے سر میں سنائی دینے والی دھمک کو روکنا چاہتا ہو یا دھو دینا چاہتا ہو۔ پھر اس نے سیدھا کھڑا ہو کر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ سرخ پھولے ہوئے پپوٹے، ہلکی بڑھی ہوئی شیو، بکھرے بال اور بھیگا ہوا چہرہ اور اس چہرے سے نیچے گردن اور سینے تک آتی پانی کی مہین لکیریں۔ رات کی تھکاوٹ بھی آئینے میں نظر آنے والے مرد کی وجاہت کو دھندلانے میں ناکام نظر آ رہی تھی۔ اس کے تیکھے نین نقش اس کے عرب یا ترک ہونے کی چغلی کھا رہے تھے یا کم از کم اس کے جینز میں اس —— وراثت کی موجودگی کا برملا اظہار کر رہے تھے۔

آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے وہ جیسے وہاں لکھا اپنے پورے دن اور اگلی رات کا شیڈول پڑھ رہا تھا...... اس کی مصروفیات کی ایک لمبی لائن تھی اور وہ ذہنی طور پر اس وقت ان میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔

نائٹ سوٹ کی شرٹ پہنے وہ باہر لاؤنج میں واپس آ گیا جہاں دیوار پر **اھدنا الصراط المستقیم** کی بڑے سائز کی پینٹنگ دیوار پر لگی ہوئی تھی۔ اسی دیوار پر جس کے ساتھ وہ صوفہ پڑا تھا جس پر بیٹھا وہ اس وقت ٹی وی آن کیے چینل بدلنے میں مصروف تھا میکانکی انداز میں...... بی بی سی سے فیشن چینلز اور سی این این سے اسپورٹس اور پھر دوبارہ بی بی سی یا سی این این اس کی روز کی چینل روٹین بھی ایک جیسی ہی تھی۔

ملازم اس کے باہر نکلنے اور بیٹھنے کے دوران اس کے لیے کافی کا ایک مگ رکھ گیا تھا۔ سامنے ایک نیوز چینل پر اچانک رات کے ایوارڈ شو کی جھلکیاں دکھائی جانے لگیں اس نے آواز تھوڑی بلند کر دی۔ نیوز کاسٹر اس کی فلم کے حوالے سے خبر دے رہا تھا اور وہ ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی ایوارڈ لیتے ہوئے فوٹیج دیکھ رہا تھا۔ تب ہی اس کا صوفے پر پڑا سیل فون بجنے لگا اس نے فون کی اسکرین پر چمکتا شیلی کا نام دیکھا اور ایل سی ڈی کی آواز ہلکی کرتے ہوئے اس نے فون کال ریسیو کی۔ وہ اس کی فلم کی ہیروئن تھی۔

"ہیلو جان۔" بے حد میٹھی اور بے حد اپنائیت بھری آواز میں اس نے اسے اسی انداز سے مخاطب کیا تھا جس انداز سے وہ انڈسٹری کے ہر ہیرو اور ڈائریکٹر کو مخاطب کرتی تھی۔

"ہیلو شیلی!" اس نے جواباً اس عام لہجے میں اسے مخاطب کیا جس میں ہمیشہ کیا کرتا تھا۔

"اف کیا کہوں تمہارے بارے میں، تم نے تو تباہی مچا دی رات کو ایوارڈ میں......" وہ اب اسے مکھن لگانے کی مہم شروع کر چکی تھی۔

"ہم لوگ تو آڈینس میں بیٹھے تھے اور پھر تالیاں بجانے لگے تو بس بجاتے ہی گئے میں نے تو کھڑے ہو کر تمہارے لیے کلیپنگ کی اور چیئر بھی کیا۔ تم نے دیکھا؟" اس نے مومن سے پوچھا۔ اس کی بات سننے کے دوران کافی پیتے ہوئے ریموٹ لیے چینل بدلنے میں مصروف ہو چکا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا شیلی بہت لمبی بات کرے گی۔

"نہیں کب؟" وہ چونکا۔

"اوہ گاڈ، یو مسڈ اٹ۔" وہ بے اختیار مایوس ہوئی۔ "اگر ان لوگوں نے ایڈٹ نہ کیا نا تو ٹی وی پر جب ایوارڈ شو چلے گا۔ تمہیں چیئر کرتے ہوئے میری فوٹیج تم دیکھنا...... تم نے تو کیسی جرأت دکھائی کہ ان کے منہ پر ہی انہیں بول دیا۔ آج دیکھو ذرا نیوز میں ایوارڈ سے زیادہ تمہاری اسپیچ کی کوریج ہے۔"

وہ قلب مومن کی جتنی تعریفیں کر سکتی تھی اس وقت کر رہی تھی کیونکہ بد قسمتی سے پچھلی رات ایوارڈ کی پارٹی میں وہ کوشش کے باوجود قلب مومن سے مل کر یہ سب نہیں کہہ پائی تھی کیوں کہ اس ایوارڈ شو کو جو برانڈ اسپانسر کر رہا تھا وہ مسلسل قلب مومن سے چپکے ہوئے اسے وضاحتیں دے کر اس کی خفگی ختم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شیلی اتنی بے وقوف نہیں تھی کہ اس برانڈ کے نمائندوں کے سامنے وہ قلب مومن کو اس "دلیری" پر وہاں کھڑے ہو کر داد دیتی۔

"میں نے ابھی نیوز پیپرز دیکھے نہیں۔ ابھی دیکھتا ہوں۔" اس نے شیلی سے مختصراً کہا۔

"ارے وہ تم نے "ڈسک" کا کور دیکھا؟" شیلی کو اچانک یاد آیا۔ مومن نے سامنے پڑے ہوئے اس میگزین "ڈسک" پر ایک نظر دوڑائی اور کہا۔ "ہاں دیکھا ہے۔"

"میری تصویر کا سائز دیکھو باقی دونوں سے چھوٹا کر دیا ہے مجھے۔" شیلی نے لمحہ بھی ضائع کیے بغیر شکایت کی۔

مومن نے کچھ کہے بغیر میگزین اٹھا لیا اور اس کور کو دیکھنے لگا جس پر اس کے ساتھ اس کی پچھلی تین فلموں کی ہیروئنز کی بے حد مختصر ملبوسات میں تصاویر تھیں اور اوپر ایک ہیڈنگ میں "دی کوئن میکر" لکھا ہوا تھا۔ مومن نے ایک نظر سرورق پر ڈالتے ہوئے میگزین کو دوبارہ ٹیبل پر پھینکتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہاف انچ ہی چھوٹی ہو گی اگر ہوئی بھی تو۔"

دوسری طرف اس کے جملے پر شیلی جیسے چلا اٹھی تھی۔

"ہاف انچ بھی کیوں چھوٹی ہوئی میری پکچر...... کس کی فلم ہٹ ہوئی ہے اس سال......؟ میری...... اور تصویر کس کی پھول دے رہے ہیں؟ وہ بھی میری؟"

مومن نے اسے تسلی دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تم پروا مت کرو۔"

"کیسے پروا نہ کروں۔ مجھے کیا پتا نہیں کہ "ڈسک" کے ایڈیٹر کی نیت کیا ہے اور کس طرح وہ لینا کو پروموٹ کر رہے ہیں۔"

شیلی نے اس کور میں موجود ایک دوسری ہیروئن کا نام لیتے ہوئے کیا۔ مومن اب بے زار ہونے لگا تھا۔ وہ صبح سویرے تصویروں کے سائز پر سر نہیں کھپانا چاہتا تھا۔

"شیلی اس وقت میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے اور تمہاری آدھی باتیں میرے سر کے اوپر سے گزر رہی ہیں۔"

اس نے بے حد صاف گوئی سے کہا۔ شیلی نے بغیر برا مانے فوراً ہی اپنی ٹون بدلی۔

"جان! مجھے بتایا کیوں نہیں...... میں اپنی باتیں لے کر بیٹھ گئی...... سو سوری جان...... میں ابھی آتی ہوں۔"

"نہیں...... نہیں ابھی تو میں آڈیشنز کے لیے نکل رہا ہوں۔" مومن نے فوراً کہا۔ شیلی نے جواباً کچھ خفگی سے اس سے کہا۔

"تم میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہو۔ اتنی بڑی ہٹ دی ہے تمہیں اور تم پھر بھی اگلی فلم کے لیے آڈیشن کرنے بیٹھے ہو۔"

"تمہیں پتا ہے میں ہیروئن ریپیٹ نہیں کرتا۔ یہ میری کامیابی کی وجہ ہے۔"

"گالی دینا چاہتی ہوں تمہیں میں اس بات پر۔" شیلی نے جواباً کہا۔

"وہ تم ٹیکسٹ کر دینا...... ابھی تو میں نکل رہا ہوں گھر سے۔" مومن نے جواب چڑانے والے انداز میں اسے کہا۔

"ہو تم ویسے گالیوں ہی کے قابل۔" دوسری طرف سے شیلی نے فون بند کرنے کے بعد کہا تھا۔

☆☆☆

اس چھوٹے سے کمرے میں پڑا فرنیچر مرمت طلب ہونے کے باوجود اپنے "خاندانی" ہونے کا اظہار کر رہا تھا۔ اس گھر اور کمرے اور اس گھر میں رہنے والے لوگوں کی خستہ حالی کے باوجود اس کمرے میں فرنیچر کے نام پر بہت ساری چیزیں تھیں۔ جو مرمت ہو جاتیں تو اینٹیک کہلاتیں اور فرنیچر کے ان ہی آئٹمز میں وہ قد آدم

شیشہ بھی تھا جو پہلے کبھی کسی ڈریسنگ ٹیبل کے ساتھ منسلک تھا مگر اب اس کے بغیر ہی اس دیوار پر لگایا گیا تھا جس کے سامنے اس وقت مومنہ سلطان کھڑی انگلیوں میں ایک سگریٹ لیے اس کے کش لگاتی اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے جیسے آئینے سے باتیں کر رہی تھی۔

''آئینہ مجھ سے محبت کرتا ہے...... میں تم سے اور تم کسی اور سے...... تینوں پاگل ہیں اور تینوں خالی ہاتھ رہیں گے۔''

وہ آخری جملے پر ہذیانی انداز میں قہقہہ مار کر ہنستی پھر کھانستی۔ اس کی آنکھوں میں اب پانی تھا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ آئینے میں خود کو دیکھ کر انگلیوں میں دبے سگریٹ کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔

''اس سگریٹ کو تمہارے ہونٹوں نے چھوا ہے۔ اب تک جل رہا ہے۔ ایسی ہی ایک آگ لگائی میں بھی جل رہی ہوں۔

وہ جیسے آئینے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہی تھی۔

''اسے تو میں بجھا سکتی ہوں مگر میں اور یہ آئینہ ہم جل سکتے ہیں۔ بجھ نہیں سکتے...... آگ ہو سکتے ہیں راکھ نہیں۔''

اس نے جلتے ہوئے سگریٹ کو اپنی ہتھیلی پر بجھایا۔ آئینے میں نظر آنے والے اس کے عکس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی اس کا سیل فون بجنے لگا تھا ہاتھ میں پکڑا سگریٹ کوڑے کی ایک ٹوکری میں پھینکتے ہوئے اس نے فون اٹھالیا اس پر داؤد کا نام چمک رہا تھا۔

''مومنہ ساڑھے بارہ بجے ہے آڈیشن۔ تم آ رہی ہو نا۔ دیکھو دیر مت کرنا۔'' دوسری طرف داؤد تھا۔

''ہاں...... ہاں...... میں آ رہی ہوں...... بس تھوڑی دیر میں نکل رہی ہوں۔'' داؤد نے اس کی بات سننے سے پہلے ہی فون بند کر دیا۔ وہ جلدی میں تھا اور ہمیشہ ہی جلدی میں رہتا تھا۔

''مومنہ! ناشتہ تو کر لو بیٹھ کر۔'' وہ ابھی فون اپنے بیگ میں رکھ رہی تھی جب ثریا ایک ٹرے میں چائے کا ایک کپ اور دو سلائس رکھے آئی۔ وہ کچھ کہے بغیر ناشتہ کرنے بیٹھ گئی۔ ثریا چند لمحے وہیں کھڑی رہی پھر اس نے کہا۔

''ریہرسل کر لی نا؟''

''ہاں!'' چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے مومنہ نے کہا۔

''مجھے سنا دو ایک بار۔'' ثریا کو تجسس ہوا۔

''نہیں اماں......! بس اب آڈیشن میں ہی بولوں گی یہ لائنز۔'' اس نے سلائس کا ایک اور ٹکڑا دانتوں سے کاٹ کر چائے سے نگلتے ہوئے کہا۔

''میں تمہارے کپڑے پریس کرتی ہوں۔'' ثریا دروازے کی طرف لپکی جب مومنہ کی آواز نے اس کے پیروں میں بیڑی ڈالی۔

''میں یہ کام نہیں کرنا چاہتی۔'' ثریا نے پلٹ کر مومنہ کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی بے چارگی کو دیکھا پھر مدھم آواز میں کہا۔

''کیوں کہتی ہو ہر بار یہ جملہ مومنہ! جب جانتی ہو کہ یہ کام چھوڑ بھی نہیں سکتیں۔''

''اپنے آپ کو یاد دہانی کرواتی ہوں اور تو کچھ نہیں۔'' اس نے سلائس کا آخری ٹکڑا نگلا یوں جیسے جلدی میں ہو۔

''جہانگیر سے مل لوں پھر ابا سے میک اپ کروانا ہے۔''

اس نے کہا اور دروازے میں کھڑی ثریا کے پاس سے گزر گئی جو اس کے کپڑے لیے وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔

اپنی کلائی میں گھڑی باندھتے ہوئے وہ اپنے گھر کے دو کمروں میں سے دوسرے کمرے میں داخل ہوئی۔

جہاں جہانگیر اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے قدموں کی چاپ پر اس نے آنکھیں کھول دیں اور مسکرایا۔ وہ بھی ہولے سے مسکرائی۔

''طبیعت کیسی ہے تمہاری؟'' وہ اس کے سوال پر بے اختیار ہنسا اور بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''آپا! پھر وہی سوال...... میں ٹھیک ہوں۔''

''مجھے پتا ہے، ایک دن بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

جہانگیر نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''مجھے یہ بھی پتا ہے۔''

''آڈیشن کے لیے جا رہی ہوں...... تم دعا کرنا۔'' اس نے جہانگیر سے کہا۔

''قلب مومن کی فلم کے لیے آڈیشن کے لیے جا رہی ہیں نا؟'' جہانگیر نے بے حد اشتیاق سے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس کا ذہن کہیں گم تھا۔ ''میں نے رات کو نیوز میں دیکھا تھا۔ اس کی فلم کو پھر ایوارڈ ملا ہے۔'' جہانگیر بڑے جوش و خروش سے اسے بتانے لگا تھا۔

''آپ کو پتا ہے ہیٹ ٹرک کر لی ہے اس نے بیسٹ فلم اور ڈائریکٹر کی...... تین فلمیں بنائی ہیں اور تینوں کے ایوارڈز جیتے ہیں۔ انڈسٹری کا پہلا ڈائریکٹر ہے جس نے یہ کارنامہ کیا ہے۔''

جہانگیر رکے بغیر اسے بتاتا چلا گیا تھا۔ وہ صرف اس کا چہرہ دیکھے چلی گئی۔ وہ آج بھی انڈسٹری کی اس طرح خبر رکھتا تھا جیسے انڈسٹری کا حصہ ہو۔ اس بیماری میں گھر میں قید ہو جانے کے بعد اس کی واحد دلچسپی یہی رہ گئی تھی...... ٹی وی پر شوبز کی خبریں اور فلمیں دیکھنا...... وہ کبھی کبھار اس کے لیے نیوز اسٹالز سے پرانے شوبز میگزینز لے آتی تو جہانگیر کے دل کی کلی کھل جاتی۔

''دعا کرنا جہانگیر!'' اس نے جہانگیر سے کہا۔ یہ جیسے اس کا معمول تھا۔ کسی بھی آڈیشن یا پروجیکٹ کی شوٹ شروع ہونے سے پہلے جہانگیر سے دعا کرنے کے لیے کہنا۔ اسے پتا نہیں کیوں اس کی دعا پر یقین تھا۔ شاید اس صبر اور برداشت کی وجہ سے جس سے وہ اپنی بیماری کاٹ رہا تھا۔

''فکر نہ کریں...... مل جائے گی آپ کو فلم...... اسٹار بنیں گی آپ...... بہت بڑی فلم اسٹار۔''

وہ جیسے اس کو خوش کرنے کی کوشش کر رہا تھا...... بہن کی جدوجہد سے وہ واقف تھا۔ شوبز کے لیے اس کی ناپسندیدگی سے بھی...... لیکن اپنے لیے دی جانے والی اس کی قربانی سے بھی۔

''ستارہ نہیں بننا مجھے...... ستارے تو ٹوٹ جاتے ہیں...... مجھے تو صرف تمہارا علاج کروا کر تمہارے ٹوٹتے ستارے کو بچانا ہے۔'' اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے مومنہ نے سوچا تھا۔

''میں باہر تک چھوڑنے آؤں۔'' جہانگیر نے اسے آفر کی۔

''بالکل نہیں۔ میں ابھی ابا کے پاس جا رہی ہوں میک اپ کروانے...... تمہیں بیٹھنا پڑے گا خواہ مخواہ ہی برآمدے میں...... وہاں گرمی ہے...... تم یہیں بیٹھو۔'' اس نے فوری طور پر اسے منع کیا تھا۔ پھر وہ اس کی سائیڈ ٹیبل پر جا کر اس کی میڈیسنز چیک کرتے ہوئے بولی۔

''کون کون سی میڈیسنز ختم ہو گئی ہیں تمہاری؟ میں آج لیتی آؤں گی۔''

جہانگیر نے اسے دو میڈیسنز کا بتایا۔ اسے اس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ اسے گھر میں ہر شخص کی دوا کا پتا تھا۔ باہر سے سلطان کی آواز آنے لگی تھی۔ وہ اسے آوازیں دے رہا تھا۔ وہ جہانگیر کے کمرے سے واپس اپنے کمرے میں گئی اور استری شدہ کپڑے پہن کر وہ برآمدے میں اس کرسی پر آ کر بیٹھ گئی جس پر بٹھا کر سلطان کسی کا بھی میک اپ کیا کرتا تھا۔

وہ پرانے زمانے کا ایک وینٹی باکس کھولے اس میں موجود چیزوں کو ادھر ادھر کرتے مومنہ کے انتظار میں

تھا۔ مومنہ کے کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے بے حد پروفیشنل انداز میں ایک کپڑے کو مومنہ کی گردن کے گرد ڈال دیا تھا۔ وینٹی باکس میں سے ایک فاؤنڈیشن نکال کر وہ اب بڑی پھرتی سے اس فاؤنڈیشن کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر گیلے اسپنج کے ساتھ اسے مومنہ کے چہرے پر لگا رہا تھا...... نقطوں کی شکل میں...... وہ میک اپ کرنے کا پرانا طریقہ تھا اور سلطان پرانے طریقوں سے ہٹنے پر تیار نہیں تھا۔ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے مومنہ خاموشی سے اس سے میک اپ کرواتے ہوئے وینٹی باکس کے ڈھکن پر لگی حسن جہاں کی ایک بے حد دلکش مسکراہٹ والی تصویر کو دیکھنے لگی جس پر کوئی بھی نظر ڈالتا تو اسے ایسا ہی لگتا جیسے وہ اسے ہی دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

وہ اب اسے ہی دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس پر نظریں جمائے مومنہ دل ہی دل میں گھڑی کی سوئیاں گن رہی تھی۔

''ابا! ذرا جلدی...... مجھے بس پکڑنی ہے۔'' مومنہ نے بالآخر سلطان سے کہہ ہی دیا۔ سلطان کے ہاتھ پہلے سے تیزی سے کام کرنے لگے تھے اور وہ ساتھ کہنے لگا۔

''ہاں...... ہاں...... بس ہو جائے گا پانچ منٹ میں سب...... حسن جہاں کو بھی پانچ منٹ میں تیار کرتا تھا میں...... اسے بھی جلدی ہوتی تھی ہر کام کی...... ایسی مکھن جیسی دودھیا ملائم اسکن تھی اس کی...... پاؤڈر بھی پھسلتا تھا۔ میرے علاوہ کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھی وہ چہرے کو...... میرے ہاتھ کے علاوہ کسی پر اعتبار نہیں تھا اسے۔''

مومنہ، حسن جہاں کا تذکرہ سننے کی عادی تھی اور صرف وہ ہی نہیں اس گھر کا ہر شخص اور سلطان کا ہر دوست اور ملنے والا۔

وہ حسن جہاں کا میک اپ آرٹسٹ رہ چکا تھا۔ دن میں کوئی وقت ایسا نہیں گزرتا تھا جب اس کو کسی نہ کسی حوالے سے حسن جہاں کی یاد نہ آتی ہو۔

وینٹی باکس کے ڈھکن پر لگی اس کی مسکراتی تصویر دیکھتے ہوئے مومنہ اس کے قصے باپ کی زبان سے سن رہی تھی اور وہ سب اتنی بار سنا ہوا تھا کہ وہ باپ کا اگلا جملہ بھی دہرا سکتی تھی۔

''یہ لو...... ہو گیا کام...... اب بس لپ اسٹک رہ گئی۔'' سلطان گہرا سانس لیتے ہوئے سیدھا ہوا اور اس نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

''ابا لپ اسٹک میں خود لگاتی ہوں۔'' مومنہ نے باپ کو روکنے کی کوشش کی۔ سلطان نے اسے ٹوک دیا اور وینٹی باکس میں سے اس کے لیے لپ اسٹک ڈھونڈنے کے لیے ہاتھ مارنے لگا۔

''لپ اسٹک لگانا ہی تو اصل آرٹ ہے۔ کیمرہ کے سامنے بری اور اناڑی کے ہاتھ سے لگی ہوئی لپ اسٹک کی وجہ سے بڑے بڑے خوب صورت چہرے بُرے لگتے ہیں۔''

وہ اس کے ہونٹوں پر برش سے لپ اسٹک لگا رہا تھا اور ساتھ اس سے کہہ رہا تھا اور وہ اپنا پاؤں ہلانے لگی تھی اسے واقعی ہی جلدی تھی۔

''یہ لو...... دیکھو ٹھیک ہے نا۔'' سلطان نے بالآخر اس سے کہا۔ اس نے آئینے میں خود پر ایک نظر ڈالتے ہوئے فوری طور پر اٹھتے ہوئے کہا۔

''بالکل ٹھیک ہے ابا۔'' سلطان پرانے زمانے کا میک اپ آرٹسٹ تھا لیکن مومنہ کو اس کے ہاتھ پر یقین تھا۔ وہ جب بھی سلطان سے میک اپ کروا کر جاتی تھی...... اسکرین پر اس کا چہرہ بے حد اچھا آتا تھا۔ سلطان اپنے کام کا ماہر تھا۔ اپنے زمانے میں فلم انڈسٹری میں اس کا طوطی بولتا تھا۔

''وہ کل جہانگیر کا ڈائیلسس ہے...... تمہارے سیریل کی پے منٹ کب آئے گی۔'' ثریا یک دم اندر کمرے سے برآمدے میں آئی تھی اور اس نے مومنہ کو یاد دہانی کروائی تھی۔

''آج جاؤں گی آڈیشن کے بعد پے منٹ کے چیک کے لیے...... جونیئر آرٹسٹ ہوں...... خود کہاں آئے گی میری پے منٹ۔'' وہ بڑبڑائی تھی۔

''بس آپ لوگ دعا کریں...... یہ فلم مل جائے کسی طرح۔'' اس نے اپنا پرس اٹھاتے ہوئے ثریا اور سلطان دونوں سے کہا۔

''میں نے تیار کیا ہے...... تم دیکھنا کیمرے کے سامنے حسن جہاں لگے گی...... یوں رول دیں گے یوں۔'' گھر سے نکلتے ہوئے اس نے اپنے عقب میں سلطان کو بے حد گمان سے ثریا سے کہتے سنا۔ وہ باپ سے یہ نہیں کہہ سکی کہ اب کوئی بھی حسن جہاں کو نہیں جانتا نہ پہچانتا ہے...... اور میک اپ دیکھ کر اگر رول دیے جاتے تو...

اسٹاپ پر کھڑی بس پر بیٹھتے ہوئے بھی اس نے یہی سوچا تھا۔

''ابا کو لگتا ہے ان کا وینٹی باکس مجھے حسن جہاں بنا دے گا...... ابا کو پتا ہی نہیں ان کے وینٹی باکس کی ساری ایکسپائر ہو چکی ہیں یا دو نمبر ہیں۔ اب تو وہ برانڈ بھی بند ہو چکا ہے جو برانڈ حسن جہاں کا پسندیدہ تھا۔'' اس نے کھڑکی سے باہر سڑک پر بھاگتی ٹریفک کو دیکھتے ہوئے تلخی سے سوچا۔ یہ ساری باتیں وہ صرف سوچ سکتی تھی کہہ نہیں سکتی تھی۔

''ابا ہر بار مجھے حسن جہاں بنا کر دنیا میں بھیجتے ہیں اور میں پھر مومنہ سلطان بن کر رہ جاتی ہوں۔'' اس نے سوچا۔

☆☆☆

آفس کی ریسپشن میں تقریباً پچیس لڑکیاں تھیں۔ مومنہ ان میں سے چند چہروں کو فوراً پہچان گئی۔ وہ چند ابھرتی ہوئی ماڈلز تھیں اور چند دوسری ایکٹریسز جنہوں نے حال ہی میں ایک آدھ سیریل میں مین لیڈ کی تھی۔ تمام پچیس کی پچیس اس ریسپشن ایریا میں بیٹھی کچھ نہ کیے اور کیے ہوئے بھی بے حد گلیمرس اور اسٹائلش لگ رہی تھیں۔ ان میں سے کچھ اپنے اپنے سیل فون پر مصروف آس پاس بیٹھی لڑکیوں کو اگنور کر رہی تھیں۔ کچھ جو ایک دوسرے سے واقف تھیں۔ وہ آپس میں بیٹھی اور کھڑی گپ شپ کر رہی تھیں۔ چند ایک ہاتھ میں پکڑے اسکرپٹ پر نظر ڈال رہی تھیں اور چند ایک ریسپشن ایریا میں موجود دوسری لڑکیوں کو گھورنے اور جانچنے میں مصروف تھیں۔ سادہ جینز اور کرتوں سے لے کر فارمل پینٹس اور کرتے تک اور کچھ اسکرٹس بھی...... لانگ شارٹ دونوں قسم کے...... صرف چند ایک تھیں جو شلوار قمیص میں ملبوس تھیں اور مومنہ ان میں واحد تھی جس کے گلے میں دوپٹہ بھی لٹک رہا تھا...... باقی کوئی اگر شلوار قمیص میں ملبوس تھی بھی تو بغیر آستین قمیص میں ٹخنوں سے بہت اونچے اور گھٹنوں سے تھوڑا ہی نیچے والی کیپری میں۔

مومنہ کے لیے وہ مجمع نیا نہیں تھا...... نہ وہ وہاں پریشانی کا شکار ہوئی، نہ کم تری کا...... وہ ایسے ہی لوگوں کے ساتھ میڈیا میں کام کر رہی تھی اور ان سب کے رویوں سے بخوبی واقف تھی۔ مگر وہاں بیٹھے اسے یہ یقین نہیں تھا کہ اس مجمع میں وہ اپنی جگہ بنائے گی یا نہیں مگر اس وقت اس آڈیشن کے لیے وہاں بیٹھے ہوئے اس کے سر پر جہانگیر کا کل کا ڈائیلسس سوار تھا۔

اس کی وہ میڈیکل فائل جو گھر سے نکلتے ہوئے ثریا نے اس کے ہاتھ میں دی تھی کیونکہ ڈاکٹر نے کچھ دوائیاں تبدیل کروائی تھیں اپنے پچھلے چیک اپ میں...... جس میں مومنہ شوٹنگ کی وجہ سے نہیں جا سکی تھی۔ وہ نئی دوائیاں مہنگی ہونے کی وجہ سے سلطان اس وقت خرید کر شروع نہیں کروا سکا تھا۔ جہانگیر کے میڈیکل اخراجات اسی طرح بڑھتے جاتے تھے اور اس کے اچانک آنے والے اخراجات مومنہ کے سارے مالیاتی تخمینوں اور اندازوں کو ملیا میٹ کر دیتے تھے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہر مہینے کسی نہ کسی سے قرض لینے پر مجبور ہو جاتے۔

وہ اس وقت بھی اسی میڈیکل فائل کو کھولے ان اخراجات کا حساب لگانے میں مصروف تھی جو اس کا رائلٹی

چیک نہ ملنے پر اسے پھر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کرنے والے تھے۔
وہ فائل کو اس طرح کھولے اس میں سر گھسائے بیٹھی تھی کہ دائیں بائیں بیٹھی لڑکیاں اس فائل کے اندر مو
نتھوں کو نہ دیکھ سکیں مگر جس وقت وہ بالآخر اس سارے حساب کتاب سے گہرا سانس لیتے ہوئے فارغ ہوئی اور ا
نے فائل بند کرتے ہوئے اپنا سر سیدھا کیا تو اس کے برابر میں بیٹھی لڑکی نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
''یو آر سو فوکسڈ' جب سے آئی ہیں بس اسکرپٹ میں سر دیے بیٹھی ہیں مجھے تو ابھی تک لائنز بھی ٹھیک
نہیں'' اس لڑکی نے مسکراتے ہوئے دوستانہ انداز میں اس سے کہا۔ وہ بھی جواباً دوستانہ انداز میں مسکرا دی
اسے اچانک آڈیشن اور اسکرپٹ دوبارہ یاد آیا۔
وہ لڑکی پہلی بار کسی ایکٹنگ اسائنمنٹ کے لیے آڈیشن دینے آئی تھی اور نروس تھی۔ چند لمحے وہ مومنہ
گپ شپ کرتی رہی اور جب وہ خاموش ہو کر اپنے اسکرپٹ کی طرف متوجہ ہوئی تو مومنہ اٹھ کر ریسپشن
سے باہر نکل آئی۔ اس کی باری میں ابھی دیر تھی اور اسے بہت ضروری کال کرنی تھی۔
اسٹوڈیو کے داخلی دروازے کے سامنے ہی ٹہلتے ہوئے اس نے اپنے ایک ڈائریکٹر کو فون کیا۔
''مومنہ! ابھی تمہیں ہی فون کرنے والا تھا میں، ایک رول ہے...... کام نکالا ہے خاص طور پر تمہارے
میں نے سوپ میں۔''
سلیم بھائی نے چھوٹتے ہی اس کی آواز سنتے ہوئے کہا۔ مومنہ بے اختیار خوش ہوئی۔
''بڑی مہربانی سلیم بھائی...... کتنے دن کا کام ہے؟''
''دس دن کا۔'' ان کے اگلے جملے نے اسے مایوس کیا تھا۔
''کوئی بڑا رول دیتے مجھے سلیم بھائی اس بار تو۔''
''ہاں، ہاں اگلی بار بڑا رول بھی دوں گا...... کتنی بار تو سمجھایا ہے تمہیں کہ پروڈیوسر کے ساتھ گپ شپ
کرو...... اس کی پارٹی میں جاؤ...... دوستی بناؤ...... آنا جانا ہوگا تو رول بھی ملے گا اور رول بڑا بھی ہوتا جائے گا۔''
سلیم بھائی نے اسے فوری طور پر وہی مشورہ دیا تھا جو وہ ہمیشہ دیتے تھے۔ وہ مومنہ کے فن کے واقعی قدر دان
مگر کام وہ اسے زیادہ نہیں دے پاتے تھے اور نہ دینے کی وجوہات وہ ہمیشہ مومنہ کو بڑی صاف گوئی سے بتا دیتے
جنہیں وہ برا مانے بغیر سن لیا کرتی تھی کیونکہ وہ وجوہات وہ پہلے ہی جانتی تھی۔
''میرا چیک مل جائے گا سلیم بھائی آج؟'' اس نے سلیم بھائی کے مشوروں کے جواب میں عجلت کے عا
میں کہا۔
''آج تو مشکل ہے۔'' انہوں نے جواباً کہا۔
''کسی طرح کروا دیں سلیم بھائی...... جہانگیر کا ڈائیلسس ہے کل...... تھوڑی بہت رقم تو دلوا دیں مجھے۔''
اس نے کچھ منت بھرے انداز میں کہا تھا۔ وہ ان کا انکار سن کر واقعی پریشان ہو گئی تھی۔
''اچھا...... اچھا میں کرتا ہوں کچھ...... تم آرہی ہو؟'' سلیم بھائی کو جہانگیر کی بیماری کا پتا تھا اور وہ اس
ہمدردی رکھتے تھے۔
''ہاں دو تین گھنٹے تک۔'' اس سے پہلے کہ وہ ان سے کچھ اور کہتی اس نے اپنے عقب میں داؤد کی آواز
وہ خفا لگ رہا تھا۔
''حد ہے مومنہ میں کب سے ڈھونڈ رہا ہوں...... فون الگ سے بزی چل رہا ہے تمہارا۔'' داؤد اندر
باہر نکلا تھا۔ وہ مومنہ کا اسسٹنٹ تھا۔
''جی ٹھیک ہے سلیم بھائی...... خدا حافظ۔'' مومنہ نے فون بند کرتے ہی اس سے معذرت کرنا شر

کی۔ ''ایک ضروری کال تھی بس...... ختم ہوگئی میری باری آ گئی کیا؟''
''یار خاص طور پر لی ہے تمہاری باری...... اور تم غائب۔ اب آجاؤ جلدی ڈائیلاگز یاد ہیں نا؟''
وہ کہتے ہوئے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اندر چلا گیا۔ وہ بھی تیز قدموں سے اس کے پیچھے گئی تھی۔

☆☆☆

داؤد نے اس کے لیے اسٹوڈیو کا دروازہ کھولا اور وہ اندر داخل ہوگئی۔ پہلی نظر میں اندر داخل ہونے پر اسے
قلب مومن نظر نہیں آیا تھا جو اس وقت ایک ٹیبل پر ایک لیپ ٹاپ پر وہ فوٹیج دیکھ رہا تھا جو آڈیشن کے لیے شوٹ
ہو رہی تھی۔
''وہاں چلی جائیں۔'' اس کے ساتھ اندر آنے والے داؤد نے اسے اسٹوڈیو کے اس حصے کی طرف بھیجا جہاں
اسپاٹ لائٹس تھیں۔ مومنہ نے اس وقت ایک ٹیبل پر لیپ ٹاپ لیے بیٹھے مومن کو دیکھ لیا تھا مگر وہ اس کی طرف متوجہ
نہیں تھا۔ اس کی پوری توجہ اس کے اپنے لیپ ٹاپ کی اسکرین تھی۔ اس اسٹوڈیو میں عملہ کے چند لوگ بھی تھے۔ مانیٹر پر
بیٹھا ایک شخص اور کیمرہ کے پیچھے کھڑا ایک اور شخص۔
مومنہ رکے بغیر سیدھا اس جگہ پر جا کر کھڑی ہوگئی تھی جہاں ایک اسٹول پڑا تھا اور اسپاٹ لائٹ کی روشنی
پڑ رہی تھی اور جیسے ہی وہ وہاں جا کر کھڑی ہوئی تھی قلب مومن نے پہلی بار نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور لیپ ٹاپ کے
بجائے اس مانیٹر کی اسکرین کی طرف متوجہ ہوگیا جو اس ٹیبل پر ہی پڑا تھا۔
''یہ مومنہ سلطان ہیں۔'' داؤد نے قلب مومن کو جیسے اس کا تعارف دیا۔ وہ مومن کی میز پر جا کر بیٹھ چکا
تھا۔ ''ان کی شو ریل میں نے شیئر کی تھی آپ کے ساتھ۔''
اس نے مومن کو جیسے یاد دلایا۔ اسپاٹ لائٹس کی روشنی میں بہت دور نیم تاریکی میں میز کے دوسری طرف
بیٹھے قلب مومن کے چہرے کے تاثرات دیکھنا اس وقت مومنہ کے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اس وقت وہاں
کی روشنیوں میں کھڑی داؤد کو بھی ٹھیک سے نہیں دیکھ پا رہی تھی۔
''اپنے بارے میں کچھ بتائیں۔''
''گریجویشن کیا ہے۔ تین چار سال سے ایکٹنگ کر رہی ہوں'' مومنہ نے میکانکی انداز میں کہنا شروع کیا۔
''میں نے کبھی کسی فلم میں نہیں دیکھا آپ کو۔'' مومن نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔
''ٹی وی پر کام کرتی ہوں میں۔'' مومنہ کو اب اسے دیکھنا کچھ آسان لگنے لگا تھا۔
''کس سیریل میں لیڈ کیا ہے؟'' مومن کا اگلا سوال آیا۔
''لیڈ نہیں کیا...... کافی سوپس میں کام کیا ہے...... سیریل میں اب کر رہی ہوں۔'' مومنہ نے جواباً کہا۔
اس نے قلب مومن کو داؤد کی طرف مڑتے اور بے حد تند و تیز لہجے میں انگریزی میں کہتے سنا۔ یہ سوپس میں کام
کرتی ہے اور تم نے اسے میری مووی کے لیے بلایا ہے۔''
مومنہ کا رنگ سرخ ہوا مگر وہ اس سے نہیں داؤد سے مخاطب تھا اور داؤد نے کچھ کم زور سے لہجے میں اس کا
دفاع کرنے کی کوشش کی۔
''ایکٹریس بہت اچھی ہے۔ اس لیے میں نے سوچا آپ دیکھ لیں۔''
مومن داؤد کے جملے پر دوبارہ سیدھا ہو کر مومنہ سے مخاطب ہوا۔
''اسکرپٹ آپ کے پاس ہے؟'' اس نے کہا۔
''جی!'' مومنہ نے جواباً کہا۔
''پہلا سین پرفارم کر کے دکھائیں۔'' اگلی ہدایت آئی۔ مومنہ نے کسی توقف کے بغیر ہاتھ میں پکڑے

اسکرپٹ کو میڈیکل فائل کے اوپر رکھتے ہوئے کھولا۔ ایک نظر صفحے پر ڈالی پھر اسکرپٹ اور میڈیکل فائل کو اسٹینڈنگ اسٹول پر رکھنے کے بعد وہ آڈیشن کے لیے تیار ہو گئی تھی۔

سامنے لگے کیمرے میں دیکھتے ہوئے اس نے جھکے ہوئے سر کو اٹھایا اور کیمرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولنا شروع کیا۔

''میں جانتی ہوں تم مجھ سے نفرت کرتے ہو۔ محبت سے زیادہ گہرا، پرانا اور دائمی رشتہ ہے میرا اور تمہارا۔ کوئی چوائس بھی دے تو میں اپنا اور تمہارا رشتہ نہ بدلوں۔''

پہلا ڈائیلاگ بولتے ہوئے اس نے سینے پر پھیلا کر لیے ہوئے دوپٹے کو دوبارہ ٹھیک کیا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنا دوسرا ڈائیلاگ بولنا شروع کرتی۔ اس نے قلب مومن کو کہتے سنا۔

''دوپٹہ اتار دیں اپنا۔'' وہ چند لمحوں کے لیے ساکت ہوئی پھر اس نے کہا۔

''جی؟''

''سین خراب کر رہا ہے یہ۔'' قلب مومن نے جواباً مانیٹر پر ہی اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ فوٹو جینک تھی یہ دیکھ چکا تھا۔

''میں باندھ لیتی ہوں۔'' اس نے مومنہ کو جواباً کہتے سنا اور اس نے کچھ خفگی کے عالم میں مانیٹر سے نظر ہٹا کر سیدھا اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اتار دینے میں کیا اعتراض ہے آپ کو؟''

''میں کمفرٹیبل نہیں ہوں گی سین میں۔'' مومنہ نے کہا تو قلب مومن بے اختیار ہنسا۔

''میری فلم میں کوئی دوپٹہ نہیں لیتا اور آپ دوپٹہ اتار دینے سے سین نہیں کروا پائیں گی...... تم نے رول بتایا ہے اسے؟'' اس نے پہلا جملہ مومنہ سے اور آخری داؤد سے بولا تھا۔

''اوہ! وہ میری اتنی ڈیٹیل میں بات نہیں ہوئی بس آڈیشن والے سینز دیے تھے۔ بریف بھی تھا اس کی'' داؤد نے اتنے ڈائریکٹ سوال پر کچھ گڑبڑا کر کہا تھا۔ داؤد کے بجائے مومنہ نے اس کے سوال کا جواب دیا تھا۔

''ہیروئن کی بیسٹ فرینڈ کا رول ہے جو اپنی دوست کے منگیتر کو چھیننا چاہتی ہے۔'' قلب مومن نے اس آواز پر گردن موڑ کر سیدھا اس کو دیکھا اور پھر بے حد تیکھی آواز اور لہجے میں اس سے کہا۔

''ویمپ کا رول ہے جو ایک مرد کو پانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔ وہ پارٹیز میں جاتی ہے، ناچتی گاتی ہے، بوائے فرینڈز کے ساتھ پھرتی ہے۔ آئٹم نمبرز بھی کرتی ہے تو کیا دوپٹہ اتارے بغیر یہ سب تم کر سکو گی؟''

وہ سیدھا آپ سے تم پر آیا تھا اور اس کے انداز میں تنفر تھا اور انداز چیلنج کرنے والا۔ مومنہ اور وہ چند لمحے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے پھر مومنہ نے بڑی خاموشی کے ساتھ اپنا دوپٹہ اتار کر اسی اسٹول پر رکھ دیا جہاں اس نے وہ اسکرپٹ اور میڈیکل فائل رکھی تھی اور پھر دوبارہ اسی جگہ آ کر کھڑی ہو گئی جہاں وہ پہلے کھڑی تھی۔

ایک بار پھر مومن اور وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے تھے۔

پھر مومنہ نے اپنا اگلا ڈائیلاگ بولنا شروع کر دیا تھا۔

''تم احمر زیاد! تم مجھ سے میری عزت کیا چھینو گے۔ عزت میری جوتی کی نوک پر اور ذلت سے بڑھ کر کبھی کوئی چیز راس آئی کہیں۔'' قلب مومن کو لمحہ بھر کے لیے یوں لگا جیسے وہ اس سے ڈائریکٹ مخاطب تھی۔ اس کے اگلے ڈائیلاگ سے پہلے ہی اس نے تیزی سے داؤد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یہ ایکٹنگ کر سکتی ہے...... لیکن میرا ایشو گلیمر ہے اور مجھے یقین نہیں کہ یہ گلیمرس لگے گی جو اس رول کو ایسا لگا ہے۔''

''میرا خیال ہے وہ سنبھال لے گی ابھی تو یہ شلوار قمیص میں ہے اس لیے لگ رہا ہے کہ شاید گلیمرس نہیں لگے گی۔'' داؤد نے اس سے کہا۔

''ہاٹ پینٹس اور بکنی میں بھی مجھے لگتا ہے یہ ایسی ہی لگے گی۔'' قلب مومن نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا تھا اور مومنہ نے اس کی بات سن لی تھی۔

''میں یہ کپڑے تو نہیں پہن سکتی لیکن میں یہ یقین دلاتی ہوں کہ میں بہت اچھی پرفارمنس......'' مومن نے اس کا جملہ بیچ میں ہی کاٹ دیا تھا۔

''میڈم! میں آرٹ فلم نہیں بنا رہا۔ کمرشل فلم بنا رہا ہوں اور میرے ایکٹرز مجھے یہ نہیں بتاتے کہ وہ کیا پہنیں گے اور کیا نہیں...... یہ میں انہیں بتاتا ہوں۔'' اس نے بے حد ہتک آمیز لہجے میں اس بار اسے مخاطب کیا تھا۔ پھر انگریزی میں کہا۔

''تمہارے پاس وہ چیز ہی نہیں ہے جو فلم اسٹار بننے کے لیے چاہیے ہوتی ہے۔''

قلب مومن نے اپنی اسی بے باکی کا مظاہرہ کیا تھا جس کے لیے وہ مشہور تھا اور مومنہ چند لمحوں کے لیے بول نہیں سکی تھی۔

''نیکسٹ آرٹسٹ۔'' وہ اب داؤد سے کہہ رہا تھا یہ جیسے مومنہ کے لیے جانے کا اشارہ تھا۔

سرخ دھواں ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ مومنہ نے اپنا دوپٹہ اور بیگ اٹھایا اور کسی کی طرف دیکھے بغیر وہ برق رفتاری سے اسٹوڈیو سے نکل آئی تھی۔ باہر ریسپشن میں بیٹھی لڑکیوں نے اس کے چہرے کے تاثرات سے جیسے اسے پڑھنے کی کوشش کی تھی اور انہیں زیادہ جدوجہد کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

اسٹوڈیو سے باہر سڑک پر چلتے ہوئے بھی اس کے کانوں میں قلب مومن کے جملے گونج رہے تھے۔

''چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیے تھا تمہیں مومنہ سلطان...... یا شاید شرم سے ڈوب مرنے کے لیے چلو بھر پانی بھی زیادہ ہے۔ تم آخر گئی کیوں تھیں اس کے پاس۔'' اس کے اندر جیسے کوئی بول رہا تھا۔

''ضرورت نے مجبور کیا تھا۔ ضرورت بڑی بے شرم چیز ہے۔''

اس نے اپنی توجیہہ پیش کی اور اس کے اندر کی آواز گونگی ہو گئی یوں جیسے اس نے اس کی توجیہہ مان لی تھی اور تب ہی یک دم مومنہ کو یاد آیا کہ وہ اسکرپٹ کے ساتھ ساتھ جہانگیر کی میڈیکل فائل بھی اندر اسٹوڈیو میں آڈیشن والی جگہ پر اسٹول پر ہی چھوڑ آئی تھی۔ اسے جیسے کرنٹ لگا تھا۔

وہ آدھ کلومیٹر چلتے ہوئے وہاں سے دور آ گئی تھی اور مین روڈ پر چڑھنے والی تھی اور اب اسے پھر واپس پیدل [illegible] کرنا تھا اور اب بھی قلب مومن کے اسٹوڈیو کی طرف ریسپشن میں موجود لڑکیوں نے اسے ایک بار پھر وہاں پا کر بڑی حیرانی سے دیکھا تھا مومنہ نے کھڑے کھڑے داؤد کو فون کیا۔ کسی نے کال ریسیو نہیں کی۔ ریسپشنسٹ موجود نہیں تھی اور وہ انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ ایک لمحہ جھجکنے کے بعد وہ اسٹوڈیو کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی تھی۔

اسپاٹ لائٹس والی جگہ پر ایک بے حد ماڈرن خوب صورت اور اسٹائلش لڑکی بہت بولڈ کپڑوں میں ملبوس کھڑی تھی اور مومن اس کے بالمقابل کھڑا اس کے اسٹیپس میں کٹے ہوئے لمبے بالوں کو اس کے ایک کندھے سے دوسرے پر ڈالتے ہوئے اسے کچھ ہدایات دے رہا تھا وہ لڑکی جواباً مومن سے کہہ رہی تھی۔

''اچھا اس طرح بال جھٹک کر یہ ڈائیلاگ بولوں میں؟''

’’ہاں!‘‘ مومن نے جواباً اس سے کہا۔
’’میں نروس ہو رہی ہوں آپ کو اتنے قریب اتنے سامنے دیکھ کر۔ آئی لو یو۔‘‘

اس لڑکی نے مومن پر لائن مارنے کا یہ موقع بھی ضائع نہیں کیا تھا اور نہ مومن نے فلرٹ کرنے کا۔
’’آئی لو یو ٹو ہنی!‘‘
اور عین اس وقت مومنہ سلطان دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی اور وہ کہیں رکے بغیر سیدھا اس اسٹول کی طرف آئی تھی جس سے کچھ فاصلے پر مومن اور وہ لڑکی کھڑے تھے۔
’’ایکسکیوزمی میری ایک فائل رہ گئی تھی یہاں۔‘‘ مومن اس کی آواز پر جیسے کرنٹ کھا کر پلٹا تھا۔
’’تمہیں کوئی مینرز ہیں...... کس سے پوچھ کر آئی ہو اندر؟‘‘ اس کا پارہ پلک جھپکتے میں آسمان کو چھونے لگا تھا۔
’’سوری میری یہ فائل رہ گئی تھی یہاں، بس یہ لینے آئی ہوں۔‘‘ مومنہ تب تک اسٹول کے پاس پہنچ کر اپنی فائل اٹھا چکی تھی۔
’’اپنے آپ کو نوٹس کروانے کے لیے اپنی چیزیں چھوڑ کر جانا بڑا گھٹیا طریقہ ہے۔‘‘
قلب مومن نے پہلے سے زیادہ بدتمیزی سے کہا۔ مومنہ کچھ لمحوں کے لیے جیسے ساکت ہو گئی تھی۔ اسے غصہ نہیں آتا تھا وہ بے حد ٹھنڈے مزاج کی تھی مگر اس وقت قلب مومن کے اوپر اسے اتنا غصہ آیا تھا کہ اگر کوئی چیز اس کے ہاتھ میں ہوتی تو وہ بھی اسے دے مارتی۔
’’جو کچھ یہاں چل رہا ہے اس سے تو یہ بہت ہی کم گھٹیا ہے۔‘‘
اس نے جوابی جملہ اس کے منہ پر اسی کے انداز میں دے مارا تھا۔ مومن کو یقین نہیں آیا اس نے کیا سنا تھا اور ایسا ہی ری ایکشن اس لڑکی کا بھی تھا۔
’’گیٹ آؤٹ!‘‘ وہ تقریباً چلایا تھا۔
’’چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں یہ فائل لینے آئی تھی یہ فائل لے کر جا رہی ہوں۔‘‘ وہ کہتے ہوئے اس کے پاس سے گزری تھی جب اس نے اسے بازو سے پکڑ کر روکا تھا۔
’’اگر یہ سب چیپ تھا تو تم آئی کیوں تھیں یہاں یہ سب کرنے...... اتنی ستی ساوتری ہو تو گھر بیٹھنا چاہیے تھا تمہیں...... رول کی بھیک مانگنے نہیں آنا چاہیے تھا۔‘‘
وہ کہتا گیا تھا اور مومنہ اس سے بازو چھڑانے میں ناکام ہونے پر مزید مشتعل ہوئی تھی اور اس بار اس نے مومن کو پوری قوت سے پیچھے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے گیا۔
’’کام لینے آئی تھی عزت بیچنے نہیں...... بکنی منی اسکرٹ میں عورت کا جسم دکھا کر تم جو آرٹ کی خدمت کر رہے ہو اس کا حصہ نہیں بننا مجھے...... پہلے پتا ہوتا تو شکل بھی نہ دیکھتی تمہاری...... تمہارا کام چیپ ہے تم اس سے زیادہ چیپ۔‘‘
وہ کہہ کر بجلی کی تیزی سے اس کے آفس سے باہر نکل گئی تھی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

بکرا منڈی

نفیسہ سعید

عید میں چند دن باقی رہ گئے تھے اور پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اب تک قربانی کا جانور نہ آیا تھا ورنہ عام طور پر جاوید بھائی پندرہ سے بیس دن پہلے ہی گائے لے آتے تھے کیونکہ زریاب جانور سے بے حد محبت کرتا اور اسے گھما پھرا کر خوب خوش ہوا کرتا لہٰذا اکلوتے بیٹے کی یہ خوشی جاوید بھائی کو بھی خوش کر دیتی۔ جب کہ اس سال تو ان کا ارادہ گائے کے ساتھ ساتھ ایک بکرا لینے کا بھی تھا۔
ثنا جب سے اس گھر میں بیاہ کر آئی تھی اس



نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ عید سے دس دن پہلے گائے آجاتی جو جاذب اور جاوید بھائی مل کر لیتے۔ جس میں امی اور مرحوم اباجی کے علاوہ ان دونوں بھائیوں کا اپنی بیویوں سمیت حصہ ہوتا جبکہ ایک حصہ ہمیشہ اللہ کی راہ میں قربان کردیا جاتا اور پھر گائے قربان ہوتے ہی گوشت کی تقسیم کا مرحلہ آتا جسے امی ناپ تول کر تین برابر حصوں میں تقسیم کرلیتیں۔ ایک حصہ اسی وقت گھر کے باہر موجود ان غرباء کو دے دیا جاتا جو آج کے دن گوشت اکٹھا کرنے اپنے گھروں سے نکلے ہوتے۔ وہ بھی پھٹے پرانے لباس میں، جنہیں دیکھ کر افسوس ہوتا کہ غریب کی واقعی کوئی عید نہیں ہوتی۔

امی کی عادت تھی سب کو تقریباً اتنا گوشت ضرور دیتیں جس سے ایک وقت کا سالن تیار ہوسکے۔ دوسرا حصہ جو عزیز رشتہ داروں کا ہوتا، اس میں سے جاذبہ آپا اور ان کے سسرال حصہ بھیج کر امی اپنے غریب عزیز و اقارب کو بھی یاد رکھتیں، نہ صرف اپنے بلکہ ثنا اور بھابھی کے رشتہ دار بھی ہمیشہ سے اس لسٹ میں شامل رہے اور اس کے بعد جو گوشت بچ جاتا، وہ عید کے تیسرے دن قریبی رشتہ دار جن میں ثنا اور مائرہ بھابھی کے گھر والے شامل ہوتے، ان کی دعوت میں کام آتا۔

تیسرا حصہ پھر سے دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ بھابھی کو دے دیا جاتا جس سے وہ بھی مطمئن نہ ہوتیں اور ہمیشہ انہیں یہ شکایت رہتی کہ اتنے سال شادی کو ہوگئے، آج تک وہ قربانی کا گوشت اپنی مرضی سے تقسیم نہ کرسکیں۔

یہی وجہ تھی جو اس سال جاوید بھائی نے اپنی طرف سے ایک علیحدہ بکرا لانے کا عندیہ بھی ظاہر کردیا اور بنا پوچھے امی جان گئیں کہ اس خواہش کے پس پردہ کون سے حقائق ہیں مگر چونکہ وہ گائے کے لیے آدھی رقم پہلے ہی دے چکے تھے لہٰذا امی نے کسی بھی قسم کی حجت سے گریز کیا۔ اب انتظار تھا گھر میں آنے والی گائے اور بکرے کا، جو بھابھی کی ایک نظر عنایت کے منتظر ابھی تک منڈی میں ہی کہیں تھے۔

وجہ صرف اتنی تھی کہ اس دفعہ جانور کی خریداری کے لیے بھابھی نے بذات خود جاوید اور جاذب کے ساتھ منڈی جانا تھا۔ جس کے لیے جاذب تو بالکل بھی راضی نہ تھا۔ بقول اس کے منڈی خالص مردوں کی جگہ تھی جہاں عورتوں کے جانے کا کوئی جواز نہ تھا جبکہ بھابھی کا کہنا یہ تھا کہ اب وقت اور حالات بہت بدل گئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی منڈی میں کافی تبدیلی آچکی ہے، جس کی زندہ مثال وہاں عارضی طور پر بنائے جانے والے ڈھابہ نما ہوٹل ہیں جہاں فیملیاں بیٹھ کر انجوائے کرتیں جو جانور کی خریداری کے لیے منڈی جایا کرتیں۔ جن میں صرف مرد نہ ہوتے بلکہ خواتین بھی شامل تھیں۔

یہی وجہ تھی جو انہوں نے جاوید بھائی کے ساتھ اپنا بکرا خریدنے جانے کا ارادہ کیا' جبکہ ثنا کو اس قسم کی تفریح خود بھی پسند نہ تھی، اس لیے اسے اس بات سے کوئی سروکار نہ تھا کہ بھابھی منڈی جاتیں یا نہ جاتیں۔

☆☆☆

اب مائرہ بھابھی کے ہاتھ ایک نئی تفریح آگئی۔ وہ روز شام کو خوب بن ٹھن کر جاوید بھائی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتیں۔ دونوں بچے بھی ساتھ ہوتے اور منڈی کی راہ لیتیں۔ روزانہ کی اس تفریح میں جانور تو اب تک کوئی نہ خریدا گیا تھا البتہ جاوید بھائی کی جیب ضرور ہلکی ہورہی تھی کیونکہ بھابھی نے رات کا کھانا بنانا بالکل ترک کردیا تھا اور شام سات بجے کی نکلی وہ رات گئے گھر میں گھستیں اور اگلے دن ثنا کو چٹخارے لے لے کر تفصیل بتاتیں۔

''منڈی کی مٹن کڑھائی کھا کر دیکھو، یقین جانو کسی بھی اچھے ہوٹل کی کڑاہی بھول جاؤ گی اور روٹیاں تو یہ گرم گرم اور سائز میں اتنی بڑی کہ کھا کر مزا آجائے۔'' انہیں تو وہاں کھائی گئی توا کلیجی بھی کبھی نہ بھولی تھی اور ایک دن تو وہ قیمہ بھرے پراٹھوں کی شان میں جو قصیدہ گو ہوئیں تو ثنا کو بھی ٹوکنا پڑا۔

''بھابھی! آپ وہاں ڈنر کرنے جاتی ہیں یا جانور خریدنے؟''

ثنا کی طرف سے آنے والا یہ جملہ بھابھی کو گویا جلتے توے پر بٹھا گیا۔ فوراً سے پیشتر انہوں نے آنکھیں نکالتے ہوئے ثنا کو دیکھا اور پھر اگلے ہی پل مسکرادیں۔

انہیں پاکستانی سیاستدانوں کی طرح یہ کمال بھی حاصل تھا کہ اپنے اوپر چڑھے خول کو کبھی چٹخنے نہ دیتیں۔ وہ خول جو انہوں نے مروت و انکساری کا اپنے اوپر چڑھایا ہوا تھا لہٰذا نہایت پیار بھرے لہجہ میں گویا ہوئیں۔

''اے لو، اب بندہ جانور ڈھونڈ ڈھونڈ کر جب تھک جائے گا تو بھلا کہیں بیٹھ کر کھانا بھی نہیں کھاسکتا؟''

''لیکن بھابھی! عید میں تو صرف تین دن رہ گئے۔ اب یہ جانور کب آئیں گے؟''

''آجائیں گے وہاں کون سا منڈیاں خالی ہوگئی ہیں۔'' تلخ لہجہ کے ساتھ بھابھی ابھی بھی مسکرارہی تھیں۔

''لوگ تو ویسے بھی چاندرات والے دن ہی لے کر آتے ہیں تاکہ زیادہ گندگی نہ ہو۔'' ثنا کو جواب دیتی بھابھی کچن میں گھس گئیں، جس کا مطلب تھا کہ اب وہ مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتیں اور ثنا ان کی ایسی تمام عادتوں کو سمجھ چکی تھی۔

☆☆☆

بھابھی تو شاید تہیہ کیے بیٹھی تھیں کہ جانور چاند رات کو ہی آئے گا مگر اس رات وہ سب ہوگیا جس نے جاوید بھائی اور جاذب کی مشکل کو حل کرتے ہوئے جانور کی خریداری سہل بنادی۔

ہوا یوں کہ بھابھی سے بات کر کے ثنا نیچے آگئی کیوں یہ وقت ان کے منڈی جانے کا تھا۔

تھوڑی دیر بعد سیڑھیوں سے آتی باتوں کی آواز خاموش ہوئی اور ساتھ ہی جاوید بھائی کی گاڑی کے بجنے والے مخصوص ہارن سے وہ سمجھ گئی کہ بھابھی پھر منڈی کے لیے نکل گئی ہیں، جس کا اندازہ اسے امی کی بڑبڑاہٹ سن کر بھی ہوچکا تھا۔

وہ امی کو کھانا دے کر خاموشی سے اپنے کمرے کا ٹی وی آن کر کے بیڈ پر جا بیٹھی۔ پہلے ایک ڈرامہ دیکھا پھر یوں ہی چینل تبدیل کرنے لگی جب نظر ایک خبر پر پڑی۔

بریکنگ نیوز منڈی میں ہونے والی بھگدڑ کے متعلق تھی، جو ایک گائے کے رسی تڑوا کر فرار ہونے کے سبب پیدا ہوئی۔ ثنا نے دیکھا بہت سی عورتیں اور بچے یہاں وہاں بھاگ رہے تھے۔ غرض ہر طرف ایک افراتفری کا عالم تھا، جب بے اختیار ہی اس کی نظر اسکرین پر عالم بدحواسی میں بھاگتی بھابھی پر پڑی۔

''امی...... امی......'' بھابھی کو دیکھتے ہی ثنا نے

نعرہ امی بلند کیا جواس کی آواز سنتے ہی ہانپتی کانپتی کمرے میں دوڑی چلی آئیں۔

''اے بیٹا! ایسا کیا ہو گیا جو تم حلق کے بل چلا رہی ہو؟''

''امی! وہ دیکھیں، منڈی میں ایک گائے نے کتنی تباہی پھیلائی ہے۔'' امی نے دیکھا' بات کرتے سے ثنا رو دینے کو تھی۔

''ہاں مگر تم کیوں اتنی پریشان ہو؟'' بات کرتے کرتے امی کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔

''اے لو، وہاں تو ہماری بہو بھی میاں بچوں سمیت گئی تھی۔ اب ذرا فون کر کے معلوم تو کرو، گائے ان پر تو نہیں چڑھ دوڑی یا پھر پھیلائی گئی تباہی میں ہماری بہو بیگم کا ہاتھ تو شامل نہیں۔'' امی کا غصہ ابھی بھی عروج پر تھا۔

''میں فون کر رہی ہوں مگر دونوں میں سے کوئی میرا فون ریسیو نہیں کر رہا۔''

امی کو جواب دیتے ہوئے ثنا نے جاذب کا نمبر بھی ملا لیا جو اس کی آواز سنتے ہی کہنے لگا۔

''میں جاوید بھائی کے ساتھ ہاسپٹل میں ہوں۔ گائے کی ٹکر سے بھابھی زخمی ہو گئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بازو بھی فریکچر ہو گیا ہے ایکسرے رپورٹ آ جائے تو ساری بات واضح ہوتے ہی علاج شروع ہو جائے گا۔ تم پریشان مت ہو اور ہاں، امی کو بھی بتا دینا۔''

''جی اچھا......'' آہستہ سے کہہ کر ثنا نے فون بند کر دیا اور پھر ساری بات امی کو بتا دی جو یہ سب سنتے ہی غصے سے لال ہو گئیں۔

''ایسے کاموں کا نتیجہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اب بتاؤ بھلا مردوں کے ہر کام میں عورت کی دخل اندازی اور مرد وہ سب کر رہا ہے جو پہلے صرف عورتوں کے کام سمجھے جاتے تھے۔ یہ نئی قیامت کی نشانی ہے اس مائرہ کو اب کون سمجھائے کہ تم کوئی بچی ہو جو روزانہ منہ اٹھائے منڈی نکل جاتی ہو۔ یہ چونچلے تو بچوں کو بھلے لگتے ہیں، بچوں کی ماں کو نہیں۔ اب دیکھو ذرا دو دن بعد عید ہے، گھر کے کام۔ ایسے میں بازو کا فریکچر، کیسے نیا لباس پہن کر عید منائے گی۔'' آخر میں امی کا لہجہ تبدیل ہو گیا جہاں اب غصے کی جگہ پریشانی نے لے لی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ مائرہ بھابھی عید پر کتنے شوق سے تیار ہوتی ہیں مگر اب کچھ نہ ہو سکتا تھا۔

بازو کے فریکچر نے جہاں بھابھی کی عید خراب کی وہاں جاذب کی ایک بڑی مشکل آسان کر دی۔ وہ اگلے دن ہی گائے کے ساتھ ساتھ جاوید بھائی کا بکرا بھی خرید لایا اور پھر ثنا کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

''دیکھ لو، اللہ تعالیٰ انسان کی مشکل اس طرح آسان کرتا ہے۔'' جاذب کا اشارہ یقیناً بڑی بھابھی کی جانب تھا جو ثنا کو بالکل پسند نہ آیا۔

''بری بات ہے جاذب! کسی کی تکلیف پر یوں خوش نہیں ہوتے۔''

''سوری یار! میں خوش نہیں ہو رہا لیکن تم خود سوچو اگر گائے ہمارا ساتھ دیتے ہوئے بھابھی پر نہ چڑھ دوڑتی تو کیا ہم آج یہ جانور خرید سکتے تھے، ہرگز نہیں۔ یقین جانو پھر یہ گائے عید کی صبح ہی ہمارے گھر آتی۔''

جاذب کی بات سن کر ثنا بھی مسکرا دی، جو بھی تھا اس گائے نے اس خاندان کے لیے بہت سی آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔ اب جاذب کو قوی امید تھی کہ آئندہ بھابھی کبھی بھی ان کے ساتھ بکرا منڈی جانے کی ضد نہ کریں گی۔ سچ تو یہ ہے کہ جس کا کام اسی کو ساجھے بشرطیکہ ہم سمجھ سکیں لیکن بازو پر پلاسٹر چڑھائے، پرانے کپڑوں میں عید مناتی بھابھی ضرور سمجھ گئی تھیں جن کی زبان سے بار بار نکلنے والا یہ جملہ یقیناً ان کے دلی جذبات کی عکاسی کے لیے کافی تھا۔ ''پتا نہیں کون بے وقوف عورتیں ہوتی ہیں جو منڈی جاتی ہیں۔ میری توبہ جو اب کبھی جاؤں۔''

☆

ثمینہ فرحان

بحرِ بیکراں ہے زندگی

''اچھا اپنا موڈ تو ٹھیک کرو...... کتنے دن رہے گا...... چلا ہی جائے گا نا آخر تمہارا کزن۔''

''آہ پتا نہیں۔'' وہ جوس کے خالی گلاس میں پڑی اسٹرا کو انگلی سے ہلاتی رہی۔

''کیا مطلب پتا نہیں؟'' وہ پورا اس کی طرف گھوم گیا۔

''بھئی مجھے کیا پتا...... اپنی ہاؤس جاب تو مکمل کر چکا ہے ملتان سے اب جناح ہاسپٹل نجانے کون سی خاک چھاننے آرہا ہے۔'' اکتائے ہوئے لہجے میں کہہ کر وہ دوبارہ سوچوں میں گم ہوگئی۔

پہلے ہی ان کا کوئی اتنا بڑا گھر نہیں تھا تین کمرے اور ایک چھوٹا سا صحن اور ایک مزید چھوٹا لاؤنج جس کو لاؤنج کہنا تو شاید لاؤنج کی شان میں گستاخی ہوگی اس کے اور امی کے مشترکہ کمرے اور کچن کے سامنے کی بچی کھچی ـــ ہوئی جگہ جس کو نفیسہ بیگم نے امور خانہ داری کے سارے ہی اصولوں پر عمل کرتے ہوئے صوفہ ڈائننگ ٹیبل بمع استری اسٹینڈ اور سلائی مشین کے اس طرح سیٹ کیا تھا کہ آپ اس کو دھڑ سے لاؤنج کہہ کر لاؤنج کو اس کی اوقات یاد دلا سکتے ہیں۔ اوپر کا کمرہ اس کے دونوں بھائی شیئر کرتے تھے اور جناب گھر کا تیسرا اسٹور نما کمرہ جو صدیوں سے پرانے سامان کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کل کا پورا دن عبیرہ کا اس کی جھاڑ پونچھ کر کے

ناولٹ

اس کو ڈاکٹر صاحب کے شایان شان بنانے کی جدوجہد میں صرف ہوا۔ اور رات اسائنمنٹ کی نذر' تب بھی نہ ہی اسائنمنٹ مکمل ہوا' نہ کل کی تھکن اتری۔ جس کی وجہ سے آج اس کے مزاج میں چڑچڑاہٹ جھلک رہی تھی جبکہ شاویز کے بات بات پر دانت نکل رہے تھے۔

ہوگا کوئی کاروباری قسم کا فائدہ ...... اس نے شیشے کے پار بھاگتی دوڑتی ٹریفک کو دیکھتے ہوئے سوچا......!

یونیورسٹی کے اس مختصر سے عرصہ میں وہ اتنا تو جان ہی چکی تھی کہ شاویز اکرام اپنے بزنس کے مفاد کی کسی بات پر خوش ہوسکتا ہے البتہ چڑنے اور بھڑکنے کے لیے اس کے پاس اسباب واقعات کی



کمی نہیں ۔ اور اس کے ناقابل فہم قسم کے اعتراضات...... زیادہ تر عیرہ کی ذات سے ہی منسوب ہوتے تھے مثلاً تم نے فلانے سے کیوں بات کی ڈھماکے سے کیوں نوٹس لیے......تم اس سے دوستی ذرا کم کرو......تم اس سے بات نہ کیا کرو......

ہاں گونگی ہو جاؤں وہ جل کے سوچتی۔

اس کے علاوہ اسے عبیرہ کا بس اسٹاپ پر کھڑے ہو کر بس کا انتظار کرنا بھی ناگوار گزرتا......

کیا چاند پر جا کر کروں بس کا انتظار وہ دل ہی دل میں کھول جاتی۔ شاویز کا پیش کردہ حل یہ تھا کہ فوراً کسی رکشا یا ٹیکسی میں بیٹھ جایا کرو۔ (اور پیسے تو میرے ابا...... جواب اس دنیا میں نہیں ہیں وہ دیں گے نا......)

اور سب سے زیادہ دشمنی تو اسے اس علاقے سے تھی جہاں عبیرہ کا گھر تھا۔ یہ تیسرا موقع تھا جب وہ اسے گھر ڈراپ کر رہا تھا......اور عبیرہ کو پورا یقین تھا کہ صدر کے گنجان آباد رہائشی علاقے میں داخل ہوتے ہی وہ ضرور کہے گا ——————

کہ تم لوگ یہ علاقہ چھوڑ کے کسی اچھی جگہ شفٹ کیوں نہیں ہو جاتے تم لوگ اپنا گھر اور دکانیں بیچ کر کسی پوش علاقے میں گھر کیوں نہیں لے لیتے۔ وہ سوچوں کے تانے بانے بننے میں مصروف تھی کہ شاویز کی آواز نے اسے متوجہ کیا۔

''اچھا چلو وہ سناؤ...... وہ تم نے کیا نظم لکھی تھی۔'' وہ بھی شاید اس کی طویل خاموشی سے اکتا گیا تھا۔

''تمہاری برتھ ڈے پر سنائی تھی تمہیں' تب تو تمہارا اتنا موڈ آف تھا' ایسے تھوڑی یاد ہے مجھے...... پتا ہے بہت دل سے لکھی تھی میں نے......'' اب فقط چند لمحوں کا ہی سفر باقی رہ گیا تھا اس لیے اپنی چیزیں اور موبائل سنبھالتی ہوئی وہ بولی۔

''ظاہر ہے......'' اسٹیئرنگ کو بہت اسٹائل سے گھما کے گاڑی کا موڑ کاٹتے شاویز نے ایک جتاتی نگاہ اس پر ڈالی...... ''میرے لیے دل سے نہیں لکھو گی تو کیا وہ اپنے لاڑکانہ سے آنے والے پینڈو کزن کے لیے دل سے لکھو گی۔ خود پسندی کے زعم میں نجانے وہ کیا کہہ گیا......

''لاڑکانہ سے نہیں ملتان سے آ رہا ہے وہ'' اس نے اس کی تصیح کی......

''ملتان ہو یا لاڑکانہ ہو...... یا پنڈ دادن خان ہے تو چھوٹا شہر ہی نا......'' ایک جھٹکے سے گاڑی رکی ......''سنو عبیرہ ذرا سنبھل کے رہنا اپنے کزن سے'' گاڑی کے لاک پر اس کے ہاتھ جمے رہ گئے۔

''میرا مطلب ہے یہ جو چھوٹے شہروں کے رہنے والے ہوتے ہیں۔ یہ ذرا سے فری ہونے کا کچھ اور ہی مطلب لے لیتے ہیں۔'' اس کی تیز نگاہوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے اپنی بات واضح کر دی۔

''ہاں اور بڑے شہروں کے رہنے والے سب کچھ جانتے بوجھتے بھی انجان بنے رہتے ہیں۔'' بالکل سامنے دیکھتے ہوئے جتنا آہستہ سے اس کے ہونٹوں سے یہ الفاظ نکلے تھے اتنی ہی ہلکی انگلیوں کی جنبش سے لاک کھل چکا تھا۔

☆☆☆

لاؤنج کے سینٹرل ٹیبل پر رکھا سوہن حلوے کا ڈبا اور ملتانی کڑھائی کے سوٹ اس بات کا ثبوت تھے کہ سعد صاحب اپنے پینڈو ساز و سامان کے ساتھ تشریف لا چکے ہیں۔

''اب ان کا فیشن نہیں ہے امی۔'' آف وائٹ سوٹ پر ہلکے رنگوں سے کڑھے گلے کو دیکھتے ہوئے وہ بولی۔

''تم مت بتانا میری تو ٹیچرز بہت پسند کرتی ہیں اسکول میں پہننے کے کام آ جاتے ہیں ایسے کپڑے۔'' نفیسہ بیگم قریبی گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر تھیں اور ہر کپڑے کو اسی زاویے سے دیکھتی تھیں۔

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں' میں بنا لوں گی۔'' وہ دوسرا سوٹ کھول کر دیکھنے لگی۔ ''میں تو ویسے ہی کہہ رہی تھی آج کل لان کے پرنٹڈ کپڑوں کا فیشن ہے نا'' اس نے بات بنائی۔

''بیٹا ان کپڑوں کا فیشن کبھی ختم نہیں ہوتا ہمیشہ رہتا ہے۔'' انہوں نے اسے سمجھاتے ہوئے کپڑوں کو تہہ لگائی۔ ''اچھا انڈے ابلے رکھے ہیں ان کو چھیل کے کوفتوں میں ڈال دو اور سلاد بنا لو اور ٹیپو سے کہنا سعد کو کھانے کے لیے بلا لائے۔''

بہت بچپن میں دیکھا تھا سعد کو' جب وہ لوگ ابو کے ساتھ چھٹیوں میں ملتان گئے تھے۔ یہ بڑے سے صحن والا گھر جس میں بہت زیادہ دروازے تھے اور جس کی چھت سے دور دور تک پھیلے کھیت نظر آتے تھے......اور بہت زیادہ گرمی...... نجانے وہ جگہ اب کیسی ہو گی ...... کھیرے کی کاشوں کو پلیٹ میں سجاتے اس نے سوچا۔

کھانے کی میز پر ڈونگے اور پلیٹیں رکھتے اس کے سامنے بیٹھے شخص سے رسمی سی دعا سلام کے بعد اور کوئی بات نہ ہوئی پر کھانے کے دوران اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کے دونوں بھائی جو کل تک اسی کی طرح اپنے پھوپھی زاد کی آمد پر نالاں نظر آ رہے تھے فقط چند ہی گھنٹوں میں اس سے کافی گھل مل گئے ہیں......

ٹیپو نویں کلاس میں اور عمر' عبیرہ سے ایک سال چھوٹا انجینئرنگ کے تھرڈ ایئر میں تھا اور سعد کو بڑے مزے سے صرف نام سے مخاطب کر رہا تھا۔ اب کیا مجھے بھی صرف نام سے مخاطب کرنا ہو گا۔ کھانا کھاتے اس پر نئی الجھن سوار ہوئی۔

دوسرے دن وہ رات کے کھانے کے بعد امی کے لیے چائے اور سعد اور عمر کے لیے کافی بنا کر لائی تو سعد امی کا بلڈ پریشر چیک کر رہا تھا اس وقت وہ لوگ لاؤنج میں بیٹھے کوئی ٹاک شو دیکھ رہے تھے۔

''ایک تو لوگوں کو شو مارنے کا کتنا شوق ہوتا ہے اب اپنی ڈاکٹری کا رعب جھاڑیں گے محترم۔'' سامنے والے خالی صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے سوچا اور ٹیپو سے ریموٹ لے کر دوسرے چینلز چیک کرنے لگی۔

''کبھی کسی ڈاکٹر نے بتایا ممانی جان کہ آپ کا بلڈ پریشر بڑھا ہوا ہے۔''

اس نے سعد کو اسٹیتھسکوپ کو کانوں سے ہٹاتے ہوئے کہتے سنا۔

''ہاں بیٹا بتایا تھا دوائیاں بھی دی تھیں پورے دو مہینے کھائیں گولیاں پھر جب بلڈ پریشر ٹھیک ہو گیا تو چھوڑ دیں۔'' انہوں نے بتایا۔

''پھر آپ نے بتایا ڈاکٹر کو کہ آپ نے دوائیاں کھانا چھوڑ دی ہیں۔'' اس نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''نہیں...... ڈاکٹر کو تو نہیں بتایا...... بلڈ پریشر ٹھیک ہو گیا تو میں نے خود ہی چھوڑ دیں۔'' نفیسہ بیگم سادگی سے بولیں۔

وہ اور عمر بھی ان کے سوال و جواب کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

''ابھی تو میں آپ کو میڈیسن لا دیتا ہوں پر ایک دو دن میں آپ میرے ساتھ اسپتال چلیے گا کچھ ٹیسٹ وغیرہ کروانے ہیں......اور......'' وہ ان لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''ممانی جان کو بلڈ پریشر کی دوا باقاعدگی سے روزانہ لینی ہے اور دھیان رہے اس میں کوئی ناغہ نہ ہو۔''

''لیکن بیٹا...... مجھے کچھ محسوس تو نہیں ہوتا کہ بلڈ پریشر بڑھا ہوا ہے۔'' نفیسہ بیگم نے اپنی کیفیت کے بارے میں بتانا ضروری سمجھا۔

''ضروری نہیں کہ آپ کو کچھ محسوس ہو......'' وہ انہیں سمجھاتے ہوئے کہنے لگا۔

''لیکن صحت پر تو اثر انداز ہوتا ہے......اور بڑھا ہوا بلڈ پریشر کسی پیچیدگی کا باعث بھی بن سکتا ہے۔''

''یار ڈراؤ تو نہیں۔'' عمر فوراً بولا۔

''میں ڈرا نہیں رہا صرف باخبر کر رہا ہوں تاکہ ممانی جان باقاعدگی سے اپنی میڈیسن لیں۔'' اور پھر وہ عمر کے ساتھ جا کے دوائیاں بھی لے آیا اور اپنی نگرانی میں کھلائیں بھی۔

☆☆☆

کچن کے برتنوں سے فارغ ہو کر وہ لاؤنج میں آ کر ادھر ادھر کی بکھری چیزیں سمیٹ رہی تھی تب ہی اس کی نظر صوفے پر پڑے اسٹیتھسکوپ پڑی۔ اس کو بچپن میں کھیل کھیل میں ڈاکٹر بننے کا بہت شوق تھا...... نجانے ڈاکٹر یہ کانوں پر لگا کر بیماری کا کیسے پتا کر لیتے ہیں...... وہ سوچا کرتی...... اور شاید اپنی کسی معصوم خواہش کے تحت اس نے اسٹیتھسکوپ کانوں سے لگالیا...... اور جب انگلی سے ہلکا سا بجایا تو کانوں میں اک جہاں گونج اٹھا...... گردن جھکائے سی ابھی شاید وہ یہ تجربہ بار بار کرنا چاہتی تھی کہ اس کی نظر سامنے سے گزرتے قدموں پر پڑی...... سعد کچن کی طرف جا رہا تھا...... اس نے جھٹ کانوں پر سے اسٹیتھسکوپ نکال باہر کیا...... عجیب خفت سی محسوس ہوئی۔

''تمہیں یاد ہے عبیرہ ...... تمہیں بچپن میں ڈاکٹر بننے کا بہت شوق تھا۔ جب تم ملتان آتی تھیں تو تمہارے کھلونوں میں ایک پلاسٹک کا پنک کلر کا اسٹیتھسکوپ بھی تھا...... اور کھیل کھیل میں تم ہمیشہ ڈاکٹر بنتی تھیں...... کھانے کی میز پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی ڈالتا وہ اس سے مخاطب تھا۔

''مجھے یاد نہیں......'' اس سے بڑی مشکل سے کہا گیا...... اور اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ پانی پیتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہا ہے......

اور پتا نہیں ڈاکٹر کو دیکھ کے بیماریاں خود بخود کیوں نکل آتی ہیں یا شاید اس کی کالی زبان کا اثر ہو کہ اگلے ہی ہفتے ایک دن جب وہ یونیورسٹی سے گھر پہنچی تو ...... ٹیپو نے بتایا کہ امی کی طبیعت خراب ہے...... اور اب تو سر میں درد کی وجہ سے چکر بھی آ رہے ہیں۔

''امی آپ نے سعد کو فون کرنا تھا نا......'' وہ پریشان ہوتی ہوئی بولی۔

''میں نے سوچا سر میں درد ہے گولی کھانے سے ٹھیک ہو جائے گا...... پر درد تو بڑھے جا رہا ہے......'' ایک ہاتھ سے اپنا ماتھا دباتے ہوئے وہ درد کی شدت سے نڈھال ہو رہی تھیں۔

اس نے پھر خود ہی امی کے موبائل سے سعد کا نمبر ملایا اور پھر اسی کی ہدایت پر وہ اور ٹیپو امی کو ٹیکسی میں جناح ہاسپٹل لے آئے...... جہاں سعد ان کا ایمرجنسی کے باہر کھڑا پہلے سے انتظار کر رہا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے کی طبی امداد کے بعد کہیں جا کے نفیسہ بیگم کی طبیعت سنبھلی۔

''ممانی جان کا صرف بلڈ پریشر زیادہ ہو گیا تھا جو دوائیوں سے اب نارمل ہو چکا ہے۔ پریشانی یا خطرے کی کوئی بات نہیں۔'' وہ نفیسہ بیگم کو وہیل چیئر پر ساتھ لیے ان دونوں کو تسلیاں دے رہا تھا۔

کچھ ٹیسٹ مزید کروانے ہیں اگر آج ہی کرالیں گے تو ممانی جان چکر لگانے سے بچ جائیں گی...... بس ساتھ ہی دل کے امراض کا اسپتال ہے وہیں سے ہوں گے۔''

ہاسپٹل کے احاطے سے باہر نکلتے ہوئے سعد نے پرسوچ انداز میں کہتے نجانے امی سے مشورہ مانگا تھا یا صرف باخبر کیا تھا...... جو بھی تھا امی کی صحت کے حوالے سے سارے معمولات وہ اسی کے سپرد کر چکی تھی اور اب خاموشی سے ان کے ساتھ فٹ پاتھ پر چل رہی تھی ٹیپو بھی یوں امی کو ایمرجنسی لے کر آنے کی وجہ سے سہما ہوا سا تھا۔

چند سال پہلے ان کے والد کو اچانک ہونے والا ہارٹ اٹیک ان کی ناگہانی موت کا باعث بنا تھا۔ جب وہ فرسٹ ایئر پری میڈیکل کی طالبہ تھی اور ٹیپو شاید تیسری یا چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا...... اور یہ دردناک واقعہ آج بھی ان کے ذہنوں پر نقش تھا اسی لیے سعد کے بار بار سمجھانے اور تسلیاں دینے کے باوجود بھی ان کے چہروں سے پریشانی کے آثار ختم نہیں ہو رہے تھے۔

دل کے امراض کے اسپتال (NICVD) میں عمر بھی پہنچ چکا تھا۔ سارے ٹیسٹ وغیرہ سے فارغ ہو کر تقریباً رات آٹھ بجے تک ان لوگوں کی واپسی ہوئی......

اگلے دن اس نے امی کا خیال رکھنے کی خاطر یونیورسٹی سے چھٹی کر لی...... صبح نو بجے اس کے موبائل پر شاویز کی کال آ گئی۔ ''کل تم جناح ہاسپٹل کے باہر کیا کر رہی تھیں فٹ پاتھ پر۔''

وہ حیرت زدہ رہ گئی۔

''میں شام کو کوثر میڈیکوز سے ہوتا ہوا وہاں سے گزرا تھا...... تم پتا نہیں کس کے ساتھ چل رہی تھیں فٹ پاتھ پر۔''

''شاویز وہ میری امی تھیں جو وہیل چیئر پر تھیں'' اس کے لہجے کی ناگواری کو بڑی مشکل سے ضبط کرتے ہوئے اس نے تیزی سے کہا۔

''میں ان کی بات نہیں کر رہا میں اس شخص کی بات کر رہا ہوں جو تمہارے ساتھ چل رہا تھا...... ایک تو تمہارا بھائی تھا دوسرا کون تھا......؟''

''سعد تھا میرا کزن'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''مجھے بالکل نہیں اچھا لگا اس طرح تمہارا فٹ پاتھ پر چلنا...... جب امی کی طبیعت خراب تھی ٹیکسی میں لے کے جاتے ...... اور یہ جناح ہاسپٹل کون جاتا ہے تم کسی اچھی جگہ آغا خان وغیرہ لے کے جاتیں آنٹی کو اور اپنے بھائی کو بلاتیں۔''

''عمر بھی وہیں آ گیا تھا شاویز...... اور ہم ٹیکسی پر ہی گئے تھے اور ٹیکسی پر ہی آئے تھے بس سامنے این آئی سی وی ڈی سے کچھ ٹیسٹ کروانے تھے اس وجہ سے امی کو وہیل چیئر پر لے گئے تھے وہاں تک۔'' اس کا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا کہ آج بھی وہ اس کے اعتراضات کو دور کرے پر کچھ تو کہنا تھا......

☆☆☆

سکون کی دوائی کے زیر اثر امی وقفہ وقفہ سے سوتی رہیں۔ شام میں ان کی طبیعت ذرا بہتر ہوئی تو اس کی مدد کو کچن میں آ گئیں۔''

میں کہتی ہوں گڑیا! اتنی سبزیاں پڑی خراب ہو رہی ہیں فریج میں، تم ذرا مجھے نکال دو میں کاٹ دیتی ہوں...... تم مکس سبزی بنا لو اور روٹیاں ٹیپو سے

کہنا بازار سے لے آئے۔" اس نے سبزیاں دھو کر انہیں کاٹنے کے لیے دیں اور خود نذیراں نے صفائی کروانے اوپر آ گئی...... آج عمر بھی جلدی گھر آ گیا تھا...... ورنہ تو دوستوں کے ساتھ یونیورسٹی کے بعد مل کر پڑھنے کی وجہ سے اس کو آتے ہوئے پانچ تو ضرور بج جاتے تھے...... کام والی ماسی کو دھونے کے لیے کپڑے دے کر وہ جب دوبارہ کچن میں آئی تو کچن کی چھوٹی سی میز پر امی کے ساتھ ساتھ سعد بھی بیٹھا مٹر چھیل رہا تھا اور عمر کھڑا چائے بنا رہا تھا۔ بند گوبھی اور گاجریں کٹ چکی تھیں اب صرف مسالا بنانا تھا وہ فریج سے ٹماٹر نکال کر کاٹنے لگی۔

"میں تھوڑی دیر تک فاروق کی طرف جاؤں گا امی۔" مگوں میں چائے کو انڈیلتے ہوئے عمر نے انہیں مطلع کیا۔

"ٹھیک ہے بیٹا! پر کھانا کھا کر جانا۔" مٹر کے چھلکوں کو تھیلی میں ڈالتی ہوئی وہ بولیں۔ "بس ابھی پک جاتا ہے سالن۔"

"پک بھی جائے گا تو بھی میں نہیں کھا کر جاؤں گا کیونکہ ایک تو کھانا عبیرہ دی گریٹ بنا رہی ہیں تو ذائقہ تو پتا ہی ہے کیسا ہوگا اور مکس سبزی میں مجھے کوئی انٹرسٹ نہیں ہے' ہاں کڑھائی وڑاہی بنی ہوتی تو شاید ٹرائی کر لیتا۔" وہ مسکراتے ہوئے چائے کا مگ سعد کو پکڑاتے ہوئے بولا۔

"اور میں بھی یہ مکس سبزی نہیں کھاؤں گا۔" لاؤنج میں ہوم ورک کرتے ٹیپو نے بھی وہیں سے اعلان کیا۔

"دوپہر میں بھی آملیٹ کھایا تھا۔ دیکھ لیں امی! ان نوابوں کو...... اور مجھے کیا پڑی ہے جب کسی نے کھانا ہی نہیں تو میں کیوں پکاؤں۔" اس نے بھی غصہ میں کٹنگ بورڈ پر چھری پٹخی۔

"نہیں تم پکاؤ سعد بے چارہ تو مہمان ہے وہ تو مروت میں کھا لے گا اور ویسے بھی وہ تمہارے پوشیدہ گنوں کے بارے میں جانکاری نہیں رکھتا۔" عمر ان کے ساتھ تیسری کرسی پر بیٹھتا ہوا اسے سلگا گیا۔

"دیکھ رہی ہیں امی آپ! وہ احتجاجاً ماں کی طرف دیکھ کر غصہ سے بولی۔

"ارے بیٹا! تم پکاؤ تو سہی۔ اچھا پکے گا تو یہ لوگ خود ہی کھائیں گے......"

"اچھا پکے گا تب نا۔" چائے کا سپ لیتے ہوئے عمر نے مسکراتے ہوئے سعد کو دیکھا۔

"ہنہ! میں نہیں پکا رہی...... سالن بھی بازار سے ہی لے آنا۔" وہ یہ کہتی ہوئی کچن سے نکل کر صحن میں آ گئی۔ جہاں بادام کے درخت کے سائے تلے بچھے تخت پر جانے کب تک بیٹھی نذیراں کو کپڑے دھوتا دیکھتی رہی...... نجانے اور کتنی دیر غصہ میں بھری بیٹھی رہتی کہ اس کو خیال آیا کہ کہیں امی خود ہی نہ کھڑی ہو جائیں سالن بنانے...... اس کا خیال تھا کہ عمر تو اسے تنگ کر کے اپنے دوست کی طرف جا چکا ہوگا پر یہاں تو صورت حال یہ تھی کہ سعد کسی ماہر شیف کی طرح سبزیوں کو فرائی کر رہا تھا' دوسرے چولہے پہ نوڈلز ابل رہے تھے۔

"ٹیپو اپنی آپی سے پوچھ کر آؤ سویا سوس کہاں ہے۔" گردن ترچھی کر کے آنچ دھیمی کرتے ہوئے وہ ٹیپو سے کہہ رہا تھا جبکہ وہ شرمندہ سی دروازے پر ایستادہ تھی...... کچن ٹیبل پر ٹیپو کو ریاضی کے سوالات حل کراتے عمر نے اسے شرارتی نظروں سے دیکھا...... ٹیپو نے بھی گردن موڑ کے اسے دیکھا۔

"یہ ادھر ہی ہے سویا ساس۔" اس نے آگے بڑھ کے خود ہی کیبنٹ کھول کے سویا ساس نکالا۔" ابھی سعد اس کے ہاتھ سے شیشی لے ہی رہا تھا کہ عمر نے جلدی سے کھڑے ہو کر عبیرہ کے ہاتھ سے شیشی اچک لی۔

"یہ انگلی کٹا کے شہیدوں میں نام پیدا کرنے کی ناکام کوششیں نہ ہی کرو تو اچھا ہے...... اب کیوں آئی ہو جب کھانا بن گیا ہے پیچ منجدھار چھوڑ کے چلی گئی تھیں۔" وہ ایک ہاتھ کمر پر ٹکا کے لڑاکا عورتوں کی طرح لڑنے کے سے انداز میں بول رہا تھا۔ سعد نے بھی دلچسپی سے اس سین کو دیکھا۔

"خیر ابھی بھی ہمیں عبیرہ کی مدد درکار ہے' میرا کام تو ختم ہو گیا ہے اب سرو کرنا آپ کا کام ہے۔" صلح جو انداز میں کہتے ہوئے وہ اس کی شرمندہ سی شکل کو نظر انداز کر کے...... نوڈلز نتھارنے لگا۔

امی کے لیے سعد نے سگھڑ عورتوں کی طرح بغیر سویا ساس کے اور کم تیل کے نوڈلز الگ ہی رکھ دیے تھے اور سب کے ساتھ بیٹھی امی بھی خوش ہو کے کھا رہی تھیں' یہ اور بات ہے کہ وہ نوڈلز کو کانٹے کے بجائے چھوٹا چھوٹا کر کے چمچہ سے ہی کھا رہی تھیں۔

"تم بھی سعد سے کچھ سیکھ لو گڑیا۔" عمر اس کو چھیڑنے کے موڈ میں ہوتا تو جان کے اسے گڑیا کہتا...... اس کو پتا تھا کہ یہ پیار کا نام سعد کے سامنے اسے شرمندہ کرائے گا...... اس لیے اب دانت نکال رہا تھا۔

"تم خود کیوں نہیں سیکھ لیتے۔" دانت پیستے ہوئے وہ صرف اس قدر بولی......

"لو بھئی مجھے کیا ضرورت ہے۔" بھر بھر کر نوڈلز کو کانٹے میں سموتے ہوئے وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "علشبہ تو ویسے ہی کھانا پکانے میں اتنی ماہر ہے بھئی میری تو قسمت کھل گئی......"

"ایسے ہی نا ہر لڑکی کا نام اپنے ساتھ لے لیا کرو۔" امی نے اسے تنبیہہ کی۔

"امی میں ایسے نہیں میں تو ویسے ہی لے رہا ہوں۔" وہ کان کھجانے لگا۔

"وہ دراصل ایک دن علشبہ اپنے ہاتھ کے بنے شامی کباب لائی تھی...... اتنے لذیذ تھے کہ کیا بتاؤں آج تک زبان وہ ذائقہ نہ بھلا سکی۔" اس کی اوور ایکٹنگ پر عبیرہ نے ناگواری سے پہلو بدلا۔ "ایک ہماری بہن صاحبہ کھانا بناتی ہیں۔"

"امی اسے منع کر دیں۔" تنبیہی انداز میں وہ غصہ سے بولی۔

"کیا ہوا بیٹا...... !بھائی تو ایسے ہی بہنوں کو چھیڑتے ہیں...... اتنا غصہ نہیں کرتے بیٹا!" نفیسہ بیگم نے اسے نرمی سے سمجھایا۔

"تم نہیں چڑو تو وہ نہیں چھیڑے گا۔" سعد نے بھی پہلی مرتبہ اسے مخاطب کرتے ہوئے گفتگو میں حصہ لیا۔

"آپ کو پتا نہیں جب یہ پٹڑی سے اترتا ہے تو...... تو کس کس کھائی میں گرتا ہے' اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں اور یہ صرف بکے جاتا ہے بنا سوچے سمجھے۔" کتنی دیر کا ضبط کیا ہوا غصہ اب شعلوں کی صورت میں اس کے منہ سے نکل رہا تھا۔

"خیر عبیرہ چائے اور کافی تو اچھی بناتی ہے۔" سعد نے جیسے شعلوں پر پانی کے چھینٹے مارے۔

"ہاں کافی اور چائے تو اچھی بناتی ہے اور دال تو بہت ہی اچھی بناتی ہے۔ پتا ہے سعد' ایک دفعہ عبیرہ نے اپنی دوست کے گھر کھٹی دال کھائی' بس جناب ہماری بہن صاحبہ نے بھی طبع آزمائی کرنے کی ٹھان لی۔ بے چاری نے اتنی محنت سے دال پکائی لیکن جب ڈھکن اٹھایا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ماچس کی ڈبیا پوری تیلیوں سمیت دال کے دیگچے میں غوطہ زن ہے...... ہائے ہائے حیرت ان پٹاخوں پر ہے جو بن پھٹے پھُس ہو گئے۔" عمر نے لہک لہک کے آخر میں گایا...... تو سعد کے لیے اپنی ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔

"یہ تمہاری یا ٹیپو کی ہی شرارت ہو گی...... ورنہ مجھے کیا پڑی کہ اتنی محنت سے دال بنا کے اس میں ماچس ڈال دوں۔" وہ غصہ سے بولی۔

"کیا آپی...... آپ مجھے ایسا سمجھتی ہیں......!" ٹیپو نے اپنا نام لیے جانے پر دہائی دی۔

"اور چلیں دال میں تو ہم نے ماچس ڈال دی کیا کھیر میں بھی......"

"ارے ہاں......" عمر کو یاد آیا...... "امی یاد ہے...... وہ جو عبیرہ نے کتنے مزے کی کھیر بنائی تھی۔ بے چاری ہلکان ہو گئی چمچہ چلا چلا کے۔ بادام پستے سب ڈالے بس چینی ڈالنا بھول گئی......" سعد کو پانی پیتے اچھو لگ گیا۔ عبیرہ کی خوں خوار نظریں بھی اس کی ہنسی کو بریک نہیں لگا سکیں۔

اور اس رات کھانے کے بعد اس نے انتقاماً، کسی سے بھی چائے یا کافی کا نہیں پوچھا۔

☆☆☆

امی کی طبیعت سنبھلی تو زندگی بھی معمول کی پٹریوں پر دوڑنے لگی اور دو ڈھائی مہینوں بعد جب سعد پہلی مرتبہ ایک ہفتہ کی چھٹی پر ملتان گیا......تو وہ جو اس کی آمد پر طرح طرح کے اندیشوں کا شکار تھی' اسے اعتراف کرنا پڑا کہ سعد ان پر بوجھ نہیں بنا بلکہ اس نے ان کی کئی ذمہ داریاں اپنے سر لے لی تھیں۔ جیسے امی کا باقاعدگی سے اسپتال سے چیک اپ کرانا۔ ان کا بلڈ پریشر چیک کرنا......ٹیپو کی پڑھائی میں مدد کرنا......گھر کا سودا سلف لا دینا......امی تو اٹھتے بیٹھتے اسے دعائیں دیتیں۔

اس دن بھی جب بجلی گئی ہوئی تھی اور وہ سب صحن میں تھے امی سعد کے بارے میں بات کرتے ہوئے بولیں۔ ''بڑی محنت کی ہے بچے نے اللہ اسے اس کے مقصد میں کامیاب کرے۔'' اتنا تو اسے امی کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ سعد کسی اسپیشلائزیشن کے امتحان کے لیے رقم کا بندوبست کرنے ملتان گیا ہے اور امتحان بھی شاید اس نے کسی باہر کے ملک جا کر دینا تھا۔

''ویسے امی اسے ضرورت کیا تھی اسپیشلائزیشن کرنے کی ......ڈاکٹر تو بن ہی چکا تھا آرام سے نوکری کرتا رہتا۔'' امی سے باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ وہ صحن میں لگے پودوں کو بھی پانی دے رہی تھی۔

اندر لائٹ نہ ہونے کی وجہ سے' عمر بھی تخت کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھا بہت ساری کتابیں تخت پر پھیلائے ویسے تو پڑھائی کر رہا تھا لیکن سارا دھیان موبائل کی طرف تھا۔

''چلو اب تو ہو گیا ہے پیسوں کا بندوبست......تمہاری زینب پھوپھی بتا رہی تھیں کہ انہوں نے گھر کا ایک حصہ بیچ دیا ہے' اس کے باہر جانے کا انتظام ہو جائے گا ان شاء اللہ......'' انہوں نے اسے بتایا۔

''میں تو کہتا ہوں ان پیسوں سے سعد کو چاہیے کہ ایک گاڑی خرید لے۔ بے چارہ بسوں میں دھکے کھاتا پھرتا ہے......موٹر سائیکل تک نہیں لی کنجوس نے۔'' عمر نے اپنی رائے دی۔

''وہ بھی لے لے گا بہت ذمہ دار بچہ ہے۔'' تمہیں تو کبھی توفیق نہیں ہوئی کہ اپنی دکانوں کی کوئی خبر لو جا کر......غیر آدمی کو بٹھایا ہوا ہے......سعد ہر دوسرے دن چکر لگاتا ہے......سارا حساب کتاب دیکھتا ہے......اور یہ تم کیا بار بار موبائل پر لگ جاتے ہو ڈھنگ سے پڑھائی کرو......انہوں نے بیٹے کو ٹوکا۔

وہ آپ کا ذمہ دار لاڈلا پی ایس ایل کا میچ دیکھ رہا ہے......وہی بار بار میسج کر کے اسکور بتا رہا ہے......عمر نے انہیں مطلع کیا۔

''سعد تو مجھے کہہ رہا تھا......'' امی دوبارہ اسی ٹون میں شروع ہوئیں'' کہ پرچون کی دکان میں ایک ڈیپ فریزر لے کر ڈال دیں تو بہت فائدہ ہو گا......سوچتی ہوں اب کمیٹی نکلے تو ڈیپ فریزر لے لیں......؟ انہوں نے بیٹے سے مشورہ مانگا۔

''امی ایسی باتیں سعد ہی سوچ سکتا ہے۔ مجھے یہ آٹا دال چینی کے بزنس کو آگے بڑھانے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ میں انجینئر بن جاؤں گا تو سب سے پہلے ان دو دکانوں کا ہی سودا کروں گا۔''

ان ہی دکانوں کی کمائی سے تم انجینئر بن رہے ہو ورنہ میری تنخواہ سے کہاں پورا ہونا تھا......'' انہیں بیٹے کے خیالات پر افسوس ہوا۔

''سعد بھائی کہتے ہیں......کوئی بھی پیشہ چاہیے چھوٹا ہو یا بڑا' عزت والا ہوتا ہے......'' ٹیپو جو صحن کی سیڑھیوں میں بیٹھا......عیبرہ کے موبائل پر بڑے انہماک سے میچ دیکھ رہا تھا اس نے بھی اپنے قیمتی خیالات کا اظہار کیا۔

''اپنے سعد بھائی کے ساتھ ملتان ہی چلے جانا تھا نا' سعد بھائی کے چمچے......کراچی تو ویسے بھی برا کھیل رہا ہے......'' عمر نے اسے چھیڑا۔

''امی آپ دعا کریں کراچی جیت جائے......امی پلیز......!'' میچ کی شاید کوئی سنگین صورت حال تھی کہ ٹیپو منت سماجت پر اتر آیا تھا......

''مجھے تو تم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی......ارے پورا ملک ہمارا ہے کوئی سا بھی شہر جیتے......اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' انہوں نے جیسے ناک سے مکھی اڑائی۔

''امی آپ میں تو اسپورٹس مین اسپرٹ ہی نہیں ہے۔'' ٹیپو کو ماں کے خیالات پر افسوس ہوا۔

''تو تم ملتان چلے جاؤ نا......ملتان تو اچھا کھیل رہا ہے۔'' عمر نے پھر اسے چھیڑا۔

''امی......!'' عیبرہ کو بھی صحن دھوتے دھوتے اچانک خیال آیا۔'' وہ زینب پھپھو سے کہیے گا کہ وہ جو انہوں نے باداموں والا گڑ بھیجا تھا نا وہ اس دفعہ بھی بھیج دیں سعد کے ہاتھ۔''

''لو یہاں اتنا اہم ڈسکشن ہو رہا ہے اور اسے باداموں والے گڑ کی پڑی ہے۔'' عمر کہتے ہوئے دوبارہ موبائل پر متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

اگر بھانجا ممانی کا دم بھرتا نظر آتا تھا تو ممانی بھی دل و جان سے نثار تھیں' جس دن اس نے آنا تھا وہ اسکول سے آتے ہی تیاریوں میں لگ گئیں......کبھی مچھلی کو مسالا لگایا جا رہا ہے تو کبھی گاجر کا حلوہ بن رہا ہے......مگر صاحب زادے کے مزاج ہی نہ ملتے تھے۔

''ممانی جان بالکل بھوک نہیں ہے......صرف چائے پیوں گا......'' وہ کچن میں پھیلاوہ سمیٹتی ان لوگوں کی باتیں سن رہی تھی۔

پتا ہے ترس گیا تھا اس چائے کے لیے......'' اسے اپنے قریب سعد کی آواز سنائی دی۔

''کیوں' کیا وہاں چائے نہیں ملتی؟'' وہ کیتلی میں پانی بھرتی حیرت سے بولی۔

''نہیں امی بناتی ہیں چائے پر وہ چائے صرف پتی میں پکا دودھ ہوتا ہے۔'' تم بہت اچھی چائے بناتی ہو......''

''کراچی میں تو ایسی ہی چائے پی جاتی ہے۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

''ہنہ......'' وہ جیسے اپنے اتنے دل سے کی گئی تعریف کو اتنے عام سے انداز میں لینے پر چپ سا ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر رک کر واپس لاؤنج میں جب چلا گیا تو نجانے کیوں عیبرہ کو ایسا لگا کہ جیسے وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا۔

''یہ دیکھیں آپی! زینب پھپھو نے آپ کے لیے کتنا پیارا سوٹ بھیجا ہے۔'' وہ چائے لے کر آئی تو ٹیپو کے جوشیلے انداز پر سب ہی مسکرا اٹھے۔

''آپ نا بھی پہن لینا کل اپنی برتھ ڈے پر'' ٹیپو اکثر ہی اس کی بہن کی کمی پوری کر دیا کرتا تھا۔

''کیا مطلب......! تمہاری پھر برتھ ڈے آ گئی......ابھی پچھلے سال ہی تو تمہاری سالگرہ منائی تھی۔'' عمر بوکھلاتے ہوئے بولا تو اس نے ان سنی کرتے ہوئے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

''اچھا تم اپنی دوستوں کو تو نہیں بلاؤ گی نا......'' پہلا تیر ضائع ہوتے دیکھ کر اس نے دوسرا نشانہ لیا۔

''کیوں تمہیں کیا تکلیف ہے۔'' چائے پیتے ہوئے اس نے لاتعلقی سے کہا۔

''نہیں مجھے تو کوئی مسئلہ نہیں پر سعد کو ہارر موویز سے ڈر لگتا ہے۔'' وہ ہی ہی کر کے ہنسنے لگا۔

''عمر یار مت تنگ کیا کرو اسے اتنا......'' سعد نے اخبار کا رول بنا کے اسے ایک لگائی۔

''کل تو میں اور آپی مل کر پیزا بنائیں گے اور کیک بھی بیک کریں گے۔'' ٹیپو گھر کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو بھرپور انجوائے کیا کرتا۔

''کیا!'' عمر چیخا۔'' امی روک لیں اسے اتنے پیسوں کا نقصان کرے گی اور بناؤ گی کیسے......ہاں؟''

''میں نے یوٹیوب پر دیکھا ہے......بغیر اوون کے پیزا بن سکتا ہے اور کیک بھی۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

''لو اور سنو۔'' عمر نے اس کا مذاق اڑایا۔

ارے ڈاکٹر صاحب یہ تم کہاں جا رہے ہو۔'' آرام سے چائے تو پی لو۔'' سعد کو اٹھتا دیکھ کر وہ بولا۔

''میری ڈیوٹی شروع ہونے والی ہے۔'' وہ لاؤنج میں لگی گھڑی کو دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''ارے بھئی ذرا ڈاکٹری نقطہ نظر سے بتانا کہ بغیر دماغ کے لوگ...... بغیر اوون کے پیزا اور کیک بنا سکتے ہیں......؟'' عمر اس کا ہاتھ پکڑے نہایت سنجیدگی سے دریافت کر رہا تھا۔

''تم اپنی خیر مناؤ کہیں تم نہ کسی چیز کے بغیر رہ جاؤ'' عیرہ کے غضب ناک تاثرات کے پیش نظر وہ اسے خبردار کرتا ہوا اسٹرھیاں چڑھ گیا...... اور حالات کی سنگینی کو بھانپتے ہوئے عمر نے بھی منظر سے غائب ہونے میں ہی عافیت جانی۔

☆☆☆

صبح اپنے کمرے کے دروازے پر ٹیپو اور عمر کے برتھ ڈے کارڈز دیکھ کے اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ آج اس نے سوچا تھا کہ اپنی دوستوں کو کیفے ٹیریا میں ٹریٹ دے گی۔ پھوپھو کا بھیجا ہوا گہرے نیلے اور سرمئی امتزاج کا خوب صورت سا سوٹ پہنا تو ساری دوستوں نے دل کھول کر تعریف کی...... تعریف تو شاویز نے بھی کی لیکن اسے یہ بات اچھی نہ لگی کہ آج کے دن اس نے اپنے کزن کا لایا ہوا سوٹ پہنا ہے۔

''یہ تمہارا کزن تم میں کچھ زیادہ ہی انٹرسٹ نہیں لے رہا۔'' آج پہلی مرتبہ بہت ہمت کر کے شاویز کے بے حد اصرار پر وہ اس کے ساتھ لنچ پر پیزا ہٹ آئی تھی۔

''ویسے اب تو اس کو اپنا کوئی پرمستقل بندوبست کر لینا چاہیے۔'' مینیو کارڈ پر نظریں دوڑاتے بھی...... شاویز کے دماغ پر سعد ہی چھایا ہوا تھا۔

''شاویز یہ سوٹ پھوپھو نے بھیجا ہے، مجھے اچھا لگا تو میں نے پہن لیا...... اور ویسے بھی ہمیں آج کے دن اپنی باتیں کرنی چاہئیں ہم کیوں کسی اور کے بارے میں بات کریں۔'' وہ اب بیٹھی پچھتا رہی تھی کہ اس کو نہیں بتانا چاہیے تھا کہ یہ سوٹ سعد لے کر آیا ہے کیونکہ ہر تھوڑی دیر بعد شاویز کے طنزیہ دل جلانے والے فقروں کا مقابلہ کرنا اس کے لیے جان لیوا ثابت ہو رہا تھا۔

''تمہارے لیے آج کے دن پہننے کے لیے کچھ اور نہیں تھا تو مجھے کہہ دیتیں۔''

''اور امی کو کیا بتاتی کس نے دیا ہے یہ سوٹ؟'' اسے بھی غصہ آ گیا...... اس لیے کہتی ہوں ہمارے گھر والوں کو ہماری پسندیدگی کا علم ہو جانا چاہیے...... وہ ٹھہر کے بولی۔

''کچھ تو رشتے کی بات شروع ہو...... اگر تم اپنے گھر والوں کو ابھی نہیں لا سکتے تو...... کم از کم مجھے ہی اپنی امی اور بہنوں سے ملوا دو...... کچھ تو بڑوں کے علم میں بات آئے...... وہ دھیمی آواز میں اسے قائل کرنے لگی۔

''اور تمہارا خیال ہے میری بہنیں تم سے ملتے ہی تمہاری خوب صورتی پر فدا ہو جائیں گی تم آج کے زمانے کو 1960 سے کمپیئر (موازنہ) نہ کرو جب چاند سی بھابی ڈھونڈنا ہی بہنوں کا واحد مشن ہوتا تھا۔'' وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میں اگر صرف ایک کلاس فیلو کی حیثیت سے بھی تمہیں ملواؤں گا نا...... تو وہ سب سے پہلے یہ نوٹ کریں گی کہ تم نے کون سے برینڈ کا سوٹ پہنا ہوا ہے۔ کون سے ماڈل کا کتنی مالیت کا موبائل ہے تمہارے پاس...... کس گاڑی میں آئی ہو۔'' آئی ایم سوری عیرہ...... تمہیں میری صاف گوئی پر دکھ ہو گا لیکن

''تو کیا تین چار سال کے بعد میری حیثیت بدل جائے گی۔ اس کے حلق میں آنسوؤں کا گولہ اٹک گیا۔

''کم از کم میں تو مالی اعتبار سے اور مستحکم ہو جاؤں گا...... کوئی اسٹینڈ لینے کے قابل ہو سکوں گا...... پھر مجھے کسی کی پروا نہیں ہو گی...... گھر والے خود مجھ پر ڈیپینڈنٹ ہوں گے۔ ہمیں اچھی زندگی ایک ساتھ گزارنے کے لیے بہت پریکٹیکل ہو کر سوچنا پڑے گا۔ جذباتی ہو کر نہیں......''

''اس کا دل بجھ سا گیا تھا...... شاویز کے حقیقت پسندانہ دلائل بھی اس میں جان نہ ڈال سکے......''

☆☆☆

گھر آ کے بھی وہ...... لائٹ بند کر کے بستر پر گر کے آج کی ملاقات کے بارے میں ہی سوچتی رہی...... عیرہ کا گھرانہ بہت ایڈوانس قسم کا نہیں تھا...... ہاں نفیسہ بیگم اس بات کی ضرور قائل تھیں کہ لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر تعلیمی مواقع فراہم کرنے چاہئیں تاکہ وہ بہتر طور پر اپنی زندگی گزار سکیں لیکن اگر ان کو یہ علم ہوتا کہ ان کی لاڈلی بیٹی یونیورسٹی میں کسی لڑکے میں دلچسپی رکھتی ہے اور اس کے ساتھ ملاقاتیں بھی کی جاتی ہیں تو یقیناً انہیں تکلیف ہوتی امی کے علم میں لائے بغیر...... کسی غیر شخص سے روابط بڑھائے...... یہاں تک کہ آج اس کے ساتھ لنچ پر بھی چلی گئی...... یہ یقیناً غلط حرکت تھی بھی اللہ میاں نے اس کی جھولی میں دکھ ہی ڈالا۔ تمام وقت وہ کتنی بے چین اور مضطرب رہی، اس سے تو لاکھ درجہ بہتر تھا کہ وہ باقی سب دوستوں کے ساتھ شاویز کو بھی یونیورسٹی کیفے ٹیریا میں ہی ٹریٹ دے دیتی۔ کروٹیں بدلتے اس نے سوچا۔ اس کو یاد آیا کہ پچھلے سال رمضان میں جب اس نے قرآن پاک کو ترجمہ سے پڑھنا شروع کیا تو اسے پتا چلا کہ اس قسم کی پوشیدہ دوستی کے بارے میں اللہ میاں نے کتنی ممانعت فرمائی ہے۔

تب ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا تھا کہ اس کی کسی سے پوشیدہ دوستی نہیں ہے لیکن آج اس کے وجود پر عجیب سا بوجھ آ پڑا تھا۔

یونیورسٹی کے پہلے سال تک وہ اس کا نام تک نہ جانتی تھی...... پھر ایک دن پتا چلا کہ ان کی کلاس کے ایک لڑکے کے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ سب لوگ شاویز کے گھر بھی گئے باقی سب کلاس فیلوز کی طرح اس نے بھی رسماً اپنی خدمات کی پیشکش کرتے ہوئے شاویز کو اپنے نوٹس فوٹو کاپی کروا کر دینے بلکہ اس کے اسائنمنٹ میں بھی اس کی بھرپور مدد کی۔ بس اسی طرح کبھی لائبریری میں کبھی کلاس میں کیفے ٹیریا میں پڑھائی کے سلسلے میں ہی بات چیت ہوتی رہی...... شاویز جہاں اپنے والد کی وفات کی وجہ سے افسردہ تھا۔ وہاں اس پر سب سے بڑی اولاد ہونے کے ناتے اپنی فیملی کو سہارا دینے کے ساتھ ساتھ اپنے والد کے بزنس کو سنبھالنے کی بھی دہری ذمہ داری پڑ چکی تھی، ایسے میں عیرہ اسے حالات کا مقابلہ کرنے کی ہمت دلاتی، کڑے وقت میں اس کی حوصلہ افزائی کرتی۔ ایک ڈیڑھ سال کے عرصہ میں جہاں شاویز نے انتھک محنت سے اپنا نام منوایا۔ وہاں اس کی اور عیرہ کی دوستی بھی مستحکم ہو گئی۔ ایسی ہی باتیں سوچتی نجانے کب وہ نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔

اس کی مغرب کی نماز بھی قضا ہونے کو تھی جب اس کی آنکھ کھلی۔ وضو کر کے اس نے نماز ادا کی ٹیپو اپنی عادت سے مجبور اسے بتا گیا تھا کہ اس کے لیے سرپرائز ہے۔ گو کہ اس کا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا کہ دوبارہ صبح والا جوڑا پہنے کہ پہلے ہی اتنا افسانہ بن چکا تھا...... لیکن پھر امی کی خوشی کا سوچتے ہوئے اس نے کپڑے تبدیل کر کے بالوں میں برش کیا اور ہلکی سی تیاری کے ساتھ لاؤنج میں آ گئی جہاں اس کے بھائیوں نے اس کے لیے ایک چھوٹی سی برتھ ڈے کا انتظام کر رکھا تھا۔

''تو تم اسی لیے نہیں آئیں کہ تمہیں کام کرنا پڑے گا......'' کبابوں کے اطراف یہ سجائے گئے فرنچ فرائز کو منہ میں ڈالتے عمر نے اسے چھیڑا......

''آپ نے جیسے بہت کام کیا ہے...... صرف دو بلونز پھلائے ہیں آپی عمر بھائی نے...... باقی سب تو میں نے اور سعد بھائی نے سجایا ہے......'' لاؤنج کی دیوار پر ربن وغیرہ سے ہیپی برتھ ڈے لکھا ہوا تھا...... سب کی خوشی کی خاطر اس نے ابھی اپنے اوپر بار بار سوار ہونے والی اداسی کو بھگانے کی بڑی ہمت اور کوشش کی......

’’تم نے پیزا کا آرڈر کیسے دیا۔‘‘ عمر نے بڑا سا پیزے کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے سعد سے پوچھا...... ’’آج تو موبائل نیٹ ورک بند تھا۔‘‘

’’اتنا بھی موبائل کا محتاج نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ میاں نے دو ٹانگیں بھی دی ہیں۔‘‘ سعد نے بریانی پلیٹ میں نکالتے ہوئے اسے جتایا......

’’اچھا میں سمجھا تمہیں اللہ میاں نے چار ٹانگیں دی ہیں۔‘‘ عمر کہاں شرمندہ ہونے والوں میں سے تھا اس نے سعد کو بھی نہیں بخشا......

’’بس تم۔‘‘ سب کو اپنی طرح ہی سمجھتے ہونا...... سعد کے جوابی جملے پر سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی...... اسی طرح سب کے ساتھ ہنستے بولتے...... اس کے بوجھل دل کی اداسی کافی حد تک کم ہوگئی......

☆☆☆

اگلے دن اس نے شاویز سے کوئی بات نہیں کی بلکہ پورے ہفتہ اپنے آپ کو صرف رسمی بات چیت تک ہی محدود رکھا۔ اور اپنے دل میں بھی تہیہ کرلیا کہ اب بھی اس کے ساتھ یونیورسٹی سے باہر نہیں جائے گی پر شہر کے حالات کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ شاویز نے ہی اسے بتایا کہ صدر کے علاقے میں بم بلاسٹ ہوا ہے تو وہ اس کو ڈراپ کردے گا کیونکہ پبلک ٹرانسپورٹ مشکل سے ملے گی۔ وہ اس لیے کافی فکرمند دکھائی دے رہا تھا تو اس کا بھی دل نرم پڑ گیا۔ اس نے فون کرکے اپنی امی کو بتادیا اور ہمت کرکے یہ بھی بتادیا کہ وہ اپنے کسی کلاس فیلو کے ساتھ آرہی ہے...... بس آج سے میں نے سچ ہی بولنا ہے وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے سوچنے لگی۔

’’دیکھو عبیرہ اس دن غصہ میں...... میں کچھ زیادہ ہی بول گیا تھا......‘‘ اگر وہ اگلے ہی دن اس سے بات کرکے معافی مانگ لیتا‘ معاف تو وہ اسے تب بھی کردیتی...... شاویز کے شرمندہ سے رویے پر اس کا اتنے دنوں سے بھرا ہوا غبار جیسے نکل گیا۔

’’تمہیں پتا ہے عبیرہ......! میں سب سے زیادہ کس چیز سے ڈرتا ہوں۔‘‘ اس نے گاڑی قریبی جوس کارنر پر روکتے ہوئے ایک لمحے کو اس کی طرف دیکھا...... ’’غربت سے۔‘‘ تمہیں پتا ہے جب پاپا کو بزنس میں بہت بڑے نقصان کا سامنا کرنا پڑا اس وقت میں اسکول میں پڑھتا تھا...... ہم لوگوں نے بہت ٹف (مشکل) ٹائم گزارہ...... تمہیں نہیں معلوم تم بہت معصوم ہو لیکن...... مجھے پتا ہے...... یہ دنیا صرف پیسے کی ہے لوگ صرف چڑھتے سورج کو سلام کرتے ہیں۔‘‘

’’تو اب تو سب ٹھیک ہے حالات بہتر ہیں...... اب تم کیوں ڈرتے ہو......‘‘ اسے شاویز کے خیالات عجیب سے لگے۔

’’اس لیے کہ ایسی دولت کا کوئی فائدہ نہیں جو ایک جھٹکے میں ختم ہوجائے کیونکہ میں نے کڑوا وقت دیکھا ہے...... میں نے دیکھا ہے کہ برے وقت میں خاندان والے کیسے ساتھ چھوڑ جاتے ہیں...... کسی برتھ ڈے تک میں یہ مجھے اور میری بہنوں کو انوائٹ تک نہ کرتے تھے کیونکہ ہم مہنگے مہنگے تحفہ نہیں دے سکتے تھے...... وہ تین چار سال اک عرصہ میں کبھی بھلا نہیں پاؤں گا...... ہم لوگ مہینوں کسی ریسٹورنٹ کی شکل نہ دیکھتے تھے‘ میری بہنیں میکوڈونلڈز اور کے ایف سی کے لیے ترستی رہتی تھیں‘ میں اتنی دولت کمانا چاہتا ہوں کہ مطمئن ہوجاؤں‘ اتنا بزنس کو فروغ دینا چاہتا ہوں کہ اسے زوال کا خدشہ نہ رہے تاکہ ہم اپنی پسند کی آسائشوں اور سہولتوں سے آراستہ...... آسودہ زندگی ہمیشہ گزار سکیں۔

مجھے یہ کیڑے مکوڑوں کی طرح کفایت شعاری کرکے پیسے گن گن کے خرچ کرتے...... زندگی نہیں گزارنی وہ بولتا رہا۔

’’اب اللہ کا شکر ہے حالات بہت بہتر ہیں لیکن پھر بھی مجھے کچھ وقت دو...... دو تین سال کم از کم...... یہ دنیا ایک ریس ہے جو رکا وہ پچھلا گیا اور مجھے ابھی رکنا نہیں ہے۔ تم اپنے کزن ہی کو دیکھ لو...... کہاں ملتان سے آیا ہے یہاں...... اور اب انگلینڈ جانے کی تیاری میں ہے...... کس لیے! پیسے کے لیے......‘‘ سعد کے ذکر پر اس کو چپ لگ گئی...... اپنا موقف اس پر واضح کرکے اب وہ سکون سے گاڑی چلا رہا تھا...... آج گھر کے سامنے کا مین روڈ بند تھا اس لیے اس کو متبادل راستہ اختیار کرنا پڑا جو گھر کے پیچھے بنے بازار سے آتا تھا۔

’’بس اب میں چلی جاؤں گی یہاں سے...... پانچ منٹ کی واک ہے۔ ان کی اپنی بھی دو دکانیں تھیں اس بازار میں وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی دیکھے اس لیے کہتے ہوئے اتر گئی۔ یونہی غیر ارادی طور پر اس کی نظر اپنی دکان جو کہ جنرل اسٹور تھا اس کی طرف اٹھی کاؤنٹر پر کھڑا سعد کسی سے بات کرتے اس کی طرف دیکھ رہا تھا...... اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے بڑی مشکل سے گھر پہنچی...... پورے راستے اس پر گھبراہٹ سوار رہی...... حالانکہ وہ امی کو بتا بھی چکی تھی تب بھی سارا دن وہ ڈر اور خوف کی کیفیت میں مبتلا رہی۔

دوسرے دن وہ صحن میں تخت پر بیٹھی نوٹس بنارہی تھی کہ ٹیپو نے صحن میں آکر اسے پوچھا۔

’’آپی! آپ چائے پئیں گی......؟‘‘

’’کیوں تم بنارہے ہو۔‘‘ وہ رجسٹر پر نوٹس اتارتے ہوئے بولی۔

’’نہیں سعد بھائی بنارہے ہیں...... انہوں نے ہی آپ سے پوچھنے کو کہا ہے......‘‘ اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔

’’نہیں...... میں نے نہیں پینی......‘‘ پتا نہیں کیسے اس سے یہ الفاظ ادا ہوئے...... مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہوسکتا ہے اس نے صرف مجھے دیکھا ہو‘ شاویز کو دیکھا ہی نہ ہو اور کیا پتا وہ یہ سمجھا ہو کہ میری کسی فرینڈ کا بھائی ہے...... گھبراہٹ میں اس سے نہ ہی سوچا جارہا تھا‘ نہ کام ہورہا تھا...... وہ کتابیں سمیٹ کر کمرے میں جانے کو تھی جب اس نے سعد کو صحن میں داخل ہوتے دیکھا۔

’’بیٹھو عبیرہ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔‘‘ قریب پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے اسے دوبارہ تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

’’کل بازار میں جس لڑکے نے تمہیں ڈراپ کیا تھا...... تمہارا کوئی کلاس فیلو ہے۔‘‘ بغیر کسی تمہید کے وہ عام سے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

’’ہنہ...... کل پبلک ٹرانسپورٹ کا مسئلہ ہورہا تھا تو اس نے مجھے ڈراپ کیا تھا۔‘‘ اب بولے بغیر چارہ نہ تھا۔

’’ہنہ...... اگر کبھی ایسا ہو تو تم عمر کو یا مجھے فون کرسکتی ہو اور اگر کسی کے ساتھ ہی آنا ہو تو تم بازار میں اترنے کے بجائے گھر تک آرام سے آؤ بلکہ جس کے ساتھ بھی آؤ اسے آنٹی سے بھی ملواؤ تاکہ آنٹی کو بھی تسلی ہوجائے اور دوسرے بندے کو بھی پتا چلے کہ تم کسی سے چھپ نہیں رہیں۔

’’میں چھپ کر نہیں آئی...... امی کو بتادیا تھا فون کرکے...... آپ نے اگر ایک بار اسے دیکھ لیا تو نجانے کیا سمجھ رہے ہیں‘‘ اسے غصہ آگیا۔

’’میں نے کچھ نہیں سمجھا تب ہی تو پوچھ رہا ہوں......‘‘ سعد نے لہجے کو مزید دھیما رکھتے ہوئے کہا۔

’’تمہاری برتھ ڈے والے دن بھی میں نے اسے تمہارے ساتھ پیزا ہٹ میں دیکھا تھا۔‘‘ اس دفعہ تو وہ چپ کی چپ رہ گئی...... شرمندگی سے نظر تک نہ ملاسکی۔

’’میرا خیال ہے اگر وہ تمہارے بارے میں سنجیدہ ہے تو اس سے کہو کہ اپنے گھر والوں کو بھیجے تاکہ ممانی جان کے علم میں تمہاری پسند آئے...... اور لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع نہ ملے......‘‘ اس نے عبیرہ کو آرام سے سمجھایا۔

’’وہ شاویز ہے‘ میرا کلاس فیلو......! میں نے اس سے ایک دو دفعہ بات تو کی ہے......‘‘ اسے کہتے ہوئے حیا آئی...... ’’وہ کہتا ہے اسے ابھی دو تین سال اپنا بزنس اسٹیبلش کرنے کے لیے چاہئیں۔ شرم کے مارے الفاظ ہی اس کے منہ سے نہ نکل رہے تھے۔

’’اصل میں جب بچے...... چاہے لڑکا ہو یا

لڑکی...... حصول علم کے لیے جب بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں جاتے ہیں تو جہاں والدین کو ان کے اعلا تعلیمی مدارج طے کرنے پر فخر محسوس ہوتا ہے وہاں انہیں یہ دھڑکا بھی لگا رہتا ہے کہ ان کی عزت پر کوئی حرف نہ آجائے...... اگر تم عقل مندی سے اپنے سارے معمولات طے کروگی تو تمہیں یا تمہارے گھر والوں کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اچھا اب تم پڑھائی کرو۔'' رسان سے کہتا ہوا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اور وہ کتنی دیر تک گم سم بیٹھی رہی...... اور شاویز اس پر تو کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا تھا پورے دو مہینے گزر گئے اور اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ ابھی بات کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے...... شکر ہے کہ اس دن کے بعد سعد نے دوبارہ اس موضوع پر اس سے کوئی بات نہیں کی ویسے بھی وہ اپنے امتحان اور انگلینڈ جانے کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا۔

☆☆☆

اس دن وہ یونیورسٹی سے گھر پہنچی تو امی بہت خوش نظر آرہی تھیں۔ ایک خوش خبری ہے تمہارے لیے'' وہ اس کے پاس بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولیں...... '' تمہاری پھوپھی نے سعد کے لیے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔ میرے تو قدم زمین پر نہیں ٹھہر رہے...... دیکھو اللہ نے کتنا کرم کیا......'' مارے مسرت کے ان کے تو الفاظ بھی منہ سے ٹھیک طرح سے نہیں نکل رہے تھے۔

'' اچھا میں ذرا نماز پڑھ لوں...... بلکہ شکرانے نفل بھی ادا کروں پھر تمہیں تفصیل سے بتاتی ہوں...... تم جب تک...... ذرا رائتہ بنالو میں نے پلاؤ بنایا ہے آج! سعد پلاؤ کے ساتھ رائتہ شوق سے کھاتا ہے۔'' اپنی بے پناہ خوشی میں انہوں نے اس کے اترے ہوئے چہرے کی طرف دھیان تک نہیں دیا......'' اس دن کیسے اسے تسلیاں دے رہا تھا۔ شاویز کے بارے میں سب کچھ جان لینے کے باوجود...... یہ شوشا چھوڑ دیا...... دوغلا انسان......

ارے شاویز جیسا اندر سے ہے ویسا باہر سے ہے اس کی طرح دوغلا نہیں ہے...... چالاک مکار انسان ......وہ غصہ سے بیٹھی کھولتی رہی......

امی نے سلام پھیر کے اسے اس طرح بیٹھا دیکھا تو پھر ٹوکا......

'' ارے تم ابھی تک بیٹھی ہوئی ہو...... جاؤ جاکے رائتہ بناؤ......''

'' رائتہ تو میں تمہارا بناؤں گی سعد!'' لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اسے لگا جیسے سعد سیڑھیا چڑھا ہو...... وہ بھی تیزی سے اس کے پیچھے سیڑھیاں چڑھ گئی۔

'' سعد!'' اس نے شاید پہلی مرتبہ اسے نام سے مخاطب کیا تھا...... کمرے کے دروازے پر اس کا ہاتھ رک گیا...... سیڑھیوں کے اختتام پر وہ دونوں چھوٹے سے ٹیرس میں آمنے سامنے کھڑے تھے......

'' آپ کو تو میرے اور شاویز کے بارے میں سب معلوم تھا پھر پھوپھو نے کیسے...... امی سے میرے لیے بات کی......!'' وہ غصہ ضبط کرتی بڑی مشکل سے بول رہی تھی......

'' میں ابھی یہ بات ڈسکس نہیں کرنا چاہ رہا عبیرہ......''

''ہاں مجھ سے ابھی نہیں کرسکتے اور پھوپھو سے آپ نے بات کرلی۔'' وہ تیز لہجے میں بولی۔

'' میں جب پہلی مرتبہ ملتان گیا تھا تب تمہارے بارے میں امی سے بات ہوئی تھی عبیرہ......! اس نے جیسے اس کی حد درجہ بدگمانی پہ ہتھیار ڈال دیے۔'' اس کے بعد دوبارہ آج تک بات نہیں ہوئی...... تمہارے اور شاویز کے بارے میں جاننے کے بعد میں نے سوچا کہ جب شاویز کا رشتہ پکا ہوجائے گا تو مجھے امی کو منع کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی......''

'' لیکن...... پھوپھو نے تو آج امی سے بات کی ہے...... بس اب آپ صاف منع کردیں پھوپھو کو کہ آپ اب راضی نہیں ہیں......'' وہ پریشان ہوتے ہوئے بولی......

'' میں یوں اچانک منع نہیں کرسکتا۔'' وہ بھی اٹل لہجے میں بولا۔

'' کیوں...... کیوں منع نہیں کرسکتے......'' وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

'' کیونکہ...... میں نے خود امی کو اپنی پسند کے بارے میں بتایا تھا...... اب کیسے خود ہی کہوں کہ جو لڑکی پہلے پسند تھی...... اب پسند نہیں ہے......'' نظریں چراتے ہوئے اس نے دروازے کا ہینڈل کھول دیا اور اس کو حیران و پریشان سا چھوڑ کے اندر داخل ہوگیا۔

وہ عجیب سی کیفیت سے دوچار ہوتی سیڑھیاں اتر کے نیچے آئی تو امی کے کمرے میں سب کو ہی پریشان اور ہراساں پایا......

'' سعد بھائی کا موبائل اور پیسے گن پوائنٹ پر کسی نے چھین لیے۔'' ابھی کوئی آدھے گھنٹے پہلے......'' ٹیپو نے ہی سب سے پہلے اسے خبر دی۔

'' تقریباً ایک لاکھ سے اوپر پیسے تھے...... بے چارہ غیر ملکی کرنسی میں تبدیل کرانے کے لیے نکال کے لارہا تھا راستے میں کسی نے لوٹ لیا......'' عمیر بتا رہا تھا...... اور ابھی وہ پولیس میں رپورٹ درج کرانے کے لیے ضروری کاغذات لینے گھر آیا تھا...... جب وہ اس سے لڑنے پہنچ گئی......

وہ اور عمر جو دوپہر کے گھر سے نکلے تو رات تک واپسی نہ ہوئی...... اس کے خیالوں میں بار بار اسکا اترا ہوا پریشان سا چہرہ آجاتا...... کاش وہ کم از کم اپنی وجہ سے ہی اسے مزید پریشان نہ کرتی...... اس کا پچھتاوا اسے مارے ڈال رہا تھا...... امی الگ افسردہ تھیں۔

رات دس بجے تک ان دونوں کی واپسی ہوئی۔

'' مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ آپ کے ساتھ اتنا برا ہوا ہے۔'' کھانا گرم کرکے میز پر رکھتے ہوئے اس نے شرمندہ سے لہجے میں افسوس کیا بس نہیں چل رہا تھا کہ رو پڑے۔

'' اب آپ کیا کریں گے......!'' نبیل پر ان دونوں کے عین سامنے بیٹھتے ہوئے لگاوٹ سے دریافت کیا گیا۔ میرا مطلب ہے امتحان دینے کیسے جائیں گے......؟'' لہجے کی نرمی پہ سعد نے چونک کر اسے دیکھا۔

'' سیٹ تو بک ہے یہ تو وہاں ہوٹل میں رہائش کے لیے پیسے الگ رکھے تھے...... دیکھو اللہ ہی کوئی سبب بنائے گا۔ ان شاء اللہ۔'' وہ گلاس میں پانی ڈالتا ہوا بولا۔

'' چلو تم اب اسے آرام سے کھانا بھی کھانے دو۔'' عمر نے اسے ٹوکا تو وہ چائے بنانے اٹھ کھڑی ہوئی......

☆☆☆

وہ گھر لاؤنج میں بیٹھی پڑھ رہی تھی کہ موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھایا۔ '' ہیلو'' دوسری طرف شاویز تھا۔

'' ہاں بولو شاویز! کیسے فون کیا۔'' اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔

'' یار بہت دن ہوگئے ہیں ملاقات نہیں ہوئی تم سے۔'' شاویز نے کچھ بے قراری سے پوچھا۔ اسے شاویز کی بات اچھی نہیں لگی۔

'' شاویز تم نے اپنے گھر میں بات کی میرے متعلق؟'' اس نے آج دوٹوک بات کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔

'' تم اس ایک بات کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو؟'' وہ جھنجلایا۔

'' پیچھے پڑنے کی بات نہیں ہے شاویز! تمہیں بتا چکی ہوں کہ میرے کزن کا پروپوزل آیا ہوا ہے۔ امی فائنل نہ کردیں کہیں۔ اس لیے تم بات کرو اپنے گھر میں۔'' اس کا لہجہ بھی تیز ہوا۔

'' کیا بات کروں میں اپنے گھر والوں کو کیسے بتاؤں کہ جو لڑکی میں نے پسند کی ہے وہ کہاں رہتی ہے اور اس کا سوشل اسٹیٹس کیا ہے۔ اور......'' وہ آگے بھی کچھ کہتا کہ اس نے اسے ٹوک دیا۔

''بس شاویز آگے ایک لفظ نہیں، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم یہ بات کرو گے۔ بہت اچھا ہوا کہ جلدی تمہاری اصلیت سامنے آ گئی۔ اب مجھے فیصلہ کرنے میں آسانی رہے گی۔''

''کیا مطلب''

''مطلب یہ کہ مجھے فیصلہ کرنا ہوگا کیا مجھے شادی اس شخص سے کرنا چاہیے جسے میری ذات، میری خوبیوں خامیوں سے زیادہ میرے اسٹیٹس سے دلچسپی ہے؟''

''صاف صاف کہو نا کہ تم اپنے کزن سے شادی کرنے پر تیار ہو گئی ہو؟'' شاویز نے طنزیہ لہجہ اپنایا۔

''ہاں شاویز کم از کم وہ انسانوں کو انسان سمجھتا ہے، پیسے اور حیثیت میں نہیں تولتا۔'' اسے شاویز کا انداز سخت چبھا تھا۔

''اس کی اپنی کیا حیثیت ہے جو وہ تمہاری حیثیت دیکھے گا۔'' شاویز اس کا یہ انداز برداشت نہ کر پایا۔

''اس کی حیثیت تم جیسے سطحی لوگ نہیں سمجھ سکتے وہ جس مقام پر ہے اس تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔''

شاویز نے غصے میں آ کر فون بند کر دیا تو وہ موبائل رکھ کر مڑی تو پیچھے سعد کو کھڑے دیکھا تھا وہ تیزی سے مڑا اور باہر نکل گیا۔

☆☆☆

صبح جب سعد نیچے آیا تو وہ کچن میں پہلے سے موجود تھی۔

''کیا لیں گے ناشتہ میں......!'' بڑی تمیز سے شاید پہلی مرتبہ دریافت کیا گیا۔

''بس ایک کپ چائے......'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے اخبار کھول کر پڑھنے لگا۔ چائے ٹیبل پر رکھ کے وہ رات کی طرح پھر سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''میں اپنے کل کے رویے پر بہت شرمندہ ہوں......'' نظریں چائے کے کپ پر مرکوز کرتے ہوئے اس نے کہا۔

اس کی بات پر سعد نے نظر اٹھا کے اس کی طرف دیکھا...... پر کہا کچھ نہیں۔

''اصل میں مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کا اتنا نقصان ہوا ہے۔''

''کون سا نقصان؟'' اخبار تہہ کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''وہ جو کل ہوا تھا۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

''کل تو بڑے بڑے نقصان ہوئے تھے۔''

اس نے کپ ہونٹوں سے لگایا......

''میں کل ہی آپ سے معذرت کرنا چاہ رہی تھی......'' وہ دوبارہ سے شروع ہوئی۔

''کوئی بات نہیں اگر تمہاری فکرمندی پریشان سی شکل رات نہ دیکھ لی ہوتی تو شاید میں بھی سکون سے سو نہیں پاتا......''

اس نے الجھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا...... کہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

''کبھی کبھی کسی شخص کا اپنے لیے فکرمند ہونا...... سکون دیتا ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے دوبارہ اخبار کھولا...... تو وہ عجیب سی کیفیت میں مبتلا اٹھ کھڑی ہوئی۔

اور جس کو اللہ پر بھروسا ہوتا ہے اللہ میاں بھی اس کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے۔ سعد کے سینئر پروفیسر کے بھائی لندن میں مقیم تھے انہوں نے اپنے بھائی سے بات کر کے اس کے رہنے کا مسئلہ حل کر دیا...... شام میں سعد خوشی خوشی سب کو بتا رہا تھا...... اور سب کے ساتھ اس نے بھی اللہ تعالیٰ کا لاکھ شکر ادا کیا...... دو دن بعد اس کی روانگی تھی، سب نے اپنی دعاؤں تلے اسے رخصت کیا۔

☆☆☆

اس کا لاسٹ سمسٹر چل رہا تھا وہ تندہی سے نوٹس بنانے میں مصروف تھی جب شاویز اس کی طرف آیا۔

''تم ادھر لائبریری میں بیٹھی ہو...... بور لڑکی...... چلو اٹھو تمہارے لیے سرپرائز ہے۔'' اسے ساتھ لیے وہ پارکنگ لاٹ کی طرف آ گیا جہاں نئے ماڈل کی چمچماتی ٹویوٹا کرولا اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ کھڑی تھی......''

''پسند آئی تمہیں......؟'' وہ جوش سے بولا۔

''تمہاری وہ گاڑی بھی اچھی تھی......'' اس نے سادگی سے کہا۔

''او ڈونٹ ٹیل می'' (مجھے نہیں بتاؤ) تمہیں پتا ہے میری چھوٹی بہن تو اسے کھٹارا کہتی تھی بڑے فخر والی ہے تمہاری نند'' کہتے ہوئے وہ ہنس پڑا۔

چار سال پرانی ہونڈا سٹی کو وہ لوگ کھٹارا کہتے تھے...... اس سے تو ساتھ دینے کے لیے ہنسا بھی نہیں گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ پورے چہرے کے پٹھے تنے ہوئے کھنچے ہوئے ہوں جو ہنس ہی نہ سکتے ہوں۔

''اب تم جلدی آؤ نا امی سے ملنے اس سے پہلے کہ پھوپھو پھر کوئی بات کریں۔''

کچھ پہلے ہی وہ سعد کے پروپوزل کے بارے میں اسے بتا چکی تھی۔

اس کی تم فکر نہ کرو تمہاری امی کبھی بھی میرے سامنے سعد کو فوقیت نہیں دیں گی۔ مالی اعتبار سے وہ اتنا مستحکم نہیں ہے...... ایک گھر تک تو کرائے پر لے نہ سکا ابھی تک...... کم از کم دس سال لگیں گے اسے سیٹ ہونے میں...... اور مائیں اپنی بیٹیوں کو عیش کرتے دیکھنا چاہتی ہیں...... اور سنو وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا'' کہیں تم بھی ہاں نہ کر دینا...... خوار ہو جاؤ گی۔'' وہ جیسے جم سی گئی۔

''بھئی لڑکے کی جیب دیکھی جاتی ہے خالی شکل یا ڈگری کو کوئی نہیں پوچھتا ہاں بس ایک ہی پلس پوائنٹ ہے کہ تمہارے خاندان کا ہے پر آج کل ان باتوں کو کون پوچھتا ہے۔'' وہ اپنی ہی دھن میں بجے جا رہا تھا......

کیا مطلب صرف وہ خوار ہو گی...... اور شاویز اس کو کوئی دکھ نہ ہوگا...... اور وہ خوار ہو گی صرف اس لیے کہ سعد کے پاس شاویز جتنا...... بینک بیلنس...... بنگلا گاڑی نہیں ہے...... اف خدایا کیا امیج ہے میرا اس کی نظر میں...... یہ مجھے کیا سمجھتا ہے۔

''میں چلتی ہوں پوائنٹ پہلے ہی مس ہو چکا ہے...... مزید دیر نہیں کر سکتی۔'' اس نے بہت دقتوں سے کہا۔

پوائنٹ جا چکا تھا۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ آنسوؤں کو پیچھے دھکیلتی بس اسٹاپ پر بس کا انتظار کر رہی تھی۔ دو بسیں گزریں جن میں بالکل جگہ نہیں تھی...... تھوڑی دیر بعد شاویز بھی اسی روڈ پر سے اپنی نئی گاڑی لے کر گزرا تو وہ غیر ارادی طور پر ساتھ کھڑی لڑکی کے پیچھے ہو گئی۔ پھر تیسری کھچا کھچ بھری بس میں سوار ہو گئی...... ''میری بہن کہتی ہے خبردار جو اس کا کھٹارا پر مجھے کالج لینے آئے...... تمہاری زندگی خوار ہو جائے گی......'' بس کے جھٹکوں کے ساتھ وہ بھی جھول گئی...... اس کے اندر بھی جھکڑ چل رہے تھے۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ اب شاویز سے کب اور کیا بات کرنی ہے...... دو ہفتوں بعد بھی واپس آ گیا اور امتحان پاس کرنے کے بعد پہلے سے زیادہ خود اعتماد نظر آ رہا تھا...... امی نے جب اسے بتایا کہ اس کی پھپھو کچھ دنوں میں کراچی آنے والی ہیں تو اس نے ہمت کر کے امی کو بتا دیا کہ ابھی وہ کم از کم ایک سال شادی نہیں کرنا چاہتی...... سعد سے اس کی دوبارہ اس موضوع پر کوئی بات نہ ہوئی......

☆☆☆

''کیا بات ہے آج کل تم بہت مصروف ہو گئی ہو۔'' وہ لائبریری سے نکلی تو شاویز بھی اس کے ساتھ چلنے لگا۔

''ظاہر ہے امتحان سر پر ہیں۔'' مختصر سا جواب دیتے ہوئے اس نے اعتماد سے اس کی طرف دیکھا۔

''پھر تم نے کیا بات کی اپنی امی سے میرے بارے میں۔'' اس نے اس کے اتنے دنوں کی خاموشی کو جاننے کی کوشش کی۔

''بھئی تمہاری طرف سے کوئی بات ہو گی تو کروں گی ناں ایسے ہی امی کو پریشان کرنے کا فائدہ...... اب میں کوئی 1960 کی ہیروئین تو ہوں نہیں کہ محبوب کے عشق میں مری جا رہی ہوں اور ماں باپ راضی نہ ہوں تو خودکشی کرنے کی چھچھوری حرکتیں کرتی پھروں، اللہ یہ چھوڑ دیا ہے جو بھی ہو......

اور ویسے بھی ہم دونوں میچور ہیں اور ہمیں اپنے کیریئر پر توجہ دینی چاہیے۔ ہمیں اپنے سارے معاملات عملی طور پر خود سنبھالنے چاہئیں۔ (اس گھٹیا پیار سمیت)
آخری جملہ اس نے صرف دل میں کہا۔
''اوکے...... دیر ہو رہی ہے کہیں پوائنٹ مس نہ ہو جائے۔ بائے......''
وہ سن گلاسز لگاتے ہوئے آگے نکل گئی......
گھر پہنچی تو لائٹ گئی ہوئی تھی...... ٹیپو بھی اس کے پیچھے پیچھے ہی گھر میں داخل ہوا...... ''آپی وہ سعد بھائی کہہ رہے ہیں کہ آپ کو بتا دوں کہ امی شگفتہ آنٹی کی طرف گئی ہوئی ہیں...... آپ کچھ پکایے گا نہیں...... وہ بازار سے کچھ لیتے آئیں گے۔'' وہ کہہ کے جاتے جاتے مڑا۔ ''اور ہم باہر ہی ہیں۔''
''دیکھ لیا ہے......'' بے زاری سے کہتے ہوئے اس نے اپنا بیگ تخت پر پھینکا اور خود بھی پاؤں اوپر کے بیٹھ گئی...... آدمی کی بھی سمجھ نہیں آتی، کوئی کہے گا کہ یہ اتنا بڑا اسپیشلسٹ بن چکا ہے۔ باہر گلی میں ٹیپو کے دوستوں کے ساتھ سعد کو کرکٹ کھیلتا دیکھ چکی تھی۔
تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ لوگ گھر میں داخل ہوئے عمر بھی ان کے ساتھ تھا...... کھانے کے لیے برگر بھی ساتھ لائے تھے۔
''یہ تم محلے کے بازار کے گرما گرم برگر کا مزا آخری آخری مرتبہ اٹھا لو اب تو باہر کی ڈگری مل گئی ہے...... اب تو تم میکڈونلڈز اور کے ایف سی سے نیچے نہیں اترو گے۔'' عمر نے خوب سارا کیچپ برگر پر لگاتے ہوئے اسے چھیڑا۔
''بھئی باہر کا کھانا...... چاہے بن کباب ہوں یا میکڈونلڈز کے برگر دونوں ہی صحت کے لیے اچھے نہیں ہیں میں تو گھر کے کھانے کو ہی ترجیح دیتا ہوں۔'' سعد نے سادگی سے جواب دیا۔
''اور اسی لیے تم ساتھ کولڈ رنک بھی نہیں لائے ہے نا......'' عمر نے چڑ کر کے کہا۔
''بالکل'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''آم لایا ہوں...... ابھی ملک شیک بنا کے پلاتا ہوں......'' کھاتے ہوئے اس نے عمر کو تسلی دی۔
''تم ہی پیو ملک شیک میں تو پڑھنے جا رہا ہوں۔'' عمر ٹشو سے ہاتھ صاف کرتا ہوا بولا۔ ''عیرہ ذرا ٹیپو کے ہاتھ چائے بھجوا دینا پلیز۔'' اس کے امتحان قریب تھے اس لیے جلدی اٹھ گیا۔
''امی بتا رہی تھیں کہ آپ کو بہت اچھے اچھے بڑے اسپتالوں میں نوکری کی پیشکش ہوئی ہے...... پھر آپ کیوں واپس ملتان جا رہے ہیں۔''
کھانے کی میز پر آمنے سامنے وہ دونوں ہی بیٹھے رہ گئے تھے۔
''میں اپنے اسپتال سے چھٹی لے کر آیا تھا مقصد یہاں کا تجربہ حاصل کرنا اور قابلیت اضافہ کرنا تھا۔ اصل مقصد تو ان لوگوں کو فائدہ پہنچانا تھا جو پرائیویٹ بڑے بڑے مہنگے اسپتالوں کی فیس نہیں دے سکتے...... تمہیں پتا ہے عیرہ میں نائنتھ کلاس میں تھا جب ابو کو کینسر ہوا...... ہم لوگ چھ مہینے تک مختلف نیم حکیم ٹائپ کے ڈاکٹروں اور حکیموں سے علاج کراتے رہے...... کوئی مرض کی تشخیص نہ کر سکا اور نہ ہی ان کا علاج شروع ہو سکا...... جب ہم لاہور کے کینسر ہاسپٹل لے کر پہنچے تو معلوم ہوا کہ کینسر آخری اسٹیج پر ہے۔ اگر میرے ابو کو بروقت کوئی قابل ڈاکٹر دیکھ لیتا تو مرض پکڑا جا سکتا تھا...... اور شاید ابو کچھ سال اور جی لیتے...... صرف پیسے نہ ہونے کی وجہ سے جن کے پیارے مر جاتے ہیں ان کے پیاروں کا دکھ ساری عمر انہیں مارتا رہتا ہے عیرہ!
اس امتحان کی وجہ سے جہاں میری قابلیت میں اضافہ ہوا ہے وہاں میرا عہدہ بھی بڑا ہو گا۔ مجھے گھر کی سہولت بھی ملے گی ان شاء اللہ مالی اعتبار سے بھی میں ترقی کروں گا۔ لیکن اصل خوشی مجھے ان لوگوں کی خدمت کر کے ملے گی جن کے پاس بہت محدود ذرائع ہیں۔''
''پھر بھی آپ کے ساتھ کے لوگ جب آپ سے زیادہ کمائیں گے تو آپ کو دکھ نہیں ہو گا کہ زندگی کی دوڑ میں آپ پیچھے رہ گئے......'' وہ پتا نہیں کیا جاننا چاہ رہی تھی۔
''جو لوگ زندگی کو دوڑ سمجھتے ہیں...... وہ ہمیشہ بھاگتے رہتے ہیں: کبھی کسی چیز کے پیچھے تو کبھی کسی چیز کے پیچھے...... کبھی آسائشوں کے پیچھے تو کبھی نام کے پیچھے......'' وہ اسے سمجھاتا ہوا کہہ رہا تھا...... ''زندگی کو پرسکون طریقے سے گزارنے والے...... محنت کرنے والے اپنے آپ کو اپنے اور دوسروں کے لیے کار آمد بنانے والے ہی اس کا اصل لطف اٹھاتے ہیں۔''
''پھر بھی آپ کو ڈر نہیں لگتا...... اگر آپ سے سب کچھ چھن جائے؟'' وہ لاشعور میں متاثر شاویز کی باتوں کے جواب ڈھونڈ رہی تھی......
''تقدیر لکھنے والی تو خدا کی ذات ہے......'' اس نے جگ سے پانی گلاس مین ڈالا۔ بس انسان کو برے وقت میں صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے...... مشکلوں سے گھبرا کر...... کوئی ناجائز...... کوئی غلط قدم نہ اٹھائیں تو کڑا وقت بھی سہل ہو جاتا ہے۔ اور تمہارے سامنے تو خود اپنی اور میری مثال ہے کیا اللہ نے ہمارا ساتھ نہیں دیا...... اور تم عیرہ! تم تو باداموں والا لڈو اور میٹھا پراٹھا کھا کے خوش ہونے والی سادہ سی لڑکی ہو۔ تم آج اس قسم کی باتیں کیوں کر رہی ہو؟'' کہتے ہوئے اس نے گلاس ہونٹوں سے لگایا۔ وہ جھینپ سی گئی۔
''تمہیں پتا ہے آج رات کی فلائٹ سے امی آ رہی ہیں اور میرے خیال میں وہ ہماری بات پکی کر کے جائیں گی......'' اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''آپ کا خیال غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔'' میز پر سے پلیٹیں اٹھاتے ہوئے اس نے نظریں چرائیں......
''ہاں خیال تو واقعی غلط بھی ہو سکتا ہے۔ پر کسی کی شفاف آنکھوں کی سچائی تو غلط نہیں ہو سکتی نا......'' وہ بڑے رسان سے کہتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔
''لیکن......'' اس کے منہ سے نکلا۔
''اف ابھی بھی لیکن...... پورا انٹرویو تم نے کر لیا ہے میرا، اب کیا رہ گیا ہے لڑکی......!'' اس نے مصنوعی خفگی سے گھورا۔
''وہ آپ کو میرے اور شاویز کے بارے میں سب پتا ہے...... اگر کبھی بعد میں آپ نے مجھے کوئی طعنہ دیا تو......'' وہ رک رک کے بولی۔
''تو میں خود تمہیں طعنوں تشنوں پر مبنی ایک فہرست تیار کر کے ابھی دے دیتا ہوں تم جوابی حملے کرتی رہنا...... مثلاً تم یہ کہہ دینا وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ''آپ خود ہی مجھ پر فدا تھے...... میں نے تو آپ سے کچھ نہیں کہا تھا...... آپ خود ہی مجھ پر لٹو ہو گئے تھے...... آپ خود ہی رات رات بھر جاگ کے میرے بارے میں سوچتے تھے...... آپ خود ہی مجھ پر عاشق تھے......''
''بس بس'' وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
''کہاں چلیں؟'' اسے جاتا دیکھ کر اس نے پکارا ''فقروں کی پوری لسٹ تو سنتی جاؤ۔''
''کیوں پھوپھی جان کو کیا رات کے کھانے میں فقروں کی لسٹ کھلاؤں گی کھانا نہیں تیار کرنا کیا مجھے۔'' وہ کچن کے دروازے پر کھڑی تڑاخ سے بولی......''
''ارے یہ غضب نہ کرنا۔'' سیڑھیوں سے اترتے ہوئے عمر کی آواز پر اس کے واقعی ہاتھوں کے توتے اڑ گئے......
''تمہارے ہاتھ کا بنا کھانا کھا کر...... پھوپھی جان کبھی بھی تمہارے رشتہ کے لیے راضی نہیں ہوں گی۔ اور میں یہ رشتہ کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا......'' کیا ہے کہ......'' وہ سعد کے برابر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔
''علشبہ چاہتی ہے کہ فیملی میں کوئی قابل ڈاکٹر ضرور ہو...... بھئی کبھی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔''
اور وہ جو اس بات پر گھبرا گئی تھی کہ عمر نے کیا سنا ہے کیا نہیں، دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ کیتلی میں چائے کا پانی بھرنے لگی۔

بے چارہ مجنوں

لائبہ اعوان

میں نے تو سنا تھا کہ منگنی اور شادی کا درمیانی عرصہ بڑا ہی حسین ہوتا ہے، بلکہ سنا کیا میں تو خود اپنے گروپ کے دو عدد تازہ تازہ منگنی شدہ دوستوں کے اس حسین سفر کا چشم دید گواہ تھا۔ ان کی لمبی لمبی ٹیلی فون کالز، منگیتروں کی طرف سے ملنے والے تحفے تحائف، گڈ مارننگ، گڈ نائٹ اور مس یو کے ٹیکسٹ اور پھر میرے دوستوں کے چہرے پر آنے والی مسکراہٹ......بس مت پوچھیں کہ اس سب سے میں اتنا متاثر بلکہ اس قدر احساس محرومی کا شکار ہوا کہ میں نے امی سے ضد کرکے، بھوک ہڑتال کرکے اپنی کزن ردا کو باضابطہ طور پر منگنی کی انگوٹھی پہنا ڈالی۔

مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ تھا۔ یا تو میں ہی کسی لڑکی کو متاثر کرنے میں ناکام اور بدقسمت تھا یا پھر میرے دوست بڑے کائیاں اور خوش قسمت تھے یا پھر یہ سب ایک دم جھوٹ اور بکواس تھا۔ منگنی شدہ ہونے سے لے کر اب تک مجال ہے جو ایک بھی رومینٹک سین ہوا ہو میرے ساتھ، بلکہ رومینٹک تو چھوڑیے یہ جان کر آپ کی تمام تر ہمدردیاں بھی میرے ساتھ ہوں گی کہ ان محترمہ کے پاس تو دو گھڑی تسلی سے میری بات سننے کی بھی فرصت نہیں ہوتی۔

آہ......دل مضطر کا مزید کیا حال سناؤں آپ کو......بس اتنا سمجھ لیں کہ ہاتھ آیا، منہ نہ لگا والی کیفیت ہے۔ اپنے تمام خواب چکنا چور ہونے کے باوجود، اس کی ہر بے رخی اور بے اعتنائی کے باوجود یہ دل ناداں ہے کہ ہر بار اس سے امید لگا بیٹھتا ہے۔

اب بھی چند دن بعد میری سالگرہ ہے اور اس کے بھلکڑ پن کو جانتے ہوئے بھی مجھے ایک موہوم سی توقع ہے کہ شاید میری بار بار کی ناراضی کے بعد اسے اپنی لاپروائی اور کٹھور پن کا احساس ہو گیا ہو اور اس دفعہ وہ کچھ خیال کر ہی لے۔

شاید......شاید رات کے ٹھیک بارہ بجے اس کی محبت بھری کال آجائے اور وہ کہے۔

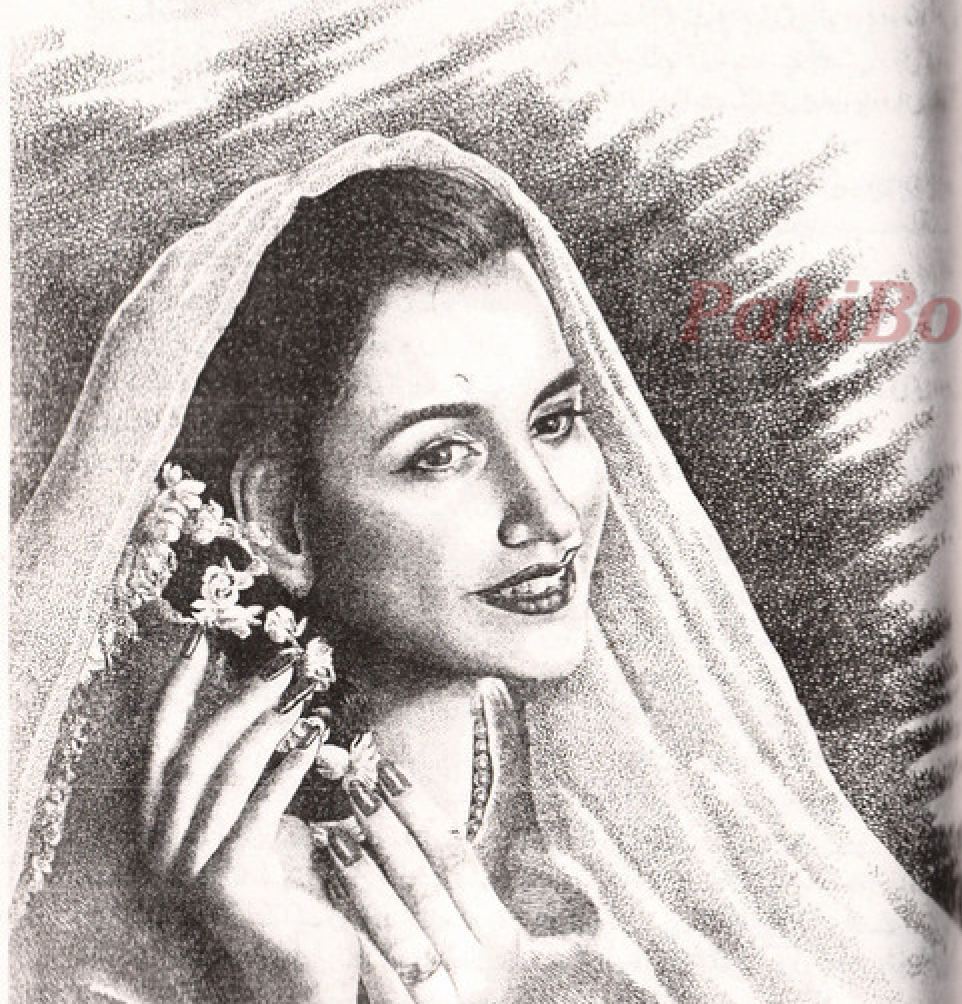
”آج تمہاری سالگرہ ہے، دیکھو ہم کو یاد ہے نا!“

یا پھر کوئی پیار بھرا میسج یا......یا جب میں صبح سو کر اٹھوں تو میرے سرہانے اس کی طرف سے بھیجا گیا پھولوں کا گلدستہ اور خوب صورت سا کارڈ......یا پھر......اوفوہ، میں بھی کس پاگل پن میں ہوں کہ اس جیسی ٹھس لڑکی سے یہ سب توقع کر رہا ہوں......سب جانتے ہوئے بھی کہ انجام ایک ہی ہونا ہے۔

لائی بے قدراں نال یاری
تے ٹٹ گئی تڑک کر کے

آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ میں شاید کچھ زیادہ ہی زودرنج ہو رہا ہوں، مگر آپ کو کیا بتاؤں کہ یہ ردا کی بچی ہر خوش گوار لمحے کو کیسے غارت کرتی ہے۔

اب یہی دیکھ لیں کہ جس دن لڑکا لڑکی کی منگنی ہوتی ہے وہ دن کیسا رومان پرور ہوتا ہے۔ دل چاہتا ہے ساری رات ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چھت پر کھڑے آنے والے خوب صورت کل کی باتیں کرتے رہیں، چاند ہمارے ہمراہ ہو اور وقت تھم جائے، ایک دوسرے کے لیے آسمان چھو لینے اور تارے توڑ لانے کی قسمیں اور وعدے......بس یہی



ستم چھایا تھا مجھ پر، جب میں نے بڑے سُرور کے عالم میں اسے کال کر ڈالی۔

”عجیب حالت ہے یار......نیند ہی نہیں آ رہی۔“ میں نے گمبھیر لہجے میں کہا تھا مگر اس کا جواب تو ...ہیں۔

”ہاں معیز......میں تو خود مچھر مار مار کر تھک گئی ہوں......منحوس سارا خون پی گئے میرا......ارے دیکھو تو پھر سے بازو پر بیٹھا ہے......اب تم دیکھو میں اس کا کیا حال کرتی ہوں۔“

فون پر ایک لمحے کی خاموشی چھائی، جس نے میرے تمام جذبوں کو فنا کر ڈالا۔ ابھی میں ٹھیک سے ماتم بھی نہ منا سکا تھا کہ میرے کانوں میں تھپ تھپ کی آواز آئی اور میں ہوش کی دنیا میں واپس آیا۔

شاید اس نے مچھر مارا تھا اور یہ اسی کی آواز تھی۔ ادھر مچھر اس کا خون پی رہے تھے اور بدلے

میں اس نے میرے جسم کا سارا خون منگنی کی پہلی ہی رات نچوڑ ڈالا تھا۔

''شکر ہے مر گیا، کب سے بچ رہا تھا مجھ سے...... ایمر جنسی لائٹ میں نشانہ بھی تو ٹھیک نہیں لگتا نا...... بس کیا بتاؤں معیز لائٹ نہیں آ رہی آدھے گھنٹے سے اور یو، پی، ایس بھی چلتے چلتے ایک دم بند ہو گیا۔'' وہ میرے دل کی حالت جانے بغیر اپنی کہے جا رہی تھی کہ اتنے میں اس کی چھوٹی بہن نے اونچی آواز میں پکارا تھا۔

''آپی لائٹ آ گئی، جلدی سے آ جائیں آپ کا فیورٹ ڈراما شروع ہی ہوا ہے ابھی......''

''آئی بس......'' اس نے ہانک لگائی تھی۔

''کتنے لکی ہو تم معیز...... ادھر تمہاری کال آئی ادھر لائٹ آ گئی...... ورنہ اتنی اچھی اپی سوڈ مس ہو جاتی میری...... اوکے بائے۔''

اس نے ایک دم فون بند کر دیا تھا اور میں حیران سا موبائل کو دیکھے گیا تھا۔ مجھ پر طاری سکتہ ٹوٹا تو دل چاہا اس کا گلا دبوچ لوں۔ خوب صورت چاند اور تاروں کی بس اتنی اہمیت رہ گئی کہ وہ میری آنکھوں کے سامنے ناچ ناچ کر میری بے بسی کا سوگ منانے لگے۔ اچانک ہی مجھے اندھیرے میں مچھروں کی فوج دکھائی دینے لگی۔

''تھپ...... تھپ......'' میں پے در پے انہیں مارنے لگا۔

''منحوس کہیں کے......'' میں یہ کہتے ہوئے چھت کی سیڑھیاں اترتا نیچے چل دیا۔ آپ سے اس دکھ بھرے سین کا تذکرہ اس لیے کیا ہے تاکہ آپ سب جان سکیں کہ میں آخر اس قدر رنجور اور مایوس کیوں ہوں......!!

☆☆☆

مہینے کے شروع کے دن تھے اور ردا بے چینی سے ڈائجسٹ کا انتظار کر رہی تھی۔ پڑھائی کے بعد دو ہی تو مشغلے تھے اس کے ایک ٹی وی دیکھنا اور دوسرا ڈائجسٹ پڑھنا۔ دوستوں کی طرف آنا جانا اور فون پر گپ شپ ابو کو پسند نہیں تھی سو وہ دونوں بہنیں آپس میں ہی لگی رہتیں۔ پیار بھی بہت تھا اور کھٹ پٹ بھی خوب تھی۔ اب بھی دونوں میں ڈائجسٹ کے معاملے میں تکرار جاری تھی۔

''میں بتا رہی ہوں ردا آپی آپ کو، اس بار پہلے میں پڑھوں گی......'' حنا نے زور دے کر کہا تھا۔

''اچھا اچھا...... دیکھ لیں گے، پہلے ڈائجسٹ تو آ لے۔'' اس نے گویا ناک سے مکھی اڑائی تھی۔

''دیکھ لیں گے نہیں...... بس میں......''

بات کرتے کرتے حنا کی عقابی نظر گملوں کے پاس پڑے ڈائجسٹ پر پڑی تھی اور وہ یاہو، کا نعرہ لگاتی ڈائجسٹ پر جھپٹتی اسے اپنے قبضے میں کر چکی تھی۔

''واہ......! اسے کہتے ہیں جہاں چاہ وہاں راہ'' حنا خوشی سے چہکی تھی۔

''دیکھو حنا...... چندا...... بس ایک اپی سوڈ پڑھ لینے دو پلیز...... پھر......'' ردا نے لجاجت سے کہا تھا۔

''بالکل نہیں...... آپ ہر بار میرے ساتھ یہی کرتی ہیں لیکن اس دفعہ میں آپ کے دھوکے میں نہیں آنے والی۔''

وہ ڈائجسٹ لیے اندر کی طرف بھاگ گئی تھی اور ردا اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھی۔

''ردا، جلدی سے میرے کپڑے استری کر دو، بازار جانا ہے مجھے......'' امی کی آواز آئی تھی اور وہ بے دلی سے آہ بھر کر رہ گئی تھی۔

''نصیب اپنا اپنا۔''

پھر جھٹ پٹ اس نے امی کے ساتھ ساتھ ابو کے دو جوڑے بھی استری کر لیے تھے۔ ٹی وی اور ڈائجسٹ کا کریز اپنی جگہ مگر کاموں میں بھی خوب طاق تھیں دونوں بہنیں، کیونکہ امی کا ماننا تھا کہ عورت کے لیے گھر گرہستی سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اب امی کا کہا تو مانو پتھر پر لکیر تھا۔

''حنا، تیار ہو جاؤ میرے ساتھ بازار جانا ہے اور پھر واپسی پر خالہ کی طرف بھی ہوتے آئیں گے۔'' امی کا اتنا کہنا تھا کہ ردا کی تو جیسے لاٹری نکل آئی۔

''چلو چلو...... امی کے ساتھ بازار جانا ہے آپ کو میڈم۔'' ردا کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ بس اب اس انتظار میں تھی کہ دونوں کے جانے کے بعد تسلی سے ڈائجسٹ سنبھالے۔

''ہاں ہاں سن لیا ہے میں نے...... زیادہ اترانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' حنا جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی مبادا امی اس کی شامت لے آئیں اور واپس آ کر بھی ڈائجسٹ پر پابندی لگ جائے۔

☆☆☆

معیز یونیورسٹی سے چھٹی کر کے سر منہ لپیٹے کمرے میں پڑا تھا۔ اس کے موبائل پر مسلسل دوستوں کے ٹیکسٹ آ رہے تھے اور وہ ''بے چارہ مجنوں'' کی تصویر بنا ہر کسی سے ناتا توڑے بیٹھا تھا۔ مسلسل بجتی بیپ سے تنگ آ کر اس نے موبائل اٹھایا تھا۔

''چھٹی کر لینے سے سالگرہ کی ٹریٹ سے جان نہیں چھوٹ سکتی مسٹر۔''

''جانتے ہیں بھئی اب ہماری کیا اوقات...... ہیر کے ساتھ مصروف ہوں گے آپ۔''

''کیا گفٹ ملا بھابھی سے......؟''

''کیا لکھا تھا کارڈ پر......؟ اب یاروں سے کیسی پردہ داری......'' اس نے تنگ آ کر غصے سے موبائل پٹخ ڈالا۔

''ہونہہ...... محترمہ کو تو یاد تک نہیں۔''

دل چاہ رہا تھا جا کر ردا کو کھری کھری سنا دے، مگر نہیں...... انسان کی اپنی بھی کوئی عزت ہوتی ہے...... ہر بار میں ہی کیوں احساس دلاؤں، اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ بس اب خاموش رہے گا۔

☆☆☆

ردا نے جیسے ہی ڈائجسٹ اٹھایا تو ٹائٹل پر ہی خوب صورت سے انداز میں ''سالگرہ نمبر'' ـــــ جگمگا رہا تھا۔

''اوہ شٹ...... معیز کی سالگرہ...... پھر بھول گئی میں، کیا کروں اب۔'' وہ جو ذوق و شوق سے ڈائجسٹ میں مگن ہونے والی تھی اب اس نئی اُفتاد پر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ جلدی سے حنا کو فون ملایا۔

''حنا یار...... وہ آج معیز کی سالگرہ ہے، کوئی پرفیوم لیتی آنا اور کارڈ...... نہیں کارڈ رہنے دو۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا۔

''اوہ...... امی سے کہہ دو خود۔'' حنا نے اسے تنگ کیا تھا۔

''حنا کی بچی...... خود بتا دینا امی کو، اور ویسے بھی اس جذباتی ہیرو نے امی کو خوب مٹھی میں کر رکھا ہے۔''

حنا کو پرفیوم کا کہہ کر اب وہ اس کی الماری میں سے ہاتھ کے بنے کارڈز تلاش کر رہی تھی۔ ابھی پچھلے مہینے ہی حنا نے کئی کارڈز بنا کر کالج نمائش میں رکھے تھے۔ قسمت سے موقع کی مناسبت سے ایک خوب صورت سا کارڈ اس کے ہاتھ لگ گیا۔ اس نے جلدی سے باقی کارڈز الماری میں رکھے تاکہ حنا کو شبہ نہ ہو اور لکھنے لگی۔

''آج تک کسی کے لیے اپنے ہاتھوں سے کارڈ نہیں بنایا...... صرف اور صرف تمہارے لیے...... ہیپی برتھ ڈے۔''

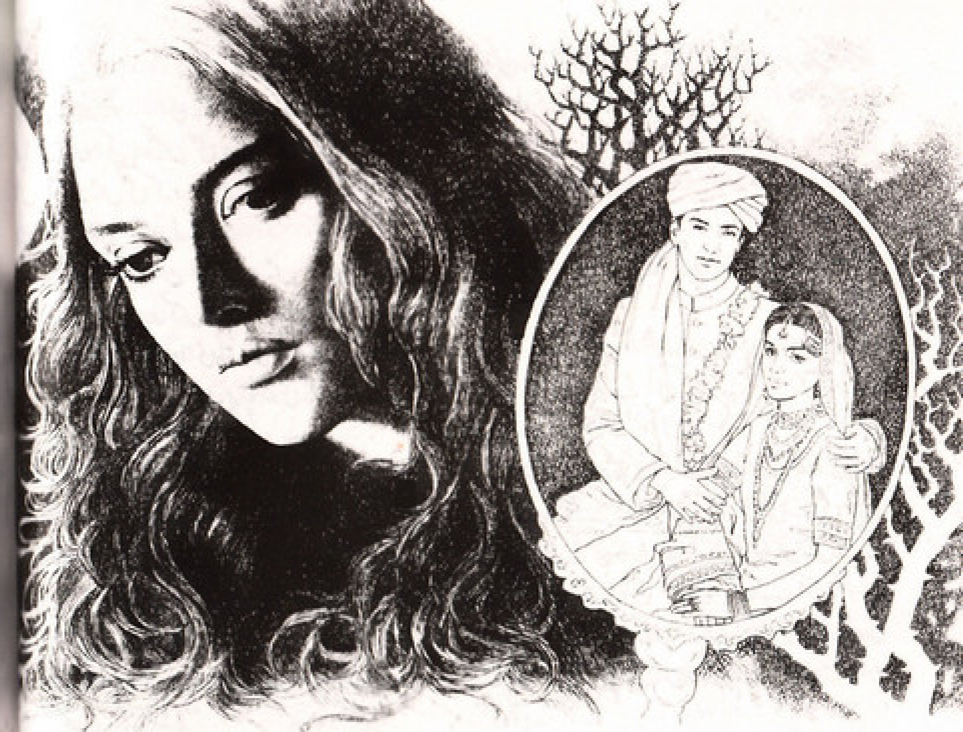
اس نے لکھنے کے بعد کارڈ پر ایک نظر ڈالی اور شکر کا کلمہ پڑھتی دوبارہ ڈائجسٹ لے کر بیٹھ گئی۔

قدرت کو معیز کی خاموشی پر ترس آ گیا تھا۔ بیچارے مجنوں کی یہ سالگرہ یقیناً یادگار ہونے والی تھی۔ کیوں کہ ردا کا ارادہ تھا کہ وہ بو کے گفٹ اور کارڈ لے کر خود ہی چلی جائے تاکہ مزید کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ ڈائجسٹ کی بدولت وہ معیز کی متوقع ناراضی اور ایک لمبی تکرار سے بچ گئی تھی۔

تو کیا ہم سب کو مل کر نہیں کہنا چاہیے......!!

''شکریہ پیارے ڈائجسٹ! سالگرہ مبارک''





نعیمہ ناز

ستم ہائے وفا

مکمل ناول

عاطف کو اس کی پھوپھی زاد، آرزو بڑے پراسرار انداز میں اپنے گھر لاتی ہے جہاں عاطف کے والد شہید احمد کی حالت قابل رحم اور عبرت ناک تھی۔ گھریلو حالات بھی دگرگوں تھے۔

عاطف کی پھوپھی عظمیٰ اپنے ماضی کو یاد کرتی ہیں۔

ثمینہ بیگم کی اپنی نند حمیرا سے کبھی نہ بنی تھی۔ مگر حمیرا کے دونوں بچے ثمینہ بیگم کے بچوں سے محبت کرتے ہیں اور حمیرا ان کی شادی کی خواہاں تھی۔ ثمینہ اپنے بیٹے شہید کی شادی اپنی بھتیجی سے جبکہ ان کے شوہر اپنی بھانجی مہربانو سے کرنا چاہتے ہیں۔

ثمینہ اپنے مرتے ہوئے بھائی کی خواہش پر شہید کا نکاح عفت سے کروا دیتی ہیں۔ یہ خبر حمیرا اور بچوں پر بجلی بن کر گرتی ہے۔ عظمیٰ کی شادی پھوپھی کے گھر ہو جاتی ہے جبکہ مہربانو کا رشتہ امیر کبیر اور حسین معیز سے ہو جاتا ہے۔ مہربانو کی بدمزاجی، بدلحاظی کی وجہ سے روز گھر میں جھگڑے ہوتے ہیں۔ وہ ناراض ہو کر میکے آ جاتی ہے۔

شہید احمد کے دل میں مہربانو کی محبت کا احساس عفت کو بے چین رکھتا ہے۔ وہ مزاجاً اپنی ساس کی طرح لڑاکا اور شکی ہے۔

عاطف کو پھوپھی کے حالات رنجیدہ کر دیتے ہیں، وہ ماں کے علم میں لائے بغیر روز والد کی خدمت کرنے جاتا ہے اور آرزو کے لیے نوکری کا بندوبست کرتا ہے۔

معیز عالم کوشش کرتا ہے کہ مہربانو واپس گھر آ جائے لیکن اس کی ضد ہے کہ جب تک وہ خود اسے لینے نہیں آئے گا وہ واپس نہیں جائے گی۔ مہربانو کے امید سے ہونے کی خبر سن کر بھی وہ ـــــ موم نہیں ہوتا۔ بچے کی پیدائش پر مہربانو کی ساس اسے لینے آتی ہیں لیکن مہربانو کی ماں ان سے بہت بدتمیزی کرتی ہیں۔ معیز عالم کو علم ہوتا ہے تو وہ مہربانو کو طلاق بھیج دیتا ہے۔

تیسری اور آخری قسط

غصے کی شدید آگ میں جھلستا ہوا وہ گھر سے نکلا تھا۔ پھوپھو کے گھر کے سامنے رکا تو پھر آگے نکل گیا۔ کتنی دیر بے مقصد سڑک پر چلتا رہا۔ موسم ٹھنڈا تھا، ہوا سرد تھی پھر بھی غصے کی آگ کم نہیں ہو رہی تھی۔ کافی دیر بہت دور تک جانے کے بعد وہ واپس پلٹا، اپنی گلی تک آیا پھر پھوپھو کے گھر کی طرف مڑ گیا۔

''اتنی دیر لگا دی، کب سے تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا۔'' حمیرا پھوپھو اسے دیکھتے ہی خوش دلی سے بولیں پھر اچانک ہی انہیں خیال آیا۔

''ارے، کیا اکیلے ہی چلے آئے۔ بیوی بچے کو ساتھ نہیں لائے، انہیں بھی تو بلایا تھا۔''

''طبیعت ٹھیک نہیں ہے عفت کی، عاطف سو گیا تھا۔ اس لیے میں اکیلا ہی چلا آیا۔'' تھکا ہارا پژمردہ چہرے کے ساتھ جھوٹ بولتا ہوا وہ صوفے پر گر سا گیا۔

''تھک جاتا ہوگا میرا بچہ! نوکری میں تو پھر بھی وقت پہ جانا، وقت پہ آنا۔ ہفتے میں چھٹی، عید تہواروں پر چھٹی، اپنے کام میں تو یہ سب کچھ بھی نہیں، نہ جانے کا وقت مقرر، نہ آنے کا۔ نہ کوئی چھٹی، کیسا کمزور ہو گیا پہلے سے، ہے نا۔'' انہوں نے جملہ حاضرین سے تائید چاہی۔

''امی کے جانے کے بعد سے اور بھی کمزور ہو گئے ہیں۔ اس عورت کی زبان تو ہرے بھرے پیڑ کو بھی سوکھا کر دے۔'' عظمیٰ نے تنفر سے کہتے ہوئے پیار اور فکر سے اپنے بھائی کو دیکھا۔

ارسلان بھی آ کر بیٹھ گیا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے کرتے پتا نہیں کیسے ماضی کی طرف رخ مڑ گیا۔ بچپن کی باتیں کرنے لگے، سب کا بچپن ایک ساتھ گزرا تھا۔ ایک ساتھ کھیلتے ہوئے، ایک دوسرے سے روٹھتے مناتے ہوئے، جھگڑے کرتے صلح کرتے ہوئے۔ ارسلان کو پتا نہیں کون کون سے قصے یاد آ رہے تھے، شہید احمد کے ساتھ ہنس ہنس کر وہ باتیں دہرا رہا تھا۔ عظمیٰ اور حمیرا پھوپھو زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ سن رہی تھیں۔ مہربانو خاموشی سے سن رہی تھی، سنتے سنتے اچانک ہی اس کا چہرہ زرد ہوا اور وہ وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ سب ہی نے اس کے یوں اٹھ کر جانے کو محسوس کیا مگر بولا کوئی کچھ نہیں۔

کھانا لگا تو پھر پتا نہیں کون کون سی یادیں تازہ ہو گئیں۔

مٹن پلاؤ کھاتے ہوئے اس کے حلق میں چاول پھنسنے لگے۔ مہربانو نے نوعمری میں پہلی بار پلاؤ بنایا تھا، چاول ٹھیک طرح سے دم بھی نہیں آئے تھے کہ شوق کے مارے اس نے جلدی سے ڈھکن ہٹا کر ایک پلیٹ میں پلاؤ نکالا اور شہید احمد کے پاس لے آئی۔

''کھا کے دیکھو، کیسے بنے ہیں۔''

اس کا دل رکھنے کو شہید احمد نے وہ پوری پلیٹ کھالی، چاول سخت تھے ان میں اچھی خاصی کنی موجود تھی۔ بعد میں جو شہید کے پیٹ میں درد ہوا، وہ ہی جانتا تھا۔

''یاد ہے بھائی! ایک بار مہر نے کچا پلاؤ کھلا دیا تھا آپ کو، رات بھر پیٹ کا درد لے کر بیٹھے رہے تھے۔'' عظمیٰ اچانک ہی بولی تھی۔

''ہاں۔'' شہید دھیرے سے مسکرا دیا۔ مہربانو کا چہرہ حسب معمول سپاٹ تھا۔

''یہ تو سب کچھ بھول گئی ہے، بولنا بھی، مسکرانا بھی۔'' شہید احمد نے تاسف سے سوچا۔

''اور یاد ہے ایک بار مہر اور آپ.......'' عظمیٰ کو کچھ یاد آیا۔ وہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ شروع ہو گئی تھی۔

''کیا فضول باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو، یہ کوئی موقع ہے گڑے مردے اکھاڑنے کا۔'' مہر نے انتہائی تلخ لہجے میں اسے ٹوکا تھا۔

عظمیٰ کے چہرے پر خفت چھا گئی، باقی سب چپ چاپ یوں کھانا کھا رہے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

☆☆☆

عفت نے آج کل نئی ضد پکڑ لی تھی، نیا گھر بلکہ یہی کہنا مناسب ہوگا کہ نئی جگہ، کسی دوسری جگہ نیا گھر لینے کی فرمائش، اب ضد کی صورت اختیار کر گئی تھی۔

شہید احمد کی سمجھ میں اچھی طرح آ رہا تھا کہ اس ضد کے پیچھے کون سی سوچ اور جذبہ کارفرما ہے۔ یقیناً وہ نہیں چاہتی تھی کہ شہید احمد اپنی بہن یا اس کے سسرال سے کوئی تعلق رکھے اور شہید یہ کر نہیں سکتا تھا۔ اس کی ایک ہی بہن تھی وہ بھی چھوٹی۔ عظمیٰ کے لیے وہ اب ماں اور باپ دونوں کی حیثیت رکھتا تھا۔ پھوپھو کے گھر دھیرے دھیرے دوبارہ جانا شروع کر دیا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

''مجھے نہیں رہنا یہاں، نہ اس گھر میں، نہ اس محلے میں، نہ علاقے میں۔''

''اب یہاں کیا کانٹے چبھنے لگے ہیں تمہیں؟''

عفت کی بے جا ضد پر شہید احمد کا پارہ ہائی ہونے لگا۔

''ایک نہیں، کئی کانٹے ہیں یہاں۔ کہو تو نام بتا دوں ان کانٹوں کے؟'' عفت نے شعلہ بار نگاہوں سے شوہر کو دیکھا، اس کی نئی سرگرمیاں یا آنیاں جانیاں عفت سے پوشیدہ نہیں تھیں۔

''بلاوجہ کے وہم پالے ہوئے ہیں تم نے۔''

شہید احمد مزید بحث سے نجات کے لیے کمرے بلکہ گھر سے باہر ہی نکل گیا۔ وہ عفت کی دن رات دوسرے گھر کی رٹ سے عاجز آ گیا تھا۔ وہ اپنی زندگی کو سیدھے سادے طریقے سے۔ ایک ہی رستے پر گامزن رکھنا چاہتا تھا مگر ہم سفر بھی تو ساتھ دے، بدگمانی اور شکوک و شبہات نے عفت کی آنکھوں پر پٹی باندھی ہوئی تھی۔ اس کے دل و دماغ کو اپنے شکنجے میں لیا ہوا تھا۔

مرد کے قدموں میں کہیں لغزش اگر نظر بھی آئے تو عورت کے لیے بہت صبر اور احتیاط کا مقام ہوتا ہے۔ شور مچانے سے مرد مزید بے باک ہو جاتا ہے پھر شہید احمد تو اپنے قدموں کو، اپنی ذات کو، اپنے آپ کو، اپنی بیوی بچے تک محدود رکھنا چاہتا تھا مگر بیوی کی دن رات کی چخ چخ اسے گھر اور گھریلو زندگی سے بے زار کر رہی تھی۔ عفت کا شک اس کی پاک دامنی کو کھائے جا رہا تھا۔

ٹھیک ہے اس نے مہربانو سے محبت کی تھی مگر وہ اس کا ماضی تھا۔ اب جو کچھ مہربانو کی زندگی تھی، اس کے حالات تھے، اسے مہربانو سے ہمدردی ضرور تھی مگر وہ اس ہمدردی کو بنیاد بنا کر اپنے گھر اور ازدواجی زندگی کو داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔

وہ جب بھی یہ سب کچھ عفت کو سمجھانے کی

کوشش کرتا، وہ اس کا الٹا مطلب لیتی۔ شہید احمد کی صفائی سے اسے لگتا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ ضرور دل میں کوئی کھوٹ ہے جو شہید احمد یوں بار بار اپنی صفائی پیش کر کے خود کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ عفت تنی ہوئی تھی، شہید احمد کھنچنے لگا تھا۔ دونوں کے درمیان رشتہ کیوں کر قائم رہتا؟

☆☆☆

ایک، دو، تین، چار اور پھر پانچواں دن بھی گزر گیا۔ شہید احمد نے آرزو کے سامنے موبائل رکھ دیا۔ سامنے اسکرین پر عاطف کا نمبر چمک رہا تھا، ایک کلک کرنا تھا اور اس سے رابطہ ہو جاتا۔

''آپ خود کیوں نہیں کر لیتے اس سے بات، آپ کا بیٹا ہے، اک دم ہی لاپروا ہو کر بیٹھ گیا آرام سے۔''

آرزو کو شدید غصہ آ رہا تھا، عاطف پر بھی اور شہید احمد کی اور اپنی ماں کی بے چینی اور بے قراری دیکھ کر اور زیادہ طیش کھانے لگتی۔ ہر آہٹ پر وہ یوں چونکتے جیسے عاطف آیا ہوگا، نظریں مستقل دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔

شہید احمد خاموشی سے آرزو کو دیکھ رہے تھے۔ آنکھوں میں التجا تھی۔

''اچھا بھئی۔'' آرزو نے عاطف کا نمبر کلک کر دیا، بیل جا رہی تھی۔

''ہیلو۔''

''میں آرزو بات کر رہی ہوں، آپ شاید بہت مصروف ہوں گے تب ہی بھول گئے کہ یہاں آپ کا انتظار ہو رہا ہے شدت کے ساتھ۔'' آرزو بغیر کسی تمہید کے شروع ہو گئی۔

''آرزو! میری بات غور سے سنو، امی کو پتا چل گیا ہے کہ میں ابو اور پھوپھو سے رابطے میں ہوں۔ وہ بہت غصے میں ہیں۔ مجھ سے وعدہ لیا ہے انہوں نے، قسم اٹھوائی ہے کہ میں ابو سے نہ ملوں، نہ ہی بات کروں۔ میں اسی لیے نہیں آ سکا۔'' عاطف بولتے بولتے سانس لینے کو رکا۔

''پھر کب آؤ گے؟'' آرزو کی مضطرب آ...
جیسے کسی گہرے کنویں سے آ رہی تھی۔

''مجھے خود نہیں معلوم، کوشش کر رہا ہوں ...
طرح امی کو منا لوں، مگر مجھے معلوم ہے کہ میری کوشش ...
کامیابی کی منزل شاید ہی چھو سکے۔'' عاطف کا لہجہ ...
یاسیت کی حدوں کو چھو رہا تھا۔

''ابو اور پھوپھو کو ہرگز کچھ مت بتانا۔ دعا کر...
کوئی راستہ نکل آئے۔''

عاطف کا شکستہ لہجہ اسے توڑ گیا۔ راستہ کہاں سے نکلے؟ گھنے جنگلوں میں، اندھی گپھاؤں میں، تاریک سرنگوں، جلتے بھنتے ریگستانوں میں اور آسمان کو چھوتی سنگلاخ چوٹیوں میں، کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آتا ہے مگر زندگی اس گنبد میں کہاں سے راستہ پاتی جہاں کوئی در ہو نہ دریچہ۔ آرزو خیالات کی بھول بھلیوں میں ایسی الجھی کہ ان دو چہروں کی طرف دھیان بعد میں گیا جو کرب کی لکیریں خود پر سجائے بے آس آنکھوں اور نامراد دلوں کے ساتھ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ دروازے کی طرف دیکھنے کا اور دیکھتے رہنے کا کیا فائدہ تھا، آنے والے کی آمد کا راستہ نفرت کے زہریلے کانٹوں سے اٹ گیا تھا۔

آرزو، ماں اور ماموں کے دکھی، مایوس چہرے دیکھ کر خود کو ملامت کر رہی تھی۔ اسے سوچنا چاہیے تھا کہ عاطف اتنے دن نہیں آیا تو ضرور کوئی خاص وجہ ہوگی۔ اس نے بے سوچے سمجھے اسپیکر کھول کر ماموں کے سامنے موبائل رکھ دیا اور انہوں نے سن لیا، وہ سب جو انہیں نہیں سننا چاہیے تھا جو عاطف انہیں نہیں بتانا چاہتا تھا، وہ انہیں پتا چل گیا۔ اذیت ناک خاموشی کا اندھیرا کمرے میں موجود تین نفوس کے درمیان پھیلا ہوا تھا۔ اس اندھیرے میں کسی کو کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا، نہ ایک دوسرے کے چہرے، نہ زندگی کا وجود نہ وہ خوشی جو کچھ دنوں ان کے ہمراہ رہی پھر ساتھ چھوڑ گئی۔ اسی اندھیرے میں تینوں ایک دوسرے سے نظریں چرائے بیٹھے رہے۔

☆☆☆

وہ حسب معمول آن لائن تھی اپنی کھنکتی ہنسی کے ہمراہ۔

''آج کل آپ بڑے چپ چپ سے ہیں؟'' سوال کے ہمراہ تشویش کا رنگ بھی تھا۔

''خاموشی کوئی بری چیز تو نہیں۔'' عاطف نے اس بات کی حمایت میں کہا جو دھیرے دھیرے اس کے اندر بس رہی تھی۔

''مجھے خاموشی اچھی نہیں لگتی۔'' ثانیہ کا انداز ایسا تھا جیسے کہنے کے ساتھ ساتھ اپنی تیکھی سی ناک بھی سکوڑی ہو۔

''معلوم ہے، جہاں تم ہوتی ہو وہاں خاموشی خود ہی اٹھ کر بھاگ جاتی ہے۔'' عاطف نے دھیرے سے کہا تھا۔

''اسے تعریف سمجھوں یا......''

''تعریف سمجھیے۔''

''آج پہلی بار آپ نے میری تعریف کی ہے۔ وہ بھی اس بات پر جس پر گھر والوں سے اکثر ڈانٹ ہی سننے کو ملتی ہے۔'' ثانیہ کا انداز روٹھا روٹھا تھا۔

''آپ بے فکر رہیں، اس گھر میں آپ کو اپنی اس عادت پر ڈانٹ ہرگز نہیں پڑے گی۔ امی تو چاہتی ہی یہی تھیں کہ گھر میں کوئی بولنے والا طوطا یا مینا ہو۔'' عاطف بے ساختہ بولا تھا اور وہ بے ساختہ ہی ہنسی تھی۔

''کیا جوڑی بنائی ہے آپ نے ہماری، طوطا اور مینا۔''

''جوڑی تو اللہ نے بنائی ہے، بندوں کے بس میں ہوتا تو شاید......'' عاطف نے دل کی بات دل میں ہی رکھی اور خاموشی پر اکتفا کیا۔

''ایک تو آپ کو نہ جانے کیا ہو جاتا ہے تھوڑی تھوڑی دیر بعد مراقبے میں چلے جاتے ہیں۔'' عاطف کی خاموشی طویل ہوئی تو ثانیہ کا شکوہ بول اٹھا۔

''آپ بولیے، میں سن رہا ہوں۔'' عاطف نے ایک گہری سانس لی۔

''میں ہی بولتی رہتی ہوں۔ آپ تو کچھ بولتے ہی نہیں، بس سنتے رہتے ہیں۔'' اب کی بار شکوے میں ناز کا رنگ تھا۔

''یہ تو آئیڈیل لائف کی علامت ہے۔''

''اچھا اور کیا کیا علامات ہوتی ہیں آئیڈیل لائف کی؟'' وہ شوخ کچھ اور شریر ہوئی۔

''کل بات کریں، اب مجھے نیند آ رہی ہے۔'' عاطف یک دم ہی سنجیدہ ہوا تھا۔

''ٹھیک ہے، اللہ حافظ۔'' ثانیہ ہمیشہ بغیر کسی چوں چرا کے اس کی مرضی پر فون بند کر دیا کرتی تھی۔

''آرزو! کاش تم مجھے نہ ملی ہوتیں یا مل گئی ہوتیں۔''

یک دم ہی عاطف کے دل میں ایک انوکھے خیال نے سر اٹھایا اور عاطف سہم گیا تھا۔ زندگی میں ایسے خیالات کی کوئی گنجائش نہیں تھی پھر بھی پتا نہیں کسی کونے کھدرے سے اس طرح کی سوچ خودرو پودے کی طرح سر اٹھا کر اپنی موجودگی کا اظہار کرتی تھی۔ ہر بار وہ اس پودے کو سر اٹھاتے ہی کچل دیتا مگر سرزمین دل پر جانے کتنے بیج پڑے تھے۔ اپنائیت کے، شناسائی کے، الفت کے، قدر و منزلت کے اور محبت کے کہ ہر دوسرے چوتھے روز کوئی نہ کوئی بیج اس کی تمام ترسختی اور رکاوٹ کو بڑی خاموشی سے مات دے کر بے حد آرام سے نمودار ہو جاتا۔ فاتحانہ انداز میں وہ عاطف کو دیکھتا اور عاطف کی بے بسی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔

آج آرزو سے بات کر کے دل کی بے کلی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ ثانیہ سے حالانکہ روز بات ہوتی تھی، جب تک بات ہوتی وہ ثانیہ کے ہمراہ رہتا۔ بات ختم، اس کی موجودگی کا احساس بھی ختم، مگر یہ آرزو کیا جادوگرنی تھی کہ ہر وقت، ہر پل اس کے خیال کے ساتھ ساتھ تھی۔ وہ دیکھنا نہیں بھی چاہتا تو اسے نظر آ جاتی، وہ سوچنا نہیں بھی چاہتا مگر وہ اس کے خیالوں میں دندناتی رہتی۔

''کیا مصیبت بن گئی ہے یہ زندگی۔''

عاطف نے آنکھیں زور سے میچتے ہوئے تکیے میں منہ گھسیڑا۔ آرزو کے ساتھ ساتھ اس وقت اسے اپنے باپ کا خیال شدت سے آ رہا تھا۔ پتا نہیں کیسے ہوں گے؟ اس کا اضطراب اور بے چینی حد سے سوا

ہو رہی تھی اور اس سے زیادہ مضطرب اور بے قرار عفت ہو رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ پل پل بیٹے کے ساتھ رابطے میں رہتیں، نوکری کی مجبوری تھی ورنہ ایک لمحے کو بھی عاطف کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتیں۔ جب تک وہ شام میں واپس گھر نہیں آ جاتا، وہ جلے پیر کی بلی بنی گھر میں ادھر سے ادھر چکر لگاتی رہتیں۔

عاطف کو خاموش اور اداس دیکھتیں تو اس پر برس پڑتیں۔ آج بھی اسے چپ چاپ کھانا کھاتے دیکھ کر ان کا لہجہ تند ہو گیا۔

''تم کس بات کا سوگ منا رہے ہو؟''

''کسی بات کا نہیں، آپ پلیز کسی کے بھی بارے میں سوچ سوچ کر ہلکان مت ہوں۔ ڈاکٹر نے پرسکون اور خوش رہنے کو کہا ہے۔'' عاطف کو ماں کی صحت کی، ذہنی حالت کی بہت فکر تھی۔

''خوش کیسے رہ سکتی ہوں، پہلے تمہارے باپ کی مہربانیوں نے خوشیوں کو مجھ سے دور کر دیا۔ اب اس شخص کی جگہ تم نے لے لی ہے۔''

''میں آپ کے پاس ہوں اور آپ کے ہی ساتھ ہوں۔ آپ مجھ پر اعتبار نہیں کر رہیں، اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی پریشان کر رہی ہیں۔''

عاطف نے بے بسی کی آخری حدوں کو چھوتے ہوئے ماں کو دیکھا۔ بیک وقت دو ایسے لوگوں سے محبت کرنا جو آپس میں بے گانگی اور نفرت کا رشتہ رکھتے ہیں، بہت ہی جاں گسل اور مشکل کام ہے۔ راہ میں سانسیں اکھڑنے والا معاملہ ہوتا ہے۔

عاطف کی حالت کچھ اس طرح کی ہو گئی تھی کہ جیسے ایک طرف شہید احمد اور دوسری طرف عفت، دونوں اس کا ایک ایک بازو پکڑ کر اپنی اپنی طرف گھسیٹ رہے ہوں۔ درمیان میں کھڑا عاطف تکلیف سے ادھ موا ہوا جا رہا تھا۔ اس کا محبت بھرا دل بیک وقت دو متضاد سمتوں میں کھنچ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ اس کے وجود کے پرزے پرزے ہو رہے تھے، پرخچے اڑ رہے تھے اور وہ بے بسی کے عالم میں خود کو بکھرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

آرزو اور ثانیہ کے معاملے میں بھی کچھ اسی قسم کا حال تھا اس کا، عفت اور شہید احمد کے ساتھ خون کے رشتوں کی کشش اور محبت تھی۔ یہاں دل کا معاملہ تھا، دل آرزو کے لیے تڑپ رہا تھا، اسی کی طرف ہمک رہا تھا۔ قسمت اس کے ہاتھوں میں ثانیہ کا ہاتھ دے رہی تھی حالانکہ ثانیہ بہت اچھی لڑکی تھی۔ تعلیم یافتہ، خوش مزاج، سمجھ دار پھر باتوں باتوں میں کتنی بار اس نے جتایا تھا کہ اس کے دل اور زندگی میں کتنا خاص اور اہم مقام ہے اس کا۔ خوب صورتی میں وہ آرزو سے کسی طرح بھی کم نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی تھی، پھر بھی دل پر اسی بد مزاج لڑکی کا راج تھا جو عاطف کے ساتھ ڈھنگ سے شاید بات کرنا بھی اپنی توہین سمجھتی تھی۔ اسی اکھڑ مزاج کے لیے عاطف کا دل پانی ہوا جا رہا تھا۔

وہ آرزو کے خیال کو پرے دھکیل دھکیل کر تنگ آ گیا تھا، تھک گیا تھا مگر وہ وہیں دل کے کسی کونے میں براجمان چپکے چپکے مسکراتی رہتی۔ زندگی انتہائی عجیب ڈگر پر چل پڑی تھی، زندگی اور دل کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر عاطف پریشان بھی تھا اور خوف زدہ بھی۔

☆☆☆

مہر بانو آج جس حال میں تھی، اس کا گھر اجاڑنے میں اس کا اپنا اور کسی کا کتنا ہاتھ تھا۔ یہ قضیے اپنی جگہ مگر حقیقت تو یہ تھی کہ گھر مہر بانو کا اجڑا تھا اور زندگی عظمٰی کی خراب ہو رہی تھی۔ مصیبت، آفت اور پریشانی اسے جھیلنی پڑ رہی تھی۔

مہر بانو کا دماغ، مزاج اور زبان پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو چکے تھے۔ ذرا ذرا سی باتوں پر عظمٰی کو ایسی بے نقط سناتی کہ وہ روہانسی ہو جاتی۔ ساس اور شوہر کا کچھ لحاظ تھا اور کچھ خوف کہ وہ مہر کے ساتھ دوبدو زبانی جنگ نہیں کر سکتی تھی۔ بچوں کی معمولی معمولی شرارتوں پر وہ آرزو اور اسامہ پر ہاتھ بھی اٹھا لیتی۔

اس بات پر عظمٰی کا دل بہت دکھتا، وہ بری طرح جل کر رہ جاتی، ساس سے دبی زبان میں شکایت کرتی تو وہ ان سنی کر جاتیں۔ جان بوجھ کر پہلو تہی کرتیں، ارسلان کو بتاتی تو وہ الٹا اس پر برس پڑتا۔

''میں دن بھر ڈیوٹی بھگتا کر تھکا ہارا گھر آتا ہوں۔ تم یہ جھگڑے لے کر بیٹھ جاتی ہو میرے آگے۔ آپس کی باتیں، خود ہی نپٹا لیا کرو۔ اب میں بچوں کی باتوں کے پیچھے اپنی ماں بہن سے لڑائی لڑوں؟''

''لڑنے کو کون کہہ رہا ہے؟ سمجھا تو سکتے ہو۔''

''کیا سمجھاؤں، مہر بانو بچی تو نہیں ہے پھر تمہیں خود بھی سمجھنا چاہیے۔ وہ فرسٹریشن کا شکار ہے، مشکل حالات میں ہے۔ برا وقت آیا ہوا ہے اس پر، اس کی دل جوئی کرو، تسلی دو۔ اس کی مدد کرنے کے بجائے تم اس کے خلاف محاذ کھول رہی ہو۔''

ارسلان اکثر ہی روایتی مرد بن جاتا تھا، بیوی کی بات سننے اور سمجھنے کے بجائے اسے الٹا چپ کروا دیتا۔ جیسا کہ اگر وہ اپنی امی اور بہن کے خلاف بیوی کی کوئی بات سن لے تو فوراً زن مرید بن جائے گا۔

گھریلو سیاست اور رشتوں کا عجیب اور گمبھیر سلسلہ تھا۔ کسی حد تک روایتی، حمیرا نے بیٹے کو یوں مٹھی میں لیا ہوا تھا کہ ان کی مرضی کے بغیر وہ سانس بھی نہیں لے سکتا تھا۔ بیٹے نے اپنا انگوٹھا، بیوی کے ٹینٹوے پر رکھا ہوا تھا، وہ ذرا سی چوں چرا بھی نہیں کر سکتی تھی مگر عظمٰی اب درحقیقت بہت تنگ آ گئی تھی مہر بانو سے۔ دن رات یہ ہی سوچتی رہتی کہ کسی طرح مہر بانو اس گھر سے چلی جائے، اس کا صرف ایک ہی حل تھا مہر بانو کی شادی اور اس کی شادی اتنا مشکل یا ناممکن بھی نہیں تھا۔ وچولن کی مدد سے رشتے آ رہے تھے مگر وہ دونوں ماں بیٹے کی نگاہوں میں نہیں جچتے تھے۔ جب سے شہید احمد اکثر یہاں آنے لگا تھا، وہ پھر سے ماضی میں جینے لگی تھی۔

ادھر عفت بدستور اپنی روش پر قائم تھی، یہاں سے دور کسی اور علاقے میں گھر لینے کا اس کا مطالبہ دن بدن زور پکڑتا جا رہا تھا۔ شہید احمد کی کوئی بات، کوئی دلیل، کوئی جواز اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''میری دکان یہیں ہے، کاروبار یہیں ہے، سب کچھ یہاں چھوڑ کر کہیں اور کیسے چلا جاؤں؟''

شہید احمد بری طرح جھنجلا ہی گیا تھا۔

''لوگ ایک علاقے سے دوسرے علاقے نوکری کرنے بھی جاتے ہیں اور کاروبار کرنے بھی۔ میں کوئی دوسرے شہر جانے کا نہیں کہہ رہی۔'' عفت نے ترنت جواب دیا تھا۔

''میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا، یہیں رہوں گا۔ تم فیصلہ کر لو، تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے تو یہیں رہنا پڑے گا۔ کہیں اور تو میرے بغیر رہنا ہو گا، اب آگے تمہاری مرضی ہے۔''

شہید احمد کے صبر کے تمام پیمانے لبریز ہو گئے، سخت لہجے میں آج اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ابھی اس کے پچھلے اشتعال اور غصے کی تلخی، عفت کے دل میں باقی تھی جب اس نے عفت کے شکوک و شبہات کو سچ کرنے کی دھمکی تھی۔ اب پھر وہ ایسے سخت اور فیصلہ کن لہجے میں بات کر رہا تھا۔ شہید احمد کا یہ لہجہ اور رویہ عفت کا یقین پختہ کر دیتا تھا کہ وہ جو کچھ سوچ رہی ہے، صحیح سوچ رہی ہے۔ جو کچھ سمجھ رہی ہے، صحیح سمجھ رہی ہے ورنہ شہید احمد مشتعل کیوں ہوتا؟

''سچ سننے کی برداشت نہیں ہے اس شخص میں۔ آئینہ دیکھنے کی تاب نہیں ہے۔'' عفت نے ایک استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ شوہر کو دیکھا۔

''اچھی طرح جانتی ہوں، یہاں رہنے کی، یہاں سے نہ جانے کی وجہ کیا ہے؟ آپ تو جائیں گے نہیں تو میں ہی چلی جاتی ہوں۔ دیکھتی ہوں، آپ کو اپنا ماضی اور اس سے جڑے لوگ پیارے ہیں یا اپنا حال اور مستقبل، جس میں آپ کی بیوی ہے اور بیٹا ہے۔''

عفت نے بھی ایک بازی لگانے کی ٹھانی اور وہی غلطی کی جو مہر بانو نے کی تھی۔ مسئلہ چھوٹا ہو یا بڑا، شوہر کا گھر جو عورت کا اپنا ہی گھر ہوتا ہے، چھوڑ کر چلے جانا کوئی عقل مندی نہیں، نہ ہی مسئلے کا حل ہے۔ میدان میں رہتے ہوئے بھی جنگ لڑی اور جیتی جا سکتی ہے۔ میدان کارزار سے باہر نکل آنے کے بعد جیت کبھی مقدر نہیں بنتی۔ شکست اور پسپائی ہی حصے میں آتی ہے۔

عفت اس زعم میں میکے چلی گئی کہ اس کی نہ سہی مگر بیٹے کی کشش اور محبت شہید احمد کو اس کے پیچھے کھینچ لائے گی۔ اس کا خیال کسی حد تک درست تھا، ایک باپ اپنے بیٹے کی محبت میں اس سے ملنے، اسے گھر واپس لے جانے کے لیے آتا رہا، واپسی کے لیے اصرار کرتا رہا مگر عفت کی واپسی کی جو شرط تھی وہ اسے ماننے سے انکاری تھا۔

اس گھر سے میرے والدین کی یادیں جڑی ہوئی ہیں، میں اسے کسی حال میں نہیں چھوڑ سکتا۔ شہید احمد نے معاملے کو افہام و تفہیم سے سلجھانے کے بجائے ضد اور انا کا مسئلہ بنالیا۔ ضد کے جواب میں ضد اور ہٹ دھرمی دکھانے سے معاملات الجھتے ہی ہیں، حل نہیں ہوتے۔ عفت اور بیٹے کے چلے جانے سے جہاں وہ جذباتی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا وہیں گھر اور گھریلو ذمہ داریاں دیکھنے والا کوئی نہ رہا۔ عظمیٰ تھوڑی دیر کو گھر آجاتی اور اپنی نگرانی میں ملازمہ سے صفائی ستھرائی کروالیتی۔ کھانے کے لیے اس نے اور حمیرا نے شہید احمد کو کہہ دیا تھا کہ وہیں کھالیا کرے۔ مستقل ہوٹل بازی بھی اس کے ذوق اور معدے پر گراں گزرتی تھی۔ بہن کے گھر کھانا معیوب لگ رہا تھا مگر حمیرا نے ڈانٹ دیا۔

''بہن کی سسرال تو بعد میں ہے، پہلے پھوپھو کا گھر ہے۔ خبردار جو فضول باتیں کیں، یہیں آجایا کرو۔''

عظمیٰ نے بھی اپنی مجبوری ظاہر کی۔

''بھائی، یہاں کی ساری ذمہ داری بھی مجھ پر ہی ہے۔ بچے دونوں چھوٹے ہیں، میں دو گھر بیک وقت نہیں سنبھال سکتی۔ صفائی وغیرہ کروادوں گی مگر وہاں جاکر پکانا، پھر یہاں کا کرنا، یہ میرے بس کی بات نہیں، آپ یہیں آکر کھانا کھالیا کریں۔''

شہید احمد باقاعدگی سے وہاں جارہا تھا۔ مہر بانو سے کبھی سامنا ہوجاتا، مختصر سی بات ہوجاتی، کبھی وہ بھی نہیں ہوتی۔ مگر اس کا اداس اور سوگوار چہرہ، شہید احمد کو یاسیت میں مبتلا کردیتا۔

''ایک بات پوچھوں؟'' کھانا کھاتے ہوئے شہید احمد نے ذرا جھجک کر کہا۔

''جی بھائی! پوچھیے۔'' عظمیٰ پانی کا جگ رکھتے ہوئے حیران ہوئی۔

''مہر بانو کی کہیں اور شادی کیوں نہیں کردیتیں پھوپھو! اس طرح کیسے زندگی گزارے گی۔''

''شادی کے لیے تو پھوپھو چاروں طرف ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں، رشتے آتے ہیں، سمجھ میں نہیں آتے۔'' عظمیٰ نے دھیمے سے جواب دیا۔

''میں تو چاہتی ہوں، کل کی ہوتی شادی آج ہوجائے مگر میرے بس میں کچھ نہیں ہے۔ کبھی سوچتی ہوں، آپ سے ہی ہوجاتی پہلے تو میرے سر پر یہ مصیبت بن کر نہ بیٹھتی۔ اتنی چڑچڑی ہوگئی ہے کیا بتاؤں، جب سے معیز کی دوسری شادی کی خبر ملی ہے، بالکل ہی کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔'' عظمیٰ روانی سے بولتی ہی چلی گئی۔

''مہر شروع سے ہی بہت نازک مزاج تھی۔''

''اب اور بھی زیادہ ہوگئی ہے، خیر چھوڑیے! یہ بتایئے عفت بھابھی کا دماغ کچھ درست ہوا یا نہیں۔''

''نہیں۔'' شہید احمد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہی رٹ لگائی ہوئی ہے۔''

''جیسے مہر نے ضد اور بحث بازی میں اپنا گھر برباد کیا، یہ بھی وہی کریں گی۔ بے کار کی ضد پکڑلی ہے۔'' عظمیٰ نے منہ بنایا۔

''بچے کا مسئلہ نہیں ہوتا تو میں تو کہتی کہ اس عورت کو چھوڑ ہی دیں۔ عجیب دماغ اور مزاج پایا ہے۔'' عظمیٰ کے دل میں بھی عفت کے رویے کے خلاف تلخی بھری ہوئی تھی۔

''مرد کی انا کو چوٹ پہنچے اور چھوڑنے پر آجائے تو بچے کی پروا بھی نہیں کرتا۔ معیز عالم نے بھی اپنے بچے کی پروا نہیں کی۔'' شہید احمد نے عجیب سے لہجے میں کہا اور گلاس میں پانی انڈیلنے لگا۔

''ہاں، پہلے پروا نہیں کی، اب ہر ہفتے چھٹی کا دن بچہ وہیں گزارتا ہے۔ پتا نہیں ایسا کب تک چلے گا۔ ان کے اپنے بچے ہوجائیں گے، مہر کی بھی کہیں اور شادی ہوگئی تو اس بچے کا مستقبل کیا ہوگا؟ والدین کے آپس کے جھگڑوں میں ان کے بچوں کی خواری ہوجاتی ہے۔''

''ایسا ہوتا ہی کیوں ہے؟'' شہید احمد کی آنکھوں میں بے بسی تھی۔

''بس شاید نصیب کے کھیل ہیں۔'' عظمیٰ برتن اٹھانے لگی۔

''ہر معاملہ نصیب پر ڈال کر انسان خود بری الذمہ ہوجاتا ہے۔''

عفت کو گئے ایک ماہ ہونے کو تھا۔ میکے میں والدین فوت ہوچکے تھے۔ بھائی بھاوج تھے، انہوں نے سمجھایا بجھایا مگر عفت کی ضد اور ہٹیلے پن کو دیکھ کر خاموش ہوگئے۔

☆☆☆

مہر بانو کے لیے ایک رشتہ تھا، زیادہ عمر نہیں تھی۔ لڑکا سا ہی تھا، دو سال پہلے شادی ہوئی تھی، بیوی ایکسیڈنٹ میں فوت ہوگئی تھی۔ بچہ کوئی نہیں تھا، وہ مہر بانو کی تصویر دیکھ گیا تھا مگر اسے بیوی کے ساتھ بچہ قبول نہیں تھا، بس ایک یہ ہی شرط تھی اس کی۔ ویسے ہینڈسم تھا، نوکری اور تنخواہ اچھی تھی۔ بہن بھائی شادی شدہ تھے، والدہ فوت ہوگئی تھیں، والد حیات تھے، ان ہی کے ساتھ رہتا تھا۔ مہر بانو نے شرط سنتے ہی انکار کردیا۔

''میں اپنے بچے کو چھوڑ کر شادی نہیں کروں گی۔''

''ارے تھوڑے عرصے کی بات ہے، جب تک میں پال لوں گی۔ لڑکا ہے، کل کو بڑا ہوگا۔ اپنے ماں باپ کے کام آئے گا۔ شوہر کو یہ بات سمجھا دینا، سمجھ ہی جائے گا۔ لوگ تو بیٹوں کے لیے منتیں مرادیں، دعائیں مانگتے تھکتے نہیں، یہاں تو پلا پلایا مفت میں بیٹا مل رہا ہے۔ کوئی بے وقوف ہی ہوگا جو انکار کرے گا، دیکھنا...... لے جائے گا تیرے بیٹے کو۔'' حمیرا نے بیٹی کو سمجھایا۔

''اور نہ لے گیا تو؟''

''کیوں نہیں، بیوی چاہے تو شوہر سے ہر بات منواسکتی ہے، تم بھی منوالینا اپنی بات۔''

''پھر وہی پٹیاں پڑھانے بیٹھ گئیں، پہلے والے نے کون سی بات مانی تھی جو اب دوسرے منوائیں گی۔'' کچن میں کام کرتی عظمیٰ کے کانوں تک ان کی آوازیں بخوبی پہنچ رہی تھیں۔

''اور وہ جو بڑے میاں ہیں؟'' مہر بانو نے دوسرا اعتراض اٹھایا۔

''ارے بڈھے کا کیا، قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ آج مرا کل دوسرا دن۔'' حمیرا بیگم نے گویا ناک سے مکھی اڑائی۔

''مجھے نہیں کرنی کوئی شادی وادی۔'' مہر بانو کی ازلی تنک مزاجی پھر عود کر آئی، اٹھ گئی ماں کے پاس سے۔

''مہر! بات کو سمجھنے کی کوشش کرو، اب اس سے اچھا رشتہ ملنا ناممکن ہے۔ اکیلا، نیم سے چھوٹا، کنوارا بر کہاں ملے گا اب۔'' حمیرا بیگم نے دہائی دی۔

''کیوں؟ کیا کمی ہے مجھ میں؟'' مہر بانو کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی ماں کی بات سن کر۔

''کمی تو کوئی نہیں پر داغ تو لگ گیا نا۔ طلاق یافتہ، ایک بچے کی ماں کو ایسا رشتہ مل جائے تو غنیمت سمجھو۔ شکر ادا کرو۔'' حمیرا نے بیٹی کو سمجھانے کے چکر میں بھونڈے پن سے صاف گوئی کی انتہا کردی۔ مہر بانو کے سر پر لگی تو تلووں پر جاکے بجھی، انتہائی بدتمیزی سے ماں سے مخاطب ہوئی۔

''تم نے ہی تو لگوایا ہے داغ۔ مائیں، بیٹیوں کو سمجھا بجھا کر گھر بسانے کی راہ دکھاتی ہیں یا سکھا پڑھا کر گھر اجاڑنے کی صلاح دیتی ہیں۔''

''اچھا، اب آئی ہے یہ عقل؟ پہلے کیوں نہیں آئی۔ جب گز بھر لمبی زبان سے ساس اور شوہر کا جینا حرام کیا ہوا تھا، تیرا گھر میں نے نہیں تیرے دماغ اور زبان نے بگاڑا ہے۔''

حمیرا بیگم بھی غصے میں آپے سے باہر ہوگئیں۔

مہر بانو کی فکر نے ان کی راتوں کی نیندیں حرام کی ہوئی تھیں اور وہ یہ صلہ دے رہی تھی کہ سارا الزام اور ملبہ ماں پر ڈال دیا۔

''احسان فراموش، نمک حرام۔'' وہ غصے میں پھر چلائیں۔

''پھر شروع ہو گئیں دونوں ماں بیٹی۔'' عظمٰی نے ایک گہری سانس لی۔ کچھ عرصے سے اس قسم کی جھڑپیں ماں بیٹی میں آئے دن ہونے لگی تھیں۔ مہر بانو اپنی بربادی کی ذمہ داری ماں کو ٹھہراتی اور وہ مہر بانو کی زبان اور مزاج کو، کچھ دیر بھڑاس نکال کر بول بال کر دونوں چپ ہو جاتیں اور پھر یوں شیر و شکر جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

''میں ہی ہوں مصیبت اس گھر میں۔'' مہر بانو زور سے چلائی۔

''تو اور کیا، تجھ سے بڑی مصیبت کیا ہو گی اس گھر پر۔ سب کی جان مشکل میں ڈالی ہوئی ہے، کیا چھوٹے کیا بڑے۔''

حمیرا بیگم بھی حلق کے بل چیخیں۔ انہیں غصہ آ رہا تھا کہ مہر بانو اب بھی حالات اور وقت کی سنگینی سمجھنے کو تیار نہیں تھی۔

''میں مصیبت ہوں، آفت ہوں، اس گھر پر تو ختم کر دیتی ہوں نا اس مصیبت کو۔'' مہر بانو کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ وہ ماں کے کمرے میں گھس گئی۔

''اب گھس گئی حجرے میں بند ہونے کے لیے۔'' وہ بڑبڑائیں۔

عظمٰی مگر نہ جانے کیوں، مہر بانو کے تیور دیکھ کر کھٹک گئی، وہ کچن سے نکل کر سیدھی کمرے میں اس کے پیچھے پیچھے گئی۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟'' مہر بانو کے ہاتھ میں خواب آور گولیوں کی بوتل دیکھ کر عظمٰی کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔

''کر نہیں رہی...... کر چکی ہوں۔'' مہر بانو نے وحشت زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اب تم سب کو نجات مل جائے گی مجھ سے۔ خوش ہو جانا سب کے سب، میری ماں بھی بہت خوش ہو گی۔ اس کی ساری فکر دور ہو جائے گی۔'' ہذیانی کیفیت میں وہ چلا رہی تھی۔

''اب کیوں چیخ رہی ہے؟'' حمیرا بیگم کمرے میں آ گئیں۔

''مہر نے......'' بُت بنی عظمٰی کے جسم میں کچھ جنبش ہوئی۔ ''مہر نے آپ کی نیند کی گولیاں کھا لیں۔''

عظمٰی جیسے خواب کی سی کیفیت میں بول رہی تھی۔ حمیرا بیگم ایک سناٹے میں آ گئیں اور پھر ان کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی۔

''اری یہ کیا کیا جنم جلی؟'' انہوں نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے دو ہتڑ اپنے سینے پر مارے۔

''میں ارسلان کو فون کر کے بلاتی ہوں۔'' حواس باختہ عظمٰی کی سمجھ میں یک دم یہی آیا۔ وہ تیزی سے اپنے کمرے میں آئی جہاں اس کا موبائل رکھا تھا۔ ارسلان کو کال کرتے ہوئے اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ بدقسمتی سے ارسلان کا نمبر مصروف جا رہا تھا، دوبارہ پلیز ٹرائی ٹو لیٹر سن کر اس نے جھلا کر کال کاٹی اور شہید کو کال کی۔

''بھائی! فوراً ـــ میرے گھر آ جائیں، ایمبولینس لے کر۔'' شہید کا ہیلو سن کر اس نے جلدی جلدی کہا۔

''کیا ہوا، خیریت تو ہے؟'' شہید اس کی بات سن کر یک دم سراسیمہ ہو گیا۔

''وہ...... مہر کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ ارسلان کا نمبر بزی جا رہا ہے، آپ پلیز جلدی سے آ جائیں۔''

عظمٰی کے حواس اس کے قابو میں نہیں تھے، فون بند کر کے وہ بھاگ کر حمیرا بیگم اور مہر کے پاس آئی۔ حمیرا بیگم زور زور سے رو رہی تھیں اور مہر کو جھنجھوڑ رہی تھیں جو آنکھیں بند کیے جھوم رہی تھی۔

''اری اسے ڈاکٹر کے پاس تو لے کے چلو۔'' عظمٰی کو دیکھتے ہی وہ مہر کو کھڑا کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔

''بھائی آ رہے ہیں، ارسلان کا نمبر نہیں ملا۔'' عظمٰی، مہر کی جانب بڑھتے ہوئے بولی۔

''اٹھو مہر! آنکھیں کھولو۔'' بے سدھ ہوتی مہر کے گالوں پر وہ آہستہ آہستہ تھپڑ مار رہی تھی، اتنے میں باہر ایمبولینس کی آواز آنے لگی۔

☆☆☆

قدر اسی کی ہوتی ہے جو دور چلا جائے، اپنے دل پر کڑے پہرے اور ضبط کی انتہائی منزلوں سے گزرنے کے باوجود بھی آنکھیں اس چہرے کو دیکھنے کی تمنائی ہو رہی تھیں۔ جسے دیکھنا ناممکنات میں سے ہو گیا تھا۔ دل اس سے ملنے کو بے قرار ہو رہا تھا، جس کا ملنا ایسا ہی تھا جیسے برسات کے دوران آسمان پر سورج یا چاند دیکھنے کی آرزو کرنا۔

''اس مصیبت کو تم خود ہی اپنی زندگی میں لائی تھیں، بڑے جتن سے ڈھونڈ کر اب بھگتو۔'' آرزو کے اندر کوئی ہنسا تھا۔

''مگر میں اس نیت سے تو نہیں لائی تھی اسے، اس خیال سے تو نہیں ڈھونڈا تھا کہ......''

آرزو کے دل نے صفائی پیش کی، ادھوری صفائی، اس کی ادھوری محبت کی طرح۔ دن مصروفیت میں کسی نہ کسی طرح گزر جاتا مگر رات...... رات تو جیسے گزرنے کے لیے نہیں بلکہ ٹھہرنے کے لیے آتی تھی۔ طویل رات صرف سردیوں کی نہیں ہوتی بلکہ ہر وہ رات طویل اور بہت طویل ہوتی ہے جو ہجر کی ہو، برہا کی ہو، کسی کی بے سبب یادوں کو سینے سے لگائے آنکھیں موندنے والوں کی ہو، جس رات میں کسی کو سوچا جائے، بغیر کسی آس، بغیر کسی امید کے۔ جس رات میں کھلی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھا جائے جس کی کوئی تعبیر نہ ہو۔

تو آرزو کی ہر رات بہت طویل تھی۔ سرما کی سرد رات، کمبل کو اپنے گرد لپیٹے وہ اس لمبی رات کو سحر کرنے کی آس اور امید میں کاٹ رہی تھی۔

کتنا اچھا ہوتا، گر میں تم سے نہ ملی ہوتی۔ کتنا اچھا ہوتا کہ دل تمہاری طلب میں، تمہاری چاہت میں یوں جوگی نہ بنتا اور...... کتنا اچھا ہوتا اگر میرے ان خوابوں کو پورا ہونے کا اتنا سا بھی امکان ہوتا۔ اتنا سا بالکل ذرہ برابر۔

سرد چہرے پر گرم آنسو پھسلنے لگے۔

''کتنا اچھا ہوتا......؟'' آرزو نے اپنی سسکی دبائی، چہرہ صاف کیا۔

یک طرفہ محبت جان لیوا ہوتی ہے، اسے اندازہ تھا، مگر اتنی جان لیوا ہوتی ہے، یہ معلوم نہ تھا۔

☆☆☆

امی اب اس سے اتنی ناراض تو نہیں تھیں، یا اگر تھیں بھی تو اظہار نہیں کر رہی تھیں مگر بہرحال ان کا رویہ اب کافی بہتر ہو گیا تھا۔ تقریباً پہلے ہی جیسا۔

آج کھانے میں انہوں نے کالی ماش کی دال گوشت میں ڈال کر پکائی تھی۔ گاجر کا حلوہ بھی تھا، خواہش، رغبت اور بھوک ہونے کے باوجود بھی عاطف نے ہاتھ روک کر ہی کھایا۔ پتا نہیں کیوں دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی، اڑا اڑا سا دل، کسی بات میں، کسی چیز میں نہیں لگ رہا تھا۔

رات میں امی کے ہاتھوں کا بنایا ہوا شنیل کا لحاف اوڑھتے ہوئے بدن عجب طرح سے سنسنا رہا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے مجھے؟'' وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ لحاف ایک طرف کیا، اس سردی میں بھی اس کے ماتھے پر ہلکا ہلکا پسینہ آ رہا تھا۔ وہ جانے کیا کچھ سوچ رہا تھا، اپنی گھبراہٹ کی وجہ جاننے کی، سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، موبائل بجنے لگا۔

''اوہ...... پھر وہی۔'' اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ اسکرین پر نگاہ ڈالے بغیر اس نے موبائل آف کر دیا۔ اس وقت اس کا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا کسی سے بات کرنے کو، ثانیہ سے بھی نہیں۔

پتا نہیں کتنی رات گئے وہ جاگتا رہا، نیند تو ایسے روٹھی ہوئی تھی جیسے بارش کے قطرے صحرا سے۔ لاکھ جتن اور کوشش کے باوجود صبح کے قریب کہیں جا کر اس کی آنکھ لگی اور دو گھنٹے بعد معمول کے الارم سے کھل گئی۔ روزانہ وہ اسی وقت اٹھتا تھا، ہاں مگر سوتا اس وقت نہیں تھا، جس طرح رات میں بلکہ علی الصبح سویا تھا۔ آنکھوں میں نیند نہیں مگر رت جگے کی سرخی تھی، پورا بدن تھکان زدہ ہو رہا تھا۔

موبائل ہاتھ میں لے کر الارم بند کیا، دو گھنٹے پہلے اس نے اپنے آف موبائل کو آن کرلیا تھا، جب نیند سے آنکھیں بھاری ہونے لگی تھیں۔

وہ منہ دھو رہا تھا جب موبائل پھر سے بجنے لگا۔

''اتنی صبح صبح کون ہو سکتا ہے۔'' وہ چونکا۔

''یہی محترمہ نہ ہوں، کل رات بات نہیں ہو سکی تو شاید دن میں اپنا کوٹہ پورا کریں۔'' تولیے سے منہ خشک کر کے اس نے موبائل اٹھایا۔ اسکرین دیکھ کر اس کا دل ایسے زور سے دھڑکا کہ وہ حیران رہ گیا۔

''گوگو؟'' موبائل کان سے لگا کر اس کے منہ سے ہیلو کے بجائے حیرانی میں ڈوبا۔ ''گوگو'' نکلا تھا۔

''فوراً آ جاؤ۔''

''کیا ہوا؟''

آرزو نے جو جواب دیا اسے سن کر عاطف پر قیامت گزر گئی۔ اس کے منہ سے یہ بھی نہیں نکل سکا کہ کب، کیسے؟ وہ گم صم سا کھڑا تھا، موبائل کان سے لگائے۔

''جلدی آ جاؤ عاطف!''

دوسری طرف آرزو نے جیسے سسکی لی تھی۔ فون بند ہو گیا تھا۔ وہ ابھی تک اسے کان سے لگائے خالی الذہنی کے عالم میں کھڑا تھا۔ کچن سے برتن کھڑکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ امی اس وقت اٹھ کر اس کے لیے معمول کے مطابق ناشتا بنا رہی تھیں۔

''امی!'' اس کی آواز میں نہ جانے کیا تھا کہ وہ چونک کر مڑیں۔

''کیا بات ہے؟'' امی اسے دیکھ رہی تھیں۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے، رات کو ٹھیک سے سوئے نہیں، آنکھیں کتنی سرخ ہو رہی ہیں۔''

وہ بے چینی اور فکرمندی سے عاطف کو دیکھ رہی تھیں۔ رت جگے کے علاوہ اس کے چہرے پر اور بھی کچھ رقم تھا، ایسا چہرہ ہو رہا تھا اس کا جیسے کسی کا سارا اسباب سفر کے دوران لٹ جائے۔

''امی!'' عاطف نے شدید کرب اور تکلیف میں پکارا تھا ماں کو۔

''میں صدقے، میرے چاند! کیا ہوا؟'' عفت کے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔

''میرے ابو...... دنیا میں نہیں رہے۔''

وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح رو رہا تھا۔ عفت گنگ کھڑی اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ دوراہے پر کھڑی تھیں، اسے ڈانٹیں یا چپ کرائیں، تسلی دیں؟ یکایک ہی انہیں لگا کہ ان کی ٹانگیں ان کا بوجھ سہارنے سے انکاری ہیں۔ وہ کرسی گھسیٹ کر وہیں بیٹھ گئیں۔

''اب تو جا سکتا ہوں نا، آپ نے ملنے سے منع کیا تھا۔ میں صرف انہیں دیکھنے جا رہا ہوں، بات نہیں کروں گا، بس اپنا آخری فرض نبھاؤں گا۔''

عاطف ماں سے کچھ نہیں کہہ رہا تھا، دھیمے دھیمے خود کلامی کر رہا تھا، عفت کا دل کٹ کر رہ گیا، نہ جانے کیوں؟ عرصہ ہوا انہوں نے خود کو اپنے دل کو پتھر کرلیا تھا مگر انہیں معلوم نہیں تھا کہ ایک روز ان کے بیٹے کے آنسو اس پتھر کو موم کر دیں گے۔

''امی پلیز! ناراض مت ہوئیے گا، اس وقت جانا تو ضروری ہے۔''

ان کی طرف دیکھے بغیر وہ ملتجی انداز میں کہہ رہا تھا۔ عفت بہت تکلیف میں تھیں، بہت پرانے زخموں سے ایک دم ہی کھرنڈ اتر گیا تھا۔ خون رِس رہا تھا، اذیت نے ان کا جسم، اعصاب اور زبان شل کر دی تھی۔ عاطف اٹھ کر جا رہا تھا۔

''خیال سے جانا...... احتیاط سے گاڑی چلانا۔''

عفت نے خود کو کہتے سنا، بلا ارادہ، بے اختیار انہیں رونا آ رہا تھا۔ اپنے کسی غم پر نہیں بلکہ بیٹے کے دکھ پر، عاطف کے آنسو دیکھ کر ان کے اپنے آنسو بھی بے قابو ہو گئے تھے۔

☆☆☆

''بہت دیر لگا دی بیٹا! تمہاری راہ تکتے تکتے، آنکھیں بند ہو گئیں بھائی کی۔ ایک بار آ جاتے، یوں حسرت بھرا دل لے کر نہ مرتے۔''

عظمیٰ عاطف کو گلے لگا کر بے قابو ہو گئیں۔

حسرت تو عاطف کے دل میں بھی تھی، پشیمانی کے ساتھ حالانکہ اس کا اتنا قصور بھی نہ تھا مگر پھر بھی اس کا حساس دل دکھ کی لے پر دھڑک رہا تھا۔

ظہر میں تدفین کر دی تھی، خاکی جسم، خاک میں جا ملا۔ مختصر سے لوگ تھے، سب ایک ایک کر کے چلے گئے۔ کوارٹر میں عاطف، آرزو اور عظمیٰ ہی بچے تھے۔ خاموشی کی زبان میں ایک دوسرے سے اپنا دکھ بانٹ رہے تھے، عاطف کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اتنا شدید کہ اسے لگ رہا تھا اس کا سر پھٹ جائے گا۔ دیوار سے ٹیک لگائے وہ نیچے زمین پر بیٹھا تھا۔ دونوں ٹانگیں پھیلائی ہوئی تھیں، آنکھیں بند تھیں۔

''یہ لو۔'' اسے آرزو کی آواز بعد میں اور چائے کی مہک پہلے آئی، عاطف نے بہ مشکل آنکھیں کھول کر دیکھا۔

''بسکٹ کھا کر چائے پی لو اور یہ سر کے درد کی گولی ہے، کھا لینا۔'' آرزو اس کے سامنے بیٹھی کہہ رہی تھی۔ ساتھ ہی اس نے اپنی امی کے سامنے بھی بسکٹ کی پلیٹ اور چائے رکھی۔

''آپ بھی کچھ کھا لیں، کل سے بھوکی ہیں۔''

عاطف نے آرزو کو دیکھا، اس کی حیران نگاہیں آرزو سے سوال کر رہی تھیں کہ اسے کیسے پتا چلا کہ اس کے سر میں درد ہے؟

''تمہاری شکل دیکھ کر ہی پتا چل رہا ہے۔''

آرزو نے اس کا سوال پڑھ لیا تھا، جواب اپنی زبان سے دیا۔

عاطف نے خاموشی سے ایک بسکٹ اٹھا لیا، وہ بھی کل رات کا کھانا کھایا ہوا تھا۔ نہ بھوک لگ رہی تھی، نہ کچھ کھانے کو جی چاہ رہا تھا۔ پیٹ میں اینٹھن سی ہو رہی تھی، بہ مشکل ایک بسکٹ کھا کر اس نے چائے کا کپ اٹھا لیا۔ اس کی سماعتیں آرزو کو سن رہی تھیں جو ڈھیرے ڈھیرے اسے بتا رہی تھی۔

''رات جب ماموں کی اچانک طبیعت خراب ہوئی اور ہم انہیں اسپتال لے کر گئے تو میں نے تمہیں کال کی تھی مگر کال کاٹ دی گئی۔ پھر جتنی بار بھی نمبر ملایا، فون بند ملا۔ اسپتال میں ڈاکٹرز نے جواب دے دیا تھا۔ پہلا ہارٹ اٹیک ہی جان لیوا ثابت ہوا، میں پوری رات وقفے وقفے سے تمہیں کال کرتی رہی۔ صبح کے قریب جا کر تمہارا فون ملا۔''

آرزو کی آواز میں نمی اور تھکن گھلی ملی تھی۔

عاطف نے ندامت اور کرب سے آنکھیں میچ لیں۔ رات میں اس نے ثانیہ کا فون سمجھ کر بغیر دیکھے ہی فون بند کر دیا تھا۔ یہ زندگی ہے، اس میں کچھ بھی ممکن ہے۔

''فون میں نے آف کیا تھا، میں کسی اور کا سمجھا تھا بغیر دیکھے ہی آف کر دیا۔'' عاطف نے آرزو اور پھوپھو سے نظریں ملائے بغیر ندامت سے اپنی کوتاہی کا اقرار کیا۔

''نصیب کا لکھا ہو کر رہتا ہے۔ تم اپنے دل پر مت لو۔'' عظمیٰ نے اسے تسلی دی۔

شام میں وہ گھر واپس آ گیا۔ عفت اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھیں۔

''امی!'' وہ بیڈ کی پائنتی پر بیٹھ گیا۔

''ہوں۔'' وہ کروٹ کے بل لیٹی تھیں، چہرہ دوسری طرف تھا۔

''آپ نے کچھ کھایا، دوائی لی؟'' عاطف ان کے پیر دبانے لگا۔ پرانا معمول اور عادت تھی اس کی، انہیں لیٹا ہوا دیکھ لیتا تو پیر دبانے لگ جاتا۔

''ہاں، کھا لیا تھا۔'' وہ اب سیدھی ہو کر لیٹ گئیں۔

''کیا کھایا؟''

”سلائس، دودھ میں بھگو کر کھالیا تھا۔ تمہارے لیے باہر سے کچھ لادوں یا گھر پر بنادوں کوئی چیز؟ کیک رس اور کوکیز وغیرہ ختم ہو گئے ہیں، وہ لا کر رکھ دینا، تھوڑے چپس اور نمکو بھی۔ وقت بے وقت کوئی مہمان آ ہی جاتا ہے۔“

”جی اچھا۔ آپ نے موزے کیوں نہیں پہنے، ٹھنڈ ہو رہی ہے۔“

”ابھی تو اتارے ہیں، الجھن ہوتی ہے پہنے پہنے۔ پہن لوں گی، اٹھوں گی تو اور......“ انہوں نے عاطف کا جائزہ لیا۔ ”تم صبح ایسے ہی نکل گئے، نہ سوئٹر، نہ جیکٹ، کچھ تو پہن لیتے۔ مجھے ہی نصیحتیں کرتے رہتے ہو۔“

”یاد نہیں رہا، اب خیال رکھوں گا۔“

”تھک گئے ہو گے، آرام کرو اب جا کر۔“ عفت نے پاؤں سمیٹنے چاہے مگر عاطف نے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی۔

”جب مجھے تھکن محسوس ہو گی تو آرام کرلوں گا۔“ وہ بدستور پیر دباتے ہوئے بولا۔

”اچھا۔“ عفت نے آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆☆

شہید نے ارسلان کو بھی فون کر کے بلالیا تھا۔ وہ مہر کو اسپتال لے جا چکا تھا۔ ارسلان بعد میں پہنچا، خودکشی کا معاملہ تھا سیدھا سیدھا پولیس کیس، پہلے ڈاکٹرز سے پھر پولیس سے، وہ دونوں کیسے نپٹے، وہ ہی جانتے تھے۔

مہر کی حالت نسبتاً بہتر تھی، ڈاکٹر نے معدہ واش کر دیا تھا۔ ویسے بھی اسے جلدی ہی اسپتال پہنچا دیا گیا تھا، اس لیے زیادہ پیچیدگی نہیں ہوئی تھی۔

مہر چپ چاپ لیٹی ہوئی تھی، حمیرا بیگم اس کے پاس بیٹھی اسے متفکر نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ کمرے سے باہر شہید احمد عظمٰی سے بات کر رہا تھا۔

”ایسی کیا بات ہو گئی گھر میں جو مہر نے یہ قدم اٹھایا؟“

عظمٰی نے الف سے یے تک ساری کہانی سنا دی۔

”کیا سے کیا زندگی ہو گئی اس لڑکی کی۔“ شہید احمد نے ترحم سے کہا تو عظمٰی نے ایک نظر اس پر ڈالی۔

”زندگی تو آپ کی بھی کیا سے کیا ہو گئی ہے۔“

”میری تو......“ شہید احمد نے کچھ کہتے کہتے ہونٹ بھینچ لیے۔

”میں نے فون کیا تھا پرسوں انہیں۔“ عظمٰی نے بتایا۔

”عفت کو؟“

”جی۔“

”شوہر کی نہیں سنتی وہ عورت، تمہاری کیا سنے گی۔“ شہید احمد کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”جی ہاں، عظمٰی کی جو انہیں سمجھانے کی کوشش کی، الٹا باتیں سننے کو مل گئیں۔“

عظمٰی کو عفت کے الفاظ ایک بار پھر یاد آئے تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی، دل جل کر خاک ہو گیا۔

”یہ صلہ ملتا ہے نیکی کا۔“ عظمٰی نے شہید احمد کو مخاطب کیا۔ ”مجھے یہ جواب ملا کہ تم کون ہوتی ہو میرے معاملات میں دخل دینے والی، اپنی حد میں رہو اور اپنے کام سے کام رکھو۔ الفاظ کے ساتھ ساتھ عفت کا لہجہ بھی تلخ تھا۔“

”سمجھ میں نہیں آتا، زندگی میرے ساتھ کیا کھیل رہی ہے۔ اچھی بھلی گاڑی چل رہی تھی ہماری، پتا نہیں بیٹھے بٹھائے عفت کو کیا ہو جاتا ہے۔“ شہید احمد بے بسی سے کہہ رہا تھا۔

”ایک بات کہوں بھائی؟“ عظمٰی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”بولو۔“

”عفت بھابھی کا مزاج بہت کڑوا اور زبان بہت تلخ ہو گئی ہے۔ گھر واپس آ بھی گئیں تو آپ کی زندگی جہنم بنائے رکھیں گی، ان کے شکوک و شبہات اور بدگمانیاں زندگی بھر ختم نہیں ہوں گے۔“

”مجھے بھی اس بات کا اندازہ ہے مگر اس کا حل کیا ہے؟ یہ ہی سوچ سوچ کر دماغ پھٹنے لگتا ہے۔“

”ایک حل ہے۔“

”کیا؟“ شہید احمد نے چونک کر اسے دیکھا۔

”آپ......“ عفت نے تھوک نگل کر خشک حلق تر کیا۔ ”آپ مہر سے شادی کرلیں۔“

شہید احمد چند لمحے عظمٰی کی شکل دیکھتا رہ گیا پھر سنبھلتے ہوئے گویا ہوا۔

”یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔“

”ویسے ہی آپ کی زندگی میں کیا آسانیاں ہیں، کیا سکھ دے رہی ہے آپ کی بیوی آپ کو۔“ عظمٰی نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔

”میں مزید نئی الجھنیں نہیں پالنا چاہتا۔“ شہید احمد متذبذب تھا۔

”نئی الجھنیں کیسی، آپ کی بیوی ویسے بھی آپ کو چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ وہ یہاں آنا نہیں چاہتی، رہنا نہیں چاہتی۔ آپ یہاں سے جانا نہیں چاہتے تو کوئی تو حل نکالنا پڑے گا۔ جو جگہ وہ خالی کر رہی ہیں اسے پر کریں اور اپنی زندگی میں سکون لائیں اور ویسے بھی۔“ عظمٰی چند لمحوں کے لیے چپ ہوئی۔

”مہر نے ہمیشہ آپ کا نام اپنے نام کے ساتھ سوچا تھا۔ بچپن سے ہی سنتی چلی آئی تھی، اس کے ساتھ جو ٹریجڈی ہوئی، اسے سہارا دینا آپ کا اخلاقی فرض ہے۔“

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، مجھے کیا کرنا چاہیے۔“ شہید احمد لاچاری کی حالت میں دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ غصے میں بیوی کو دوسری شادی کی دھمکی دینا اور بات ہے اور اس پر عمل درآمد الگ بات ہے۔ ہاں ہوتا ہو گا کسی کسی کے لیے آسان مگر شہید احمد کے لیے اتنا آسان نہیں تھا۔ مشکلات تو عظمٰی کے لیے بھی بہت ہیں۔ مہر نے اس کی گھریلو زندگی کو تلخیوں سے دوچار کیا ہوا تھا، اپنی ازدواجی زندگی کی ناکامیوں کا بدلہ وہ یوں لے رہی تھی کہ بات بے بات پر بھڑک اٹھتی۔ عظمٰی کو باتیں سنانے پر آتی تو سنائے چلی جاتی، ساتھ میں بچوں کی بھی شامت تھی۔ اس پر مستزاد حمیرا بیگم بھی اکثر بیٹی کی حمایت میں عظمٰی کو رگید دیتیں۔

ارسلان کا بس اماں اور بہن پر تو چلتا نہیں تھا، وہ بھی عظمٰی کو ہی دبا کے رکھتا، مہربان ہوتا تو اسے صورتحال اور برداشت کی تلقین کر دیتا۔ عظمٰی چکی کے دو پاٹوں میں پس رہی تھی۔ اوپر سے مہر کا یہ نیا قدم اس کے لیے اور مصیبت کھڑی کر گیا۔ اپنے بچے چھوٹے تھے، ان کے ساتھ ساتھ مہر کے بیٹے کی ذمہ داری بھی کلی طور پر اس پر آ گئی۔ پہلے بھی گھڑی گھڑی حمیرا بیگم شہزاد کے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے اسی کو آواز لگاتی تھیں۔ بے شک ماسی آتی تھی، وہ ایک بار صفائی ستھرائی کر کے چلی جاتی، باقی پورا دن عظمٰی بچوں اور بڑوں کے کاموں کے لیے ہلکان ہوتی رہتی۔ کبھی دبی زبان میں ساس سے شکایت کرتی، بچے کے معاملے میں لاپروائی کی تو حمیرا بیگم الٹا اسی پر برس پڑتیں۔

”دیکھ رہی ہو وہ مصیبت میں ہے، اب اللہ کی طرف سے برا وقت ہے اس پر، تو تم بھی شکایتیں کرنے بیٹھ گئیں۔ نند تو بعد میں بنی پہلے تو تمہاری بہن ہے، کتنا بہناپا اور دوستی تھی تم دونوں کی۔ اسی کا لحاظ کرلو، معصوم بچے کا کیا ہے، جہاں اپنے دو بچوں کے کچھ کام کر رہی ہو، تیسرے کا بھی کرلو۔ اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں۔“

بولتے بولتے ان پر رقت طاری ہو جاتی، دوپٹہ منہ پر رکھ کر سسک پڑتیں۔

”میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میری بچی پہ ایسا وقت بھی آئے گا۔ ایسی نازوں کی پلی یوں اپنے ہی گھر میں ذلیل ہو گی۔ راجہ کی بیٹی تقدیر کی ہیٹی۔“

حمیرا بیگم رونے بیٹھ جاتیں، عظمٰی کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے، گھر کی مجموعی صورت حال سے اور حالات سے تنگ آ گئی، بے زار ہو گئی تھی۔ جتنی شدومد سے، دل کی گہرائی اور سچائی سے وہ مہربانو کا

گھر بسنے کی دعا کرتی تھی۔ شاید حمیرا خود بھی نہ کرتی ہوں لیکن اسے یہ نظر آ رہا تھا کہ مہر کے لیے جس قسم کے رشتے آ رہے ہیں، ان میں سے کسی کو منتخب کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہی تھا۔ یہ بیل منڈھے چڑھنے کی ایک ہی صورت نظر آئی اسے، وہ تھا شہید احمد۔ ویسے بھی عفت نے اپنے رویے اور سلوک سے میکے کا رستہ اس سے چھڑا دیا تھا۔ خود اب وہ شوہر کو ذہنی اذیت میں مبتلا کر کے میکے میں بیٹھی ہوئی تھی، عفت کے لیے اس کے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں تھا۔ ہاں بھتیجے سے بہت محبت تھی، اس کا خیال بارہا آیا، یہی سوا! شہید احمد نے بھی کیا تھا۔

"عاطف کا کیا ہوگا؟ اسے میرے خلاف بھڑکائے گی عفت۔" شہید احمد نے خدشے کا اظہار کیا۔

"کیا بھڑکائے گی، بھڑکانے دو۔ بڑا ہوگا تو آپ سمجھا لینا اسے۔ آپ کا خون ہے، سمجھ جائے گا۔"

کچھ یہ تھا کہ شہید احمد اپنی ازدواجی زندگی کی ناہمواری اور روز کی چخ چخ سے تنگ آیا ہوا تھا۔ عظمیٰ اپنی گھریلو مشکلات کا حل اور میکے کا رستہ کھلا رکھنا چاہتی تھی، کچھ ماضی کی محبت اور البیلی یادوں کی چنگاریاں تھیں جو شہید احمد کے دل میں پھر سے سلگنے لگی تھیں۔ مہر کی زندگی کا رخ اور عفت کی مستقل سرد مہری، مسلسل ہٹ دھرمی اسے مہربانو کی طرف لیے جا رہی تھی۔ عظمیٰ کی ترغیب، تسلی اور دلاسے مستزاد تھے، اس نے اپنی ازدواجی زندگی کی ڈولتی کشتی سے مہر کی محبت کی ناؤ میں چھلانگ لگا دی۔ حمیرا پھوپھو کے دل کی مراد بر آئی، مہر بھی خوش ہی تھی، سب سے زیادہ خوشی اطمینان اور سکون عظمیٰ کو حاصل ہوئے تھے۔ مہر رخصت ہو کر اسی گھر میں آ گئی، جو عفت خالی چھوڑ گئی تھی اور گھر ہوں یا دل، بہت عرصے تک خالی نہیں رہتے۔ پرانے مکین چھوڑ جائیں تو جلد یا بدیر نئے مکین آ جاتے ہیں۔ شہید احمد کا دل اور گھر ایک بار پھر آباد ہو گیا تھا۔

☆☆☆

کتنا ویران سا ہو گیا تھا گھر، عظمیٰ اس خالی کونے کو دیکھتی جہاں شہید احمد کا بیڈ تھا۔ تو اس کے دل میں ہوک سے اٹھتی، پچھلے کچھ سالوں سے زندگی نے اس کے ساتھ عجیب نہیں بلکہ سنگین کھیل کھیلے تھے۔ وہ عرش سے فرش پر آ گئی تھیں۔ آسمان سے زمین تک کا سفر بہت تیزی کے ساتھ طے ہوتا ہے اور جتنی تیزی سے انسان نیچے آتا ہے۔ اتنی ہی قوت سے وہ زمین سے ٹکراتا ہے، پرخچے اڑ جاتے ہیں ہر چیز کے، جسم کے دل کے، احساسات کے، جذبات کے، انسان سمیت اس سے جڑا سب کچھ یوں ختم ہو جاتا ہے، جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ مہر کی دوبارہ شادی کے بعد اس کی زندگی ویسی ہی پرسکون اور خوش و خرم ہو گئی تھی جیسا کہ عظمیٰ نے سوچا تھا۔

☆☆☆

مہر کی شادی کو تقریباً چھ سال گزرے تھے کہ حمیرا بیگم کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد عظمیٰ اپنی راجدھانی کی اکیلی ملکہ تھی، سیاہ سفید کی مالک، محبت کرنے والا شوہر، دو پیارے پیارے صحت مند اور ذہین بچے، خوش حالی، نعمتوں کی فراوانی، انسان کو اور کیا چاہیے۔ ہر قسم کے خوف، خدشے اور وہم سے پاک اطمینان بھری زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں تھی، ان دنوں عظمیٰ اکثر سوچا کرتی تھی "زندگی کتنی خوب صورت ہے" اور دنیا میں بہت سی خوب صورتیاں بالآخر بدصورتیوں میں بدل جاتی ہیں۔

فطرت کا قانون ہو یا پھر قدرت کے اٹل فیصلے، جب لاگو ہوتے ہیں تو پھر کچھ نہیں دیکھتے۔ عظمیٰ اور بچوں کی زندگی پر قدرت کا فیصلہ چسپاں ہو رہا تھا، دھیرے دھیرے، کچھ مہینوں سے وہ ارسلان کو بے حد پریشان دیکھ رہی تھی۔ عظمیٰ کے بار بار پوچھنے پر بھی وہ ٹال جاتا مگر عظمیٰ پریشان ہوتی تھی۔ ارسلان اتنا الجھا ہوا اور فکر مند نظر آنے لگا تھا کہ جس دن ان کا بیٹا اعلا تعلیم کے لیے کینیڈا جا رہا تھا۔ اس دن بھی اس کے چہرے سے تفکرات کی پرچھائیاں ختم نہیں ہوئی تھیں، وہ مستقل اور مسلسل کسی ادھیڑ بن کا شکار نظر آتا تھا۔ عظمیٰ نے پیار سے پوچھا، غصے سے بھی، منتیں بھی کیں، ضد بھی مگر ارسلان کی زبان نہ کھلی۔

"نوکری کے اپنے مسائل ہوتے ہیں یار! حاسدوں سے میرا جلدی جلدی پروموشن ہضم نہیں ہو رہا۔"

کہہ کر عظمیٰ کو ٹال دیتا مگر عظمیٰ کو اس کی یہ وضاحتیں ہضم نہیں ہو رہی تھیں۔ پہلے سوچا کہ بھائی سے مدد لے مگر شہید احمد خود اپنے ہی معاملات میں پھنسا ہوا تھا۔ عفت نے اس کی دوسری شادی کے بعد ہی اس سے طلاق کا مطالبہ کر دیا تھا۔ شہید احمد اسے طلاق نہیں دینا چاہتا تھا مگر دو کشتیوں میں بیک وقت سواری ممکن نہیں۔

عفت نے طلاق لینے کے بعد شہید احمد کو بیٹے کی شکل دیکھنے سے بھی محروم کر دیا تھا۔ مہر سے شادی کے بعد ایک بیٹی ہوئی تھی مگر چند ماہ بعد فوت ہو گئی پھر ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ شہزادی بدستور پابندی سے اپنے باپ اور دادی کے پاس جاتا تھا۔ معیز عالم کی دو بیٹیاں تھیں، بیٹا کوئی نہیں ہوا، اس لیے بھی شہزادہ کی اہمیت، وقعت اور قدر وہاں بہت تھی۔ باپ اور دادی کے لاڈ پیار نے اسے خودسر بنا دیا تھا، اس کی ہر خواہش کے لیے اس کا باپ بے دریغ پیسہ خرچ کرتا تھا۔ شہید احمد نے اس کو اپنا بیٹا سمجھ کر پیار کرنے اور قریب لانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

شہید احمد کو عاطف سے محرومی کے بعد اولاد کی شدید چاہ، خواہش اور ضرورت تھی مگر شہزادہ کے پاس اس کا باپ موجود تھا۔ اسے کسی اور باپ کی ضرورت نہیں تھی۔ مہربانو ویسی ہی رہی جیسی کہ تھی، کبھی شعلہ، کبھی شبنم، کبھی آگ، کبھی پانی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو جو سمجھا اور جو توقعات وابستہ کیں، وہ سب کچھ کہیں کہیں موجود رہا۔ کہیں کہیں گم ہو گیا، زندگی کی حقیقتیں تلخ اور سخت نکلیں۔

ان ہی تلخ و شیریں دنوں میں شہید احمد کا بڑا شدید ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ اس حادثے میں اس کی ریڑھ کی ہڈی متاثر ہوئی تھی۔ اس کی نقل و حرکت بہت کم ہو کر بستر تک ہی محدود ہو کر ہو گئی تھی۔ اٹھارہ سالہ شہزادہ اس کا کام سنبھالنے لگا، ابھی اس نے انٹر کیا تھا۔ پڑھائی میں ویسے بھی اس کا دماغ کم ہی لگتا تھا۔ ارسلان کا بیٹا ذہین اور محنتی تھا، وہ پڑھنے کے لیے کینیڈا چلا گیا۔ شہزادہ کاروبار سنبھالنے کے لیے نوعمر اور ناتجربہ کار تھا، یہ کوئی اتنی بڑی خامیاں نہیں تھیں، وہ سیکھنے کی کوشش کرتا تو وقت کے ساتھ ساتھ نہ ہی نوعمر رہتا ہی نہ ناتجربہ کار مگر اس میں غیر ذمہ داری کا مادہ تھا۔ لاپروائی اس کی فطرت کا خاصا تھی، خلوص کا فقدان تھا۔ محنت سے وہ جی چراتا تھا، اس کی فطری خامیوں اور منفی عادات نے دھیرے دھیرے شہید احمد کے کاروبار کو گھن لگانا شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

سفیر، ارسلان کا گہرا اور جگری دوست تھا، دونوں کے آپس میں خاندانی تعلقات تھے۔ وہ خاص طور پر عظمیٰ سے ملنے آیا تھا، اس نے جو کچھ بتایا وہ عظمیٰ کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سفیر بھائی؟"

عظمیٰ نے سرسرائی آواز میں سوال کیا، اسے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ سفیر کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا، یقین آتا بھی کیسے؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ارسلان دوسری شادی جیسا اتنا بڑا قدم اٹھا لیتا اور اسے کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی۔

"مجھے خود بھی یقین نہیں تھا پہلے، میں نے اسے افواہ سمجھا مگر بدقسمتی سے یہ سچ ہے، حقیقت ہے۔ میں تصدیق کر چکا ہوں۔" سفیر دھیمے لہجے میں بولا۔

"مگر...... کب؟ کس سے؟ ایسے کیسے......؟ وہ کیسے کر سکتا ہے اس طرح۔"

عظمیٰ، سفیر سے مخاطب نہیں تھی۔ وہ خود کلامی کر رہی تھی۔ اس کے بدن کا لہو جیسے سوکھ رہا تھا، دماغ ماؤف ہو رہا تھا، اسے لگ رہا تھا کہ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھی ہے۔ کچھ بھی تو سجھائی نہیں دے رہا تھا، وہ تیز روشنی سے نکل کر یکایک گھپ

اندھیرے میں داخل ہوگئی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا نہ کوئی بات۔ سفیر کے جانے کے بعد کتنی ہی دیر وہ یوں ہی سکتے کے عالم میں بیٹھی رہی، کانوں میں بس سفیر کی باتیں گونج رہی تھیں۔

''میں خود نہیں جانتا بھابھی کہ ارسلان اس عورت کے چنگل میں کیسے پھنس گیا۔ اس کی شہرت اچھی نہیں ہے، اتنے بڑے بڑے اس کے تین لڑکے ہیں، جنہیں وہ اپنا بھائی بتاتی ہے۔ جرائم پیشہ افراد سے بھی گہرا ناتا ہے اس کا اور پولیس والوں سے بھی تعلقات ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ ارسلان کسی مصیبت میں نہ پھنس جائے، آپ اسے سمجھائیے، دعا کیجیے، وہ کسی بڑی مصیبت کا شکار نہ ہو۔''

سفیر اپنا فرض نبھا کر دوستی کا حق ادا کر کے چلا گیا تھا، ادھر عظمیٰ کی حالت دگرگوں تھی۔

ارسلان آیا تو وہ خود اتنا پریشان اور بکھرا ہوا تھا کہ عظمیٰ ایک لمحے کو سب کچھ بھول بھال گئی۔ ارسلان آتے ہی بستر پر دراز ہوگیا تھا، چہرے پر جیسے صدیوں کی تھکن اور تفکرات تھے۔

''کھانا لاؤں؟''

''بھوک نہیں ہے۔'' ارسلان اٹھ بیٹھا اور سگریٹ سلگانے لگا، یہ عادت بھی اسے کچھ عرصہ قبل ہی ہوئی تھی۔

''سفیر بھائی آئے تھے۔'' عظمیٰ نے کچھ کہنے سے پہلے تمہید باندھی۔

''سفیر؟'' ارسلان نے حیران ہو کر عظمیٰ کو دیکھا اور پھر اس نے سر جھکا لیا۔ خاموش ہوگیا۔ اس نے وجہ نہیں پوچھی سفیر کے آنے کی، عظمیٰ کی آنکھوں میں، چہرے پر وہ وجہ لکھی تھی، ارسلان جان گیا تھا۔

''تم اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟''

عظمیٰ اچانک ہی پھٹ پڑی تھی۔ کہنا تو وہ بہت کچھ چاہتی تھی، بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ ان گنت سوال تھے اس کے دل میں، اس کے چہرے پر رقم تھے مگر ارسلان کی حالت دیکھ کر اسے غصے سے زیادہ رونا آرہا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں وہ سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا۔ اسے کچھ کہنا ایسا ہی تھا جیسے مرے ہوئے کو اور مارا جائے، اس کے وجود سے پچھتاوا چھلک رہا تھا، جیسے پانی سے برتن لبالب بھرنے کے بعد باہر بہنے لگے۔

''مجھے یقین نہیں آرہا، کیسے ہوگیا یہ سب، تم ایسے تو نہیں تھے۔'' عظمیٰ بے ربط بول رہی تھی، یکا یک زندگی جیسے بے ربط ہوگئی تھی تو الفاظ میں ربط کہاں سے آتا۔

ارسلان بے بسی سے اسے دیکھ رہا تھا، پھر بولا تو اس کی آواز کسی سرگوشی سے بلند نہ تھی۔

''مجھے خود بھی نہیں معلوم، میں کیسے اپنے راستے سے بھٹک گیا، کیسے پھنس گیا۔ کسی کے بچھائے پھندے میں، جو اب میرے گلے کا پھندا بن گیا ہے۔''

عظمیٰ اس کی باتیں سمجھنے سے قاصر تھی، بیوی بچوں کے ساتھ ایک خوش گوار زندگی گزارتے گزارتے، اچانک دوسری شادی کا قدم اٹھانا آسان نہیں ہوتا۔ ارسلان اب خود بھی پریشان ہونے کے ساتھ ساتھ حیران تھا۔ اس عورت کی طرف بغیر سوچے سمجھے وہ یوں کھنچا چلا گیا جیسے مقناطیس کی طرف لوہا کھنچا چلا جاتا ہے۔ بہت جلد اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کس قماش کے لوگوں میں پھنس گیا ہے۔ اس کے پر یوں کاٹ کر دیے گئے تھے کہ وہ پھڑ پھڑانے کے سوا کچھ کر نہیں سکا۔

اس نے اس شادی کو غلطی سمجھ کر اور تسلیم کر کے صفحہ زندگی سے مٹانا چاہا مگر یہ اتنا آسان نہیں تھا جتنا کہ اس نے سمجھا۔ آرزو کے اغوا کی دھمکی نے ارسلان کو یہ قدم اٹھانے سے باز رکھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ محض ایک دھمکی نہیں ہے بلکہ اس پر عمل بھی ہوسکتا ہے۔ اس عورت کے ساتھ رہ بھی نہیں سکتا تھا، اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ ارسلان کسی شکنجے میں پھنس گیا تھا، تکلیف بڑھتی جارہی تھی اور رہائی کی کوئی سبیل نہیں تھی۔

اب ایک نئی مصیبت اس کے لیے کھڑی ہوگئی تھی، اس سے مطالبہ کیا جارہا تھا کہ وہ اپنا مکان بیوی کے نام کردے۔ جس مکان میں عظمیٰ رہتی تھی بچوں کے ساتھ۔ اس مکان کو دوسری بیوی کے نام کردیتا تو عظمیٰ اور بچے کہاں جاتے؟ اور اتنی قیمتی جائیداد کو وہ کیسے، کسی کے حوالے کردیتا، جس کے بنانے میں اس کی محنت اور خون، پسینے کی کمائی لگی تھی لیکن ایسا نہ کرنے پر اسے دھمکیاں مل رہی تھیں۔ پولیس سے رابطے کا اس نے سوچا مگر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا کہ اس کی بیوی کی پہنچ اعلا صلاحیت کے حامل غنڈوں بدمعاشوں تک ہی نہیں بلکہ پولیس کے اعلا افسران تک بھی تھی اور ویسے بھی اس محکمے کی کارکردگی کا جو حال تھا، اسے کسی خاص مدد کی توقع بھی نہیں تھی، پھر آخر وہ کیا کرے؟

سوچ سوچ کر دماغ کی رگیں پھٹنے لگی تھیں۔ دوسری طرف سے مکان نام کرنے کے مطالبے میں شدت آتی جارہی تھی۔ ارسلان کو سب سے زیادہ فکر اپنی بیٹی کی تھی جس کے متعلق اسے دھمکیاں دی گئی تھیں، فکر نے اسے ادھ موا کردیا تھا۔

☆☆☆

شہید احمد نے پیالہ اپنے آگے سے سرکا دیا۔

''پرہیز بتایا ہے تمہیں ڈاکٹر نے۔ اب کیا مرغے بھون کردوں تمہیں؟'' مہربانو نے عادت کے مطابق تنک کر جواب دیا تھا۔

''نمک مرچ اور تیل کم بتایا ہے اور تو کوئی پرہیز نہیں ہے۔ ہلکے نمک، مرچ اور آئل میں کچھ بھی بنادو۔ مرغا بھوننے کو نہیں کہتا، کوئی دال سبزی ہی سہی۔ تم نے تو بس دلیہ پکڑ لیا ہے، پورا پورا ہفتہ اسی میں نکال دیتی ہو۔''

شہید احمد کو مہربانو پر غصہ آرہا تھا اور اس سے پہلے دکان کا پرانا اور وفادار ملازم شہزادہ کے بارے میں جو کچھ بتا کر گیا تھا اس نے شہید احمد کے پیروں تلے زمین نکال دی تھی۔ وہ غصہ بھی مہربانو پر ہی نکال رہا تھا۔

''ایسے کیوں چیخ رہے ہو، ابھی تو جو بنا ہے وہ کھالو۔ کل کچھ بنادوں گی۔'' مہربانو نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ ''یہ شخص تو جان کو آگیا ہے میری۔'' اس کے چہرے پر حقارت اور بےزاری چھائی ہوئی تھی۔

''نہیں کھانا مجھے کچھ بھی۔ بھوک ہی اڑ گئی میری۔ اپنے بیٹے کے کرتوتوں کا علم ہے تمہیں، پورا کاروبار تباہ کر کے رکھ دیا میرا۔'' شہید احمد پھٹ پڑا۔

''اچھا، کل تک تو وہ تمہارا بیٹا تھا، پڑھنے کی عمر میں اسے کام پر لگادیا، اب مطلب نکل گیا تو میرا بیٹا ہوگیا وہ۔''

''سب کچھ ختم کر کے رکھ دیا اس نے، اونے پونے دام میں مال بیچ کر پوری دکان، گودام سب خالی کردیا۔ نہ اصل رقم کا پتا ہے نہ منافع کا۔''

شہید احمد کا جی چاہ رہا تھا کہ اپنے بال نوچ لے۔ دن رات محنت کر کے اس نے اپنا جو چھوٹا سا کاروبار سیٹ کیا تھا، وہ سب زمین بوس ہورہا تھا۔ اس کی جسمانی حالت اب بہتر ہورہی تھی، ایک دو ہفتوں میں اس کا ارادہ تھا کہ کاروباری سرگرمیوں میں پہلے کی طرح حصہ لینے کا مگر حقیقت یہ تھی کہ کاروبار رہا نہ اس کی سرگرمیاں۔

''کاروبار پہلے سے ہی خسارے میں جارہا تھا، میرے بیٹے کی کیا غلطی ہے۔'' مہربانو یوں بے نیاز بن گئی جیسے شہید احمد سے اور اس کے کاروبار سے مہربانو کا کوئی واسطہ، تعلق ہی نہ ہو۔

''میں نے ہمیشہ اسے اپنے بیٹے کی طرح سمجھا اور اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا، جیسے کوئی دشمن ہو۔ دھوکا دیا ہے اس نے، مال اونے پونے دام میں بیچ کر دوستوں، یاروں میں، اپنی عیاشیوں میں پیسے اڑا دیے۔''

شہید احمد کرب کی انتہا پر تھا، شہزادے نے جو کچھ کیا وہ کیا۔ دکھ اس بات کا بھی تھا کہ مہربانو اس سے بہت دور ہورہی تھی، اس کی بے رخی، بے گانگی شہید احمد کو تکلیف دے رہی تھی۔ وہ بیوی تھی، دکھ سکھ کی ساتھی مگر سکھوں کے سارے موسم شہید احمد کے ساتھ گزارنے کے بعد جب مشکلات کی دھوپ

پڑی تو وہ شہید سے دور جانے لگی۔ شہید احمد کے ایکسیڈنٹ، ناگہانی معذوری اور اب کاروبار کی بگڑتی ہوئی صورت حال، ان سب میں وہ بہت سرد مہر اور اجنبی سی بن گئی تھی۔ بہت بے زار اور اکتائی ہوئی ہو جیسے، اب بھی شہزادے کے معاملے میں اس نے شہید احمد کی دل جوئی کے بجائے الٹا اسی کو موردِ الزام ٹھہرا دیا۔ اس کی قینچی کی طرح چلتی زبان شہید احمد کے پرزے پرزے کر رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بے بسی کے عالم میں بیٹھا تھا۔

میرے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور کیوں؟ شہید احمد سوچ رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مہربانو کے تلخ رویے اور بے رخی کے پیچھے ایک پرانی کہانی ہے جو کچھ عرصہ پہلے دوبارہ شروع ہو گئی تھی۔

☆☆☆

''ہیلو، کیا ہو رہا ہے؟ آپ کی طبیعت ٹھیک ہوئی، ڈاکٹر کو دکھایا تھا؟ میڈیسن باقاعدگی سے لی؟''

حسب عادت اور حسب معمول تابڑ توڑ سوالوں کی بوچھاڑ، جوابوں کا انتظار کیے بغیر عاطف پر ہو رہی تھی۔ پچھلے ایک ہفتے سے عاطف طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے بات نہیں کر رہا تھا۔ شہید احمد کے انتقال کے بعد سے وہ کافی اپ سیٹ تھا، دکھ اور صدمہ بھی تھا، خود پہ ندامت بھی تھی۔ کسی سے بات کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ثانیہ کو اور اس کی فیملی کو یہی معلوم تھا کہ اس کے والد فوت ہو چکے ہیں۔ اب اگر اسے اصل بات بتاتا تو ایک نیا پنڈورا باکس کھل جاتا، نہیں بتاتا تو اس کی شوخیوں کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے بہانا کر کے ایک ہفتہ نکال ہی لیا، آج وہ پھر آن لائن تھی۔

''میں اب ٹھیک ہوں۔'' عاطف نے ایک گہری سانس لی اور مختصر جواب دیا۔

''جواب سے تو لگ رہا ہے ابھی تک ٹھیک طرح سے ٹھیک نہیں ہوئے آپ۔''

''میں اب واقعی بالکل ٹھیک ہوں۔'' عاطف اپنی بات پر قائم رہا۔

''چلیں ٹھیک ہے، آپ پر اعتبار ہے تو آپ کی بات پر بھی ہے۔'' ثانیہ نے بات ختم کی پھر حسب عادت چہکی۔

''آپ کو معلوم ہے، میرے انکل آنٹی کینیڈا سے آرہے ہیں۔''

''اچھا۔'' عاطف بجھے بجھے سے لہجے میں بولا۔ اسے اس وقت ثانیہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی تو اس کے انکل آنٹی میں کیا دلچسپی دکھاتا۔

''امی، پاپا نے کہا تھا کہ ان کے آنے پر ہماری شادی ہو گی۔''

''اچھا، یہ تو مجھے نہیں معلوم۔'' عاطف کے دل میں اچانک ہی خطرے کی گھنٹی بجی، وہ کچھ بے چین سا ہو گیا۔

''آپ تو بس...... آپ ہی ہیں۔ کوئی انٹرسٹ ہی شو نہیں کرتے کسی بات میں۔'' ثانیہ نے بولتے بولتے دھیرے سے شکوہ کر ہی ڈالا۔

''شادی میں تو ابھی چھ مہینے ہیں باقی، ہے نا۔'' عاطف نے خود کو یا شاید اسے باور کرایا۔

''ہاں، مگر انکل آنٹی دو ماہ بعد آرہے ہیں۔ ان کی پراپرٹی کے کچھ لیگل معاملات ہیں، اس لیے جلدی آنا پڑا ہے ورنہ وہ چھ ماہ بعد ہی آنے والے تھے۔''

''تو...... اس لیے شادی جلدی ہو گی؟''

''امی، پاپا ایک دو روز میں آپ کی امی سے بات کرنے آئیں گے۔ میں نے سوچا کہ آپ کو پہلے سے آگاہ کر دوں، کہیں اچانک شاک نہ لگے۔''

''شاک تو لگ گیا۔'' عاطف نے دل میں سوچا۔ کچھ دیر بعد فون بند کر کے وہ پھر کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ خود کو اور زندگی کو کس دوراہے پر کھڑا کر دیا تھا اس نے، چوائس کوئی نہیں تھی، انتخاب بس ایک ہی راستے کا کرنا تھا اور دل تھا کہ دوسرے راستے کے لیے ہمک رہا تھا۔

☆☆☆

تھوڑی سی خریداری کرنی تھی، اس لیے وہ اکیلی ہی بازار چلی آئی ویسے بھی کس کے ساتھ آتی؟ شہید احمد کی حالت تو پہلے سے بہت بہتر تھی، وہ آسانی سے چل پھر رہا تھا مگر عمومی مردوں کی طرح وہ بھی شاپنگ پہ جانے سے کتراتا تھا۔ مہربانو کی عادت بھی تو وہی روایتی عورتوں والی تھی۔ دس دکانیں پھرنے کے بعد اسی پہلی دکان سے چیز خریدتی جو پہلی نظر میں پسند اور سمجھ میں آئی تھی۔ ویسے بھی شہید احمد نے اب دکان پر جانا شروع کر دیا تھا۔ شہزادہ اب فارغ تھا، دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے میں وقت گزار رہا تھا۔

مہربانو تھیلے ہاتھ میں پکڑے جانے کس دھن میں سڑک پار کر رہی تھی جب اس کے انتہائی قریب ایک کار کے بریک بہت زور سے چرچرائے تھے۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر ٹکر لگ چکی تھی، ہاتھ اور کندھے میں درد کی ایک شدید لہر اٹھی اور پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا۔

ہوش آیا تو خود کو اسپتال کے بیڈ پر پایا اور آنکھ کھلتے ہی جو چہرہ اسے اپنے سامنے نظر آیا، اس نے جیسے مہربانو کو سرپرائز کر دیا تھا۔

''آ...... آپ......'' مہربانو نے بے اختیار اٹھنے کی کوشش کی۔

''لیٹی رہو، اٹھو گی تو درد ہو گا۔'' معیز عالم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔

''آئی ایم سوری، میری گاڑی سے تمہیں چوٹ لگی ہے۔ بازو میں فریکچر ہو گیا ہے۔'' معیز عالم بالکل نارمل لہجے میں بات کر رہا تھا۔ مہربانو کچھ پریشان سی تھی اور کچھ متذبذب بھی، پھر بھی نہ جانے کیوں معیز عالم کا یوں معذرت کرنا اسے اچھا نہیں لگا۔

''غلطی میری بھی تھی، جلدی میں تھی۔ ادھر اُدھر دیکھے بغیر اندھا دھند سڑک پار کر رہی تھی۔'' مہربانو نے اعتراف کیا۔

معیز عالم چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ مہربانو کو اس کی نظروں سے الجھن ہو رہی تھی۔

''اگر برسوں پہلے تم اسی طرح اعلا ظرفی اور کشادہ دلی کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔'' معیز عالم اچانک ہی بولا تھا مگر دھیمی آواز میں، مہربانو یک ٹک اسے دیکھتی رہ گئی، کوئی جواب نہ بن پڑا کہ کیا کہے۔

''میں نے شہزادے کو کال کر دی ہے وہ آتا ہی ہو گا۔'' معیز عالم کو شاید اس کا جواب نہیں چاہیے تھا، اسے جو کہنا تھا اس نے کہہ دیا۔

''تو...... کیسی گزر رہی ہے؟''

''ٹھیک۔'' مہربانو اس سے مختصر جواب نہیں دے سکتی تھی۔

''مگر تمہارے چہرے پر نہ وہ آسودگی ہے نہ وہ خوشی، جو ہونی چاہیے۔''

''ان سب باتوں کا کیا مقصد ہے؟'' مہربانو جز بز ہو کر بول ہی پڑی۔

''تمہیں اس حال میں دیکھ کر اور جو کچھ شہزادہ تمہارے گھریلو حالات بتاتا ہے وہ جان کر، بہت افسوس ہوتا ہے مجھے۔''

''اب افسوس کرنے سے کیا حاصل، اس وقت تو غصے میں فیصلہ کر دیا تھا۔'' مہربانو کی زبان بھی پھسل پڑی۔

''اسی لیے غصے کو حرام قرار دیا گیا ہے، غصے میں انسان جو فیصلہ کرتا ہے اس پر پچھتاتا ہے جیسے...... جیسے میں اکثر پچھتاتا تھا۔''

معیز عالم کے اعتراف پر مہربانو کی دھڑکن ایک لمحے کو جیسے رک سی گئی۔

مگر پھر آنے والے دنوں میں یہ دھڑکن چل پڑی دوبارہ اور پرانے روابط و مراسم کا ایک نیا سلسلہ ہی چل نکلا۔

☆☆☆

موسم نے کروٹ بدلی تو خشک ہواؤں نے اور زرد پتے اپنے ہمراہ ادھر سے اُدھر لے جانے شروع کر دیے۔ خزاں نے اپنے پنجے سبز درختوں میں گاڑ دیے تھے اور پتے زرد ہو کر نیچے

گر پڑے۔

زندگی بھی زرد پتوں کی مانند کسی بگولے کی زد میں تھی۔ نہ سمت، سفر نہ منزل کھڑکی میں کھڑی آرزو نے لان کا نظارہ دیکھتے ہوئے ایک یاسیت کے عالم میں کھڑکی بند کی تھی۔ مڑ کر پردہ برابر کر کے اس نے اے۔ سی آن کر دیا۔ بڑی بی سو چکی تھیں۔ دوپہر کا کھانا کھا کر قیلولہ ضرور کرتی تھیں، ان کی ہدایت کے مطابق وقت پر اے سی آن کر کے، کمرا بند کر کے وہ کوارٹر میں آ گئی۔ افنان، ماں سے کچھ کہہ رہا تھا، اسے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

"تم شوق سے اپنی بات جاری رکھو۔ میں اپنا منہ بند رکھوں گی۔" تلخی سے کہتی ہوئی وہ الماری سے ٹیک لگا کر نیچے ٹک گئی۔

"تم آخر مان کیوں نہیں جاتیں، مسئلہ کیا ہے؟"

افنان پچھلے تین روز سے بحث کر رہا تھا اور ابھی تک نہ وہ ہارا تھا، نہ آرزو۔ دونوں اپنی اپنی ضد پر اٹل تھے اپنی جگہ۔ عظمیٰ بیگم بیٹے کی طرف دار بن کر آرزو کو ہی سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں، ناکام کوشش۔

"مجھے نہیں جانا کہیں بھی، میں یہیں ٹھیک ہوں۔" آرزو نے پیر پھیلا کر آنکھیں موند لیں۔

"یہاں نوکرانی بن کر بہت خوش ہو تم۔" وہ بھی اسی کا بھائی تھا۔ طنز کے تیر چلانے اسے بھی آتے تھے مگر آرزو اس سے کچھ کم نہیں تھی۔

"بھاوج کی نوکرانی بننے سے بہتر ہے، یہاں کسی کی بھی نوکرانی بن جاؤں۔" آرزو کے ترکی بہ ترکی جواب پہ وہ چیں بہ چیں ہو گیا، رخ موڑ کر ماں سے مخاطب ہوا۔

"یہ یہاں خوش ہے، آپ چلیں میرے ساتھ۔"

"لڑکی ذات ہے، ایسے کیسے اکیلے چھوڑ دوں۔" عظمیٰ بیگم نے ہک دک ہو کر بیٹے کا چہرہ دیکھا۔

"عاطف سے بات ہوئی تھی میری، وہ کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے اس مسئلے کا۔"

"میں "کسی" کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوں، سنبھال سکتی ہوں خود کو میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" آرزو کو پھر طیش آ گیا۔

"تم ہر وقت غصے میں رہتی ہو، جذبات سے کام لیتی ہو، عقل استعمال نہیں کرتیں۔" افنان کا تجزیہ صحیح تھا۔ آرزو نے اس کی نفی کرنے کے بجائے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ ہاں دل ہی دل میں بڑبڑائی ضرور تھی۔

"برا بھلا جیسا بھی تھا ہم اپنا وقت کاٹ رہے تھے، یہ اور آ گیا پریشان کرنے کے لیے۔"

تین روز پہلے جب وہ اپنے پرانے محلے میں کوثر خالہ سے ایڈریس لے کر یہاں آیا تو عظمیٰ بیگم پر تو شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی اسے دیکھ۔ آرزو حیران تھی مگر زیادہ نہیں اور خوش ہونا تو شاید اس نے چھوڑ ہی دیا تھا۔

"مجھے معلوم تھا، میرا بیٹا ایک دن ضرور آئے گا۔" بیٹے کا چہرہ بے تحاشا چومتے ہوئے عظمیٰ بیگم نے اپنے آنسوؤں سے اسے تر کر ڈالا تھا۔

"پتا تھا بیٹا آئے گا، تب ہی اپنا ایڈریس فوراً کوثر کو بتا دی تھی کہ بیٹا آئے تو آسانی سے ان تک پہنچ جائے۔"

آرزو نے خوشی کے آنسو بہاتی ماں کو دیکھا۔

افنان نے اپنے آنے کا مقصد اگلے روز ہی بیان کر دیا تھا، وہ ان دونوں کو اپنے ساتھ لے جانے آیا تھا۔ عظمیٰ بیگم تو خوش تھیں۔ اس کی بات سن کر تیار ہو گئیں مگر آرزو اکڑ گئی۔ جانے سے صاف انکار کر دیا، ماں نے سمجھانے کی کوشش کی مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

"ہماری محبت میں نہیں لے جا رہا ہمیں، اپنی غرض سے لے جا رہا ہے۔ جڑواں بچے ہیں، دونوں میاں بیوی جاب کرتے ہیں۔ گھر اور بچے سنبھالنے کے لیے میڈ رکھنا بہت مہنگا پڑتا ہے، وہاں ہر کوئی افورڈ نہیں کر سکتا۔ اس لیے لے جا رہا ہے۔" آرزو کی باتیں تھوڑی صحیح تھیں اور کچھ کچھ غلط۔

"یہاں ہوتے میرے پوتا پوتی تو کیوں نہ سنبھالتی انہیں، وہاں دیکھ بھال کر لوں گی تو کیا حرج ہے۔" عظمیٰ بیگم تو بچوں کا سوچ کر ہی نہال ہو رہی تھیں۔

"اتنے عرصے تک خیال نہیں آیا ماں بہن کا، نہ فون، نہ خط۔ اب اپنی غرض کے لیے بھاگے بھاگے آ گئے سات سمندر پار سے۔"

آرزو کی بڑبڑاہٹیں بھی عظمیٰ بیگم کا جوش و خروش اور خوشی کم کرنے میں ناکام تھیں۔

☆☆☆

علاج کے سلسلے میں وہ جتنی بار بھی کلینک گئی، معیز عالم کو وہاں موجود پایا۔ شہزادہ اسے چھوڑ کر چلا جاتا پھر لینے آ جاتا۔ وہ جدید دور کا لڑکا تھا، جلد بازی اور بھاگم بھاگ والی زندگی کا شیدائی اس کے لیے انتظار کرنا محال تھا۔ یہ وقت معیز عالم، مہربانو کے ساتھ گزارتا۔ اس کی بیوی فوت ہو چکی تھی، دو بیٹیاں تھیں، ایک کا رشتہ طے کر دیا تھا، دونوں پڑھ رہی تھیں۔

"آپ ہر بار کیوں آ جاتے ہیں یہاں؟" مہربانو ابتدا میں کچھ پریشان تھی۔

"اپنی غلطی کے ازالے اور کفارے کے لیے۔ تمہیں تکلیف میں دیکھ کر خود پر ندامت ہوتی ہے۔" معیز عالم کا ذومعنی جواب اور انداز مہربانو کو پہلے پہل الجھن میں مبتلا کرتا تھا پھر یہ الجھن بھی سلجھ گئی۔ جب دھیرے دھیرے معیز عالم کے ہمراہ قدم سے قدم ملا کر وہ چلتی چلی گئی، آگے بڑھتی چلی گئی۔

معیز عالم اپنے جرم کا کفارہ ادا کرنا چاہ رہا تھا جو طلاق کی صورت میں کیا تھا۔ مہربانو اپنی اس غلطی کا ازالہ کرنا چاہ رہی تھی جو شہید احمد سے شادی کی صورت میں کی تھی۔ اس شادی اور شوہر سے اسے جو امیدیں تھیں، جو توقعات تھیں وہ ادھوری ہی رہ گئی تھیں، پوری نہیں ہوئیں پھر شہید احمد کی بیماری، لاچاری نے اسے بے زار کر دیا تھا۔ وہ ٹھیک ہوا تو کاروبار کی دگرگوں حالت اور شہزادے کے معاملے پر شہید احمد کی باتوں اور رویے سے وہ اور بھی بدظن ہو گئی۔ بیٹا اسے اپنے آپ سے، اپنی جان سے بھی پیارا تھا۔ اس کے بارے میں ایک لفظ بھی کسی کا برداشت نہیں کر سکتی تھی خواہ وہ اس کا شوہر ہی کیوں نہ ہو۔ معیز عالم کی باتیں، اس کا رویہ، اس کی پیش قدمی نے مہربانو کو اس حد تک شہ دی کہ ایک روز بڑی بے شرمی اور ڈھٹائی سے اس نے شہید احمد سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔

"کیا کہہ رہی ہو تم؟ ہوش میں تو ہو؟" شہید احمد کو اس کے مطالبے کے زہر نے بالکل نیلا کر دیا۔ وہ مرنے کے قریب تھا مگر مہربانو کو اس پر ترس نہ آیا۔

"میں عدالت نہیں جانا چاہتی، تمہیں بھی اپنی عزت پیاری ہے۔ بہتر ہے کہ معاملہ گھر کی چار دیواری میں ہی ختم کر لو۔" مہربانو کے سنگین چہرے اور پتھریلے لفظوں نے اسے سنگسار ہی کر ڈالا۔

وہ عظمیٰ اور ارسلان کے پاس گیا مدد مانگنے مگر وہ خود اپنی ہی مصیبت میں گرفتار تھے۔ ارسلان کی دوسری شادی اس کے گلے کا پھندا بن رہی تھی۔ عظمیٰ شوہر کی حالت دیکھ کر، کڑھ کڑھ کر آدھی ہو چکی تھی۔ اپنے بھائی کی افتاد سن کر تو بالکل ہی ڈھے گئی۔

پھر بھی دونوں نے مہربانو سے بات کی، اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر مہربانو سمجھنے، سمجھانے کی حدود سے بہت آگے نکل گئی تھی۔ معیز عالم نے جو سحر اس پر پڑھ کے پھونکا تھا اس کے فسوں سے باہر آنا اب مہربانو کے لیے ناممکن تھا۔ وہ اپنے مطالبے پر ڈٹی ہوئی تھی۔

☆☆☆

"میں بہت پریشان ہوں، کیا کروں۔ اکیلی چھوڑ کر جا نہیں سکتی، ساتھ جانے پر وہ راضی نہیں۔" عظمیٰ بیگم کی آواز سے واقعی پریشانی جھلک رہی تھی۔

"اس کا تو ایک ہی حل ہے کہ گوگو کی شادی کر دی جائے۔" کوثر خالہ نے ترنت مشورہ دیا۔

''اتنی جلدی کہاں سے ڈھنگ کا رشتہ ملے گا؟ رشتے درختوں پر تو لگتے نہیں کہ ہاتھ بڑھایا اور توڑ لیا۔'' اس بار ان کی آواز سے مایوسی جھلک رہی تھی۔

''ٹھیک ہے رشتے بے شک درختوں پر نہیں لگتے مگر ملتے تو اس دنیا میں ہیں نا۔ اور ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ رشتہ کیا چیز ہے۔''

''تمہاری نظر میں کوئی ہے تو بتا دو۔'' عظمیٰ بیگم نے یاسیت کے عالم میں بولتے ہوئے جیسے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے۔ آنکھوں کے سامنے عاطف کی شبیہ لہرائی اور ایک آہ بھر کر وہ اپنی پرانی محلے دار، سہیلی کوثر خالہ کی طرف متوجہ ہو گئیں جو کچھ کہہ رہی تھیں۔

''نظر میں ہی نہیں بلکہ میرے گھر میں ہے ایک رشتہ، اگر تم قبول کرو تو۔ فہد کو اپنا داماد بنا لو، چودہ جماعت پڑھ کر نوکری کر رہا ہے۔ بیس ہزار روپے تنخواہ ہے۔ آگے اور بھی بڑھ جائے گی۔''

''میں مشورہ کر کے جواب دیتی ہوں۔'' عظمیٰ بیگم خوش بھی تھیں اور متذبذب بھی۔

افنان سے مشورہ کیا تو وہ فوراً ہی راضی ہو گیا، وہ تو پہلے کسی بھی طرح اس مسئلے کا حل چاہتا۔ آرزو سے بات ہوئی تو حسب توقع وہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔

''مجھے نہیں کرنی شادی وادی۔''

''آج نہ سہی، کل سہی، کبھی نہ کبھی تو کرنی ہے۔ میں تو تمہارے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان تھی۔ اللہ نے غیب سے مدد کر دی۔''

''اور پھر یہ بھی تو سوچو کہ یہاں رہتے ہوئے کوئی اچھا رشتہ کہاں سے آئے گا؟ ڈرائیور، چوکیدار مالی، خانساماں، اسی ٹائپ کے رشتے ملیں گے۔''

عظمیٰ بیگم کی بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ افنان نے جلتی پر تیل چھڑک دیا۔ مگر خلاف توقع بھڑکنے کے بجائے آرزو خاموش تھی۔ ایک نظر اس نے ماں کو اور بھائی کو دیکھا اور چپ چاپ گھٹنوں پر ٹھوڑی جما کر اپنا پسندیدہ پوز بنا کر بیٹھ گئی۔ زندگی میں جانے کتنے رموز ہیں کہ ہر بار ایک نیا چکر ایک نئی گردش سامنے آتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے وہ یہی سوچتی رہی

اسے راضی کرنے کا کام عاطف کو سونپا گیا۔ وہ آ تو نہیں سکا، مگر فون پر آرزو سے بات کی۔

''میری شادی سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا اور نہیں ہوئی تو کیا نقصان ہوگا؟'' آرزو کا لہجہ مزید کٹیلا ہو گیا۔

''ہم ہر کام اپنے فائدے نقصان کے لیے نہیں کرتے۔ ماں، باپ کی مرضی اور خوشی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔ نہ آرزو، نہ خواہش۔''

عاطف سامنے ہوتا تو وہ دیکھتی کہ یہ سب کہتے ہوئے اس کے چہرے پر تاریک سایہ سا لہرا گیا تھا۔ اپنوں کی خوشی کے لیے خود کو قربان کرنا، کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔ کوئی اس سے پوچھے تو۔

''افنان بھائی، امی کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔'' آرزو کا لہجہ پست ہو گیا۔

''ہر وقت منفی انداز میں مت سوچا کرو۔ ہر بات کا تاریک پہلو نہ دیکھا کرو۔ تم یوں بھی تو سوچ سکتی ہو کہ ایک ماں جس بیٹے کو دیکھنے کے لیے ترس رہی تھی، جس سے ملنے کے لیے تڑپ رہی تھی۔ اس کے ساتھ رہنا۔ اس ماں کو کیسا سکھ اور خوشی دے گا۔''

''اور میں؟'' آرزو کا بھیگا لہجہ سن کر وہ بے چین ہو گیا۔

''تمہیں تو ویسے بھی ایک نہ ایک دن ان سے رخصت ہونا ہی ہے۔ ابھی وہ افنان کے ساتھ نہ جائیں، کل کو تمہاری شادی کے بعد بالکل اکیلی رہ جائیں گی۔ کون ہوگا ان کے پاس، ان کا سہارا بننے کے لیے ان کی دیکھ بھال کرنے کے لیے؟ انہیں خوشیاں دینے کے لیے؟''

''میں ہوں اپنی امی کے پاس۔ ہمیشہ رہوں گی ان کے ساتھ۔''

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔'' عاطف نے اسے جھڑکا۔

''یوں جذباتی ہو کر زندگی نہیں گزاری جاتی، بعض گھونٹ چاہے کتنے ہی کڑوے کیوں نہ لگیں، ہمیں پینے ہی پڑتے ہیں۔''

''تو تم دل سے چاہتے ہو کہ یہ کڑوا گھونٹ پی لوں؟'' آرزو کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ وہ بے بس بیچارہ گیا۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش میں اور بے اختیار ہو گیا۔

''میں بھی تو پی رہا ہوں، میرا ساتھ دینے کے لیے ہی سہی۔'' وہ دھیمے سے بولا تھا اور آرزو نے مزید کچھ کہے فون بند کر دیا۔

''یہ سب کیوں...... کیوں؟'' وہ بے اختیار ہو کر سسک پڑی تھی۔

اپنے آنسوؤں کی دھند میں اسے سب کے چہرے خوب صاف نظر آ رہے تھے۔ ماں کا منتظر چہرہ، بس۔ پر اس کی ہاں خوشیاں بکھیر سکتی تھی اور عاطف کا چہرہ، جو دور بہت دور تھا۔ وہ ہاں کرتی تب بھی نہ کرتی تب بھی۔ دوریاں اور آنسو، مقدر تھے تو پھر؟ میری ماں کو ہی خوشیاں مل جائیں۔ اس نے فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

دل میں اندھیرا ہو جائے تو دنیا اندھیر ہو جاتی ہے۔ شہید احمد کی دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ مہر بانو نے اپنا مطالبہ پورا کروا کر ہی دم لیا۔ طلاق کے کاغذات پر دستخط کرتے ہوئے اس کی حالت ایسے ہارے ہوئے جواری کی سی تھی جو اپنی زندگی بھی ہار گیا ہو۔ مہر بانو چلی گئی۔ شہزادہ بھی چلا گیا۔ اس گھر سے زندگی سے اور دل سے بھی۔

کئی دن تک وہ گھر میں ہی پڑا رہا۔ عظمیٰ ناشتہ کھانا لے کر آ جاتی۔ دونوں ایک دوسرے سے اپنا دل ہلکا کر لیتے۔ دکان سے کئی بار جلیل رضا آ چکا تھا۔ بے چارہ بہت پرانا اور وفادار تھا۔ شہید احمد کے باپ کے دور کا تھا۔ انہی کا ہم عمر، شہید احمد کو دیکھ دیکھ کر کفِ افسوس ملتا۔

''کل کے بچے تھے ہمارے سامنے کیا حال ہو گیا تمہارا، مگر خیر جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب اپنے گھر سے باہر نکلو، دکان آؤ اپنا کام دیکھو۔'' وہ اسے سمجھا بجھا کر چل دیتے۔

شہید احمد ہر روز دکان جانے کا ارادہ کرتا اور ہر روز اس کا ارادہ ٹوٹ جاتا۔ ایک روز اس نے جلیل صاحب کو بلوایا۔ وہ آئے تو شہید احمد نے ان کے سامنے ایک نوٹس رکھ دیا۔

''یہ کیا ہے۔'' انہوں نے اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔

وہ بینک کی طرف سے آیا تھا۔ اس نوٹس کے مطابق انہوں نے مکان کے کاغذات گروی رکھ کر بینک سے قرضہ لیا تھا اس کی قسطیں واجب الادا تھیں جن کی ادائیگی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

''کب لیا تم نے قرضہ۔'' جلیل رضا نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

''میں نے نہیں لیا۔'' شہید احمد نے دھیرے سے جواب دیا۔

''پھر؟'' انہوں نے جو سوال کیا اس کا سیدھا اور مختصر جواب یہ تھا کہ مہر بانو سے نکاح کے بعد چاہت اور محبت سے سرشار اولین دنوں میں شہید احمد نے ایک جذباتی قدم اٹھایا اور مکان مہر بانو کے نام کر دیا۔ اب ان ہی کاغذات کو گروی رکھ کر بینک سے قرضہ لیا گیا تھا۔ شہید احمد کو اب خیال آ رہا تھا کہ شہزادہ اپنے دوستوں کے ساتھ دبئی، ملائیشیا اور ہانگ کانگ گھوم پھر کر آیا تھا۔ مہر بانو نے بتایا تھا کہ وہ اپنے باپ کے پیسے پر عیش کر رہا ہے۔ شہید احمد کو آج علم ہوا کہ وہ پیسہ کون سے باپ کا تھا۔

اسے شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے ایک جذباتی فیصلہ کر کے خود ہی اپنے ہاتھ پیر کٹوائے تھے اور شاید یہ قدرت کی طرف سے بھی اس کے لیے سزا تھی کہ۔ اس نے اپنے سگے بیٹے کا حق مار کر کسی اور کو یہ حق دے دیا تھا۔ اس کا خمیازہ تو اسے بھگتنا ہی تھا اور وہ بھگت رہا تھا۔

قسطوں کی ادائیگی کے لیے اس کے پاس کوئی رقم نہیں تھی۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے لاتا، ناچار اسے اپنا مکان بیچ کر بینک کا قرضہ ادا کرنا پڑا۔ جو تھوڑی بہت رقم بچی وہ ڈوبتے ہوئے کاروبار میں لگا دی مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ ڈوبتے ہوئے جہاز کی کتنی

ہی مرمت کی جائے اسے ڈوبنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ کاروبار جہاز دھیرے دھیرے ڈوب رہا تھا۔ وہ فقط بے بسی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

مہربانو کی بے وفائی پھر مکان اور کاروبار سے بھی ہاتھ دھو بیٹھنا۔ ساری قیامتیں جو یکے بعد دیگرے اس پر ٹوٹی تھیں۔ کوئی تو رنگ لانا ہی تھا انہیں۔

اور بالآخر ایک روز وہ بالکل ہی ڈھے گیا۔ اعصاب جو دھیرے دھیرے شل ہو رہے تھے۔ ایک روز جواب دے گئے۔ اس کے دماغ اور اعصاب پر بیماری حملہ آور ہوئی تھی۔ اس کے دل سے جینے کی امنگ ختم ہو گئی تھی۔ زندگی اب ایک بے کار اور بے معنی شے تھی اس کے لیے، چاہے رہتی یا ختم ہو جاتی۔ شہید احمد کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اسے بھوک نہیں ستاتی تھی۔ پیاس نہیں لگتی تھی۔ وہ پہروں آنکھیں پھاڑے جانے کیا کیا سوچتا رہتا تھا۔ نیند اس کے قریب بھٹکنے کا نام بھی نہیں لیتی تھی۔

عظمیٰ اسے اپنے گھر لے آئی تھی۔ حالانکہ اس وقت اس کی اپنی کشتی گرداب میں پھنسی ہوئی تھی۔ پھر وہ اس کا ماں جایا بھی تھا۔ دنیا اور زندگی سے ہار کر ایک زندہ لاش بن چکا تھا۔ اس سے بے اعتنائی اور گریز، عظمیٰ کے لیے ممکن نہیں تھا۔ ادھر ارسلان سوکھ کر کانٹا بن چکا تھا۔ خون آشام بلا نے اس کا سارا ہی خون چوس لیا تھا۔ مکان نام کرنے کی جو مہلت اسے ملی تھی۔ اس میں بار بار اضافے کے بعد اب آخری ڈیڈ لائن اسے دی گئی تھی۔ جس کے ختم ہونے میں فقط تین روز باقی تھے۔

جس دن یہ ڈیڈ لائن ختم ہوئی۔ اسی روز شام میں اس کی لاش ریلوے لائن سے ملی۔ بظاہر خودکشی کا کیس لگتا تھا مگر لاش پر تشدد کے نشانات اور پوسٹ مارٹم رپورٹ کچھ اور ہی کہانی بیان کرتی تھی۔ پولیس نے ضابطے کی کارروائی مکمل کر کے لاش سردخانے سے نکال کر لواحقین کے حوالے کی اور کیس سردخانے میں ڈال دیا۔

مقدمہ کس کے خلاف ہوتا؟ اور کون کرتا؟

عظمیٰ تو خود ہی اپنے ہوش و حواس سے بے گانہ تھی۔ پھر اس کے پاس نہ اتنی ہمت تھی نہ رقم کہ وہ ان طاقت ور اور بااثر مافیا کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتی جنہوں نے عدت ختم ہونے سے پہلے ہی اسے اور گھر کے باقی مکینوں کو گھر سے باہر نکال دیا اور خود قبضہ جما کر بیٹھ گئے۔ ان کے پاس جو کاغذات تھے اس کی رو سے ارسلان نے یہ مکان انہیں فروخت کر دیا تھا۔ عظمیٰ کو خود سے زیادہ بیٹی کی فکر تھی۔ اس کی زندگی اور عزت پیاری تھی۔ اس کسمپرسی کے عالم میں اس کی ایک دیرینہ ملازمہ نے ان تینوں کو اپنے اورنگی ٹاؤن میں پناہ دلوا دی تھی۔

☆☆☆

پڑوس سے فون آیا تو عاطف کے ہوش ہی اڑ گئے۔ بس نہیں چلتا تھا کہ وہ پر لگا کر اسپتال پہنچ جائے جہاں امی کو لے جایا گیا تھا۔ ذرا دیر میں وہ اسپتال پہنچ ہی گیا۔ ایمرجنسی میں ان کے بیڈ کے پاس کھڑا فکرمندی اور بے بسی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ عفت پر فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ پڑوسن سے باتیں کر رہی تھیں۔ طبیعت خراب ہوئی تو انہوں نے عاطف کو فون کر دیا اور اپنے بیٹے کے ساتھ عفت کو اسپتال لے آئیں۔

”بڑی خوشی خوشی تمہاری شادی کی باتیں کر رہی تھیں مجھ سے، اچانک طبیعت خراب ہو گئی۔ میں تو گھبرا گئی۔ فوراً یہاں لے آئی۔“ وہ بھیگی آنکھیں لیے عاطف کو بتا رہی تھیں۔

ثانیہ کے گھر والوں کو اطلاع مل گئی تھی۔ سب کے سب بھاگے چلے آئے۔

”پریشان مت ہو بیٹا۔ ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گی عفت بہن۔“ ثانیہ کی امی نے اسے تسلی دی۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ عاطف نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

اصل امتحان تو عفت کے ڈسچارج ہو کر گھر آنے کے بعد شروع ہوا۔ ان کا نچلا دھڑ پورا مفلوج ہو چکا تھا۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ مستقل فزیوتھراپی اور میڈیسن سے بہتری آ سکتی ہے مگر اس میں وقت لگے گا۔ صبر اور مستقل مزاجی کی ضرورت تھی۔

عاطف نے ایک کل وقتی ملازمہ رکھ لی تھی جو صرف امی کے کاموں کے لیے تھی، آفس سے آ کر وہ انہیں فزیوتھراپی کے لیے لے کر جاتا۔ گھر کی پہلے سے جو ملازمہ تھی وہ گھر کے سارے کام کر رہی تھی۔ اس کی تنخواہ ڈبل ہو گئی تھی۔ عاطف کی تھکن اور نیند کی کمی مستقل ہوتی جا رہی تھی۔

ان ہی بھاگتے دوڑتے دنوں میں عظمیٰ پھپھو کا فون آیا۔ آرزو کی بات پکی ہو گئی تھی۔

”شادی میں ایک سال ہے۔ افنان نے وعدہ کیا ہے کہ ایک سال بعد مجھے اپنے ساتھ لے کر آئے گا۔ میں چاہ رہی تھی میرے سامنے ہی رخصتی ہو جاتی۔ میرا دل نہیں مان رہا۔ گوگو کو یوں اکیلا چھوڑنے پر۔ حالانکہ بڑی بی نے اور ان کی بہو نے تو بہت تسلیاں دی ہیں کہ اپنی بیٹی کی طرح خیال رکھیں گی مگر۔“ عظمیٰ پھپھو بولتے بولتے خاموش ہو گئیں۔

”میں کیا کروں مجھے بتاؤ۔“ وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح عاطف سے پوچھ رہی تھیں۔

”آپ کوثر خالہ سے بات کریں دوبارہ۔“

”کی تھی، اس کی بھی مجبوریاں ہیں۔ ابھی بیٹی کی شادی کر کے فارغ ہوئی ہے۔ بیٹے کی شادی کے لیے کچھ بھی انتظام نہیں ہے۔ سادگی سے کرنے پر آمادہ نہیں۔ پہلے بیٹے کا بیاہ ہے، دھوم دھام سے کرے گی۔ میرے جانے میں ابھی دو ہفتے ہیں۔ ہر وقت گوگو کا خیال رہتا ہے۔ کبھی سوچتی ہوں کہ ابھی جانے کا خیال دل سے نکال دوں۔ گوگو اپنے گھر کی ہو جائے تو پھر چلی جاؤں گی اگلے سال۔ ہیں؟“ انہوں نے عاطف کی رائے چاہی۔

”افنان ابھی آیا ہوا ہے۔ اگلے سال نہ جانے کیا صورت حال ہو۔ آپ کا ابھی جانا ہی مناسب ہے۔“ عاطف نے سوچ کر جواب دیا۔

”اور گوگو؟“

”گوگو میری ذمہ داری ہے آپ اس کی فکر مت کریں۔“ عاطف نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”ویسے بڑی بیگم صاحبہ نے کہا ہے کہ اسے سرونٹ کوارٹر کے بجائے اپنے برابر والے روم میں شفٹ کر لیں گی۔“

”یہ تو اچھی بات ہے۔“

”میرا دل نہیں مان رہا تا۔ کیا کروں؟“ عظمیٰ نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

”دو ہفتے ہیں ابھی، دیکھیں، اللہ کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی دے گا۔“ عاطف نے انہیں تسلی دیتے ہوئے فون بند کر دیا۔ اپنی الجھنیں اور پریشانیاں ہی کم نہیں تھیں۔ عظمیٰ پھپھو اور آرزو کے مسائل نے بھی اسے اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ تین ہفتے ہوئے تھے عفت کو اسپتال سے آئے ہوئے اور تین ہفتوں میں ان کے لیے کل ہی تیسری ملازمہ رکھی گئی تھی۔ وہ حد سے زیادہ چڑچڑی ہو گئی تھیں۔ ان کی بیماری نے جسمانی ہی نہیں ان پر ذہنی طور پر بھی منفی اثر ڈالا تھا۔

وہ ایک متحرک اور پھرتیلی خاتون تھیں۔ گھر کے کاموں میں، ذمہ داریوں میں ہمہ وقت خود کو مصروف رکھتی تھیں۔ اب بیماری اور لاچاری کی حالت میں یوں بے بس ہو کر دوسروں کے رحم و کرم پر ہونا، ان سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ بدمزاجی اور چڑچڑے پن نے ان کے اندر جگہ بنالی تھی۔ عاطف لاکھ ان کی دل جوئی کرتا، انہیں تسلی دیتا مگر ان کے لیے ساری صورت حال کو قبول کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اپنی ملازمہ سے ان کا رویہ ناقابل برداشت حد تک تلخ اور ناگوار ہو جاتا، اپنے بعض کاموں کے معاملے میں وہ ملازمہ سے تعاون کرنے والی نہیں تھیں۔

اس حد تک زچ کر دیتیں کہ وہ بے چاری ملازمت چھوڑنے پر ہی مجبور ہو جاتی۔ عاطف کے لیے یہ مسئلہ بھی انتہائی پریشان کن تھا۔ ہر ہفتے ایک نئی ملازمہ کی کھوج اور تلاش اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ بھلا ہو پڑوس والی آنٹی کا اور ثانیہ کی امی کا انہوں نے اس معاملے میں عاطف کی مدد کی اور اب تک کر رہی تھیں۔ مگر یہ سلسلہ کب تک چلتا۔ آئے دن

پرانی ملازمہ کا جانا اور نئی کا آنا۔

ثانیہ اپنی امی اور ابو کے ساتھ آئی تھی۔ ویسے تو وہ اسپتال بھی باقاعدگی سے آئی تھی انہیں دیکھنے۔ اب گھر بھی دو تین بار آچکی تھی۔ ہر بار ان کے لیے پرہیزی کھانا بنالاتی۔ ڈاکٹرز نے جن چیزوں کی اجازت دی تھی کھانے پینے کی وہ اشیاء بھی لے آتی۔

''آنٹی! آپ پریشان نہ ہوں۔ ان شاء اللہ بہت جلد ٹھیک ہوجائیں گی۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ سب آپ کی ول پاور پر ڈیپنڈ کرتا ہے۔ آپ ہمت نہیں ہاریں گی تو آپ کی بیماری ہمت ہار کر بھاگ جائے گی۔ جیت جائیں گی آپ۔'' ثانیہ ان کا سر دباتے، ہاتھ سہلاتے دھیرے دھیرے بولتی رہتی سمجھاتی رہتیں۔

عفت اس کی باتیں سن کر کبھی کبھی مسکرادیتیں۔ یہ بھی شکر کا مقام تھا کہ اتنی تبدیلی تو آئی ان میں۔ پھر یہ جو تیسری ملازمہ آئی تھی۔ وہ پچھلے دس دن سے تو ٹکی ہوئی تھی۔ کچھ وہ متحمل مزاج تھی اور روپے میں چار آنے تبدیلی عفت بیگم کے مزاج میں بھی آئی تھی۔ گھر کے معاملات میں تھوڑی سی بہتری آرہی تھی اب عاطف کے لیے ایک محاذ اور تھا جسے اسے سر کرنا تھا۔

رات میں کھانے کے بعد جب وہ انہیں دوائی دے رہا تھا تو اس کی نظر بالوں پر پڑی، خشک، بے ترتیب اور الجھے ہوئے۔

''آپ کے بال کیسے ہورہے ہیں۔ چوٹی نہیں باندھی صابرہ نے؟''

''بنائی تھی آج، جیسے ہی وہ تیل لگانے لگی۔ گھر سے فون آگیا۔ لڑکے کا ایکسیڈنٹ ہوگیا موٹر سائیکل سے، بے چاری سب کچھ چھوڑ چھاڑ فوراً ہی بھاگی۔''

''اچھا!'' عاطف نے سوچتے ہوئے ماں کو دیکھا۔

''چلیں، میں تیل لگا کر بال باندھ دیتا ہوں۔''

''رہنے دو، تم کیا کروگے یہ سب کام، کل ثانیہ آئے گی وہ باندھ دے گی۔'' عفت بولتے بولتے مسکرادیں۔

''تھوڑی خدمت بیٹے سے بھی کروالیں۔''

عاطف تیل کی بوتل اٹھا کر ان کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔ وہ کرسی پر بیٹھی تھیں۔ بستر پر لیٹے لیٹے تھک جاتی تھیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی کھانے کے لیے، عاطف نے انہیں کرسی پر بٹھایا تھا۔

''بال سفید ہورہے ہیں آپ کے؟'' تیل کی مالش کرتے ہوئے عاطف نے غور کیا۔

''سفید تو کب سے ہیں۔ بہت دنوں سے ڈائی نہیں ہوئے۔ سوچ رہی تھی کہ ثانیہ سے ڈائی لگوالوں۔''

''صابرہ سے لگوالیجیے گا۔'' عاطف نے یوں ہی مشورہ دیا۔

''کیوں، تمہیں اچھا نہیں لگتا اگر میں اپنی بہو سے کوئی خدمت لوں؟''

امی نے اسے چھیڑا تھا۔ وہ گڑبڑا گیا۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ابھی وہ اس گھر میں تو نہیں آئی نا اسے عجیب سا نہ لگے۔'' عاطف نے بولتے بولتے ہونٹ بھینچ لیے۔

''عجیب کیوں لگے گا۔ وہ بچی تو خود اتنے پیار اور محبت سے میرے کام کرتی ہے۔'' عفت کے لہجے میں ثانیہ کے لیے شفقت اور حلاوت گھلی ہوئی تھی۔

عاطف خاموشی سے سر میں تیل لگا کر بال سلجھا رہا تھا کنگھا کرکے اس نے بری بھلی جیسی بھی چوٹی باندھ ہی دی۔ سچ تو یہ تھا کہ۔ اسے ٹھیک سے چوٹی باندھنی آئی ہی نہیں۔

''صحیح بندھی ہے؟'' عاطف نے تیل کی بوتل رکھ کر فکرمندی سے معائنہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔'' عفت نے اپنی مسکراہٹ دبائی۔

عاطف نے بہت ہلکے ہاتھوں سے چوٹی باندھی تھی۔ پیچھے سے بہت ڈھیلی ہورہی تھی۔ آگے سے بال بس نکلنے کو تھے۔ مگر خیر۔ انہیں اپنے بیٹے پر پیار آرہا تھا۔ آج کل کتنی اولادیں ہیں جو والدین کے لیے ایسے جتن کرتی ہیں ان کا بیٹا نایاب تھا۔ اکثر انہیں اپنے بیٹے پر بہت فخر محسوس ہوتا تھا جو شاید ٹھیک ہی تھا۔

عاطف ہاتھ دھو کر آیا تو بیڈ کے کنارے پر ٹک گیا۔ عفت کی کرسی کے قریب۔

''امی...... ایک بات کہنی تھی آپ سے۔'' عاطف کا لہجہ غیر معمولی تھا۔ وہ چونک پڑیں۔

''کیا بات ہے؟''

''میں نے آپ کو آگاہ کیے بغیر ایک ذمہ داری اپنے سر اٹھالی ہے۔''

''کیسی ذمہ داری؟'' عاطف کی بات اور انداز نے عفت کو تشویش میں مبتلا کردیا تھا۔

''ایک لڑکی کے تحفظ کی ذمہ داری ہے۔ بس کچھ دنوں کی بات ہے۔ اس کا رشتہ طے ہے۔ شادی ہوکر چلی جائے گی یہاں سے۔'' عفت کی آنکھوں میں امڈتی بے پناہ حیرت اور شک کی پرچھائیوں کو دیکھ کر عاطف نے جلدی جلدی وضاحت کی۔

''مگر وہ ہے کون؟ تمہارا کیا تعلق کیا واسطہ ہے اس سے، تم کیسے جانتے ہو اسے۔'' عفت نے تابڑ توڑ سوالات کی بارش کردی۔

''بات یہ ہے امی جان!'' عاطف نے ماں کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں گویا ہوا۔

''جس جس نے جو کچھ کیا وہ اپنے کیے کا خود ذمہ دار ہے۔ اعمال کی بازپرس کرنے والا اللہ ہے۔ بڑوں کی غلطیوں یا گناہوں کی سزا چھوٹوں کو نہیں ملنی چاہیے۔''

''عاطف! کھل کر کہو، تم کس کی بات کررہے ہو؟'' عفت کے چہرے پر ماضی کے مہیب سایوں کا عکس پھیل گیا۔ ان کا تنفس تیز ہونے لگا۔

''صرف ایک بار، پہلی بار میرا مان رکھ لیں امی۔'' ان کے ٹھنڈے ہاتھ بدستور عاطف کے گرم ہاتھوں میں جکڑے ہوئے تھے۔

''کون ہے وہ لڑکی؟'' وہ بولیں تو آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہ تھی۔

عاطف سر جھکائے بیٹھا تھا۔ بولا تو اتنی دھیمی آواز میں کہ عفت نے بمشکل اس کا لیا ہوا نام سنا۔

''گوگو!''

''گوگو؟'' عفت نے بے یقینی سے دہراتے ہوئے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ اس کا جھکا ہوا سر دیکھا۔ پھر سرد آواز میں بولیں۔

''مجھے بستر پر لٹا دو۔''

☆☆☆

اگلے روز چھٹی تھی، ثانیہ اپنی امی کے ساتھ آئی تھی۔ امی نے اپنی پرانی ملازمہ سے مہمانوں کی خاطر داری کے لیے کھانا پکوایا تھا۔ مٹن پلاؤ اور کباب، وائٹ چکن اور فروٹ ٹرائفل، ثانیہ نے اسپیشل سلاد بنائی، ٹیبل لگانے میں ملازمہ کی مدد کی، عفت بیگم اسے روکتی رہیں۔

''ارے بیٹا! تم مہمان ہو، آرام سے بیٹھو، ہوجائیں گے سارے کام۔'' مگر ثانیہ کی امی مسکرا کر بولیں۔

''کرنے دیں، کل کو آکر بھی تو گھر اسی نے سنبھالنا ہے۔ اچھا ہے کچھ واقفیت پہلے ہوجائے گی۔'' عفت خاموش ہوگئیں مگر دل ہی دل میں مطمئن اور خوش تھیں۔ ایسی اچھی لڑکی اور اتنا سمجھدار سمدھیانہ تو قسمت والوں کو ہی ملتا ہے۔

''میں سوچ رہی تھی کہ شادی کی تاریخ طے کردیں اگلے ماہ کی۔'' عفت نے کھانے کے بعد سمدھن سے اکیلے میں بات کرتے ہوئے موضوع چھیڑا۔

''اگلے ماہ کی؟'' سمدھن بے چارگی سے مسکرائیں۔

''اب تو ہمارے مہمان بھی جانے والے ہیں۔ ویسے چھ ماہ بعد آئیں گے دوبارہ تب تک آپ کی کنڈیشن بھی ان شاء اللہ بہتر ہوجائے گی۔ بھئی ہم تو چاہتے ہیں کہ بیٹے کے ولیمے پر وہیل چیئر کے بجائے آپ اپنے پیروں پر چل کے سب کا استقبال کریں۔ سب سے مبارک باد وصول کریں۔''

ایک طرح سے سمدھن صاحبہ کی بات بھی ٹھیک ہی تھی۔ انہوں نے جیسے عفت کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی۔ وہ مزید کچھ کہے بغیر، اصرار کیے بغیر، فقط ایک آہ بھر کر رہ گئیں۔

☆☆☆

تم سچ کہہ رہے ہو؟ تمہاری امی مان گئیں؟'' عظمیٰ پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری تھی عاطف کی بات سن کر۔

''جی، میں سچ کہہ رہا ہوں، اجازت دے دی ہے انہوں نے۔'' عاطف نے کہا مگر اس نے یہ نہیں بتایا کہ عفت بیگم نے کن لفظوں اور کن شرائط پر اجازت دی ہے اسے۔

''اللہ تیرا شکر ہے۔'' عظمیٰ بیگم سے اپنی بے پناہ خوشی سنبھالنی مشکل ہو رہی تھی۔ ان کی مشکلات اللہ نے کیسے حل کر دیں۔ ان کی خواہشات کیسے پوری کر دیں۔ بیٹے سے ملنے کی، اس کے ساتھ رہنے کی خواہش، بیٹی کا گھر بسنے کی' اس کے تحفظ کی خواہش، اس مہربان ہستی نے ایسے ان کے معاملات سلجھائے کہ انہیں پتا بھی نہیں چلا۔ ''اپنے رب کا جتنا بھی شکر کروں کم ہے۔'' انہوں نے کانپتی ہوئی آواز میں عاطف سے کہا۔ آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

'' ملنے نہیں آؤ گے۔'' تین روز بعد ان کی فلائیٹ تھی۔

''ایئرپورٹ آؤں گا۔''

''اچھا!'' عظمیٰ بیگم تھوڑی سی مایوس ہو گئیں مگر خیر، اس کی مجبوریاں بھی جانتی تھیں۔

عاطف، بیٹا تم نے بہت بڑا احسان کیا ہے مجھ پر، میں تو اس قابل تھی بھی نہیں۔ بہت بڑا دل ہے تمہارا، بہت اعلا ظرف ہو۔ میرے روئیں روئیں سے تمہاری زندگی کے لیے، خوشیوں کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔'' عظمیٰ بیگم جذبات سے مغلوب آواز میں بول رہی تھیں اور عاطف نہ جانے کیوں اپنی تعریف سن کر محجوب ہو رہا تھا۔

''چلیں پھر میں بعد میں بات کرتا ہوں۔'' عاطف نے فون آف کر دیا۔

تین دن بھی گزر ہی گئے۔ سالوں پر محیط موسم گزر جاتے ہیں۔ مہینوں پر مشتمل موسم گزر جاتے ہیں کبھی مختصر کبھی طویل، خوشیوں کے، دکھوں کے ادوار بھی گزر جاتے ہیں تو تین دنوں کی کیا اوقات تھی۔ یہ بھی گزر گئے اور روانگی کا وقت، جدائی کی ساعت قریب آن پہنچی۔

''ایک بات کہنی تھی تم سے۔'' عفت سے مل کر اجازت لیتی عظمیٰ بیگم عاطف کو ذرا دور لے گئیں۔

''جی۔''

''وہ......'' عظمیٰ بیگم نے سر جھکا لیا پھر بولیں۔ ''اللہ سے تو ہر آتی جاتی سانس میں اپنے گناہوں کی غلطیوں کی معافی مانگتی رہتی ہوں۔ مگر جانتی ہوں جب تک تمہاری امی مجھے معاف نہیں کریں گی مجھے خدا سے بھی معافی نہیں ملے گی۔ ان کے سامنے جانے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں' ان سے کہنا......'' عظمیٰ بیگم کی آواز بھر آ گئی۔ انہوں نے چند لمحے ٹھہر کر خود پر قابو پایا۔

''ان سے کہنا، مجھے معاف کر دیں۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں۔ جن کی مدد سے ان سے معافی مانگوں، بس اس اللہ کی رحمت کے واسطے سے معافی طلب کرتی ہوں جو سب کے گناہوں کو، عیبوں کو ڈھانپ لیتا ہے۔ اس رحمٰن و رحیم اللہ کے واسطے مجھے معاف کر دیں۔ میری ہر زیادتی، ہر غلطی، ہر گناہ کے لیے۔'' بولتے بولتے ان کی آواز دوبارہ بھرائی۔ آنسو بہنے لگے،

''اب پتا نہیں کب ملنا ہو یا نہ ہو۔'' عظمیٰ نے عاطف کی پیشانی چوم لی۔

آرزو کے ساتھ گھر واپس آتے ہوئے عاطف کا دل بہت بوجھل تھا۔ زندگی کے اور لوگوں کے کیسے کیسے رنگ ہیں؟ یہی لوگ اور یہی رنگ زندگی کو کہیں حسین اور خوشنما بنا دیتے ہیں اور کہیں بدصورت اور

...ملا۔

ڈرائیونگ کرتے کرتے اس نے ایک نظر آرزو پر ڈالی۔ وہ پہلے کی نسبت بہت کمزور لگ رہی تھی۔ آنکھیں خشک تھیں چہرہ سپاٹ مگر کون جانے یہ دل، یہ آنکھیں کتنے سیلاب، کتنے سمندر اپنے اندر بہائے ہوئے تھے۔

''اتنی کمزور کیوں ہو رہی ہو۔ پہلے تو ایسی نہ تھیں۔''

''پہلے زندگی ایسی نہیں تھی۔'' وہ دھیرے سے بولی اور دل بھی، اندر سے کوئی چپکے سے بولا، آرزو بے چین ہو گئی۔

''پہلے زندگی میں پریشانیاں تھیں۔ مشکلات تھیں۔ اب اتنی نہیں ہیں۔'' عاطف نے اسے جتایا تھا یا باور کروایا تھا۔

''ہر تھوڑے عرصے بعد زندگی کا ایک نیا رخ سامنے آتا ہے۔ اب خدا جانے اس کے دامن میں میرے لیے کیا ہو۔''

''ان شاء اللہ کچھ نہ کچھ اچھا ہی ہو گا۔'' عاطف کا لہجہ یقین سے بھرا ہوا تھا۔

''میں خوش فہمیاں نہیں پالتی!'' آرزو کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

''پال لینی چاہئیں۔ کبھی پوری ہو بھی جاتی ہیں۔'' عاطف نے گاڑی روکی، گھر آ گیا تھا۔

گیٹ کے ساتھ ہی سیڑھیاں تھیں۔ عاطف سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ آرزو اپنا چھوٹا سا بیگ لیے اس کے پیچھے تھی۔

''لاؤ یہ بیگ مجھے دے دو۔'' دفعتاً عاطف چوتھی سیڑھی پر رکا اور مڑ کر آرزو کو مخاطب کیا۔

''زیادہ وزن نہیں ہے اس میں، میں اٹھا لوں گی۔'' آرزو نے نسبتاً دھیمے اور سادہ لہجے میں جواب دیا تھا۔

عاطف خاموشی سے سیڑھیاں چڑھتا رہا۔ اوپر بھی اس سے بھی اوپر چھت پر ایک کمرہ بنا ہوا تھا۔ باقی پوری چھت خالی تھی۔ صاف ستھری،

''آ جاؤ۔'' کمرے کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے آرزو تھی۔ صاف ستھرا، کشادہ کمرہ تھا۔ ایک طرف سنگل بیڈ، لوہے کی الماری، ڈریسر اور ایک چھوٹا سا بیڈ روم فریج، ایک طرف دیوار کے دو کرسیاں رکھی تھیں۔

''اتنا اہتمام تم نے کیوں کیا ہے؟'' آرزو کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔ سامنے ایک دروازہ تھا جو غالباً نہیں بلکہ یقیناً اٹیچڈ باتھ تھا۔

''تمہارے رہنے کا ٹھکانا کیا ہے اور بس۔'' عاطف کا لہجہ سادہ سا تھا۔

''میری ضرورتیں بہت کم ہیں۔'' آرزو کا لہجہ مدہم تھا۔

''اور خواہشات؟'' عاطف نے بے اختیار ہی سوال کیا۔

''وہ تو ہیں ہی نہیں۔''

''نہ خواب کوئی، نہ خواہش کوئی۔''

آرزو سر جھکائے ہاتھ کی لکیروں میں جانے کیا کھوج رہی تھی۔

''آنکھوں میں رہتی ہے بارش کوئی۔''

عاطف نے باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

''ایک بات سنو۔'' آرزو کے پکارنے پر وہ رکا۔

'' جہاں اتنے احسان کیے ہیں وہاں ایک احسان اور کر دو۔ کوئی چھوٹی موٹی جاب دلوا دو جو میرے گزارے کے لیے کافی ہو۔''

''یہی امید تھی تم سے۔'' عاطف بڑبڑایا۔

''بائی داوے۔ پھوپھو کے حوالے سے میرا تمہارا ایک رشتہ بنتا ہے۔ اگر تم میری کمائی میں سے دو روٹیاں کھا لو گی تو کیا فرق پڑے گا؟''

''تمہیں نہیں پڑے گا۔ مجھے پڑے گا۔'' آرزو کا لہجہ دوٹوک تھا۔

عاطف نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور آرزو کے قریب بیڈ پر رکھ دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' آرزو اس موٹے اور پھولے ہوئے لفافے کو کچھ حیرت اور کچھ مشکوک نگاہوں

سے دیکھ رہی تھی۔

"یہ افنان دے گیا ہے تمہارے لیے۔ تمہارے اخراجات کے لیے۔ شادی تک یہ تمہاری ضروریات کے لیے کافی ہوں گے۔ شادی میں تو وہ پھوپھو اور اپنی فیملی کو لے کر آئے گا ہی۔" عاطف نے سنجیدگی سے بتایا۔

"تمہیں کیوں دیا۔ مجھے نہیں دے سکتا تھا وہ۔" آرزو اب بھی مشکوک تھی۔

"تم بہت جلد بھڑک جاتی ہوں۔ افنان سے تو ویسے تمہارا موڈ خراب تھا۔ تم لے لیتیں اس سے؟" عاطف نے الٹا اس سے سوال کیا۔

آرزو خاموش ہوگئی۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا وہ۔

"اور ہاں ایک بات اور" عاطف کو کچھ خیال آیا۔

"تم اپنا ناشتہ اور کھانا یا کچھ بھی کچن سے لے سکتی ہو، مگر پلیز کوشش کرنا...... امی سے سامنا نہ ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ اور کچھ؟" وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ گویا ہوئی۔

"کسی شے کی ضرورت ہو یا کوئی مسئلہ ہو تو بلا جھجک کہہ دینا۔"

"ہوں۔" آرزو نے سر ہلایا۔

عاطف کمرے سے نکل گیا۔ آرزو بیڈ پر بیٹھی لب بھینچے نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

"ہیلو کیسے ہیں آپ؟"

"ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو؟"

"یہ تو آپ بتائیے، کل ہی تو ملاقات ہوئی تھی ہماری۔"

"اسے ملاقات نہیں، آمنا سامنا کہتے ہیں۔"

"تو پھر؟ کیا خیال ہے ملاقات کے بارے میں؟" ثانیہ مزید شوخ ہوئی۔

"آج کل تو خود سے ملاقات کے لیے بھی وقت نہیں ہے میرے پاس۔"

"بڑی خوب صورتی سے دامن بچا کر نکلتے ہیں آپ۔ میں تو ایویں آپ کو اتنا سیدھا سادہ سمجھ رہی۔"

"آپ کی سادگی تھی کہ آپ مجھے سیدھا سادہ سمجھتی رہیں۔"

"ہاؤ کیوٹ!" عاطف کی برجستگی پر وہ ہنس پڑی۔

"آج کل سادگی اور معصومیت بہت کم، کہیں کہیں نظر آتی ہے۔" عاطف کچھ سنجیدہ ہو کر بولا۔

"کیا آپ نے واقعی مجھے نہیں دیکھا۔" حیرت سے شاید آنکھیں پٹپٹا رہی تھی۔

"خوابوں کے ساتھ ساتھ آپ خوش فہمی کی دنیا میں بھی رہتی ہیں؟"

"آپ کو سیدھا سادہ سمجھنے اور کہنے والا میں اپنا بیان واپس لے رہی ہوں۔" ثانیہ نے اعلان کیا۔

"نوازش...... اینڈ خدا حافظ۔"

"او کے، خدا حافظ۔"

کروٹ لینے کی کوشش میں وہ ہانپ گئیں مگر اپنی کوشش میں ناکام رہیں۔

کچن میں زرینہ موجود تھی۔ کھٹر پٹر کی آوازیں آرہی تھیں۔ انہوں نے ایک دو بار اسے پکارا مگر شاید اس تک عفت بیگم کی پکار نہیں پہنچی۔

"پتا نہیں کیا مصلحت ہے خدا کی۔ جو مجھے یوں معذور بنا کر بستر پر ڈال دیا۔ میری تو کوئی بیٹی بھی نہیں جو اس حالت میں میری خدمت کر سکے۔ بیٹا بہت اچھا ہے بہت خیال رکھتا ہے مگر میرا ہر کام تو وہ بھی نہیں کر سکتا۔" آزردگی کے عالم میں سوچتے سوچتے عفت بیگم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اتنے میں زرینہ آگئی۔

"آپ مجھے آواز دے رہی تھیں؟"

"اب پہنچی میری آواز تم تک؟" ان کا مزاج تلخ ہوگیا۔

"برتن دھو رہی تھی۔ ایک دو ہی رہ گئے تھے۔ انہیں ختم کر کے آئی ہوں۔" زرینہ نے صفائی پیش کی۔

"ذرا مجھے اٹھا کر کرسی پر بٹھا دو۔ تھک جاتی ہوں لیٹے لیٹے۔" زرینہ اچھی کاٹھی کی صحت مند عورت تھی۔ عفت کو ہینڈل کرنا اس کے لیے زیادہ مشکل یوں بھی نہیں تھا کہ عفت پہلے ہی دبلی پتلی تھیں پھر بیماری کے دوران تھوڑی اور کمزور ہوگئیں۔ مگر پھر بھی ایک وجود کو بستر سے اٹھا کر کرسی پر منتقل کرنا تھا تو ایک مشقت طلب کام، زرینہ نے جیسے تیسے کر ہی لیا۔

"صابرہ نہیں آئی ابھی تک؟" زرینہ نے گھڑی کی طرف نظر دوڑائی۔ اس وقت تک تو وہ عفت کا پیمپر چینج کر کے، نہلا دھلا کر فارغ بھی ہو جاتی تھی۔

"آرہی ہوگی۔ اللہ ماری کو بسوں میں بھی تو دیر ہو جاتی ہے۔"

عفت بیگم چڑچڑے پن سے بولیں۔ انہیں اب بہت الجھن ہو رہی تھی۔ رات آٹھ بجے کا ڈائپر بندھا ہوا تھا۔ اب ساڑھے دس ہونے کو تھے۔ ان کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، کھجلی ہونا بھی ایک عذاب بن جاتا۔

"آپ کہیں تو میں بدل دوں؟" زرینہ پرانی تھی۔ ہمدردی میں بولی۔

"نہیں۔ تنخواہ وہ لے، کام تم کرو رہنے دو، اب آئے گی، خود کرے گی اپنا کام۔" عفت کی ازلی تنک مزاجی پھر عود آئی۔

"اچھا جی!" زرینہ کچن میں چلی گئی۔ عفت بے چینی سے صابرہ کا انتظار کر رہی تھیں۔ ابھی تک ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ نہ صبح کی دوائی لی۔

"اف خدایا۔ کیسی اذیت ہے۔" عفت کو سوچوں کے ناگ ڈسنے لگے۔

کتنی پھرتیلی اور پرعزم، باہمت ہوا کرتی تھیں وہ۔ صبح سے رات تک گھر میں کتنے ہی کام کر لیتیں۔ اور کچھ نہیں تو کچن میں گھس کر عاطف کی پسندیدہ ڈشیں تیار کرنے لگ جاتیں۔

"آہ میرا بچہ! ڈھنگ سے کھانا بھی نہیں کھاتا اب بھی اتنا کمزور ہوگیا ہے۔"

بیٹے کا سراپا ان کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

ایک بے بسی کی نظر انہوں نے خود پر ڈالی۔

"ڈاکٹرز کہتے ہیں۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔ کھڑے ہونے، چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں گی۔ مگر کب؟" ان کی آنکھوں میں مایوسی تیرنے لگی۔

اتنی عمر تک؟ بیماری سے پہلے کبھی اتنی شدت سے احساس نہیں ہوا تھا کہ صحت کتنی بڑی نعمت ہے۔ چلتے ہاتھ پیر ہونا کیسی دولت ہے۔ آج اپنے کاموں کے لیے دوسرے کی محتاجی انہیں ایک اذیت سے دوچار کر رہی تھی۔

"بیگم صاحب!" زرینہ نے اندر جھانکا۔

"کیا ہے؟" ان کی بے زاری اور چڑچڑا پن عروج پر تھا۔

"ناشتہ لادوں آپ کو؟ ناشتہ تو کر لیں۔ صبح سے بھوکی بیٹھی ہیں۔"

"اس حالت میں تو کبھی بھی ناشتہ نہیں ہوگا مجھ سے۔" وہ بگڑ گئیں۔

"ذرا فون تو کر صابرہ کو۔" اسی طرح بگڑے لہجے میں انہوں نے زرینہ کو حکم دیا۔

زرینہ نے بہت دیر ٹرائی کیا مگر فون مل کر نہیں دیا۔

"نہیں مل رہا۔" اس نے ناکام ہو کر فون عفت کی گود میں رکھ دیا۔

"تمہارا کام ہوگیا؟" عفت نے خود کو پرسکون کرنے کے لیے ایک گہری سانس لی۔

"ہاں جی۔ میں اب جا رہی ہوں، ساڑھے بارہ تک آؤں گی۔ روٹی ڈال دوں گی آپ کی، سالن بنا دیا ہے۔"

"اچھا، تم جاؤ۔" عفت کو معلوم تھا کہ وہ اب ایک دوسرے گھر میں صفائی ستھرائی کا کام کرنے جائے گی۔ وہاں سے واپس آ کر پھر یہاں کا کچن سنبھالتی تھی۔

"اگر آپ کہیں تو کچھ دیر ٹھہر جاؤں؟"

"نہیں تم جاؤ، تمہیں دیر ہو رہی ہے۔" انہوں نے جھنجلا کر زرینہ کو بھگایا۔ وہ ان کی عادت اور مزاج

سے واقف تھی۔ چپ چاپ چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد وہ بے چینی سے صابرہ کا انتظار کررہی تھیں۔ انہیں پیاس بھی لگ رہی تھی۔ موسم نے تیور بدل لیے تھے اب ذرا گرمی ہو چلی تھی۔ پانی سامنے ہی بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھا تھا۔ بدقسمتی سے ان کا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ انہوں نے اپنے اوپر کے دھڑ کو جھلاتے ہوئے جھکنے کی کوشش کرتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا اور —— کرسی سمیت منہ کے بل گر پڑیں۔

''آہ......'' ان کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی تھی۔ باہر گیٹ بند کرتی آرزو نے ان کی آواز واضح طور پر سنی تھی۔ عاطف نے اسے ایک قریبی اسکول میں ایک ویکنسی بتائی تھی۔ وہ وہیں جارہی تھی۔ چیخ سن کر اندر آئی تو عفت بیگم اوندھے منہ نیچے گری ہوئی تھیں۔ کرسی ان کے اوپر الٹی پڑی ہوئی تھی۔

آرزو نے جلدی سے آگے بڑھ کر کرسی ہٹائی اور عفت کو سیدھا کیا۔ ان کے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ تکلیف اور اذیت کے احساسات چہرے پر رقم تھے۔

''زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟'' آرزو نے بغور ان کا چہرہ اور سر وغیرہ دیکھا کہیں سے خون تو نہیں نکل رہا۔ شکر ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

''تم کون ہو؟''

''آیئے میں آپ کو اوپر لٹا دیتی ہوں۔'' آرزو نے ان کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھائے۔

''نیچے کیوں آئیں؟ منع نہیں کیا تھا تمہیں عاطف نے میرے سامنے آنے سے؟''

عفت کو اس کی شکل میں عظمیٰ کی جوانی صاف نظر آرہی تھی۔ وہ پہچان گئیں۔

''منع کیا تھا۔'' آرزو نے تسلیم کیا۔ ''میں کام سے باہر جارہی تھی۔ آپ کی چیخ سن کر اندر آئی ہوں۔'' اس نے صفائی پیش کی۔

''اب جاؤ۔'' وہ رکھائی سے بولیں۔

''مجھے مناسب نہیں لگ رہا۔ آپ کو اس طرح چھوڑ کر جانا۔ آپ کی ملازمہ نہیں آئی آج؟''

''آجائے گی تمہیں کیا!'' عفت بیگم چڑ چڑ ہورہی تھیں۔

''آپ کے کپڑے خراب ہورہے ہیں'' آرزو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ تم جاؤ یہاں سے'' وہ جھلا کر زور سے بولیں تو ایک کراہ نکل گئی۔ گرنے سے ہاتھ اور منہ پر زور سے لگی تھی۔ درد اور تکلیف کی شدت سے احساس ہورہا تھا۔

آرزو خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ گیٹ کھلنے کی آواز آئی اور چند لمحوں میں صابرہ اندر کمرے میں داخل ہورہی تھی۔ یقیناً تیز تیز چل کر آئی تھی تب سانس پھولی ہوئی تھی۔

''باجی کو کیا ہوا۔ ایسے نیچے کیوں لیٹی ہیں؟'' اس نے حیرانی سے عفت بیگم کو پھر آرزو کو دیکھا۔

''پہلے یہ بتا۔ تو کہاں مری ہوئی تھی؟'' طیش اور غصے کے مارے عفت بیگم کا برا حال تھا۔

''کوئی احتجاج ہورہا تھا راستے میں جی، پوری سڑک بند کی ہوئی تھی۔ پورے دو گھنٹے لگ گئے گاڑی کو نکلنے میں۔'' صابرہ نے دیر سے آنے کی وجہ بتائی۔

''اچھا، پہلے مجھے اٹھا کر بٹھاؤ اور پانی پلاؤ۔''

''جی اچھا!'' صابرہ انہیں اٹھا کر بٹھانے لگی۔

''تم ابھی تک یہیں ہو؟'' ان کی نظر آرزو پر پڑی تو پارہ پھر چڑھ گیا۔

آرزو خاموشی سے اٹھ کر چل دی۔

☆☆☆

''آپ ٹھیک تو ہیں۔''

''ہاں، ہاں بالکل ٹھیک، بہت خوش، بہت مزے میں ہوں۔ میں نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میرے اتنے پیارے پیارے پوتے پوتیاں ہوں گے۔ بالکل انگریز لگتے ہیں۔ اتنے گورے چٹے، کنچی آنکھیں، بھورے بال۔'' عظمیٰ بیگم پرجوش ہوئیں تو بولتی ہی چلی گئیں۔

''اور تم سناؤ، ٹھیک تو ہونا، کوئی پریشانی؟ کوئی مسئلہ تو نہیں؟''

''میں ٹھیک ہوں۔ آرام سے ہوں، کوئی پریشانی نہیں، کوئی مسئلہ نہیں۔''

آرزو نے ماں کو فقط تسلی نہیں دی تھی بلکہ سچ ہی کہا تھا۔

''کوثر آئی تھی ملنے؟''

''ہاں آئی تھیں پرسوں۔'' آرزو نے ایک گہری سانس لی۔

''اچھا کچھ کہہ رہی تھی۔'' عظمیٰ پرجوش ہوئیں۔

''کچھ خاص نہیں بس ادھر ادھر کی باتیں کرکے چلی گئیں۔''

''عاطف کیسا ہے؟''

''ٹھیک ہے۔''

''اور...... عفت...... بھابھی؟'' عظمیٰ نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ پیرالائیزڈ ہیں۔'' آرزو نے مختصر جواب دیا۔ اس کی نظروں کے سامنے نیچے فرش پر گری ہوئی لاچار اور بے بس عفت کا چہرہ گھوم گیا۔

''آپ سنائیں کیا کرتی رہتی ہیں سارا دن؟'' آرزو نے سوال کیا۔

''گھر کے کام کرلیتی ہوں۔ بچوں کے ساتھ لگی رہتی ہوں یا پھر کھڑکی میں بیٹھ کر باہر کے نظارے کرتی رہتی ہوں۔''

عظمیٰ کے لہجے کی کھنک شگفتگی اور تازگی بتا رہی تھی کہ وہ کتنی آسودہ، مطمئن اور خوش ہیں۔

''مجھے تمہاری بہت فکر رہتی ہے۔'' یکایک ہی عظمیٰ کی آواز سے افسردگی چھلکی۔

''مت کریں اتنی فکر، میں ٹھیک ہوں، خوش ہوں۔'' آرزو ہولے سے بولی۔

''اچھا!'' عظمیٰ بیگم نے بے یقینی کا اظہار کیا۔ اس کے خوش ہونے کی بات پر انہیں کچھ زیادہ یقین نہیں تھا۔ مگر آرزو ہر بار فون پر تواتر سے یہ جملہ دہراتی۔ ''میں خوش ہوں۔'' خدا جانے وہ ماں کو یقین دلاتی تھی یا خود کو!

پتا نہیں ایسا کیا کھالیا تھا انہوں نے جو پیٹ خراب ہوگیا۔ دوپہر کے بعد اچانک ہی پیٹ میں مروڑ ہوئی اور پھر جو پتلے پانی سے موشن لگے ہیں تو انہیں سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ ڈائپر لیک ہوکر سب باہر تک آگیا۔ شلوار قمیص، چادر، سب خراب ہوگئے۔ وہ تو شکر ہے کہ چھٹی کا دن تھا۔ عاطف گھر میں تھا۔ صابرہ تو خیر بہت دور سے آتی تھی۔ اس کا آنا مشکل تھا بہت مگر عاطف نے زرینہ کو فون کیا تھا گھر آنے کے لیے۔

''میں تو ایک میت میں آئی ہوئی ہوں لیاری میں ہوں۔ اس وقت ابھی نہیں آسکتی۔'' زرینہ نے معذرت خواہانہ لہجے میں جواب دیا۔

عاطف نے مایوسی کے عالم میں فون بند کیا۔

''کس سے کہوں؟ کسے بلاؤں۔'' وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ثانیہ اپنے بھائی کے ساتھ چلی آئی۔

اف...... عاطف سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ثانیہ نے کل بتایا تو تھا اسے آج آنے کے لیے، مگر اس کے ذہن سے ہی نکل گیا۔ بھائی کو تو وہ فوراً ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ ثانیہ امی کے کمرے میں چلی گئی۔

''کیسی ہیں آنٹی؟''

ثانیہ ان کے قریب آئی ٹھٹھک گئی۔ بدبو کے مارے وہاں کھڑا ہونا محال تھا۔ پھر بھی وہ خود پر جبر کرکے کھڑی رہی۔

''امی کو موشن لگ گئے ہیں۔'' عاطف کمرے میں داخل ہوا۔ ''اس وقت اتفاق سے امی کی ہیلپ کے لیے کوئی نہیں ہے۔'' عاطف کے چہرے پر پریشانی صاف ظاہر تھی۔

''میں کچھ ہیلپ کرواسکتی ہوں؟'' عاطف کو دیکھتے ہوئے ثانیہ نے سوال کیا۔

''تم......!'' عاطف ہچکچا گیا۔

''ایک منٹ!'' اس نے عفت بیگم کی ٹانگوں پر پڑی چادر ہٹائی اور یکدم ہی وہ ابکائی لیتی ہوئی

باتھ روم میں بھاگ گئی تھی۔

عاطف، ماں سے نظریں چرا کر کمرے سے باہر واپس چلا گیا۔ اندر سے اب تک ثانیہ کے الٹیاں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ باتھ روم سے آئی تو۔ دیوار کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''آئی ایم سوری آنٹی! دراصل میں ابھی ابھی کھانا کھا کر آئی تھی تو'' ثانیہ معذرت خواہانہ انداز میں بول رہی تھی۔

''تم ڈرائنگ روم میں بیٹھ جاؤ ثانیہ!'' عفت بیگم کے چہرے کے عضلات تنے ہوئے تھے۔

''جی!'' وہ رسی چھڑا کر بھاگنے کے انداز میں کھڑی ہوئی اور کمرے سے نکل گئی۔

کچھ دیر بعد عاطف اندر آیا۔ تھکا تھکا سا کرسی پر بیٹھ گیا۔

''مہمان چلے گئے؟'' عفت بیگم کا لہجہ عجیب سا تھا۔

''جی!''

''عاطف!''

''جی!''

''مجھے خدا نے معذور کیوں کر دیا؟ میں آج اس حال میں کیوں ہوں؟ کیا واقعی سارا قصور میرا ہی تھا؟'' ان کا دل دوز لہجہ عاطف کا دل چیر گیا۔

''آپ ایسا کیوں سوچ رہی ہیں۔''

عاطف ان کے سرہانے جا بیٹھا۔ کوئی اور وہاں بیٹھتا تو اسے وہاں بدبو کے مارے بیٹھنا تو کیا کھڑا ہونا بھی محال ہوتا مگر عاطف جیسی اولادیں، جن کے رگ و پے میں والدین کی محبت رچی بسی ہو، انہیں بدبو کے بجائے ممتا کی خوشبو ہی آیا کرتی ہے۔

عاطف کو اپنے ماں، باپ کے وجود سے کبھی ایسی بو محسوس نہیں ہوئی جو اسے، ان سے دور بھاگنے پر مجبور کر دے۔ یا ناک پر کپڑا رکھ کر بہ کراہیت اور مجبوری میں ان کا کام کروائے۔ اس نے شہید احمد کے ساتھ جو بھی حسن سلوک کیا۔ ایک بیٹے کا فرض سمجھ کر کیا۔ ماں کے ساتھ ہر ممکن طریقے سے ان کا خیال رکھنے، ان کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتا تھا مگر اس معاملے میں وہ مجبور تھا۔ ماں کی یہ خدمت خود اپنے ہاتھوں سے نہیں کر سکتا تھا۔ فکر مندی اور پریشانی نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا ہوا تھا۔

''میں نے تمہیں بھی پریشان کر دیا۔ مصیبت میں ڈال دیا ہے نا؟'' عفت بیگم نے بیٹے کا فکر مند چہرہ دیکھا۔ ''تمہیں گھن نہیں آرہی میرے وجود سے؟'' عفت بیگم کی نگاہوں میں ثانیہ کا ابکائی لیتا چہرہ تھا۔

''جب میں چھوٹا تھا تو آپ کو میرے گندے وجود سے گھن آئی تھی؟''

''میں ماں ہوں، ماں کو اپنی اولاد سے کبھی گھن نہیں آتی چاہے وہ چھوٹی ہو یا بڑی۔''

''مجھے بھی نہیں آتی، نہ ابو سے بھی آئی نہ آپ سے آتی ہے۔'' عاطف نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

آج پہلی بار اس نے یوں عفت کے سامنے شہید احمد کا ذکر کیا تھا۔ عفت خاموش ہو گئیں۔ عاطف جو کچھ سوچ رہا تھا یک دم کھڑا ہو گیا۔

''میں ابھی آتا ہوں۔'' ماں سے کہہ کر وہ نکل گیا۔ اس کا رخ سیدھا اوپر کی طرف تھا۔ چند منٹ بعد وہ آرزو کے سامنے کھڑا تھا۔

''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' حیران نظروں سے اسے تکتی آرزو سے، وہ مخاطب ہوا۔

''آؤ۔'' عاطف نے کہا تو وہ بغیر سوال کے اس کے ساتھ ہو لی۔

نیچے امی کے کمرے کے باہر وہ ایک لمحے کو رکا اور آرزو سے بولا۔

''دراصل میری امی کو تمہاری ضرورت ہے۔''

آرزو کوئی جواب دیے بغیر اندر داخل ہو گئی۔

عفت نے ایک نظر اسے دیکھا پھر بیٹے کو اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''امی پلیز اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ ساری صورت حال آپ کے سامنے ہے۔ صابرہ کل بہت جلدی بھی آئی تو نو بجے تک آئے گی آپ رات بھر اس حالت میں کیسے رہیں گی۔'' عاطف جیسے ماں کے سامنے گڑگڑایا تھا۔

''میں برداشت کر لوں گی صبح تک، مجھے کسی کا احسان نہیں چاہیے۔''

آرزو...... ان کے قریب آکر کھڑی ہو گئی اور ان کے چہرے کو دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولی۔

''میں جو کچھ آپ کے ساتھ کروں گی وہ احسان نہیں بلکہ احسان کا بدلہ ہو گا۔ ایک بار میں بھی اسی طرح اپنے ماموں کے لیے آپ کے بیٹے کے پاس گئی تھی۔ وہ اگر مجھے انکار کر دیتا، دھتکار دیتا تو شاید حق بجانب ہوتا کہ باپ کی طرف سے اس کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی مگر اس نے اعلاظرفی کا مظاہرہ کیا۔ میں اس وقت جو آپ کے سامنے موجود ہوں تو اس لیے کہ والدین کی نیکیاں اور اچھائیاں تو اولاد کے آگے آتی ہی ہیں مگر اولاد کی نیکیاں بھی اکثر والدین کے لیے رحمت بن جاتی ہیں۔''

عفت بیگم، آرزو کی لمبی چوڑی تقریر سن کر ڈھے سی گئی تھیں۔ ان کا شکست خوردہ چہرہ دوسری طرف تھا اور ان کی سماعتوں نے آرزو کی آواز سنی جو عاطف سے کہہ رہی تھی۔

''تم باہر جاؤ، میں سنبھال لوں گی۔''

عاطف نے باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔

☆☆☆

''آئی ایم سوری عاطف! اس دن کے لیے ویری سوری، دراصل میں نے اس طرح کا کوئی معاملہ کبھی ہینڈل نہیں کیا۔ اس لیے......'' دو دن کے اندر ثانیہ چھ بار معذرت کر چکی تھی۔

''میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہہ رہا ہوں۔ اٹس او کے، بھول جاؤ اس بات کو اور آگے بڑھو۔'' عاطف اس کی بار بار کی تکرار سے تنگ آ گیا تھا۔

''آنٹی تو ناراض نہیں ہیں۔''

''نہیں۔''

''اور آپ؟''

''اف ف......!'' عاطف کا دل چاہا۔ سامنے دیوار پر اپنا سر پھوڑ لے۔

''نہیں'' خود پر قابو پا کر وہ انتہائی تحمل اور بردباری سے گویا ہوا۔

''ویسے آپ بہت باہمت ہیں۔''

''اچھا!'' عاطف اس اطلاع پر بالکل نارمل تھا۔

''جیسی آنٹی کی کنڈیشن ہے۔ ایسے پیشنٹ کو ہینڈل کرنا بڑا دل گردے کا کام ہے۔'' ثانیہ حسب عادت بنا رکے بول رہی تھی۔

''وہ میری ماں ہیں۔''

''آج کل تو لوگ اپنے پیرنٹس کی ایسی حالت میں ان سے بے زار ہو جاتے ہیں۔ تنگ آ جاتے ہیں۔''

''ایسے لوگ اپنا ماضی بھول جاتے ہیں کہ ان کے والدین نے انہیں کیسے پالا اور اپنا مستقبل فراموش کر دیتے ہیں کہ کل کو وہ بھی اپنے والدین کی جگہ ہو سکتے ہیں۔''

''ایسی باتیں ہر کوئی نہیں سوچتا۔'' ثانیہ ہولے سے بولی۔

''سوچنا چاہیے۔''

''اف ف...... مجھے کیا ہو گیا میں کتنی سیریس سیریس باتیں کرنے لگی ہوں۔ ہیں؟'' ثانیہ یک دم ہی اپنی جون میں واپس آ گئی۔

☆☆☆

وہ بڑے مزے سے بیڈ پر پھسکڑا مار کر بیٹھی تھیں۔ پلیٹ میں چپس رکھے تھے۔ گاہے گاہے انہیں اٹھا کر منہ میں رکھ لیتیں اور کولڈ ڈرنک کا گھونٹ بھر لیتیں۔ آرزو کے پاس فی الحال تو ان کی خاطر کے لیے بھی کچھ تھا۔

''اپنی ماں سے اور بھائی سے بات ہوتی رہتی ہو گی تمہاری؟''

''جی، ہر دوسرے تیسرے دن ہو جاتی ہے۔''

''عظمیٰ بتا رہی تھی کہ افنان تمہیں بھی لے جا رہا تھا ساتھ گئیں کیوں نہیں؟''

”یوں ہی......“

”تو اب ہو آؤ، اب تو تمہاری ماں بھی وہیں ہے۔ ان سے بھی مل لینا نئی جگہ نئے لوگ بھی دیکھ لینا۔“

”امی سے بات ہو جاتی ہے، اسکائپ کے ذریعے، وہ مجھے دیکھ لیتی ہیں میں انہیں دیکھ لیتی ہوں۔ بس کافی ہے اور اس سے آگے کوئی ارادہ نہیں ہے میرا۔“

آرزو کا دوٹوک لہجہ سن کر انہوں نے جانچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا پھر یخ کولڈ ڈرنک کا گھونٹ بھرتے ہوئے رسان سے بولیں۔

”مگر بھنو۔ کوئی کام اپنوں کی خوشی کے لیے بھی تو کرنے پڑتے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ آرزو نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”بھئی بات یہ ہے کہ تمہارے منگیتر یعنی ہمارے بیٹے صاحب کو باہر جانے کا شوق ہے۔ سب ہی کو ہوتا ہے۔ اب اگر وہ چار پیسے زیادہ کمائے گا تو تمہارا ہی بھلا ہوگا۔ تم دونوں میاں بیوی وہیں سیٹل ہو جاؤ اپنے بھائی کے پاس تو اس سے اچھی کیا بات ہے۔ تمہاری تو ماں بھی وہیں ہے۔ بھائی، بھاوج ہیں۔ ان کے بچے ہیں میرا ارادہ ہے کہ اگلے مہینے نکاح ہو جائے۔ تم افنان کے پاس چلی جانا پھر اپنے میاں کو بھی بلا لینا۔ ہیں؟“

کوثر خالہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا پھر دوبارہ گویا ہوئیں۔

”تمہاری امی سے بات ہوئی تھی اس موضوع پر کہنے لگیں کہ آرزو راضی ہو تو کوئی مسئلہ نہیں، اسی لیے میں نے سوچا۔ ڈائریکٹ تم سے بات کرلوں۔ ویسے بھی اکیسویں صدی ہے کمپیوٹر، موبائل کی دنیا، اب تو بچے ہی سارے معاملات خود ہی طے کر لیتے ہیں۔ والدین کو ذرا کم ہی زحمت دیتے ہیں۔“

آرزو چپ چاپ ان کی باتیں سن رہی تھی۔ سمجھ بھی رہی تھی مگر اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت انہیں ٹال دے یا ٹکا سا جواب دے دے۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے بیٹا! آرام سے سوچ سمجھ لو پھر فیصلہ کرنا۔ ہمیں کوئی لالچ نہیں ہے۔ بس تم بچوں کے بھلے کے لیے ہی سوچا تھا یہ سب، تمہاری جو مرضی ہو بتا دینا۔ ہمیں ہر فیصلہ قبول ہوگا۔“

کوثر خالہ نے میٹھے لہجے میں بولتے ہوئے اس کا کاندھا تھپتھپایا۔

وہ چلی گئیں تو آرزو نے ایک گہری سانس لی۔ پتا نہیں تقدیر کے دامن میں کتنی آزمائشیں ہیں میرے لیے، کمرے میں تنہا بیٹھی وہ بے بسی سے سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

اچھی خاصی گاڑی ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی کہ پھر پٹری سے اتر گئی۔ صابرہ نوکری چھوڑ رہی تھی۔

”بڑے بیٹے کی نوکری لگ گئی اس نے پہلے ہی کہہ رکھا تھا کہ جس دن مجھے نوکری مل گئی۔ ماں کو کام نہیں کرنے دوں گا۔ اب اس کی ضد ہے کہ کام چھوڑ گھر بیٹھ جاؤں۔“

صابرہ کے لہجے میں بیٹے کی محبت بھی تھی اور تھوڑا سا غرور بھی، مان بھی کہ اس کا بیٹا کتنی محبت اور قدر کرتا ہے ماں کی۔

”جب تک کسی اور کا بندوبست نہیں ہو جاتا۔ تب تک تو آجائیں۔“ عاطف بوکھلا گیا۔ گڑگڑانے لگا ان کے آگے۔

”بیٹا! میں تو خود ہی آؤں پر کیا کروں۔ بیٹا نہیں مان رہا۔ اب اس کی بات بھی تو رکھنی ہے نا، کوئی بھروسا نہیں اس کا لگی لگائی نوکری چھوڑ کر بیٹھ جائے۔ ویسے میں نے بات کی ہے ایک دو عورتوں سے، جیسے ہی کوئی بات بنی میں فون کر کے بتا دوں گی۔ تمہارا نمبر ہے میرے پاس۔“

عاطف کو دل بھر کر ہمت اور تسلی دے کر صابرہ رخصت ہوگئی۔ زرینہ پچھلے ہفتے ہی اپنی بیٹی کے پاس پنجاب گئی تھی۔ دو ماہ کے لیے اپنی بھانجی کو یہاں لگا گئی تھی اپنی جگہ۔ اس نے یہ اضافی کام (جس کا اسے منہ مانگا معاوضہ دینے کی پیش کش تھی) سنتے ہی یکسر انکار کر دیا۔

”نہ جی ناں، میرے میاں نے بڑی مشکل سے کھانا پکانے والی نوکری کی بات مانی ہے وہ بھی خالہ کے کہنے پر اسے اگر پتا چل گیا کہ میں اگلے کا گو موت بھی صاف کر رہی ہوں تو میری چٹیا پکڑ کر زمین پر دے مارے گا، غصے کا بڑا تیز ہے میرا مرد۔“

عاطف جگہ جگہ فون کھڑکا رہا تھا کبھی پرانی ملازماؤں کو کبھی ثانیہ کی امی کو پڑوس والی آنٹی سے بھی کہہ رکھا تھا۔ فی الحال تو کہیں سے بھی کوئی شنوائی نہیں ہوئی تھی۔

”جب تک کوئی نہیں مل جاتی، اس کو ہی بلا لو۔“ عفت بیگم نے بیٹے سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”کسے؟“ عاطف چونکا، فوری طور پر تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ امی کس کی بات کر رہی ہیں۔

”ثانیہ کو؟“

”پاگل ہوئے ہو، وہ تو قریب کھڑی بھی نہیں ہو سکتی، وہ کیا کرے گی۔“ عفت بیگم کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی۔

”میں، ثانیہ کی ذمہ دار نہیں ہوں، یہ کام تو اپنی مرضی اور دل سے وہ لڑکی کر سکتی ہے جو مجھ پر احسان کرے بلکہ احسان کا بدلہ اتارے۔“

”امی......! آپ کو علم ہے آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ عاطف کے سر پر حیرت کا آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔

”میں اپنی بیماری میں ہر وقت یہی سوچتی رہتی تھی کہ مجھے خدا نے یہ معذوری، یہ بیماری کیوں دی۔ اب کہیں جا کر میری سمجھ میں آیا ہے کہ“

عفت خاموش ہو گئیں پھر عاطف کی طرف دیکھے بغیر بولیں۔

”میں دل ہی دل میں تم سے بہت شاکی بہت ناراض تھی کہ تم...... تم اپنے باپ سے کیوں ملے۔ وہاں کیوں گئے اور کیوں جاتے رہے۔ اس شخص کی خدمتیں کرتے رہے۔ حتیٰ کہ اس کے انتقال کے بعد بھی میرا دل پوری طرح صاف نہیں ہوا تمہاری طرف سے، مجھے ایسا لگا تھا جیسے تم نے مجھ پر، اسے ترجیح دی، میری قربانیوں کو، میری تکالیف کو تم نے نظر انداز کر دیا۔ مگر اب میری سمجھ میں آیا کہ ایسی حالت میں کسی اپنے کی ضرورت شدت سے ہوتی ہے جو مریض کا مان رکھتے ہوئے محبت کے ساتھ، خاطر اور دلداری کے ساتھ، مریض کا ہم قدم ہو بے بسی اور بے کسی کے عالم میں، اجنبی ہاتھوں میں اپنا آپ سپرد کرنا۔ کسی اذیت سے کم نہیں، میں شروع میں ذہنی طور پر اس بات کو قبول نہ کر سکی۔ اسی لیے چڑچڑی ہوگئی تھی۔ تلخ ہوگئی تھی۔ اب خود کو کسی اور کی جگہ رکھ کر سوچا تو تم پہ فخر محسوس ہوتا ہے کہ ایک بہت قریبی اور محترم رشتے کو تم نے ذہنی اور جسمانی آرام پہنچایا۔ خوشی دی، خود پر افسوس ہوتا ہے۔ کاش تمہیں قسم دے کر پابند نہ کرتی تو...... تو شاید جانے والا سکون سے رخصت ہوتا۔“

عفت کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ آواز بھرائی ہوئی تھی۔

عاطف نے تڑپ کر ان کے ہاتھ تھامے اور چومنے لگا۔

”آپ پتا نہیں کیا کیا سوچتی رہیں۔ الٹا سیدھا سوچ سوچ کر اپنی طبیعت خراب کی ہے آپ نے، ماضی کو مت سوچیں گزرا وقت واپس تو نہیں آسکتا۔ اس کے بارے میں سوچ سوچ کر خود کو ہلکان کیوں کر رہی ہیں۔“ ماں کے آنسو دیکھ کر عاطف کا دل کٹ رہا تھا۔

”کبھی میں سوچتی ہوں۔ ہو سکتا ہے میرا ہی قصور ہو۔“

”نہیں۔“ عاطف نے سر ہلایا۔

”طوفان کبھی بھی اچانک نہیں آتا اس کے لیے پہلے پورا ماحول بنتا ہے۔ فضا بنتی ہے بہت سارے عوامل حصہ لیتے ہیں پھر کہیں جا کر اپنے وقت پر طوفان آتا ہے اور بہت کچھ ملیامیٹ کر دیتا ہے تباہ کر دیتا ہے۔ ختم کر دیتا ہے، جو کچھ بھی ہوا۔ اس میں سارا قصور نہ آپ کا تھا نہ سارا قصور دوسروں کا، شاید

سب ہی تھوڑے تھوڑے اپنی اپنی جگہ ذمہ دار تھے۔ آپ منفی سوچ کر خود کو اذیت مت دیں۔ اپنے دل ودماغ کی طاقت اور قوت ماضی کے خیالات میں ضائع مت کریں۔ انہیں اپنی صحت کی طرف لگائیں۔ ڈاکٹر کہتا ہے آپ اپنی ول پاور استعمال کریں تو آج سے ہی ٹھیک ہونا شروع ہو جائیں۔"

عاطف ان کے ہاتھ تھامے انہیں سمجھا رہا تھا۔ بیٹے کے لفظوں سے زیادہ، بیٹے کے ہاتھوں کا لمس اس کی گرمی ایک ماں کو طاقت بخش رہی تھی۔

"مجھے پتا نہیں تھا تم اتنی لمبی اور اتنی اچھی تقریر بھی کر لیتے ہو۔"

وہ آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ مسکرائیں۔ دھوپ چھاؤں کا سا عالم ہو گیا۔

"آپ ابھی ٹھیک سے جانتی کہاں ہیں کہ آپ کا بیٹا کتنا ٹیلینٹڈ ہے۔"

عاطف نے فرضی کالر اکڑائے۔

☆☆☆

ایک ہفتہ ہو گیا تھا اسے۔ یہ ذمہ داری نباہتے ہوئے روزانہ وہ انہیں چینج کراتی، صاف کرتی، دھلاتی، نہلاتی، ناشتہ کراتی۔

سب کچھ شاید ٹھیک ہی تھا۔ عفت بیگم اسے پہلے کی طرح جھڑکتی نہیں تھیں۔ بھگاتی نہیں تھیں مگر زیادہ بات بھی نہیں کرتی تھیں۔ آرزو کون سا باتونی تھی یا ان سے باتیں کرنے کے شوق میں مری جا رہی تھی۔ دونوں کے درمیان خاموشی کا پردہ حائل تھا۔

ایک دن بیٹھے بیٹھائے عاطف سے کہنے لگیں۔

"میرا دل نہیں چاہتا اس لڑکی کی شکل دیکھنے کو، ہو بہو اپنی ماں کا عکس ہے۔ اسے دیکھتی ہوں تو عظمیٰ کا بار بار خیال آتا ہے میرے گھر کی بربادی میں اس کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔"

عفت بیگم کی ذہنی رو بھٹک چکی تھی۔ وہ لگاتار عظمیٰ کے خلاف بول رہی تھیں۔ عاطف بے بس سا کبھی ماں کو دیکھتا، کبھی دروازے کی طرف جہاں ذرا

پرے کچن میں آرزو کھڑی اپنا ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ وہاں تک عفت بیگم کی آواز بخوبی پہنچ رہی تھی۔

"تم نے کہا تھا کہ وہ معافی مانگ کر گئی ہے مجھ سے، مگر میں کیا کروں، اسے معاف کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا مجھ میں۔"

"چھوڑیں یہ سب پرانی باتیں۔ اچھی اچھی باتیں سوچا کریں مستقبل کی تاکہ جلدی سے ٹھیک ہوں۔" عاطف نے ان کا موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"میرا مستقبل تو تم ہو۔ تمہاری خوشیاں ہیں۔" وہ ماضی کو ایک طرف کر کے بیٹے کی جانب متوجہ ہو گئیں۔

"ہاں تو سوچیں نا میرے فیوچر کے بارے میں خوشیوں کے بارے میں۔" عاطف بڑے مزے سے بول رہا تھا۔

"کئی دن ہو گئے تمہاری سسرال سے کسی نے چکر نہیں لگایا۔ میں سوچ رہی تھی کہ شادی کی بات فائنل کر لوں۔ ایک دو ماہ کے اندر ہی ہو جائے تو ٹھیک رہے گا۔ کیوں؟"

"جیسے آپ کی مرضی اور خوشی۔" عاطف کے لبوں پر مسکراہٹ تھی مگر بہت پھیکی اور بے جان، ان کی ناشتے کی خالی ٹرے اٹھا کر وہ کچن میں لے گیا۔

"امی کی باتوں کا برا مت ماننا، وہ کبھی کبھی یونہی فرسٹریٹڈ ہو جاتی ہیں۔" عاطف نے معذرت خواہانہ لہجے میں آرزو کو مخاطب کیا۔

"کوئی بات نہیں۔" رسان سے کہتے ہوئے آرزو مگ میں چائے انڈیلنے لگی "امی کا بھی قصور تھا۔ انہوں نے کئی بار میرے سامنے شرمندگی اور ندامت کا اظہار کیا تھا۔"

"ایک شرمندگی اور ندامت کا اظہار میں بھی کرنا چاہتا ہوں۔" عاطف دھیمی آواز میں بولا۔

"کیا؟" مگ اٹھاتے آرزو کے ہاتھ وہیں تھم گئے۔

"امی کے لیے تمہیں بہت زحمت ہو رہی ہوگی، جیسے ہی کوئی میڈ مل گئی تم......"

"مجھے تو کوئی خاص زحمت نہیں ہو رہی، آرزو

نے اس کی بات کاٹ کر سنجیدگی سے کہا اور اگر تمہیں زیادہ ہی شرمندگی اور ندامت ہو رہی ہے تو اس کام کے لیے مجھے پے کر دو، میں ـــ جاب لیس ہوں۔ جاب کی ضرورت تو مجھے ویسے بھی تھی۔"

"مجھے نہیں لگتا کہ تم اس کام کے لیے مجھ سے معاوضہ لو گی۔"

"لے لوں گی۔ اتنی اچھی نہیں ہوں میں۔" آرزو مگ اٹھا کر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

کتنی دیر ہو گئی تھی بحث کرتے مگر کوئی نتیجہ تھا کہ نکل کے ہی نہیں دے رہا تھا۔ نتیجہ نکلتا بھی کیسے، دونوں فریق اپنی اپنی بات پر ہی اڑے ہوئے تھے۔

"ہر بات میں ضد اچھی نہیں ہوتی آرزو!" عظمیٰ بیگم زچ ہو گئیں، بے بسی سے بولیں۔

"ضد نہیں کر رہی میں، آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ شادی اس طرح نہیں ہوتی شرطوں پہ مطالبات پر۔"

"نہ وہ لوگ کوئی شرط رکھ رہے ہیں نہ مطالبہ کر رہے ہیں۔ بس ایک بات کہی ہے۔ تم مان جاؤ تو ٹھیک، ورنہ اس کے بغیر بھی تمہیں بیاہنے کو تیار ہیں۔"

"تو پھر آپ کیوں اصرار کر رہی ہیں۔"

"تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں۔"

"میرا بھلا ملک سے باہر رہنے میں ہے؟" آرزو بڑبڑائی تھی۔ "ہر تحریر کو مدہم کر دیتے ہیں۔ یادوں کو مٹا دیتے ہیں۔" اس کے اندر سے کوئی بولا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔" آرزو نے خود کو تقدیر کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ وقت کے بہاؤ اور مرضی کے سپرد کر دیا تھا۔ اس کے سوا اور اس کے بس میں تھا بھی کیا۔

☆☆☆

کمرے میں داخل ہوتے ہی انہیں ایک خوش گوار تبدیلی کا احساس ہوا تھا۔ عفت بیگم کا کمرہ بہت صاف ستھرا اور کشادہ لگ رہا تھا۔ کمرے میں موجود

کچھ فرنیچر کم کر دیا گیا تھا۔ جو تھا وہ بھی ایک نئی ترتیب سے لگایا گیا تھا جس سے کمرہ روشن اور کھلا کھلا لگ رہا تھا۔ عفت بیگم سے مل کر وہ کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ان کے سوال پر چونک پڑیں۔

"بڑے دن بعد آئی ہیں آپ، میں نے فون بھی کیا تھا مگر رابطہ نہیں ہو سکا۔"

"بس مصروفیت میں گھرے ہوئے تھے۔ خاندان میں دو جگہ فوتگی ہو گئی تھی ایک دو شادیاں تھیں۔ بس ان ہی میں لگے ہوئے تھے سب۔"

سمدھن نے تفصیلی جواب دے کر ان کی خیریت دریافت کی۔ "آپ بتائیے کیا حال احوال ہیں۔ کچھ امپروومنٹ ہوئی؟"

"وہی صورت حال ہے جو تھی۔" عفت بیگم نے ایک نظر پیروں پر ڈالی ان کی آنکھوں میں ہلکی سی اداسی اور مایوسی تیر رہی تھی۔

"فزیوتھراپی سے کوئی فرق نہیں پڑا؟"

"تھوڑا سا فرق پڑا ہے۔ وہ بھی نہ ہونے کے برابر۔"

"چلیں، اللہ مالک ہے، جس نے بیماری دی ہے وہی شفا بھی دے گا۔" ثانیہ کی امی نے انہیں تسلی دی۔

"جی۔ بے شک۔" عفت بیگم نے بے چینی سے انہیں دیکھا۔ "ایک بات کرنا تھی آپ سے۔"

"جی!"

"میں جلد از جلد عاطف کی شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

"ہمارا خیال تھا کہ آپ کی صحت کچھ بہتر ہو جاتی تو پھر کر لیتے یہ نیک کام۔" سمدھن نے بڑے سبھاؤ سے کہتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

"صحت تو پتا نہیں کب بہتر ہو، اس کے انتظار میں مزید وقت نہیں ضائع کرنا چاہتی۔" عفت بیگم کچھ مضطرب لگ رہی تھیں۔

"اچھا، میں اپنے شوہر سے بچوں سے مشورہ کر کے جواب دیتی ہوں آپ کو۔" سمدھن نے خوش خلقی

سے جواب دیا۔ اتنے میں ملازمہ ٹرے سجا کر لے آئی۔

"یہ لیجیے۔" عفت بیگم نے انہیں پیش کش کی اور ان کی طرف گلاب جامن کی پلیٹ بڑھائی۔

☆☆☆

آرزو نے معمول کے مطابق ان کے سارے کام کیے، مگر اس کی غیر معمولی چپ اور چہرے کے عجیب سے تاثرات عفت کو کچھ پوچھنے پر اکسا رہے تھے، مگر وہ خاموش رہیں۔ دونوں کے درمیان بمشکل ایک دو جملوں کا ہی تبادلہ ہوتا تھا وہ بھی اشد ضروری بات ہو تو، یہی وجہ کہ عفت چاہنے کے باوجود بھی آرزو سے کچھ پوچھ نہ سکیں۔ شاید طبیعت خراب ہو، انہوں نے دل میں سوچا، اسی سوچ بچار اور کشمکش میں آرزو اپنا کام نمٹا کر اوپر چلی گئی۔ انہیں لگ رہا تھا کہ اس نے شاید ناشتہ بھی نہیں کیا۔

شام میں عاطف آیا تو انہیں ذکر کرنا یاد ہی نہیں رہا۔ رات میں یاد آیا۔

"اس لڑکی کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی آج۔" عفت آرزو کو یوں ہی مخاطب کرتی تھیں۔

"کیوں، کیا ہوا؟" عاطف چونکا۔

"بس پتا نہیں کیا بات ہے۔ مگر کوئی بات ہے ضرور، اس کی شکل بتا رہی تھی۔"

"آپ پوچھ لیتیں۔" عاطف رسان سے بولا۔

"بس پوچھا ہی نہیں، تم پوچھ لو۔"

"اب اس وقت؟ گیارہ بج رہے ہیں۔" عاطف نے وال کلاک میں وقت دیکھا۔

"ایک منٹ۔" اسے کچھ خیال آیا۔ اس نے آرزو کا نمبر ملایا۔ کئی بار ٹرائی کیا مگر بے سود، موبائل آف تھا۔

"صبح چھٹی ہے، دیکھ لوں گا کیا مسئلہ ہے اس کا ہے۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" امی سونے کے لیے لیٹ چکی تھیں۔ مگر سوتے سوتے بھی انہیں یہی خیال آ رہا تھا۔ "پتا نہیں کیا بات ہے۔"

اگلی صبح حسب معمول تھی۔ سورج نکلا اور اس نے اپنی شعاعوں کے تھال بھر بھر کر لٹا دیے۔ روشنی ہی روشنی تھی ہر طرف، مگر کسی کی زندگی میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ آرزو روز کی طرح آج بھی نیچے اتری معمول کے مطابق عفت بیگم کے سارے کام کیے اور پھر واپس جانے لگی۔

"گوگو!" عاطف نے اسے پکارا، وہ کب سے بیدار ہو کر اس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

"ناشتہ نہیں کرو گی؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"یہاں آؤ، بیٹھو۔" عاطف نے اسے بلایا۔ وہ روبوٹ کی طرح آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟" عاطف نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ آنکھوں میں اور چہرے پر ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ عاطف کے دل کو دھچکا سا لگا تھا اس کی صورت دیکھ کر، اس کا سراپا دیکھ کر، جیسے کوئی پھول، طوفان سے گزر کر آیا ہو۔

"کوئی مسئلہ ہے، کوئی بات ہے تو بتاؤ مجھے؟" بہت نرم اور مہربان لہجے میں پوچھ رہا تھا وہ۔

آرزو کی آنکھیں گیلی ہونے لگیں اور ان میں آنسو جمع ہونے لگے۔ حالانکہ پچھلی دو راتوں سے تو اسے یوں لگ رہا تھا جیسے رو رو کر اس کے سارے آنسو خشک ہو گئے ہوں۔ مگر وہ تو پھر یوں آ کر جمع ہو رہے تھے جیسے کوئی سیلاب۔

"کیا بات ہے۔ مجھے نہیں بتاؤ گی۔" عاطف پلک جھپکے بنا اسے دیکھ رہا تھا اور اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اس کا دل مسل رہا ہو۔ آرزو کے آنسو اسے ایسی تکلیف دیں گے۔ عاطف نے کبھی سوچا نہ تھا۔

"میری امی!" وہ کراہی۔

"کیا ہوا پھپھو کو۔" عاطف تیزی سے آگے ہوا۔

"میری امی چلی گئیں۔" اس کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب رواں تھا۔

"کیا؟" عاطف کو یوں لگا ایک لمحے کو جیسے اس کی سانس رک گئی ہو۔ وہ بے یقینی سے آرزو کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ دیر سے بڑبڑایا۔

"تم کیا کہہ رہی ہو؟ کب ہوا یہ؟ کیسے؟" عاطف کے منہ سے بے ربط الفاظ نکل رہے تھے۔

آرزو نے اپنا بھیگا چہرہ صاف کیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بتانے لگی۔

"پرسوں رات ایک بجے کے قریب افنان کا فون آیا تھا جس نے اس دل خراش سانحے کی اطلاع دی۔" عظمیٰ کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ اتنا شدید کہ اسپتال لے جاتے لے جاتے وہ خالق حقیقی سے جا ملیں۔"

"تم کل صبح نیچے آئیں اور کچھ نہیں کہا۔ امی سے، میں نہیں تھا۔ امی کو تو بتا سکتی تھیں۔" عاطف کو اس کی ذہنی کیفیت پر شبہ ہو رہا تھا۔

"وہ نفرت کرتی ہیں میری امی سے، انہیں کیا بتاتی۔" وہ ہچکیوں سے بری طرح رو رہی تھی۔ دو راتوں سے وہ اکیلی رو رہی تھی۔ کوئی کاندھا میسر نہیں تھا جس پر سر رکھ کر وہ دل کا بوجھ ہلکا کرتی۔

"نفرت تو ہم زندوں سے کرتے ہیں۔ مردوں سے کون نفرت کرتا ہے؟ میری امی اتنی سنگ دل نہیں ہیں آرزو۔" عاطف شدید دکھ کے عالم میں بول رہا تھا تم مجھے فون کر سکتی تھیں۔ مجھے بتا سکتی تھیں۔ تم نے وہ بھی نہیں کیا؟"

"ایئرپورٹ پر آخری بار وہ گلے ملی تھیں۔ مجھے پتا ہوتا کہ دوسرے ملک کے بجائے وہ دوسری دنیا میں چلی جائیں گی تو انہیں کبھی نہ جانے دیتی، وہ آخری لمس، آخری نظر، بس یہی بچا ہے میرے پاس، اور کچھ نہیں۔"

آرزو عاطف کی باتوں سے بے نیاز بول رہی تھی اور رو رہی تھی۔

عاطف کی بات سن کر عفت بیگم ساکت اسے دیکھ رہی تھیں۔ آرزو بھی وہیں موجود تھی۔ شدت گریہ سے اس کی آنکھیں اور چہرہ سوج رہے تھے۔

"تم پر قیامت گزر گئی اور تم اس عالم میں بھی میرے کام معمول کے مطابق کرتی رہیں؟ بغیر کچھ کہے؟" عفت بیگم کے لہجے میں بے انتہا حیرت اور اتنی ہی بے یقینی تھی۔

"میں نے سوچا، آپ شاید میری امی کو معاف نہ کریں۔ تو اس خدمت کے، اس نیکی کے بدلے، میرا اللہ ہی انہیں معاف کر دے، وہ آپ کا دل بدل دے۔"

آرزو کے لفظوں نے ان کا دل چیر کر رکھ دیا۔

"اس نے کبھی تو کوئی نیکی ایسی کی ہوگی جو تمہارے جیسی بیٹی ملی اسے۔" عفت بیگم نے خود کو کہتے سنا۔

کوثر خالہ تک اطلاع پہنچی تو وہ آئیں، آرزو کے گلے لگ کر خوب روئیں۔

"ابھی عمر ہی کیا تھی اس کی، کتنی جلدی چھوڑ گئی سب کو۔" کوثر خالہ آرزو کے ساتھ مل کر آنسو بہاتی رہیں اور عظمیٰ کی باتیں، ان کا تذکرہ کرتی رہیں۔ ان کے جانے کے بعد صابرہ، عفت بیگم سے پوچھنے لگی۔

"یہ جو ابھی آئی تھیں، آپ کی رشتہ دار ہیں؟"

"آرزو کی ہونے والی ساس ہیں۔"

"آرزو کی؟" صابرہ نے بے یقینی سے دہرایا۔

"تم جانتی ہو انہیں۔" عفت نے یوں ہی پوچھ لیا۔

"ہاں!"

☆☆☆

ثانیہ کے امتحان ختم بھی ہو گئے۔ اس کی فون کالز میں کچھ کمی آ گئی تھی۔

"میں نے شادی کی بات کی تھی، ثانیہ کی امی سے، مجھے معلوم نہیں تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ ان کا اشارہ عظمیٰ کی ناگہانی موت کی طرف تھا۔

"پھر وہ آرزو کی ساس بھی تقاضہ کر رہی ہیں۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ جو فرائض ادا کرنے ہیں وہ بھی ضروری ہیں۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بولتی رہیں۔

"جیسے آپ مناسب سمجھیں۔"

عاطف ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا۔ دل کی خواہش کچھ اور تھی اور مصلحت کے تقاضے کچھ

اور، زندگی کی طلب کچھ اور تھی اور دست تقدیر کی عنایت کچھ اور۔

"اس دنیا میں بہت سے لوگوں کے ساتھ یہ ستم ظریفی ہوتی ہے میرے ساتھ بھی سہی۔" وہ کچھ نہ کچھ سوچ کر اپنے دل کو بہلا رہا تھا۔

آرزو پر بے حسی کا عالم طاری تھا۔ نہ کوئی خواہش رہی دل میں نہ طلب، دل کی جگہ کوئی سنگ تھا پہلو میں جیسے، نہ دھڑکتا تھا نہ کچھ محسوس کر سکتا تھا۔

افنان کا فون آیا تھا عاطف کے پاس، شادی کے اخراجات کے لیے اس نے ایک خطیر رقم بھیجی تھی، خود اس کا آنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اس لیے اس نے عاطف سے بات کی تھی۔

"تم سنبھال لو گے نا سب کچھ؟" اپنی لمبی چوڑی مجبوریاں بیان کر کے اس نے عاطف سے سوال کیا تھا۔

"ہاں میں سنبھال لوں گا سب کچھ۔" عاطف نے ایک گہری سانس لی تھی۔

☆☆☆

رات بہت سرد اور تاریک تھی۔ ہوا تھی کہ ہڈیوں میں گھسی جا رہی تھی۔ اندھیرا تھا کہ رگ و پے میں پیوست ہوا جا رہا تھا۔ تین ماہ دس دن پہلے وہ یہاں آئی تھی۔ معیز عالم ہی اسے چھوڑ گیا تھا یہاں۔

"جیسے ہی تمہاری عدت ختم ہوگی میں آ کر لے جاؤں گا۔ پھر ہم نکاح کر لیں گے۔"

خوش رنگ خوابوں اور دلاسوں کی تسلیاں مہربانو کے ہاتھ میں تھما کر وہ چلا گیا تھا۔ وہ ایک دار الامان تھا۔ درمیانے درجے کا نہ بہت زیادہ اچھا، نہ بہت زیادہ برا۔ مگر مہربانو کو اس سے کیا مطلب۔ اسے تو بس وہ تین ماہ دس دن یہاں گزارنے تھے جو کسی نہ کسی طرح گزر ہی گئے۔ دو دن اور اوپر گزر گئے۔ وہ بے چینی سے معیز عالم کا انتظار کر رہی تھی۔ بے قراری حد سے گزری تو اسے کہا۔

"آپ آئے نہیں۔ میں پرسوں سے انتظار کر رہی ہوں۔" مہربانو کی بات سن کر معیز عالم نے اتنے زور کا قہقہہ لگایا تھا کہ مہربانو کے کان جھنجنا اٹھے۔ دل بری طرح سہم اٹھا اور جو کچھ وہ آگے کہہ رہا تھا۔ اس نے مہربانو کے پیروں تلے زمین نکال دی۔

"میں تمہیں اتنا بے وقوف نہیں سمجھتا تھا مگر تم تو میرے اندازے سے کہیں زیادہ بے وقوف نکلیں اور میری سوچ سے کہیں زیادہ خود غرض۔" اس کا لہجہ سانپ کی پھنکار۔ جیسا ہو گیا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" مہربانو گھبرا گئی۔

"بات سنو بے وقوف عورت! برسوں پہلے تم نے مجھ سے طلاق لے کر مجھے جس طرح دنیا کی نظروں میں ذلیل کیا، میری عزت، وقار اور انا کو ملیا میٹ کیا، میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکا۔ تم سے بدلہ لینے کا موقع ہاتھ آیا تو میں نے وہ موقع گنوایا نہیں۔"

"اتنا بڑا دھوکا؟ معیز عالم اتنا بڑا دھوکا دے سکتا ہے اسے۔" مہربانو کا دل قبول کرنے سے انکاری تھا۔ وہ تیورا کر گر پڑی۔ ہوش آ کر بھی اسے یقین نہ آیا۔ شہزادے سے بات کی، اسے بلایا تو اس نے جواب دیا۔

"امی! میں آپ سے ملنے آتا رہوں گا کبھی کبھی مگر آپ کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ میں تو خود ابو کے ساتھ رہتا ہوں۔ میرے پاس نہ کوئی جاب ہے نہ کوئی ٹھکانہ، کہاں رکھوں گا آپ کو؟"

مہربانو کو اب علم ہوا تھا کہ قیامت آنا، اور قیامت گزرنا کسے کہتے ہیں۔

دار الامان میں بہت ساری دکھی اور بے سہارا عورتوں میں ایک اور عورت کا اضافہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

ماں سے جو آخری بات ہوئی تھی اس کی، وہ اس کے نکاح کے متعلق تھی۔ کوثر خالہ ایک دو بار آ کر عفت اور عاطف سے تقاضا کر چکی تھیں کہ سادگی سے نکاح کر دیں اور پھر رخصتی، عفت نے آرزو کی مرضی پوچھی۔

"امی سے میری آخری بات یہی ہوئی تھی۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ میں راضی ہوں۔" آرزو کے لب و لہجے میں اداسی اور یاسیت گھلی ملی تھی۔

"تم خوش نہیں لگ رہی ہو؟" عفت نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔

"امی بہت یاد آتی ہیں۔" آرزو نے سر جھکا کر کہا اور اس نے سچ ہی کہا تھا۔

"بہت پیار کرتی تھیں تم اپنی ماں سے؟" عفت کا سوال سن کر آرزو نے اپنا سر اٹھایا۔

"ہر بیٹی کرتی ہے۔"

"ہاں اور بیٹے بھی، جیسے میرا بیٹا مجھ سے بہت پیار کرتا ہے، اتنا کہ اس محبت کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کی ہمت رکھتا ہے۔"

"جانتی ہوں۔" آرزو نے ہولے سے جواب دیا۔

"میرا بیٹا بہت پیارا بیٹا ہے۔ بہت محبت کرنے والا۔ خیال رکھنے والا، ہمدرد میرا بس چلے تو دنیا کی ساری خوشیاں لا کر اس کے قدموں میں ڈھیر کر دوں۔" آج پہلی بار عفت بیگم آرزو سے اتنی لمبی بات کر رہی تھیں۔

"اس کے قدموں میں خوشیاں ڈھیر کرنے کو تو میرا بھی دل چاہتا تھا مگر......"

آرزو گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی، پہلو میں جو سنگ ہے وہ سنگ ہی رہے تو بہتر ہے، پھر سے دھڑکنے لگا تو جانے کیا قیامت ڈھائے۔

نکاح کی تقریب بہت سادہ اور مختصر تھی۔ کوثر خالہ کے گھر والوں کو آنا تھا۔ عفت نے اپنی پڑوسن کو مدعو کیا تھا۔ آرزو کے لیے ان ہی سے عفت نے شاپنگ کروائی تھی۔ گلابی رنگ کا بے حد نفیس جوڑا اور اس کے ساتھ کے لوازمات وہ آرزو کے لیے لائی تھیں۔ گو کہ آرزو ہچکچا رہی تھی، مگر انہوں نے اپنی بہو کے ساتھ اسے پارلر بھیج دیا۔

"اپنے نکاح پر بھی ڈھنگ سے تیار نہیں ہوگی تو کب ہوگی۔"

آرزو تیار ہو کر آ چکی تھی۔ عفت بیگم کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ بیوٹیشن کی مہارت نے اس کے نقوش کی خوبصورتی اور اجاگر کر دی تھی۔ بیش قیمت خوب صورت پہناوے اور دیگر آرائشی لوازمات نے اسے سر سے پاؤں تک جگمگا دیا تھا۔

عاطف اپنی ہی دھن میں تیزی سے اندر آیا تو بے ساختہ ہی نگاہ آرزو پر پڑی تھی۔ جو ایک سنہری خواب ہی لگ رہی تھی کسی شاعر کا، کسی دیوانے کا، عاطف نے بے اختیار ہوتی نظروں کو قابو کیا اور ماں سے مخاطب ہوا۔

"امی! قاضی صاحب آنے والے ہیں۔ مہمان کب تک آئیں گے فون کریں انہیں۔"

"مہمان کون؟ دلہن موجود ہے۔ دولہا بھی ہے۔ گواہ بھی ہیں پھر کسی اور کی کیا ضرورت ہے؟" امی مسکرائیں۔

عاطف چکرا گیا اور دلہن بنی آرزو کا دل بری

طرح دھڑک اٹھا، کچھ تو تھا عفت بیگم کے لفظوں میں، لہجے میں، جو وہ بری طرح چونک پڑی تھی۔

''تمہارے لیے بھی جوڑا منگوا کے رکھا ہے میں نے، الماری سے لے لو اور تیار ہو جاؤ۔ آرزو کا نکاح آج تم سے ہی ہو رہا ہے۔''

''امی......!'' عاطف بے بسی سے انہیں دیکھنے لگا۔ (کیوں مجھ غریب کی جان لینے پر تلی ہوئی ہیں میری پیاری امی؟)

''جاؤ، جلدی سے تیار ہو کر آؤ، قاضی صاحب کے آنے سے پہلے تمہیں ریڈی ہونا چاہیے۔'' عفت بیگم کی آواز میں جو کھنک تھی وہ عاطف نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ ان کے چہرے پر جو چمک تھی۔ وہ عاطف پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

''یہ......کیا ہے؟'' آرزو ٹپٹا کر یک دم کھڑی ہو گئی۔ عاطف نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اسے آج سے پہلے معلوم نہیں تھا کہ کوئی لڑکی گھبرائی گھبرائی سی اتنی حسین بھی لگ سکتی ہے۔

''تم یہاں کھڑے کھڑے کیا دیکھ رہے ہو، جاؤ جا کر تیار ہو جاؤ اور لڑکی، تم بیٹھ جاؤ۔''

عاطف کو ڈانٹ کر وہ آرزو سے مخاطب ہوئیں۔ آرزو بیٹھ تو گئی مگر پہلو میں جسے سنگ بنا رکھا تھا اس نے۔ پل بھر میں دل بن گیا تھا اور یوں شدت سے دھڑک رہا تھا کہ بس، آرزو کو لگا اس کی تو جان ہی نکل جائے گی۔

''تمہاری کوثر خالہ اپنے بیٹے کا رشتہ تم سے پہلے کسی اور جگہ کر چکی تھیں۔ نکاح کی تاریخ بھی طے ہو گئی تھی وہاں۔ نکاح سے ہفتہ بھر پہلے انکار کر کے بیٹے کی بات تم سے پکی کر دی۔ بیٹے کو باہر سیٹل کرانا چاہتی تھیں۔ جو تم سے نکاح کے بعد شاید ذرا آسان ہو جاتا اور اگر ان کی خواہش پوری نہ ہوتی تو نہ جانے تم سے کیا سلوک کرتے، ان کا لالچ اور مطلب پرستی دیکھ کر میں نے انکار کر دیا تھا انہیں۔'' عفت بیگم آرزو کو بتا رہی تھیں۔

''اور ثانیہ بے چاری کا کیا کیا؟'' آرزو نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''ثانیہ کے گھر والوں نے خود ہی انکار کر دیا۔'' عفت نے جیسے اس کے چہرے پر لکھا سوال پڑھ لیا تھا۔

''شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں، وہ اپنی بیٹی کو کسی آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتی تھیں۔ جس پر ثانیہ پوری نہ اتر سکے۔ میری جیسی آزمائش کو سہارنا، ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔'' عفت بیگم کے لبوں پر آزردہ سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

''آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔ پچھلے دو ہفتوں میں اچھی خاصی امپرومنٹ ہوئی ہے۔'' ان کی یاسیت، آرزو نے یکدم ہی تڑپ کر انہیں دیکھا تھا۔

''دو ہفتے پہلے ہی میں نے یہ فیصلہ کیا تھا۔'' وہ یکا یک مسکرائیں۔

''معلوم ہے میں نے یہ فیصلہ کیوں کیا؟'' پتا نہیں کیسے انہیں آرزو کے دل میں اٹھنے والے ہر سوال کی خبر ہو رہی تھی۔

''امی میں تیار ہوں۔''

عفت بیگم نے جیسے ہی کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، عاطف اندر آ گیا۔ فان کلر کے کرتا شلوار اور واسکٹ میں اس کا دراز قد نمایاں ہو رہا تھا۔ اور چہرے سے خوشی، یوں پھوٹ رہی تھی جیسے زمین سے پھوٹتا ٹھنڈے، میٹھے پانی کا چشمہ یا طلوع ہوتے سورج کی روشن کرنیں۔

آرزو نے چپکے سے ایک نظر اس پر ڈالی۔

''اف......'' وہ نظر لگ جانے کی حد تک خوش اور پیارا لگ رہا تھا۔

''ماشاء اللہ!'' عاطف ان کے قریب آیا تو انہوں نے بڑی محبت سے اس کی پیشانی چومی۔

''کبھی میں سوچتی تھی کہ دنیا کی ہر خوشی ہر نعمت لا کر اپنے بیٹے کے آگے ڈھیر کر دوں اور اب کچھ عرصے پہلے مجھے احساس ہوا کہ اپنے بیٹے کو اس کی من پسند خوشی مل جائے تو سمجھو دنیا بھر کے سکھ مل جائیں گے۔''

''اور آپ کو میرے دل کی خوشی کا کیسے پتا چلا؟'' عاطف ماں کو یوں دیکھ رہا تھا، جیسے کوئی نئی، کوئی دوسری عفت بیگم تھیں اس کے سامنے۔

عفت بیگم نے بیٹے کو دیکھا اور مسکرائیں۔

''جب تم چھوٹے سے تھے تو باہر سے اکثر کبھی بلی کا بچہ کبھی کسی پرندے کا گرا ہوا بچہ اٹھا لاتے تھے۔ میرے ڈانٹنے پر اسے باہر لے جانے کے بجائے گھر کے ہی کسی کونے میں چھپا دیتے اور پھر سارا وقت تمہاری آنکھیں، منتظر آنکھیں مجھے دیکھتی رہتیں کہ میں کب اس بچے کے لیے ٹھکانے اور کھانے پینے کا بندوبست کرتی ہوں۔ مجھ سے ان آنکھوں کی آس اور امید دیکھی نہیں جاتی تھی۔ میں اس امید کو پورا کر دیتی تھی، اب بہت عرصے بعد میں نے پھر اپنے بیٹے کی آنکھوں میں ایک التجا دیکھی، جسے وہ چھپانے کی کوشش کرتا رہا تھا مگر مجھے وہ نظر آ ہی گئی۔''

بات ختم کر کے انہوں نے سکون کی ایک گہری سانس لی۔

''تم قاضی صاحب کو فون ہی کر دیتے، وہ ابھی تک آئے نہیں۔''

''وہ تو آ بھی گئے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔'' عاطف نے بڑی سادگی اور معصومیت سے بتایا تھا۔

☆☆☆

قدرت نے دونوں کا بندھن نصیب میں لکھا تھا جو اپنے وقت پر پورا ہوا، نکاح کے بعد مبارک باد اور دعائیں دینے والے اگرچہ تھوڑے سے لوگ تھے مگر بہت پرخلوص اور سچی دعائیں تھیں ان کی دو روز بعد رخصتی اور پھر ولیمہ تھا۔ آج تو پڑوس والی آنٹی اور ان کی بہو نے سب کچھ سنبھالا ہوا تھا۔ کھانے کے بعد سارا کام سمیٹ کر۔ وہ گھر چلی گئیں۔ آرزو چینج کرنے اوپر اپنے کمرے میں آ گئی۔ آئے ہوئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی حالانکہ وہ کھلا ہوا ہی تھا۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو؟'' آرزو گھبرا کر عاطف کو دیکھ رہی تھی۔

''مبارک باد دینے آیا ہوں۔ اجازت ہو تو اندر آ جاؤں۔'' وہ بڑی شرافت سے مخاطب تھا مگر مسکراہٹ تھی کہ چہرے سے جیسے چپک گئی تھی۔

''نیچے، دے تو دی تھی مبارک باد۔'' آرزو ٹپٹا رہی تھی۔

''مگر میرا دل چاہ رہا ہے میں بار بار مبارک باد دوں، گزرتے ہر ہر لمحے میں تمہیں کہوں کہ مبارک ہو۔'' وہ ابھی تک وہیں کھڑا تھا مگر اس کی پرشوق اور والہانہ نگاہیں، آرزو پر سے ہٹنے سے انکاری تھیں۔

''کیا تم نے کبھی سوچا تھا کہ یہ سب ہوگا؟''

''نہیں۔'' آرزو نے نفی میں سر ہلایا۔

''مگر میں سوچتا تھا۔ پتا نہیں کیوں؟ حالانکہ خود کو روکتا بھی تھا ایسے خواب دیکھنے سے مگر......''

آرزو خاموشی سے اسے دیکھے گئی۔ دھڑکنیں اتنا شور مچا رہی تھیں۔ اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ بس پتا نہیں کیوں آنکھوں میں پانی جمع ہو رہا تھا۔ اس نے سر جھکا کر چھپانے کی کوشش کی مگر کیسے چھپاتی، مستقل اس کی نظروں کے حصار میں تھی۔

''تم رو رہی ہو؟ خوش نہیں ہو کیا۔'' عاطف ششدر ہو گیا اس کے آنسو دیکھ کر۔

''آنسو، خوشی کے بھی ہوتے ہیں۔ بے وقوف!'' آرزو کو ہنسی آ گئی، پریشان ہو کر بھی کتنا کیوٹ لگ رہا تھا۔

''تم، خوشی میں روتی ہو اور غم میں کیا کرو گی؟'' عاطف ابھی بھی حیران تھا۔

''اب غموں کی پروا کسے ہے۔'' آرزو نے رخ موڑ لیا تھا۔

''اب تم جاؤ مجھے تنگ مت کرو۔'' وہ دھیمے سے بولی تھی۔

''ٹھیک ہے، جا رہا ہوں ویسے بھی اب غموں کی پروا کسے ہے؟'' عاطف مسکراتا ہوا پلٹ گیا تھا۔

☆

قرۃ العین خرم ہاشمی



"میرا نام نیلوفر ابا نے بہت چاہ سے رکھا تھا! اپنے زمانے (جو زیادہ نہیں بس پچیس تیس سال پرانا تھا۔) کی، میٹرک پاس، اونچی لمبی، خوب صورت لڑکی مشہور تھی۔ خوبصورت تو خیر آج بھی ہوں مگر اس وقت کی تو بات ہی اور تھی ......! رشتوں کی ایک لمبی لائن تھی۔
میرے غریب ماں باپ کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ یہ گوہر نایاب کس کی پھیلی ہوئی جھولی میں ڈالیں۔
میرے والدین کی اسی بوکھلاہٹ میں قرعہ فال شوبی کے ابا کے نام نکل آیا! بس پھر ......! ندی کی طرح پرسکون زندگی، سونامی کا منظر پیش کرنے لگی۔ میں تو اکثر اپنی ساس کے آگے ہاتھ جوڑ کر، ترلے منتیں کر کے اس پہنچے ہوئے بابا جی کا پتا پوچھتی تھی کہ جس نے



میری مرحومہ ساس کو ایسے جادو منتر سکھائے کہ ان کے جیسے بیٹے کے لیے پری جیسی حسین و جمیل اور نازک دلہن بیاہ کر لے آئیں! ہک ہاہ......!"
نیلوفر نے گہری سانس لی تو چہرے پر لگے مکیچر کو ناک اور منہ کے ذریعے اندر جانے کا راستہ مل گیا اور نیلوفر چھینکتے چھینکتے بے حال ہو گئی۔
"ہائے اللہ! مر گئی میں! کیا لگا دیا ہے تم نے میرے چہرے پر؟" نیلوفر نے جلدی سے ادھر ادھر ہاتھ مارے۔ اسی وقت پارلر والی رخشی آگے بڑھی۔
"اف آنٹی! آپ سے کہا بھی تھا کہ خاموش بیٹھیں!" رخشی نے چڑ کر کہا۔ پاس بیٹھی دوسری عورت نیلوفر کی حالت دیکھ کر مسکرانے لگی۔
"بہت بدتمیز ہو لڑکی تم! بلکہ لڑکی بھی نہیں، آنٹی تو تم خود لگتی ہو۔ تمہاری میری عمر میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہو گا۔ اب تمہاری شادی میری طرح وقت پر نہیں ہوئی تو میرا کیا قصور۔ اونہہ! ایک تو لوگ شادی دیر سے کرتے ہیں اور اوپر سے بچے بننے کا شوق بھی رکھتے ہیں۔ صاف کرو میرا چہرہ پتا نہیں کیا لگا دیا ہے۔ میرے دماغ پر چڑھ گئی ہے اس کی بو۔"
سفید کریم چہرے پر لگائے چیختی نیلوفر سچ میں کسی ڈراونی فلم کا حصہ لگ رہی تھی۔
"بے بی نیلوفر! یہ مکیچر چہرے پر لگانے کے لیے تھا۔ کھانے کے لیے نہیں! اف نجانے کہاں سے آ جاتے ہیں۔ جب پتا نہیں ہوتا کسی چیز کا۔" رخشی نے مہارت سے ہاتھ چلاتے ہوئے اس کا چہرہ صاف کیا۔
نیلوفر نے جلدی سے آنکھیں کھول کر سامنے لگے آئینے میں دیکھا۔
"تم نے تو کہا تھا کہ میرا چہرہ شیشے کی طرح چمکنے لگے گا مگر مجھے تو کوئی فرق نظر نہیں آ رہا ہے۔" نیلوفر نے کڑے تیوروں کے ساتھ پوچھا۔
رخشی نے گہری سانس لے کر پاس بیٹھی دوسری عورت کی طرف دیکھا۔
"فرق تو صاف نظر آ رہا ہے، اب آپ نہ مانیں تو الگ بات ہے۔ برائے مہربانی میرے دوسرے کلائنٹ منتظر ہیں۔ فضول بحث کرنے میں وقت ضائع مت کریں۔" رخشی نے روکھے لہجے میں کہا اور دوسری عورت کی طرف متوجہ ہو گئی جو بال کٹوانے کے لیے منتظر بیٹھی ہوئی تھی۔
"واہ جی! تمہارا وقت قیمتی ہے تو کیا ہم فارغ ہیں؟ میں تو سب کو بتاؤں گی کہ تمہیں کام نہیں آتا ہے۔ نیلوفر نام ہے میرا۔ دیکھتی ہوں کیسے میرے محلے میں اپنا پارلر چلاتی ہو تم!" نیلوفر غصے سے کہتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ رخشی نے گہری سانس لی اور دوسری عورت کی طرف متوجہ ہو گئی۔
"آپ نہیں جانتیں ان محترمہ کو۔ بہت تیز اور چالاک ہیں یہ! اتنی جلدی آپ کا پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔" اس عورت نے کہا تو رخشی نے قینچی ہاتھ میں پکڑتے ہوئے اطمینان سے کہا۔
"پروفیشنل لائف میں یہ سب چلتا رہتا ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ بالوں کی لمبائی کتنی رکھنی ہے۔ ویسے تو آپ کے چہرے پر......" رخشی تفصیل سے سمجھانے لگی تو وہ عورت سر ہلاتی اس کی باتیں سننے لگی۔

☆☆☆

نیلوفر غصے میں پارلر سے نکلی تو نظر گنڈیری والے پر پڑی۔ اس نے ایک کلو گنڈیریاں لیں اور گھر آنے تک غصے سے گنڈیریاں چوستے ہوئے آدھی سے بھی کم رہ گئی تھیں۔ نیلوفر نے دروازہ کھولا تو اسے دیکھ کر تین سالہ زینب نے خوشی سے آواز نکالی۔ نیلوفر صحن میں رکھے موڑھے پر بیٹھ گئی اور دوپٹا سر سے اتار کر کندھے پر ڈال لیا۔
"آ جا، ندیدی ماں کی بچی! کھا لے گنڈیری تو بھی! کتنی ترسی ہوئی ہے اپنی ماں کی طرح ہر چیز کے لیے!"
نیلوفر کا پیار بھی مرچ مسالے سے سجا تیکھا ہی ہوتا تھا۔ زینب، دادی کے پاس آئی اور گنڈیری والا شاپر تھام لیا۔ نیلوفر نے سر گھما کر سارے گھر پر نظر ڈالی۔ چھوٹا سا گھر صاف ستھرا تھا۔ نیلوفر نے باورچی خانے کی طرف دیکھا۔ وہاں بھی خاموشی تھی۔
"لگتا ہے تیری ماں سوئی دھاگا لے کر بیٹھ گئی ہے۔ آخر کو اڑانے کے لیے پیسے بھی تو چاہئیں نا اسے! تیرے باپ کی تو اتنی کمائی نہیں ہے کہ تم لوگوں کی فضول خرچیاں برداشت کر سکے۔"
نیلوفر حسب معمول شروع ہو گئی۔ مقصد زینب کو سنانا نہیں بلکہ اس کی ماں کو تپانا تھا۔ اس لیے اس کی آواز اتنی اونچی ضرور تھی کہ اندر کمرے میں موجود شمع با آسانی سن رہی تھی مگر وہ خاموشی سے سر جھکائے تیزی سے ہاتھ چلاتی قمیص کی ترپائی کرتی رہی۔
"کیا آج کھانا بازار سے منگوانا پڑے گا؟ کسی کو کچھ احساس بھی ہے کہ دوپہر کا ایک بج چکا ہے۔ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جن کی بہوویں وقت پر ساس سسر کو کھانا پیش کرتی ہیں۔ بغیر کسی لالچ کے خدمت کرتی ہیں۔ ایک ہماری بہو ہے۔ جب تک شور نہیں کرو، مجال ہے کہ اس کے کان پر جوں تک رینگ جائے۔ ہاں بھئی! شوہر جو مٹھی میں کیا ہوا ہے۔ ساس جائے بھاڑ میں۔"
نیلوفر کی چلتی زبان کو بریک تب لگے جب کمرے کے دروازے پر شمع کا تھکا ہوا وجود نمودار ہوا وہ خاموشی سے صحن کے کونے میں رکھے پرانے فریج کی طرف بڑھی اور آٹا نکال کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ نیلوفر نے طنزیہ مسکراہٹ چہرے پر سجا کر زینب کی طرف دیکھا۔ جو گنڈیریوں کے چھلکے پھیلا چکی تھی۔
"کرتی رہے گی صفائی اس کی اماں خود ہی۔ چل نیلوفر! آج کا کوٹا تو پورا ہوا۔ اب دیکھتے ہیں ڈرامے کی اگلی قسط میں کیا ہوا ہے؟ قسم سے ڈرامے میں ناگن کا رول تو میں بہت اچھا کر لیتی مگر میری قسمت میں تو غربت کی چکی میں پیسنا لکھا تھا!"
نیلوفر بڑبڑاتی ہوئی اندر والے کمرے کی طرف چلی گئی۔ شمع کھانے کی ٹرے اٹھا کر اندر کمرے میں داخل ہوئی تو نیلوفر پورے انہماک سے چھوٹے سے

ٹی وی کی طرف متوجہ تھی۔ ٹی وی کی آواز اتنی اونچی تھی کہ شمع کو ڈر تھا کہ کہیں سویا ہوا دو سالہ علی نہ اٹھ جائے مگر نیلوفر کو کہنا بے کار تھا۔ اس نے نیلوفر کے سامنے ٹرے رکھی اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

''اونہہ!'' نیلوفر نے اسے جاتا دیکھ کر ناگواری سے منہ بنایا اور سر جھٹک کر کھانے کی طرف متوجہ ہوگئی۔

☆☆☆

''دیکھ شوبی! میں نے تیری بات مان کر اس سوکھی، پھیکے شلجم جیسے رنگ والی لڑکی سے تیری شادی تو کردی مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں اسے سر پر چڑھاؤں گی! یہ بھی شکر کرو کہ اسے سخت ناپسند کرنے کے باوجود میں نے اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے۔ صرف اور صرف تیری خاطر۔ تیرا بڑا بھائی تو کئی بار مجھے کہہ چکا ہے کہ اس گھر کو بیچ دوں اور اس کے پاس چلی آؤں۔ مگر! مجھے احساس ہے کہ تو رل جائے گا میرے پیچھے۔'' نیلوفر نے احسان جتاتے ہوئے کہا تو شوبی سر پہ ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

تنگ اور پرانے سے محلے میں بنے تین مرلے کا یہ چھوٹا سا گھر اس کی واحد جائے پناہ تھی۔ سات سال پہلے بڑا بھائی ٹھیکیداری میں ''اوپر کی کمائی'' سے ترقی کرتا ہوا اچھے محلے میں پانچ مرلے کا گھر بنانے میں کامیاب ہوگیا تو اپنی بیوی اور پانچ بچوں کو لے کر خوشی خوشی یہاں سے چلا گیا تھا۔ شوبی جس نے محلے میں آوارہ گردی کرنے میں جوانی کا وقت گزارا۔ نہ تعلیم حاصل کی اور نہ کوئی ہنر اور اسے اس بات کا تب تک احساس نہیں ہوا جب تک وہ شمع کی محبت کا اسیر ہو کر اس کی چوکھٹ پر طلب گار بن کر نہ گیا اور وہاں سے بری طرح رد ہوا۔ شمع کا باپ کسی صورت بھی اس رشتے پر راضی نہیں تھا مگر نیلوفر جو پہلے خود بھی اس رشتے پر راضی نہیں تھی، بیٹے کی دیوانگی دیکھ کر کمر کس کر میدان میں اتری اور شمع کے گھر والوں کو بالآخر اس رشتے پر راضی کر ہی لیا۔ نیلوفر نے شمع کے باپ کو صاف دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے رشتہ نہیں دیا تو وہ پورے محلے میں یہ بات مشہور کر دے گی کہ شمع اور شوبی کا چکر چل رہا ہے اور اگر یہ بات محلے میں پھیلی تو اس کی باقی دو بیٹیوں کے رشتے بھی نہیں ہوں گے۔ شمع کا باپ اس دھمکی سے ڈر گیا۔

اس نے ایک بوجھ کی طرح سادگی سے شمع کی رخصتی تو کردی مگر اس پر میکے کے دروازے بند کردیے۔ یہ ہی وہ کمزور پہلو تھا جس کا فائدہ اب نیلوفر اٹھا رہی تھی۔

وہ شمع سے بہت چڑتی تھی۔ اسے اپنے بیٹے کا دیوانہ پن برا لگتا تھا کہ وہ عام سی لڑکی کے پیچھے دنیا بھلا بیٹھا تھا اور اب اسی عام سے لڑکی کے لیے دن رات محنت کر کے تھوڑے بہت پیسے کما کر لا رہا تھا۔ شمع سے شادی اور پھر آگے پیچھے کے دو بچوں نے شوبی کو احساس دلایا کہ اس پر بڑی ذمہ داری عائد ہوگئی ہے۔

اس لیے وہ پوری ایمان داری سے کام کرنے کی کوشش کرتا، اس کے پاس تعلیم اور ہنر تو تھا نہیں۔ کپڑوں کی ایک دکان پر سیلز مین کی نوکری کر رہا تھا۔ جہاں اسے بہت معمولی تنخواہ ملتی تھی۔ اس لیے شمع نے گھر میں کپڑوں کی سلائی کا کام شروع کردیا تھا۔ محلے کی کچھ خواتین جو بڑے گھروں میں کام کرنے جاتی تھیں، وہ اسے کام لا دیتیں۔ جس سے شمع کے اضافی خرچے پورے ہو جاتے۔ وہ دونوں میاں بیوی تنگی میں گزارا کر کے بھی خوش تھے مگر نیلوفر کے پاس پیسوں کی کمی نہیں تھی، اسے بڑا بیٹا ہر مہینے باقاعدگی سے ایک معقول رقم خرچے کے لیے دیتا تھا۔

نیلوفر وہ رقم صرف اپنی ذات پر خرچ کرتی یا ان سے کمیٹی ڈال لیتی۔ وہ اچھا پہنتی، اچھا کھاتی پیتی تھی۔ اس کے کمرے میں ہر سہولت تھی۔ اسے باقی گھر والوں سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ وہ بہت من موجی قسم کی عورت تھی۔

تیکھے نین نقش، گورا چٹا رنگ اور مناسب قد کاٹھ کی وجہ سے وہ اپنی اصل عمر سے کچھ سال کم ہی نظر آتی تھی۔ اس میں کچھ اس کی بے فکری اور اچھی خوراک کا بھی ہاتھ تھا۔ پہلے شوبی بھی ماں کی لائن پر ہی چل رہا تھا مگر پسند کی شادی کرنے کی وجہ سے وہ ماں کے لیے بھی پرایا بن گیا۔ نیلوفر بہو کی ضد اور جلن میں اکثر شوبی اور بچوں کے ساتھ بھی زیادتی کر جاتی۔ حالانکہ اسے شوبی کے بچوں سے بہت پیار تھا مگر یہ پیار اس حسد سے بہت کم تھا جو اسے شمع سے تھا۔ ہر روز صبح کام پر جانے سے پہلے نیلوفر شمع کی شان میں کچھ کلمات فرما کر یہ احسان ضرور جتاتی تھی کہ اس نے ان لوگوں کو گھر بدر نہیں کیا ہے۔

☆☆☆

شمع نے ناشتا شوبی کے آگے رکھا۔ شوبی کی نظر اٹھی اور شمع کے پیلے چہرے اور بجھی آنکھوں پر پڑی تو وہ بے چین ہوگیا مگر ماں کے سامنے کچھ بھی کہہ کر وہ شمع کے لیے کوئی مسئلہ نہیں بنانا چاہتا تھا۔ وہ تو کام پر چلا جاتا تھا بعد میں نیلوفر نے شمع کی زندگی تنگ کردینی تھی۔

''چار سال شادی کو ہوئے ہیں اور تیسرا بچہ! شمع کو اچھی خوراک اور آرام کی بہت ضرورت ہے۔'' شوبی ناشتا سامنے رکھے گہری سوچ میں گم تھا۔ نیلوفر نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ وہ بیٹے کی پریشانی سے واقف تھی مگر اس کے لیے کچھ بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''یقین کر شوبی! اس طرح سوچنے سے تیری کوئی لاٹری نہیں نکل آئے گی جو تو اس مہارانی پر اڑا سکے۔ چل شاباش ناشتا کر اور کام پر جا۔ ماں کے سر پر بہت عرصہ راج کرلیا۔ اب محبت کو نباہ۔'' نیلوفر نے طنزیہ لہجے میں کہا اور چائے پینے لگی۔ شوبی نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا اور پھر سامنے رکھے ناشتے پر ایک نگاہ ڈالی۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل کیا کہ بغیر ناشتا کیے اٹھ کر چلا جائے مگر وہ جانتا تھا کہ دکان پر دوپہر دو بجے سے پہلے کھانا نہیں ملے گا اور وہ خالی پیٹ کام نہیں کرسکتا تھا اس لیے خاموشی سے نوالے توڑنے لگا۔

☆☆☆

نیلوفر نے کنگھی کر کے چہرے پر کریم لگائی اور پھر ہلکی سی لپ اسٹک لگا کر آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور خود سے مطمئن ہو کر دوپٹا سر پر لیتی کمرے سے باہر نکل آئی۔ بکھرے بالوں اور ملگجے کپڑوں میں ملبوس شمع صحن میں لگے نلکے کے سامنے بمشکل بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔

''ابھی تو چوتھا مہینہ ہے اور نخرے دیکھو محترمہ کے!'' نیلوفر نے اسے دیکھ کر حسب معمول منہ بنایا۔ شمع نے ایک نظر ساس پر ڈالی اور پھر سر جھکا کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوگئی۔ دونوں بچے ماں کے پاس ہی بیٹھے کھیل رہے تھے۔

''میں بھی ساتھ جاؤں گی۔'' زینب نے دادی کو تیار دیکھا تو فوراً اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ نیلوفر نے ایک نظر اس پر ڈالی۔

''تجھے ساتھ لے جا کر میں نے اپنی بے عزتی نہیں کروانی۔ تُو اپنی ماں کے ساتھ ہی جچتی ہے! چل ہٹ دیر ہو رہی ہے مجھے!'' نیلوفر نے زینب کو پیچھے کرتے ہوئے کہا تو وہ رونے لگی۔ نیلوفر برے برے منہ بناتی گھر سے نکل گئی۔ اس کا ارادہ آج اپنی سہیلی کلثوم کے گھر جانے کا تھا۔ جو شہر کے اچھے علاقے میں رہتی تھی مگر بہت ملنسار اور اچھی طبیعت کی مالک تھی۔ اس لیے تو آج تک نیلوفر سے دوستی نبھا رہی تھی۔

نیلوفر اس کے گھر پہنچی تو وہ کھانے کی میز سجائے اس کی منتظر تھی۔ نیلوفر نے میز کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھا۔

''تم تو آج بھی بہت تیز ہو کام کرنے میں، اتنا سب کچھ......!''

کلثوم دھیرے سے ہنس پڑی۔

''ارے مجھ سے اب کہاں ہوتے ہیں بھاگ بھاگ کر ایسے کام۔ اب میری بہوویں ہیں ناں! انھوں نے ہی سب سنبھالا ہوا ہے۔ میں تو ــــ حکم چلاتی ہوں۔ بس یہ کھیر میں نے بنائی ہے''

''بھئی قسمت ہے تمہاری!'' نیلوفر نے کہتے ہوئے بریانی سے اپنی پلیٹ بھرلی۔

''قسمت تو تمہاری بھی بری نہیں، بہت اچھی اور سمجھدار لڑکی ہے شمع! تمہاری بڑی بہو سے تو لاکھ درجے اچھی ہے وہ۔ بڑی نے تو کبھی سیدھے منہ بات ہی نہیں کی تھی۔'' کلثوم نے کچھ یاد آنے پر کہا تو

نیلوفر نے بریانی کی پلیٹ سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''تمہیں لگتی ہو گی شمع سیدھی اور سادی! بھلا جو لڑکیاں عاشقی معشوقی کر کے شادیاں کریں وہ کہاں سے سیدھی سادی ہو گئیں؟ بس رہنے ہی دو تم! یہ بتاؤ کہ تمہاری دونوں بہوویں کہاں ہیں؟ نظر نہیں آ رہیں؟'' نیلوفر نے پوچھا تو کلثوم نے اپنی پلیٹ میں چاول نکالے۔

''ایک کی امی بیمار ہے اور دوسری کی چھوٹی بہن کو دیکھنے کچھ لوگ آ رہے تھے۔ اس لیے وہ دوپہر کے کھانے کی سب تیاری کر کے چلی گئی ہیں۔ باقی رضیہ تو ہے۔ وہ دیکھ لے گی۔'' کلثوم نے اپنی کام والی کا نام لیتے ہوئے کہا تو نیلوفر نے سر ہلایا۔ کھانے کے بعد وہ ٹھنڈی کھیر سے لطف اندوز ہو رہی تھیں جب کلثوم نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ کھیر میں نے خاص اپنے ولید اور حرا کے لیے بنائی ہے۔ رات کو واپس آئیں گے تو انھیں سرپرائز دوں گی۔ بہت خوش ہوں گے۔ سچ پوچھو تو اپنے والدین سے زیادہ دادو کے دیوانے ہیں بچے!'' کلثوم نے محبت سے اپنے پوتے اور پوتی کا ذکر کیا تو نیلوفر کی نگاہوں کے سامنے شوبی کے دونوں بچے گھوم گئے۔ جن کے پاس نہ اچھا کھانے کو تھا اور نہ اچھا پہننے کو! اسے روتی ہوئی زینب یاد آئی تو بے ساختہ اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا اور وہ جو شام تک رہنے کے ارادے سے یہاں آئی تھی۔ کھیر ختم کر کے ایسے وہاں سے نکلی جیسے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔ شام سے پہلے وہ اپنے گھر کے دروازے پر تھی۔ زینب اور علی چارپائی پر بیٹھے چائے اور پاپے کھا رہے تھے۔ دادی کو دیکھ کر دونوں نے سر اٹھایا اور ٹکر ٹکر اس کے چہرے کو دیکھنے لگے۔ اس وقت وہ اتنے معصوم اور پیارے لگے کہ نیلوفر کا دل کیا کہ انھیں خود میں کہیں چھپا لے۔

''دیکھو میں تم لوگوں کے لیے کیا لائی ہوں!'' نیلوفر نے ہاتھ میں پکڑا شاپر آگے کیا۔

''کیا ہے اس میں؟'' زینب نے بے چینی سے پوچھا۔ نیلوفر انھیں وہاں ہی رکنے کا اشارہ کر کے باورچی خانے کی طرف چلی گئی اور تھوڑی دیر کے بعد پلیٹ میں سب کچھ رکھ کے لائی تو دونوں بچوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔

''دادی جلیبی!'' زینب نے کہا تو نیلوفر ہنس پڑی۔

''چل ہٹ شریر لڑکی! دادی کو جلیبی کہہ رہی ہے۔ اپنی ماں کے بدلے مت لے اور کھا۔ سموسے بھی لائی ہوں تم لوگوں کے لیے!'' نیلوفر نے مسکرا کر کہا۔ زینب اور علی اپنے سامنے رکھی چیزوں کی طرف متوجہ تھے۔ اسی وقت واش روم کا دروازہ کھلا اور گیلے بال تولیے سے صاف کرتی شمع سامنے کا منظر دیکھ کر ٹھٹک کر اپنی جگہ رک گئی۔

''ایسے ٹکر ٹکر کیا دیکھ رہی ہے؟ کیا بچوں کے کھانے کو نظر لگانی ہے؟ فکر مت کر تیرا بھی حصہ رکھا ہے۔ یہ پکڑ اور مجھے چائے بنا کر دے۔ ''ناگن'' کی پرانی قسط ٹیلی کاسٹ ہونے والی ہے۔''

نیلوفر نے شاپر اس کی طرف بڑھایا اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ شمع حیرت سے اپنی جگہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

''دیکھ لے شمع! اگر باجی خوش ہوئیں تو تجھے سلائی کے ساتھ ساتھ اضافی دو سو بھی دیں گی۔ انھوں نے کہہ کر بھیجا ہے، انھیں یہ سوٹ دو دن تک ہر حال میں چاہئیں!''

کوثر نے کہا تو شمع سوچ میں پڑ گئی۔

''مگر کوثر باجی! آپ تو جانتی ہیں کہ میری حالت ایسی نہیں ہے کہ میں زیادہ دیر تک بیٹھ کر کام کر سکوں۔'' شمع تذبذب کا شکار تھی مگر کوثر بضد رہی اور اسے سوٹ تھما کر گھر سے باہر نکل گئی۔ نیلوفر اس ساری بحث کے دوران مزے سے جامن کھانے میں مصروف رہی۔

''تو اتنے نخرے کیوں دکھا رہی ہے جب پتا بھی ہے کہ کوثر کی باجی کے کپڑے تیرے پاس ہی آتے ہیں!'' نیلوفر نے کہا تو شمع نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''آج کل طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ کمر میں درد اور چکر......'' شمع نے دھیمے لہجے میں کہنا چاہا۔

''اوبی بی! یہ بیماری نامہ بند کرو تمہاری باتیں سن کر تو مجھے چکر آنے لگے ہیں'' نیلوفر نے لاپروائی سے کہا تو شمع گہری سانس لے کر اندر کی طرف مڑ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازے پر دستک ہوئی اور نصرت بڑا سا شاپر تھامے گھر کے اندر داخل ہوئی۔

''بڑے دنوں کے بعد چکر لگایا نصرت تم نے!'' نیلوفر نے خوش دلی سے اسے خوش آمدید کہا۔ نصرت اس کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''بس بہن کام کب جان چھوڑتے ہیں......! نئے سوٹ آئے تھے آج۔ وہ ہی دکھانے آئی ہوں۔ قیمت بھی بہت مناسب ہے اور پرنٹ بھی نئے ہیں۔ شمع کہاں ہے اسے بھی بلا لے!'' نصرت نے کہتے ہوئے اپنا شاپر کھولا۔ شمع کسی کام سے باہر نکلی تو نصرت کو دیکھ کر سلام کیا اور اس کے لیے چائے بنا کر لے آئی۔ تب تک نیلوفر سب سوٹ کھول کر دیکھ چکی تھی۔

''یہ کتنا پیارا ہے!'' کالے اور سرخ رنگ کے لان کے سوٹ کو دیکھ کر بے ساختہ شمع کے منہ سے نکلا تو نیلوفر بھی چونک گئی۔

''تو لے لے...... تیرے صاف رنگ پر بہت جچے گا یہ!'' نصرت نے مسکرا کر کہا تو شمع سوچ میں پڑ گئی۔ جیسے اپنے پاس رکھے پیسوں کا حساب کتاب کر رہی ہو۔ تب تک نیلوفر نے ایک سوٹ اپنے لیے اور ایک کاٹن کا مردانہ کرتا بھی لے لیا۔

''یہ شوبی کے لیے لیا ہے؟'' نصرت نے مسکرا کر پوچھا۔

''ارے نہیں! اگلے ہفتے قاسم کے گھر جانا ہے۔ اس کی بیٹی کی سالگرہ ہے۔ میرا بیٹا اتنا خیال رکھتا ہے تو سوچا کیوں نہ ایک چیز اس کے لیے بھی لے لوں!'' نیلوفر نے کہا تو شمع چونک گئی۔ وہ تو بھول ہی گئی تھی کہ اگلے ہفتے جیٹھ اور جیٹھانی کے گھر دعوت پر جانا ہے۔

''یہ کتنے کا ہے نصرت؟'' نیلوفر نے پوچھا تو نصرت بولی۔

''یہ پانچ سو میں صرف قمیص ہے مگر اس کے گلے اور بازو پر ہلکی سی کڑھائی ہے۔ اس لیے اس سے کم میں نہیں ملے گا'' نصرت نے دو ٹوک انداز میں کہا تو نیلوفر نے سر ہلا کر اپنا بٹوہ کھولا اور پیسے نصرت کے ہاتھ میں رکھے۔

''شمع بیٹی! تم نے کچھ لینا ہے؟'' نصرت نے پاس کھڑی شمع سے پوچھا۔

''نصرت باجی! ابھی نہیں۔'' شمع نے کہا تو نیلوفر مسکرا دی کہ شمع سوٹ کی سلائی ملنے پر خریداری کرے گی۔

''اچھا جیسی تمہاری مرضی۔ میرا مال تو ہاتھوں ہاتھ بک جاتا ہے۔'' نصرت نے کہا اور چائے پی کر وہاں سے چلی گئی۔ شمع سب کاموں سے فارغ ہو کر سوٹ کی سلائی میں مصروف ہو گئی۔ نیلوفر اسے دیکھ کر طنزیہ مسکرانے لگی۔

''کتنا مزا آئے گا جب تمہارا پسند کیا ہوا سوٹ میں تمہاری نگاہوں کے سامنے پہن کر پھروں گی۔ تمہاری ہار دیکھنے کا مجھے شدت سے انتظار ہے شمع بیگم!''

نیلوفر نے سوچا کہ وہ سوٹ کل صبح نصرت کے گھر جا کر خرید لے گی۔ وہ شمع کی متوقع حالت کے بارے میں خود ہی سوچ کر ہنستی رہی مگر اگلے دن جب وہ پیسے لے کر نصرت کے گھر گئی تو سب سوٹ بک چکے تھے۔ نیلوفر اپنے منصوبے پر پانی پھرتا دیکھ کر تلملا کر رہ گئی۔

☆☆☆

اس دن شوبی گھر سے نکلا تو بہت پریشان تھا۔ نیلوفر نے صبح ہی اسے صاف سنا دیا تھا کہ بڑے بھائی کے گھر پہلا فنکشن ہے۔ خاندان کے اور بھی لوگ آئیں گے۔ اس لیے وہ طور طریقے سے شامل ہو! اور اسی طور طریقے کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ وہ پریشان اور گم صم سا سارا دن کام کرتا

رہا۔ شام ڈھلے گھر لوٹا۔ روز کی طرح شمع اس کی منتظر تھی۔ سارے دن کی تھکن اور رویوں کی اذیت، اس کی بے لوث محبت کے سامنے کہیں گم سی ہو جاتی تھی۔ شوبی مسکرا دیا۔ وہ پیسے کے معاملے میں ضرور غریب تھا مگر محبت کا بے تاج بادشاہ تھا۔ شمع اس کے لیے تازہ روٹی بنانے چلی گئی۔ شوبی دونوں بچوں کو لے کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ نیلوفر بھی اپنے کمرے سے باہر نکل آئی اور شوبی کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"اماں! میں نے ایک دوست سے کچھ پیسے ادھار لیے ہیں۔ کل جمعہ پڑھ کر گھر آ جاؤں گا۔ پھر ہم سب قریبی بازار چلیں گے۔ قاسم بھائی کے گھر اتنا بڑا فنکشن ہے۔ بچوں کے لیے نئے کپڑے لینا بہت ضروری ہے اور اگر کچھ پیسے بچے تو ایک سستا سا سوٹ شمع کو بھی لے دوں گا۔" شمع نے ٹرے اس کے سامنے رکھی اور پانی کا جگ لینے چلی گئی۔

"اسے چھوڑ! تو اپنے لیے نئے کپڑے لے لینا۔ اس کے پاس تو پہلے ہی بہت کپڑے ہیں۔ اپنا حال دیکھا ہے؟ اپنے حلیے سے تو قاسم کا بھائی نہیں لگتا ہے۔ ایک بھائی اتنا ٹپ ٹاپ اور ایک......!!" نیلوفر نے منہ بنا کر کہا تو شوبی لاپروائی سے بولا۔

"میری خیر ہے اماں! شمع کو زیادہ ضرورت ہے اس وقت۔" شمع نے پانی کا گلاس بھر کر اس کے سامنے رکھا۔ شوبی کی نگاہیں اس کی نگاہوں سے ملیں تو دونوں محبت سے مسکرا دیے۔ نیلوفر یہ دیکھ کر تپ گئی۔

"چل بڑا آیا ہے تُو اس کی فکر کرنے والا۔ وہاں اتنے لوگوں میں اپنے حلیے سے تماشا بنے گا۔ مجھے کیا بھاڑ میں جاؤ تم لوگ!" نیلوفر غصے میں کہتی وہاں سے چلی گئی۔ شمع نے گہری سانس لے کر شوبی کی طرف دیکھا۔

"اماں کی تو عادت ہے۔ تم دل پر مت لینا۔" شوبی چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر اپنے بچوں کو کھلا رہا تھا۔ شمع نے ایک نگاہ اس پر ڈالی اور چائے بنانے باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

☆☆☆

جمعہ بازار میں رش معمول کے مطابق تھا۔ وہ لوگ بچوں کی شاپنگ کر کے فارغ ہو چکے تھے۔ اب شوبی شمع کے لیے کوئی مناسب سوٹ دیکھ رہا تھا۔ نیلوفر مختلف ٹھیلوں سے چیزیں لے کر کھاتی ہوئی ہر چیز پر تنقید کر رہی تھی۔

"یہ سوٹ کتنا پیارا ہے!" شمع نے کالے اور سرخ رنگ کے لان کے سوٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ایسا ہی سوٹ اس دن نصرت کے پاس بھی تھا۔ شوبی بھی سوٹ دیکھ کر سراہنے لگا۔

"کتنے کا ہے یہ بھائی؟" شوبی نے دکان دار سے پوچھا اور اس کی بتائی قیمت سن کر اس کا چہرہ بجھ گیا۔

"ہم آگے سے دیکھ لیتے ہیں۔ یہ اتنا بھی خاص نہیں ہے۔" شمع نے فوراً کہا تو شوبی سر جھکا کر چل پڑا جبکہ نیلوفر نے سوچتی ہوئی نظروں سے سوٹ کی طرف دیکھا۔ شمع کی ہار کا دکھ دیکھنے اور اپنی ادھوری خواہش پوری کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

"تمہارے پاس بھی تو کچھ پیسے ہیں نا؟ ہم وہ ہی سوٹ لیں گے۔ مجھے کوئی اور پسند نہیں آ رہا۔" آگے سے گھوم کر شوبی واپس اسی اسٹال کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

"ہاں مگر!" شمع کی بات منہ میں ہی تھی جب نیلوفر آگے بڑھی اور اس نے اپنے چھوٹے سے بٹوے سے پیسے نکال کر دکان دار کی طرف بڑھائے۔

"بھائی یہ کالا اور سرخ رنگ کا سوٹ پیک کر دو!" نیلوفر نے جلدی سے کہا۔

"اونہہ! بڑی آئی یہ سوٹ پہننے والی! جب میں یہ سوٹ پہنوں گی تو جل کر کوئلہ ہو جائے گی۔" نیلوفر نے جیت کی خوشی سے سرشار ہو کر سوچا۔

نیلوفر نے سوٹ پیک کرواتے ہوئے فخریہ نظروں سے گردن گھما کر پیچھے کھڑے بیٹے اور بہو کے چہرے کے تاثرات دیکھنے چاہے مگر یہ کیا......!

وہ دونوں ساتھ لگے مردانہ کپڑوں کے اسٹال پر کھڑے بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ نیلوفر نے دکان دار سے شاپر پکڑا اور تیزی سے ان کی طرف بڑھی۔

"اماں آپ ہی سمجھائیں انھیں! میرے پاس تو بہت کپڑے ہیں۔ یہ اپنے لیے یہ کڑھائی والا کرتا شلوار لے لیں۔ پچھلے دو سالوں سے تو عید پر بھی کوئی نیا کپڑا نہیں بنایا ہے انھوں نے! اب بھائی کے گھر کیا پہن کر جائیں گے۔ بس میں نے کہہ دیا۔ بھائی کتنے پیسے ہوئے؟"

شمع بات ختم کرتے ہوئے دکان دار کی طرف متوجہ ہوئی اور ہاتھ میں پکڑے پیسوں میں سے گن کر اسے پکڑائے۔ شوبی بڑبڑاتا رہ گیا۔

"بس اتنے پیسے بچے ہیں میرے پاس! اس سے میں برف کا گولا لوں گی۔" شمع نے اپنی زرد ہتھیلی پر رکھے چند نوٹوں کو دیکھا تو شوبی نے مسکرا کر سر ہلایا۔ شوبی نے علی کو گود میں اٹھایا ہوا تھا اور شمع نے زینب کی انگلی تھام رکھی تھی۔ وہ چاروں مگن سے انداز میں آگے بڑھ رہے تھے جبکہ نیلوفر ان کے پیچھے قدم گھسیٹتی ہوئی چل رہی تھی۔ برف کا گولا لے کر وہ اتنے خوش اور مطمئن تھے جیسے ساری دنیا کی دولت ان کے پاس ہو۔

"ارے اماں! آپ کیوں پیچھے رہ گئی ہیں؟ برف کا گولا لیں گی؟" شوبی نے گردن گھما کر پیچھے کھڑی نیلوفر سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

وہ باتیں کرتے ہوئے آگے چلنے لگے اور ان کے پیچھے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی نیلوفر، چھوٹی چھوٹی سوچوں کے دھاگوں میں الجھتی، ضمیر کے جال میں پھنستی جا رہی تھی۔

"پیچھے تو میں بیچ میں رہ گئی ہوں......!" نیلوفر بڑبڑائی۔ "ہمیشہ دوسروں سے مقابلہ کر کے انھیں نیچا دکھانے کا شوق رہا ہے مجھے۔ پچھلے چار سالوں سے ہر قدم پر شمع کو شکست دے کر اپنی برتری ثابت کرتی رہی ہوں مگر آج......!" نیلوفر نے اپنے چھوٹے سے پیسوں سے بھرے بٹوے اور دوسرے ہاتھ میں پکڑے سوٹ کی طرف دیکھا۔

"اپنے دونوں ہاتھوں میں جیت کے ترازو رکھنے کے باوجود، آج میری ممتا کا پلڑا کمزور رہا اور کل کی آئی اس لڑکی کی عام سی محبت، میری ممتا سے جیت گئی......!" نیلوفر نے اپنی آنکھوں میں پھیلتی نمی کو چھلکنے سے روکا تھا۔

"اور یہ سچ ہے نیلوفر بی بی! چاہے آپ دنیا کے کسی بھی محاذ پر جیت جائیں مگر یہ ممتا کی ہار ہر ہار سے بڑی اور تکلیف دہ ہوتی ہے"

قاسم کے گھر ہونے والی بڑی سی تقریب میں شعیب عرف شوبی اپنی بیوی اور دونوں بچوں کے ساتھ نئے کپڑے پہنے ہنستے مسکراتے ہوئے شریک ہوا تھا۔ نیلوفر دو دن پہلے ہی قاسم کے گھر رہنے کے لیے چلی گئی تھی۔

"ماشاء اللہ! بہت اچھا لگ رہا ہے یہ رنگ تم پر۔" قاسم کی بیوی نے شمع کو دیکھ کر بے ساختہ تعریف کی۔

"اچھا کیوں نہیں لگتا! میں اپنی بہو کے لیے خود چن کر یہ رنگ لائی تھی۔ اس کی صاف رنگت پر کالا اور سرخ رنگ کتنا اٹھ رہا ہے نا۔"

نیلوفر نے فخریہ انداز میں کہا تو شمع حیرت سے ان کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ وہ پچھلے کچھ دنوں سے نیلوفر کے مزاج میں آئی تبدیلی کو نہیں سمجھ پا رہی تھی۔

پہلے تو اس کے لیے سرپرائز سوٹ خریدنا اور پھر اس کی تعریف کرنا۔ شمع جتنا سوچتی اتنا ہی الجھتی گئی۔

دوسری طرف نیلوفر اس کی الجھن سے نگاہیں چرائے، اپنے دل میں اٹھتی اس تڑپ پر نظریں جمائے بیٹھی ہوئی تھی جو ہر حال میں محبت کی بازی اپنی ممتا کے زور پر پھر سے جیتنا چاہتی تھی۔

مگر وہ جانتی تھی کہ اس کے لیے ابھی بہت وقت درکار ہے کیونکہ محبت کی بازی وہ ہی جیت سکتے ہیں جو نیت اور عمل میں خالص ہوتے ہیں اور اس کے لیے نیلوفر کو ابھی بہت محنت کرنا تھی! شاید اپنی زندگی کی آخری سانس تک۔

☆

فاخرہ جبیں

یہ گھر یہ اجالے دیپ کے

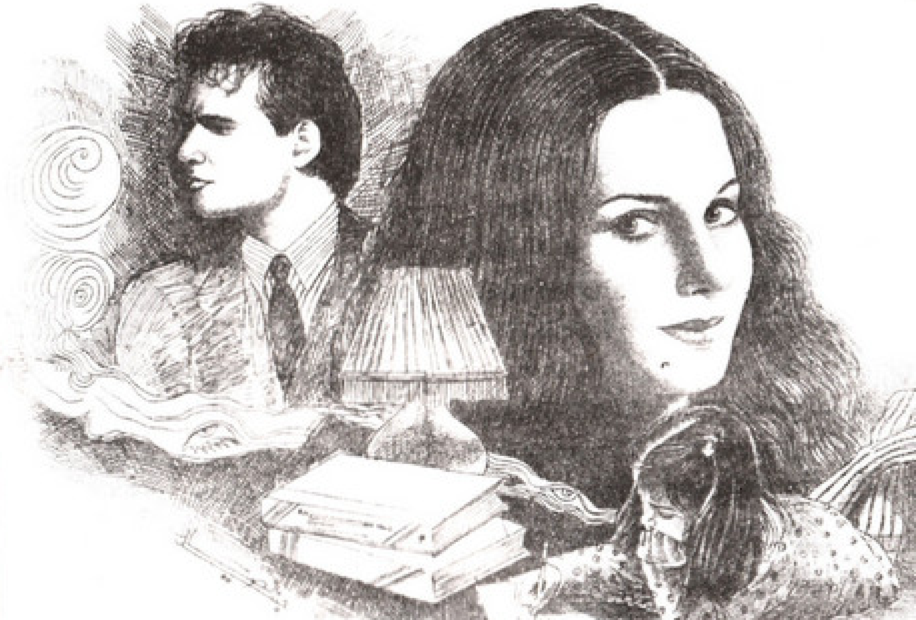
کالونی کی خاموش فضا میں اچانک ہی ایک نسوانی چیخ گونجی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دوڑتے قدموں کی آواز اور کتے کے غرانے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔

معلوم نہیں یہ چیخ ان گھروں میں بند لوگوں تک پہنچی نہیں یا پھر یہاں کے مکین اس قدر بے حس تھے کہ انہوں نے اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

اس نے بھاگتے بھاگتے مڑ کر دیکھا۔ وہ خطرناک کتا اپنے نوکیلے دانتوں کی نمائش کرتا ابھی تک اس کے تعاقب میں تھا۔

''ہائے میں مر گئی۔ آج مجھے کوئی نہیں بچا سکتا۔'' کتے کے غرانے کی آواز اسے بالکل قریب سے سنائی دی تھی اور بالکل آخری لمحے جب وہ ناامید ہو کر اپنی ٹانگ تحفتاً اس کتے کو پیش کر دینے والی تھی۔ ایک سفید گیٹ عین اس کے سامنے آ گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا بیگ گھما کر اس کتے کے منہ پہ دے مارا وہ شاید اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ بوکھلا کر چند قدم پیچھے ہٹا اسے بس ذرا سا موقع ہی چاہیے تھا سو فوراً ہی جوتے کی نوک گیٹ میں

مکمل ناول



پھنسائی اور اگلے ہی لمحے وہ دیوار پہ چڑھی۔

''اف انتہائی ڈھیٹ اور اول نمبر کے ذلیل کتے ہو تم۔'' دیوار پہ چڑھ کر اس نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا وہ کتا شاید انسانی زبان سے اچھی خاصی واقفیت رکھتا تھا جب ہی تو اس کی بات سنتے ہی فوراً اس پر جھپٹا تھا وہ بھی تیار بیٹھی تھی اسے جمپ لگاتے دیکھ کر وہ فوراً دوسری طرف کود گئی۔ نیچے گرتے ہی اسے احساس ہوا کہ اس کے دوپٹے کا کچھ حصہ باہر رہ گیا ہے غالباً کتے کے منہ میں۔

''اللہ کا واسطہ ہے اب جان چھوڑ بھی دو محض تمہاری کوٹھی میں جھانک کر ہی دیکھ لیا تھا' وہ بھی غلطی سے مگر تم تو پیچھے ہی پڑ گئے ہو۔'' اس نے گیٹ کی درز سے جھانک کر کتے کے منہ میں اپنے دوپٹے کا کچھ حصہ دیکھ کر لجاجت سے کہا۔ مگر وہ جوں کا توں خونخوار نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ تھک ہار کر اس نے اپنا رخ موڑ لیا۔ اب وہ دیوار سے ٹیک لگائے اس کوٹھی کا جائزہ لے رہی تھی جس میں وہ اس وقت کھڑی تھی۔

''خاصی اجاڑ اور ویران لگ رہی ہے۔ معلوم نہیں یہاں کوئی رہتا بھی ہے کہ نہیں۔''

اس نے بے ترتیب لان اور خالی برآمدوں کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے سوچا۔

''باہر کا راستہ تو اس وقت بلاک ہے کیوں نہ اندر جا کر دیکھا جائے۔''

وہ بہت احتیاط سے درختوں اور پودوں کے پیچھے چلتی دائیں دیوار کی طرف آ گئی۔

''یہاں لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے تھے۔ اس نے اچک کر دیکھا' یہ باورچی خانہ تھا۔ سامنے ہی فل سائز فریج تھا۔ باورچی خانے سے اٹھتے کھانوں کی مخصوص مہک نے ایک دم ہی اسے احساس دلایا کہ وہ گزشتہ رات سے بھوکی ہے۔

اس نے کلائی پہ بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ سوا تین بج رہے تھے۔

''کمال ہے' اتنی دیر سے بغیر کھانا کھائے میں زندہ ہوں۔'' اس نے حیرت سے سوچا کیونکہ بھوک کے معاملے میں وہ خاصی بے صبری واقع ہوئی تھی۔

اس نے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا' ابھی تک کوئی انسانی وجود اسے نظر نہیں آیا تھا۔ بہت احتیاط سے اس نے اپنا شولڈر بیگ کھڑکی میں رکھا۔ دونوں ہاتھ اچھی طرح کھڑکی پہ جمائے اور اچک کر کھڑکی کے راستے باورچی خانے میں داخل ہو گئی۔

''ہائے اللہ اگر کوئی آ گیا تو یقیناً مجھے چور، ڈاکو ہی سمجھے گا۔'' اس نے گھبرائے گھبرائے سے انداز میں بند دروازے کو دیکھا اور جلدی سے فریج کا دروازہ کھولا۔ سب سے پہلے پانی کی بوتل اٹھا کر منہ سے لگائی اور غٹا غٹ آدھی بوتل خالی کر دی۔ پھر ایک نظر تمام اشیاء پر ڈال کر اس نے بڑا سا سیب اٹھا لیا۔

''اللہ میاں جی معاف کر دینا۔ مجبوری کی حالت میں اتنی سی چوری تو جائز ہے ناں؟''

وہ فریج بند کر کے پلٹی تھی اور اسی دوران دروازے کے باہر قدموں کی چاپ نے اسے دہلا کر رکھ دیا۔ بوکھلاہٹ میں اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ واپس کھڑکی کی طرف بھاگے یا یونہی آنے والے کا استقبال کرے اور جب دروازے کا ہینڈل گھوما تو وہ بے اختیار اور بلا ارادہ ہی بجلی کی سی تیزی سے فریج کی اوٹ میں ہو گئی۔

آنے والا سیدھا چولہے کے پاس پہنچا تھا۔ چھوٹی سی دیگچی میں پانی ڈال کر اسے چولہے پہ رکھا اور کیبنٹ کھول کر کوئی ڈبہ نکالنے لگا۔ غالباً چائے بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ سانس روکے فریج کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

''ابھی یہ دودھ نکالنے فریج کی طرف آئے گا اور میں بھی بے وقوف ہوں' مجھے فوراً کھڑکی سے باہر کود جانا چاہیے تھا۔ یا اللہ یہ صرف ایک منٹ کے لیے باہر چلا جائے یا پھر چند لمحوں کے لیے اس کی آنکھوں پہ اندھیرا چھا جائے۔''

اس نے آنکھیں بند کر کے دل کی گہرائیوں سے دعا کی تھی۔

آنے والے کو کیبنٹ میں نجانے کیا نظر آیا تھا کہ وہ ڈبے ہلا ہلا کر شی شی کی آوازیں نکالنے لگا تھا۔

''افوہ! کیا مصیبت ہے' اب نکل بھی جاؤ۔'' آنے والے نے جھنجلا کر ایک ڈبہ ہلایا اور اس کے ساتھ ہی ایک موٹا تازہ چوہا وہاں سے نکل کر پوری رفتار سے اس کی طرف بڑھا تھا۔ اس کے پورے بدن میں ایک دم سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ خود کو روکتے بھی نجانے کیسے زوردار چیخ اس کے لبوں سے آزاد ہو ہی گئی تھی اور شاید اسی فلک شگاف نعرے سے خوف زدہ ہو کر ہی اس چوہے نے اپنا رخ بدل لیا تھا ورنہ شاید وہ بے ہوش ہو کر چاروں شانے چت ہو گئی ہوتی۔

آنے والے کے ہاتھ میں جو کچھ بھی تھا وہ ایک دھماکے کے ساتھ زمین پہ آ رہا تھا۔ بے حد حیرت اور بے یقینی کے عالم میں اس نے اس نازک حسینہ کو دیکھا تھا جو دونوں ہاتھ کانوں پہ رکھے، آنکھیں بند کیے ایک ٹانگ اوپر اٹھائے کانپ رہی تھی۔ (بس چلتا تو شاید دوسری ٹانگ بھی اٹھا لیتی)

''یہ زمین سے اگی ہے یا آسمان سے ٹپکی ہے۔'' آنے والے نے پریشان ہوتے ہوئے سر اٹھا کر چھت کو دیکھا۔ مگر وہاں ایسے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

حواس بحال ہوتے ہی اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ وہ سامنے کھڑا کڑے تیوروں سے اسے گھور رہا تھا۔

''کون ہو تم۔'' اس نے یک دم اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اپنے سامنے کیا۔

اسے اس سچویشن میں رونا دھونا انتہائی فضول لگا تھا سو ایسا کوئی بھی ارادہ ملتوی کرتے ہوئے اس نے گھور کر پہلے اس شخص کو پھر اس ہاتھ کو دیکھا جس نے ابھی تک اس کا بازو سختی سے جکڑ رکھا تھا۔

''میں جو کوئی بھی ہوں' تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟'' اس نے زوردار جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا اور قدرے ڈپٹ کر کہا۔

''کیا الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے یعنی کہ چوری اور سینہ زوری۔'' پھر یقیناً وہ محاورات میں پی ایچ ڈی تھا۔

''کیا؟ کیا کہا؟ آ...... آپ مجھے چور سمجھ رہے ہیں آپ کا خیال ہے میں یہاں چوری کرنے آئی ہوں دماغ تو ٹھیک ہے آپ کا، چوروں کی شکلیں ایسی ہوتی ہیں؟'' اس نے مزید غصے کا اظہار کر کے اس شخص کو مرعوب کرنے کی کوشش کی۔

''چوروں کا تو مجھے معلوم نہیں لیکن چورنیوں کی شکلیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ مسکین سی مجبوری اور قحط زدہ بھی۔''

''خاموش ہو جائیں اتنی اچھی شکل کو آپ نے کیا سے کیا بنا دیا۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''اپنی شکل دیکھی ہے آپ نے۔ چور ڈاکو ہی نہیں قاتل اور دہشت گرد بھی لگ رہے ہیں۔'' اس کا

بس نہیں چل رہا تھا کہ کوئی منتر پڑھ کر خود یہاں سے غائب ہو جائے یا اس بدتمیز انسان کو ہی نظروں سے اوجھل کر دے۔

"کون ہے؟ کیا ہو رہا ہے یہاں؟" اس سے پہلے کہ وہ مزید بدلہ چکاتی اچانک ہی دروازے میں حیرت بھری آواز سنائی دی تو وہ فوراً پلٹی۔ سرسری سی نظر اس ہستی پر ڈالنے کے بعد وہ انہیں غور سے دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔

سر کے بالوں میں سفیدی زیادہ اور سیاہی کم تھی اس لیے بالوں کا رنگ سرمئی لگ رہا تھا۔ داڑھی بھی ایسی ہی تھی۔ آنکھوں پر چشمہ تھا۔ سرمئی کھدر کے سوٹ پر سرمئی ہی چادر کاندھوں پر ڈال رکھی تھی۔ عجیب بادل نما انسان' تھے وہ مگر خاصے جانے پہچانے۔ اس نے جھٹ اپنے شولڈر بیگ کی زپ کھول کر ایک تصویر اندر سے نکالی۔ غور سے اس تصویر کو دیکھا اور پھر اس ادھیڑ عمر شخص کو چند لمحے یونہی موازنہ کرتے ہوئے گزر گئے۔

"آ..... آپ ظفر ایاز ہیں ناں؟" اس نے بے تابی سے ان سے پوچھا۔

"جی ہاں' میں ظفر ایاز ہی ہوں مگر۔" انہوں نے کچھ پوچھنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی وہ چیخ کر ان کی طرف بڑھی۔

"تایا جان۔"

"تایا جان۔" انہوں نے اچانک خاصا گھبرا کر اپنے کندھے سے لگی چھکوں پھکوں روتی اس بھتیجی کو دیکھا اور پھر سوالیہ نظروں سے سامنے کھڑے رافع کو دیکھا۔ وہ تو خود انجان تھا محض کندھے اچکا کر رہ گیا۔

"بیٹی! میں نے تمہیں پہچانا نہیں' تم ہو کون؟" انہوں نے اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے پوچھا۔ اس نے فوراً ان سے علیحدہ ہو کر آنسو پونچھے اور دوبارہ بیگ کھنگالنے لگی اور ایک اور تصویر ان کے سامنے کر دی۔

"یہ دیکھیے یہ تصویر اس میں، میں آپ کی گود میں بیٹھی ہوئی ہوں۔" اس نے تصویر پہ انگلی رکھی۔ انہوں نے تصویر اس کے ہاتھ سے لے کر غور سے دیکھی اور پھر ایک دم ہی ان کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوا تھا۔ اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے انہوں نے نظر غائر اسے دیکھا۔

"تم، تم علیزہ مراد ہو؟" ان کے لہجے میں بے یقینی سی تھی۔

اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا تو انہوں نے بے اختیار اسے سینے سے لگا لیا۔

"علیزہ بیٹی۔" ان کی آواز بھرا سی گئی تھی۔

"آؤ میرے ساتھ۔" وہ بغیر کوئی سوال کیے اسے بازو کے حلقے میں لیے باہر نکل گئے۔ رافع اپنا تجسس دبائے چائے بنانے کے لیے مڑا تھا لیکن دھواں اگلتی دیگچی دیکھ کر وہ صرف صبر کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔

"پیارے بیٹے ظفر۔

تمہیں یاد ہو گا برسوں پہلے ہم دونوں گھرانوں کے بیچ ایک جنگ لڑی گئی تھی۔ ضد اور انا کی جنگ۔ بدقسمتی سے یہ جنگ زرینہ نے جیت لی اور تمہارے بھائی مراد کو دوسری شادی کے بعد اپنی پہلی بیوی زرینہ اور بیٹی علیزہ سے دست بردار ہونا پڑا۔ اس وقت بھی میرا یہی خیال تھا اور اب بھی یہی کہتی ہوں کہ زرینہ کا یہ فیصلہ بہت غلط تھا۔ جو کچھ آج ہو رہا ہے برسوں پہلے اس کا تصور مجھے رات، رات بھر جگائے رکھتا تھا۔ مگر زرینہ کو اپنے تینوں بھائیوں پر مان اور غرور تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے بھائی اپنی بہن اور بھانجی کو ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھیں گے مگر ہمیشہ وہ ہی تو نہیں ہوتا جو ہم سوچتے ہیں۔ رفتہ رفتہ تینوں بھائیوں کے رویے ایسے بدلے کہ زرینہ ٹوٹ کر رہ گئی۔ حالات کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ نہ رہا تو زندگی ہار گئی۔

علیزہ اب جوان ہو گئی ہے' اب سے پہلے وہ تمام رشتے داروں کی بے نیازی کے سائے میں پروان چڑھتی رہی ہے مگر اب یکایک اسی کے منجھلے ماموں کو اس پر پیار آنے لگا ہے۔ وہ اسے اپنی بہو بنانا چاہتا ہے۔ تم نے اس کے بیٹے کو نہیں دیکھا مگر میں جانتی ہوں۔ وہ ذہنی مریض ہے۔ دورہ پڑتا ہے تو ہر چیز تہس نہس کر کے رکھ دیتا ہے۔ علیزہ تو کانچ سے بنی ہے، بہت معصوم اور پیاری ایک ہی ٹھیس میں بکھر کر رہ جائے گی۔

میں جانتی ہوں مراد اس دنیا میں نہیں ہے مگر علیزہ تمہارا خون ہے۔ مجھے امید ہی نہیں یقین بھی ہے کہ تم چاہو بھی تو علیزہ سے منہ نہیں موڑ سکو گے مگر پھر بھی اگر اسے بہتر مستقبل نہ دے سکو تو کسی کنویں میں دھکا دے دینا یا دریا برد کر دینا مگر واپس نہیں بھیجنا۔ یہاں کسی کو خبر نہیں کہ علیزہ تمہارے پاس گئی ہے میں نے سب سے یہ ہی کہا ہے کہ خالہ سے ملنے گئی ہے۔ بہتر ہو گا اگر تم جلد از جلد اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کر لو۔

دعا گو سلطانہ جہاں"

انہوں نے گہری سانس لے کر خط سامنے سے ہٹایا تو نظر سامنے صوفے پر بیٹھی علیزہ پر جا پڑی وہ بند مٹھی پہ ٹھوڑی جمائے سارے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ چہرے پہ بے زاری کا تاثر تھا' نظر یونہی گھومتی ہوئی ان پر جا کر رکی تو انہیں اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ ایک دم سیدھی ہوئی۔

"تایا جان نانی اماں نے خط میں کیا لکھا ہے؟" ان کے چہرے پہ سوچ کی پرچھائیں دیکھ کر وہ پوچھے بنا نہیں رہ سکی تھی۔ اس کی بات پر وہ جیسے کسی گہرے خیال سے چونکے تھے۔ بغیر کوئی جواب دیے انہوں نے عینک اتار کر سائیڈ ٹیبل پہ رکھی اور پھر دونوں آنکھوں کو ملنے لگے۔

"علیزہ بیٹی آپ کی نانی اماں نے آپ سے یہاں آنے کے بارے میں کیا کہا تھا؟" چند لمحوں بعد انہوں نے علیزہ سے پوچھا۔

"میری بات تو لگتا ہے انہوں نے سنی ہی نہیں۔" اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

"کچھ خاص تو نہیں بس کچھ دنوں سے وہ یہ کہہ رہی تھیں کہ تمہارا اب یہاں رہنا ٹھیک نہیں' پھر انہوں نے یہاں کا ایڈریس اچھی طرح سمجھایا اور یہ خط بحفاظت آپ تک پہنچانے کو کہا تھا اور یہ کہ خط پڑھنے کے بعد میں وہی کروں جو آپ مجھے کہیں۔" اس نے سادہ سے انداز میں انہیں بتایا۔

"ہوں انہوں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ وہ آپ کو یہاں کیوں بھجوا رہی ہیں؟" تایا جان اب کمرے میں ٹہلنے لگے تھے۔

"بتایا تھا اسی لیے میں یہاں آنے پر رضامند ہو گئی تھی ورنہ اکیلے اتنی دور کا سفر کرنے کے بارے میں، میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔" وہ سامنے میز پہ نظریں جمائے آہستگی سے بولی تھی۔

"ٹھیک ہے علیزہ! اب آپ یہیں رہیں گی۔ ہمیشہ ہمارے ساتھ۔" انہوں نے بڑے پیار سے اپنے مرحوم بھائی کی آخری نشانی کو دیکھا۔

"اور کسی قسم کی فکر کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہاں آپ کی بہنیں موجود ہیں وہ آپ کو کمپنی دیا کریں گی۔ آج اصل میں ان کی خالہ کے بیٹے کی منگنی کا فنکشن تھا لہٰذا سب لوگ وہاں گئے ہیں' شام تک لوٹ آئیں گے۔ یہ سامنے ارم کا کمرہ ہے اس کے ساتھ فرح کا جو کمرہ پسند آئے فی الحال اس میں آپ آرام و قیام کریں۔ بعد میں ارم آپ کے لیے کوئی کمرہ سیٹ کر دے گی ٹھیک ہے ناں؟"

انہوں نے قدرے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا تو اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اٹھ کر کمرے میں گئی تو انہوں نے فوراً رافع کو آواز دے ڈالی۔

"جی بابا جان؟"

"بیٹا جا کر اپنی امی کو لے آؤ اور وہاں علیزہ کا تذکرہ فی الحال مت کرنا' میں چاہتا ہوں علیزہ کو کسی غیر معمولی صورت حال کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ آج کی شام اس کے لیے اجنبی نہ ہو وہ شام کو کمرے سے باہر آئے تو اسے یہ ہی محسوس ہونا چاہیے جیسے وہ برسہا برس سے یہیں رہتی چلی آ رہی ہے۔"

رافع نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ان کا لہجہ محبت کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ رافع کی حیرت انہیں محسوس

ہوئی تو وہ مسکرا دیے۔

''وہ بہت معصوم اور پیاری بچی ہے۔ ہم سب کو اس کے حصے کی محبت اسے دینی ہوگی۔''

''میرا خیال ہے ایسے بچے کے لیے معصوم کی بجائے بے وقوف کا لفظ زیادہ مناسب رہے گا۔'' انہوں نے اپنی بات دل ہی میں کہی اور گاڑی کی چابی لے کر باہر نکل گئے۔

☆☆☆

کمرے میں اٹیچ باتھ روم نے اسے اچھا خاصا خوش کیا تھا۔ لہٰذا وہ فوراً ہی نہانے کے لیے گھس گئی۔ ٹرین کے ذریعے خاصا لمبا سفر کرنے کا اس کا یہ ابتدائی تجربہ تھا سو تھکن بھی بے حد محسوس ہو رہی تھی۔ نہانے کے بعد تولیے سے گیلے بال رگڑ رگڑ کر خشک کرتے ہوئے اس نے کمرے کا جائزہ لیا اور خوب حیران بھی ہوئی۔

''غالباً تایا جان نے اسے ارم کا کمرہ کہا تھا۔ کمال ہے بھئی اتنے ڈھیر سارے شوق ایک ساتھ ہی پال رکھے ہیں اس نے۔'' اس نے بک ریک میں شاعری اور نثر کی بے شمار کتابیں دیکھ کر سوچا۔

کمرے کے ایک کونے میں کمپیوٹر پڑا تھا جسے وہ ہاتھ لگائے بغیر آگے بڑھ گئی۔ سونی کا ریموٹ کنٹرولڈ اسٹیریو بھی موجود تھا' جس کے ساتھ ایک ریک میں بے حد خوب صورت گانوں اور غزلوں پر مشتمل ——— سی ڈیز پڑی تھیں جنہیں اس نے صرف دیکھنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ چھوٹے سے ڈریسنگ ٹیبل پر تقریباً ہر رنگ کی نیل پالش اور لپ اسٹک موجود تھی۔

''معلوم نہیں وہ خود کیسی ہوں گی؟ کہیں میری یہاں موجودگی پر ناراض ہی نہ ہو جائیں۔''

فطری طور پر یہ سوچ اس کے ذہن میں ——— آئی کیونکہ جہاں سے وہ آئی تھی وہاں کوئی فرد کسی کے کمرے میں یوں آزادانہ گھوم پھر نہیں سکتا تھا۔ ایک تکلف سا گھر کے ہر فرد میں ہر وقت موجود رہتا تھا۔

''چلو جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' اس نے لاپروائی سے سوچا اور جب بال قدرے خشک ہو گئے اور نیند اس پر غالب آنے لگی تب وہ بیڈ پر لیٹی اور چادر کھینچ کر سر تک تان لی۔ چند ہی لمحوں میں وہ پوری طرح غافل ہو چکی تھی۔

☆☆☆

وہ غنودگی میں ہی تھی جب اسے دروازہ کھلنے اور پھر لائٹ آن کرنے کی آواز سنائی دی اور پھر شاید کسی نے بہت آہستگی اور نرمی سے اس کے پاؤں پر گدگدی کی تھی۔ بے اختیار ہی اس نے پاؤں کھینچ لیے اور چادر منہ سے ہٹا کر مندی مندی آنکھوں سے سامنے دیکھا۔ سامنے ایک اجنبی لڑکی اور اجنبی کمرے کو دیکھ کر چند لمحوں کے لیے تو وہ حیران رہ گئی مگر پھر ایک دم اسے یاد آیا کہ وہ نانی اماں کے کمرے میں نہیں بلکہ تایا جان کے گھر میں اور ارم کے کمرے میں ہے۔

''سوری بھئی تم نے تو غالباً لمبی نیند کا پروگرام بنا رکھا ہے مگر وہاں سب کے سب کھانے پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

اس لڑکی نے بڑے پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں تو وہ بھی مسکراتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

''مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے میں ابھی سوئی تھی۔'' اس نے وال کلاک کو دیکھا جس کی سوئیاں نو کے ہندسے پر جگمگا رہی تھیں۔

''ہاں سفر کی وجہ سے تھکن بھی تو بہت ہو جاتی ہے اسی لیے نیند بھی گہری آتی ہے۔'' وہ کہتے ہوئے چادر تہہ کرنے لگی۔

''آپ ارم ہیں ناں؟'' اس نے بیڈ سے اترتے ہوئے اس لڑکی کو دیکھا تو وہ بے اختیار مسکرا دی۔

''ہاں بھئی میں یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ میں ارم ہوں۔ کلینیکل سائیکالوجی کی اسٹوڈنٹ ہوں۔'' ارم نے بڑی نفاست سے چادر تہہ کر کے رکھی اور پھر اسٹڈی ٹیبل سے کتابیں اٹھا کر ترتیب سے بک ریک میں رکھیں۔

چند لمحوں میں ہی علیزہ کو اندازہ ہو گیا کہ ارم اچھی خاصی پھرتیلی لڑکی ہے۔

''اچھا اب تم جلدی سے منہ ہاتھ دھو لو میں کھانا لگا رہی ہوں۔'' وہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی تو دائیں طرف سے خوب باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں' وہ اندازے سے چلتی ہوئی وہاں تک آئی مگر پھر ٹھٹک گئی۔ کھانے کی میز پر اس وقت اچھی رونق تھی۔

''آؤ آؤ علیزہ بیٹی۔'' تایا جان نے اسے دیکھ کر فوراً پکارا تو سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ جھجکتی ہوئی آگے بڑھی۔ سب سے پہلے تائی امی اٹھی تھیں۔

''ماشاء اللہ۔'' انہوں نے گلے سے لگا کر پیار کیا اور پھر کھانے کی میز تک لے گئیں۔

''ہاں بھئی' پھر خوب تھکن اتاری ہماری بیٹی نے؟'' تایا جان اس سے پوچھ رہے تھے۔

''جی تایا جان۔'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔

''علیزہ کیا خیال ہے کھانا شروع کرنے سے پہلے تمہاری نانی امی کو فون نہ کر لیا جائے؟ بعد میں ذرا دیر ہو جائے گی۔'' تایا جان نے گویا اس کے دل کی بات کہہ دی تھی لہٰذا وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اسے لے کر لاؤنج میں آ گئے۔ نانی اماں سے اس کی مختصر سی بات ہوئی پھر تایا جان نے ریسیور اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔

''ٹھیک ہے بیٹی جا کر کھانا کھاؤ میں ابھی آتا ہوں۔'' تایا جان کے کہنے پر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ تنہائی میں بات کرنا چاہتے ہیں اس لیے وہ خاموشی سے اٹھ کر ڈائننگ روم میں آ گئی۔

کھانا خاصے خوش گوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ لگا ہی نہیں کہ وہ پہلی دفعہ ان سے مل رہی ہے۔ باقاعدہ تعارف تو کسی نے نہیں کروایا تھا مگر باتوں ہی باتوں میں اسے معلوم ہو چکا تھا کہ تایا کے سب سے بڑے بیٹے واسع اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ اوپر والے پورشن میں رہتے ہیں اور آج بچوں کو ان کی نانی سے ملوانے اپنے سسرال گئے ہیں۔ اس سے چھوٹے رافع ہیں' اکنامکس میں ماسٹرز کر رہے ہیں۔

اس کے بعد ارم تھی جس سے تعارف ہو چکا تھا۔ سب سے چھوٹی فریح فرسٹ ایئر میں تھی۔ فریح خاصی ہنس مکھ، شرارتی سی تھی۔ بات چیت کے انداز میں ابھی تک بچپن کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ کھانے کے دوران بھی وہ مسلسل بولتی رہی اور باقی سب اس کی باتوں سے محظوظ ہوتے رہے۔

کھانے کے بعد ارم برتن سمیٹنے لگی تو وہ بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ ارم نے اسے منع کرنا چاہا مگر وہ بھی اس کے پیچھے کچن تک چلی آئی۔ کچن دیکھتے ہی اسے یاد آیا کہ وہ کس طرح گھر میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک خیال اس کے ذہن میں آیا تو وہ فوراً اپنا دوپٹا دیکھنے لگی۔

''ارے یہ کیا ہوا ہے؟'' ارم نے حیرت سے دوپٹے کے ایک کونے کو غائب دیکھ کر پوچھا تو اسے بتانا پڑا۔

''اوہ چلو کوئی بات نہیں میری وارڈ روب بھری ہوئی ہے کپڑوں سے' جو دل چاہے نکال کر بدل لو۔'' اس کی پرخلوص آفر پر وہ حیرت سے اسے دیکھے گئی۔

''یہ لوگ تو میرے اندازے سے بھی بڑھ کر اچھے ہیں۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر جب وہ ارم کے ساتھ اس کے کمرے میں گئی تو مزید شرمندہ ہو گئی۔

ارم نے قالین پر فوم ڈال کر اپنے لیے بستر تیار کر رکھا تھا مگر پھر بھی بڑی شرمندگی سے اس سے معذرت کر رہی تھی۔

''اصل میں شام کو واپس آتے ہی ادھر ادھر کے کام نمٹانے لگی تھی۔ تمہارے لیے کمرہ سیٹ کرنے کا وقت ہی نہ مل سکا۔ آج کی رات یہیں گزارلو کل انشاء اللہ یونیورسٹی سے جلدی واپس آؤں گی اور تمہارا کمرہ ٹھیک ٹھاک قسم کا سیٹ کروں گی۔''

"ایسی کوئی بات نہیں ارم آپ اپنے بستر پر آجائیں میں یہاں آجاتی ہوں۔"

"اس او کے یار مجھے ہر قسم کے بستر پہ نیند آجاتی ہے تم سو جاؤ۔" ارم لاپروائی سے کہہ کر اپنے کمپیوٹر کے سامنے جم گئی۔

"اتنی جلدی نیند کہاں آئے گی ابھی تو اٹھی ہوں۔"

"ارے ہاں یہ تو مجھے خیال ہی نہیں رہا چاہو تو ٹی وی دیکھ لو یا کوئی کتاب وغیرہ پڑھ لو۔" ارم نے مشورہ دیا تو وہ اٹھ کر ریک میں سے کتاب پسند کرنے لگی پھر یونہی کتاب پڑھتے اور کبھی صفحے الٹ پلٹ کرتے ہوئے اس نے کافی وقت گزار لیا۔ ارم کمپیوٹر سے اٹھی تو ڈھیر ساری کتابیں سامنے پھیلائے نوٹس تیار کرنے لگی۔ وہاں سے فارغ ہو کر اس نے عشا کی نماز پڑھی۔ پھر بالوں میں تیل کا مساج کیا اور انہیں بینڈ میں سمیٹ کر بستر پہ آئی تو بارہ سے اوپر کا وقت ہو رہا تھا۔ علیزہ کتاب بند کیے بڑی دلچسپی سے اس کی سرگرمیاں دیکھ رہی تھی۔

"کیا خیال ہے اب سو نہ جائیں؟" ارم نے پوری سنجیدگی سے اس سے پوچھا تو وہ کتاب سرہانے رکھ کر لیٹ گئی اور پھر کتنی ہی دیر کروٹیں بدلنے کے بعد بالآخر نیند کی دیوی اس پر مہربان ہو ہی گئی۔

☆☆☆

صبح خاصی ہنگامہ خیز تھی۔ واسع بھائی بیوی بچوں سمیت سسرال سے واپس آگئے تھے کیونکہ بچوں نے اسکول بھی جانا تھا۔ واسع اور ان کی بیگم تو فی الحال اوپر ہی تھے مگر ان کے دونوں بچے صوفیہ اور فرہاد حسب عادت نچلے پورشن میں آگئے تھے۔ علیزہ جب اٹھ کر باہر آئی تو اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ سورج کی کرنیں ہر طرف پھیل چکی تھیں وہ تسبیح پڑھتی تائی امی کے پاس آبیٹھی۔

"پتا نہیں نانی اماں نے اب تک ناشتا کیا ہوگا کہ نہیں۔ بڑی ممانی تو ان کے کمرے میں جھانک کر بھی نہیں دیکھتیں۔ چھوٹی ممانی اپنے بچوں کی مصروفیت کا رونا رو رہی ہوں گی اور منجھلی ممانی کو کالج جانے میں دیر ہو رہی ہو گی ہر روز پہلا پیریڈ ان کے سبجیکٹ کا ہوتا تھا کہیں اب تک بھوکی نہ بیٹھی ہوں۔ رانو ہاں رانو یقیناً انہیں ناشتا کروا دے گی۔" اسے ایک دم ملازمہ کا خیال آیا تو قدرے مطمئن ہو گئی۔

"کیا سوچ رہی ہو بیٹی۔" تائی امی نے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ کر پوچھا تو وہ چونک گئی۔

"کچھ نہیں تائی امی! بس ایسے ہی، تایا ابا اٹھ گئے کیا؟"

"ہاں وہ تو سویرے ہی اٹھ جاتے ہیں' چہل قدمی کے لیے باہر گئے ہیں بس اب آتے ہی ہوں گے۔" اسی دوران ارم نے اسے ناشتے کے لیے پکارا تو وہ کچن میں موجود چھوٹی ٹیبل تک آگئی۔

ہر بندے کے اٹھنے کا ٹائم مختلف تھا لہذا ناشتا فرداً فرداً ہی کیا جاتا۔

ارم نے عجلت میں ناشتا اس کے سامنے میز پر رکھا اور خود باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو براؤن سوٹ پہنے یونیورسٹی جانے کو تیار تھی۔ اس کے ساتھ ہی بیٹھ کر وہ جلدی جلدی ناشتا کرنے لگی۔

"ارم آپ کے پاس جادو کی کوئی چھڑی ہے کیا؟" وہ اس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"کیا مطلب؟" چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے ارم نے حیرت سے پوچھا۔

"بھئی دیکھیں ناں اتنے سے وقت میں آپ نے ناشتا تیار کیا، سب کو کروایا اور پھر برتن بھی سمیٹ لیے اور اب نہ صرف یونیورسٹی جانے کو تیار ہیں بلکہ خود بھی ناشتا کر چکی ہیں۔" اس کی بات پہ ارم کو بے اختیار ہی ہنسی آگئی۔

"بھئی اصل میں، میں وقت ضائع کرنے کے معاملے میں بڑی کنجوس ہوں۔ ایک منٹ بھی فضول نہیں گزار سکتی پھر جب میں ایک کام کر رہی ہوتی ہوں تو صرف وہی کام کرتی ہوں آئی سمجھ میں بات۔" ارم نے چائے کا کپ رکھتے ہوئے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"رافع بھائی کے آج صرف دو پیریڈ ہیں اس میں بھی انہی کے ساتھ ــــ آؤں گی۔" ارم کہتی جلدی سے باہر نکل گئی اور جب وہ ناشتا کر کے نکلی تو تایا جان فرح کو چھوڑنے کالج جا چکے تھے۔ اس کی ملاقات واسع بھائی اور روبینہ بھابھی سے ہوئی۔ واسع بھائی دفتر چلے گئے اور روبینہ بھابھی کچھ دیر اس کے پاس بیٹھنے کے بعد دوبارہ اوپر چلی گئیں کہ انہیں کچھ کام وغیرہ کرنا تھا۔

"زیتون بوا کے جانے سے بہت سارے کام رہ جاتے ہیں۔" تائی امی نے کہا۔

"اچھا وہ ملازمہ ہیں یہاں۔" اس نے اندازہ لگایا۔

"ارے بیٹا ملازمہ کہاں رہی اب وہ گھر کی فرد سمجھو کوئی سترہ، اٹھارہ سال تو ہو گئے اسے یہاں کام کرتے ہوئے اور سچ کہوں تو اس نے مجھے بھی بے کار کر رکھا ہے' کبھی کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی، فرح کو تو بوا نے ہی پالا ہے۔"

تائی امی اسے بتا رہی تھیں۔ وہ بھی پوری توجہ سے ان کی بات سنتی اور کبھی ذہنی رو بھٹک کر کہاں سے کہاں جا پہنچتی۔

تقریباً ساڑھے دس بجے ارم اور رافع کی واپسی ہوئی۔ ارم کتابیں رکھنے کمرے میں چلی گئی اور رافع اخبار اٹھا کر وہیں ان کے پاس آگئے۔

"ہاں بھئی علیزہ' کیا ہو رہا ہے؟" انہوں نے اخبار اپنے سامنے پھیلاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"کیا کرنا ہے اس بے چاری نے' صبح سے بیٹھی ہے میرے پاس۔ میں بولتی رہی یہ چپ چاپ سنتی رہی بہت ہی کم گو بچی ہے۔" اس کے بجائے تائی امی نے جواب دیا تھا۔

"کیا؟" انہوں نے اخبار سے نظریں ہٹا کر حیرت سے اسے دیکھا۔

"آپ کے سامنے نہیں بولی ہوں گی امی ورنہ تو جب بولنے پر آتی ہیں اگلے بندے کی سٹی گم کر دیتی ہیں۔" انہیں اس کے ساتھ ہونے والی پہلی ملاقات اچھی طرح یاد تھی۔

"لو خوامخواہ بھلا" تائی امی ان کی بات کو صرف مذاق سمجھی تھیں وہ مسکراہٹ روکتے ہوئے ارم کے پاس جانے کو اٹھی تو رافع کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے رک گئی وہ اخبار سے سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگے۔

"ویسے رافع بھائی آپ کی سٹی مل گئی کہ نہیں۔" وہ بہت معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔ وہ چند لمحے سنجیدگی سے اسے دیکھتے رہے مگر پھر اپنی مسکراہٹ ضبط نہ کر سکے۔

☆☆☆

ابتدائی چند دن اس نے بہت احتیاط سے گزارے تھے۔ کیونکہ نانی اماں نے اسے خاصا ڈرا دھمکا کر یہاں بھیجا تھا کہ وہاں ایسے رہنا، ویسے رہنا اس کے سوا اب تمہارے پاس کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، جیسا دیں ویسا کھا لینا جیسا پہنائیں ویسا پہن لینا مگر یہاں اسے ایسی کوئی صورت حال نظر نہیں آئی تھی کہ اسے اپنا من مار کر زندہ رہنا پڑتا۔ یہاں تو بے حد اپنائیت تھی، محبت تھی، آزادی تھی۔ ماموں کے گھر کی طرح اسے یہاں تیسرے درجے کا فرد نہیں سمجھا گیا تھا بلکہ اتنی ہی اہمیت دی گئی جتنی کہ اس گھر کے ہر فرد کو حاصل تھی۔ نہ کوئی روک ٹوک تھی نہ نگرانی مگر پھر بھی کبھی تایا جان غور سے اس کی طرف دیکھتے تو وہ ہنستے ہنستے ایک دم چپ ہو جاتی۔

"ہنستی رہا کرو علیزہ۔ تم ہنستی ہوئی بالکل مراد کی طرح لگتی ہو۔" بھائی کو یاد کر کے وہ کھو سے جاتے تو زہرہ بیگم بھی تاسف سے علیزہ کو دیکھتی رہ جاتیں۔

مراد ان کا نٹ کھٹ سا دیور، ان پر جان دیتا تھا مگر افسوس کہ اس کو ازدواجی زندگی راس نہ آئی۔ زرینہ خاصی ضدی اور تنک چڑھی تھی۔ مراد کی اس کے ساتھ کبھی انڈر اسٹینڈنگ نہ ہو سکی۔ نتیجتاً مراد نے فائزہ نامی بے سہارا لڑکی سے دوسری شادی کر لی۔ اس نے شوہر کی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ زرینہ

کے لیے یہ بٹوارہ ناقابل قبول تھا سو اس نے طلاق کا دعوا کر دیا۔ مصالحت کی ہر کوشش ناکام ہو گئی اور بالآخر مراد نے زرینہ کو طلاق دے دی۔ علیزہ اس وقت ماں کا دودھ پیتی تھی' قانونی طور پر بھی وہ بچی کو فی الحال ماں سے جدا نہ کر سکتے تھے۔ سو زرینہ علیزہ کو بھی اپنے ساتھ لے گئی اور اس کے دو سال بعد ہی ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں مراد اور فائزہ اس دنیا سے چل بسے۔ علیزہ کے ننھیال والوں کے سرد رویے کی وجہ سے وہ لوگ علیزہ سے بھی کوئی تعلق نہ رکھ سکے اور رفتہ رفتہ جیسے اسے ہمیشہ کے لیے ہی بھول گئے تھے۔

''زہرہ! تم نے دیکھا علیزہ کی آنکھیں بھی بالکل مراد جیسی ہیں' سیاہ، روشن بالکل ستاروں جیسی۔'' ظفر صاحب کی آواز پر انہوں نے چونک کر دیکھا' وہ علیزہ کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے تک رہے تھے۔

''ہاں واقعی۔'' انہوں نے علیزہ کی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے تائید کی تھی۔

اور اس روز انہوں نے علیزہ کو ارم کے لباس میں دیکھا تو فوراً اسے اپنے پاس بلا لیا جیب میں ہاتھ ڈال کر انہوں نے بغیر دیکھے، بغیر گنے کتنے ہی نوٹ اس کی مٹھی میں دبا دیے۔

''ارم کے ساتھ بازار جاؤ اور جو دل چاہے خرید لاؤ اپنے لیے۔ کپڑے جوتے جیولری اپنے روم کے لیے ڈیکوریشن پیسز، پردے جو بھی تم چاہو۔''

''مگر بابا جان اس کی کیا ضرورت ہے ویسے بھی فی الحال مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔'' اس نے پیسے لوٹانے چاہے تو وہ خفگی سے اسے دیکھنے لگے۔

''بابا جان کہتی ہو سمجھتی نہیں۔''

وہ اپنی جگہ شرمندہ ہو کر رہ گئی۔ سب کی دیکھا دیکھی وہ انہیں بابا جان ہی کہنے لگی تھی۔ پیسے لے کر وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ پہنتی اوڑھتی تو وہ ماموں کے ہاں بھی تھی مگر وہاں ہر بار ایک سوٹ اس کے سامنے صدقہ و خیرات کی طرح پھینک دیا جاتا تھا۔

رات وہ بہت دیر تک دل ہی دل میں ان چیزوں کی لسٹ بناتی رہی جو صبح اسے بازار سے خریدنی تھیں۔

☆☆☆

ارم کی یونیورسٹی سے واپسی پر وہ دونوں بازار چلی آئیں۔ شاپنگ کے لیے وہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ بازار گئی تھی۔ مگر اس وقت اس کے ہاتھ میں صرف چند سو روپے ہوتے تھے۔ اس کی کزنز اور ممانیوں کے پرس لال، ہرے نوٹوں سے بھرے ہوتے۔ ایک کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری چیز خریدتی چلی جاتیں، وہ روپے مٹھی میں تھامے سوچتی رہ جاتی کیا خریدے؟ کیا نہ خریدے۔ جو چیز خریدنے لگتی وہ ہی غیر اہم لگنے لگتی۔

''اس سے اچھا ہے فلاں چیز خرید لوں وہ زیادہ اہم ہے۔'' وہ سوچتی اور آگے بڑھ جاتی اور پھر اکثر یہ ہوتا کہ وہ سارے روپے نانی اماں کی چیزیں خرید کر ختم کر لیتی' کبھی ان کے لیے جرابیں خرید لیتی، کھانے کی کوئی چیز اور کبھی انہیں سنانے کے لیے کوئی اچھی سی کتاب' نانی اماں دیکھتیں تو اسے ڈانٹتیں۔

''اپنے بیٹوں کے گھر میں رہتی ہوں میں جو کہوں گی وہی لا کر دے دیں گے' تمہارا یہاں کون ہے؟ نہ باپ، نہ ماں، نہ بھائی اگر کبھی ماموں ترس کھا کر کچھ روپے ہاتھ پہ رکھ ہی دیں تو اپنے لیے ڈھنگ کی کوئی چیز ہی خرید لیا کرو۔''

نانی اس کو ڈانٹتیں اور وہ شرمندگی سے ہونٹ کاٹتی رہ جاتی' انہیں بتا ہی نہ پاتی کہ جن دکانوں پر اس کی کزنز جاتی ہیں وہاں کم سے کم قیمت سوٹ بھی ہزار بارہ سو سے کم کا نہیں ملتا تھا۔ پھر وہ کہاں سے اپنے لیے ''ڈھنگ کی چیز'' خریدتی۔

''علیزہ کہاں کھوئی ہو بھئی دیکھو ناں یہ پرنٹ کتنا خوب صورت ہے۔ مگر مہنگا بہت ہے۔'' ارم نے اسے ٹہوکا دیا تو وہ اپنے خیال سے بری طرح چونک گئی۔

''لیکن جناب قیمت تو بہت زیادہ ہے۔'' اس نے قیمت سن کر حیرانی کا اظہار کیا۔

''میڈم! آپ نے صرف قیمت سنی ہے کپڑا نہیں دیکھا۔ آپ دیکھیے ذرا کس قدر ملائم اور خوب صورت کپڑا ہے۔'' سیلز مین مخصوص مسکراہٹ چہرے پہ سجائے کپڑا ان کے سامنے پھیلانے لگا۔

''جی کپڑا دیکھ کر ہی تو مناسب قیمت بتا رہی ہوں آپ کو۔'' اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

''چلیں اگر آپ کم قیمت کپڑا ہی چاہتی ہیں تو یہ لے لیں ڈیزائن وہی ہے مگر اس کپڑے کی کوئی گارنٹی نہیں۔'' اس نے ایک اور کپڑا اس کے سامنے پھیلایا۔ جسے اس نے کمال بے نیازی سے بغیر دیکھے سامنے سے ہٹا دیا۔

''دیکھیں صاحب' ہمیں یہ ہی کپڑا چاہیے اور وہ بھی مناسب قیمت پر۔''

''نہیں جی پھر تو بہت مشکل ہے۔ آپ کہیں اور سے دیکھ لیں۔'' سیلز مین نے اس کی ہٹ دھرمی دیکھ کر مایوسی سے کہا۔

''کیا؟ کیوں دیکھ لیں کہیں اور سے میں یہ ہی لے کر جاؤں گی اور اسی قیمت پر لے کر جاؤں گی جو میں آپ کو بتا رہی ہوں۔ غضب خدا کا ابھی پچھلے ہفتے ہی ایک دکان پر یہ کپڑا انتہائی مناسب دام پہ مل رہا تھا ہم تو یہاں کے مستقل خریدار ہیں اس لیے یہاں آ گئے چلو ارم وہیں چلتے ہیں۔'' اس نے پہلے سیلز مین کو آنکھیں دکھائیں اور پھر ارم کی طرف پلٹی۔

''اے بیٹی ذرا مجھے بھی تو بتاؤ کس دکان کی بات کر رہی ہو تم۔'' ساتھ بیٹھی خاتون نے فوراً اس سے دریافت کیا تو سیلز مین کا پچھلے کئی لمحوں سے کھلا منہ ایک دم بند ہو گیا۔

''معلوم نہیں صبح سویرے کس کا منہ دیکھ لیا تھا۔'' سیلز مین جھنجلا کر بڑبڑایا۔

''یقیناً آئینہ دیکھ لیا ہو گا۔'' جواباً علیزہ بھی بڑبڑائی مگر خاصی اونچی آواز میں۔

''نوید ادھر آؤ اور یہ سوٹ انہیں پیک کر دو۔'' سیلز مین نے اپنے ساتھی کو پکارا اور خود فوراً وہاں سے کھسک گیا۔

''مائی گاڈ علیزہ! تم تو اچھی خاصی ایکسپرٹ لگ رہی تھیں اس معاملے میں۔'' ارم نے دکان سے نکلتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا تو وہ مسکرا دی۔

''اصل میں یہ سارے گر میں نے چھوٹی ممانی سے سیکھے ہیں۔ اب دیکھو ناں؟ اگر ہمارے ساتھ دوسری خاتون بھی اٹھ جاتیں تو ان کا نقصان وہ کیسے برداشت کرتے' آخر کو انہیں مستقل گاہکوں کا خیال رکھنا ہی پڑتا ہے۔'' علیزہ نے اسے گویا گر بتایا تھا۔

پھر اسی طرح انہوں نے ڈھیروں چیزیں خرید لی تھیں۔

''سچ بھئی پہلے تو یہ شاپنگ ہمیشہ تھکا دیا کرتی تھی مگر آج میں نے بہت انجوائے کیا ہے' تم تو دکانداروں کو بوکھلا کر رکھ دیتی ہو۔'' ارم چلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''ارے وہ...... وہ رافع بھائی جا رہے ہیں۔''

ٹیکسی کی تلاش میں نظریں دوڑاتے ہوئے ارم ایک دم بول اٹھی اور یہ محض اتفاق ہی تھا کہ رافع نے بھی ان دونوں کو دیکھ لیا۔

''تم لوگ یہاں کیا کر رہی ہو۔'' وہ گاڑی قریب لے آئے۔

''خریداری اور کیا کرنا ہے بازار میں' ویسے اچھا ہی ہوا آپ مل گئے ورنہ اچھا خاصا خوار ہونا پڑتا۔'' ارم نے تو جیسے انہیں دیکھ کر سکون کا سانس لیا تھا۔

''کیا خیال ہے تم لوگوں کو آئس کریم نہ کھلا دی جائے۔'' انہوں نے آئسکریم پارلر کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔

''نیکی اور پوچھ پوچھ۔'' ارم اور علیزہ پوری طرح ان سے متفق تھیں۔

☆☆☆

اتنی دردناک چیخ گھر میں گونجی تھی کہ رافع کے ہاتھ سے کیلکولیٹر اور امی کے ہاتھ سے تسبیح چھوٹ گئی تھی۔ واسع بھائی کے دونوں بچے ڈر کے مارے اپنی ماں کی گود میں پناہ لینے لگے تھے۔

''اوہ میرے خدا! امی مانا کہ چیخنا اس کا پسندیدہ

مشغلہ ہے مگر خدارا اسے کہیں کہ چیخنے سے پہلے ہمیں انفارم کر دیا کرے۔'' رافع نے چڑ کر کیلکولیٹر اٹھایا اور اسے چیک کرنے لگے۔

''ارے خدانا خواستہ کہیں کچھ ہو نہ گیا ہو۔'' امی گھبرا کر علیزہ کے کمرے کی طرف دوڑیں یہاں کا منظر ہی کچھ اور تھا۔ علیزہ اپنا پاؤں پکڑے فرش پر دھرنا مارے بیٹھی تھی۔ آنکھوں سے ٹپ، ٹپ آنسو بڑی بے دردی سے گرائے جا رہے تھے۔ ارم بڑی شد و مد کے ساتھ فرح کو ڈانٹ رہی تھی اور فرح دونوں ہاتھ پشت پہ باندھے، سر جھکائے بڑی شرافت سے ارم کی ڈانٹ سن رہی تھی۔

''ارے بیٹی کیا ہوا؟'' وہ پریشان ہو کر فوراً آگے بڑھیں۔

''سارا قصور اس فرح کی بچی کا ہے۔ یہ دیکھیں ذرا۔'' ارم نے فرح کے ہاتھ سے ربڑ کی بنی ہوئی سیاہ رنگ کی چھپکلی چھین کر امی کے سامنے لہرائی۔ ''علیزہ بے چاری میز پر چڑھ کر پینٹنگ دیوار پہ لگا رہی تھی اس نے اچانک اس پر چھپکلی پھینک دی اور ظاہر ہے وہ ایک دم ڈری تو میز سے نیچے گر گئی۔''

''لاحول ولا قوۃ ہٹاؤ اسے۔'' امی نے جھرجھری لے کر چھپکلی کی طرف سے رخ موڑا اور علیزہ پر جھک گئیں۔

''بیٹی زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔''

اس نے بمشکل نفی میں سر ہلایا مگر پاؤں جوں کا توں تھام رکھا تھا۔

''میرا تو خیال ہے پاؤں میں موچ آ گئی ہے دیکھیں ذرا۔'' ارم نے غور سے اس کے پاؤں کا معائنہ کیا۔

''ارے ہاں پاؤں تو سوج رہا ہے۔ فرح جاؤ ذرا رافع کو بلاؤ۔ بیٹی زیادہ درد ہو رہا ہے؟'' امی بے حد پریشان ہو گئیں تو اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

''رافع بیٹا ادھر آؤ جلدی سے، یہ دیکھو ذرا پاؤں کس قدر سوج گیا ہے اس کا، میرا تو خیال ہے جلدی سے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔'' رافع کو اندر آتے دیکھ کر انہوں نے جلدی سے اسے کہا۔

رافع نے پنجوں کے بل بیٹھ کر اس کے پاؤں کو ہلا جلا کر دیکھا۔ بے اختیار ہی علیزہ کے منہ سے سسکی نکل گئی۔ رافع نے مطمئن ہو کر پاؤں چھوڑ دیا۔

''امی ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں بس آیوڈیکس لگا دیں پاؤں ٹھیک ہو جائے گا۔''

''کیسے ٹھیک ہو جائے گا اور اگر تمہارے ابا جان نے اسے اس حال میں دیکھا تو ہم سب کی جان کو آ جائیں گے۔ وہ تو اس کی ذرا سی تکلیف نہیں برداشت کرتے۔'' امی نے خفگی سے بیٹے کو گھورا۔

''رہنے دیں تائی امی آیوڈیکس سے ٹھیک ہو جائے گا۔'' علیزہ نے اٹھنا چاہا تو ارم نے فوراً اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔

''تم ابھی تک یہاں کھڑے ہو گاڑی نکال کر۔'' امی نے علیزہ کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے رافع سے کہا تو وہ گہری سانس لے کر باہر نکل گئے۔

پاؤں پہ وزن نہیں پڑ رہا تھا مگر وہ ارم کے سہارے بمشکل گاڑی میں جا بیٹھی۔

''رافع بھائی مجھے لائبریری تک جانا تھا جاتے ہوئے مجھے وہاں ڈراپ کر دیجیے گا۔''

ان کا سنجیدہ موڈ دیکھ کر ارم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا اور پھر ان کے اثبات میں سر ہلاتے ہی اس نے گاڑی میں بیٹھنے میں ایک منٹ کی دیر نہیں لگائی تھی۔

ارم کو لائبریری میں ڈراپ کرنے کے بعد پہلا کلینک رافع کو نظر آیا انہوں نے وہیں گاڑی روک دی اور ڈاکٹر نے اس موچ کا وہی علاج کیا تھا جو رافع گھر میں تجویز کر چکے تھے۔ البتہ ایک پین کلر ٹیبلٹ کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ علیزہ انہیں اس طرح تکلیف دینے پر شرمندہ ہو رہی تھی مگر کلینک سے گاڑی تک جانے میں مجبوراً ان کا سہارا لینا پڑا تھا۔

''ایک بات بتاؤ علیزہ۔ تم ان چوہوں، چھپکلیوں سے اتنا ڈرتی کیوں ہو؟'' انہوں نے بڑی سنجیدگی سے سوال کیا تھا مگر اس نے اپنا سر مزید جھکا لیا تھا غالباً شرمندہ ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ان سے ڈر لگتا ہے اس لیے۔'' وہ بمشکل ہی اس کا جواب سن پائے تھے۔

''ویسے بائی داوے تمہیں کن چیزوں سے ڈر نہیں لگتا؟'' سوال خاصا مشکل تھا وہ چند لمحے سوچتی رہی۔

''میرا خیال ہے مجھے بڑے بڑے جانوروں سے ڈر نہیں لگتا۔'' اس نے اپنی بہادری کی داد پانے کے لیے ان کی طرف دیکھا تھا مگر وہ بری طرح تاؤ کھا گئے۔

''یہ تم میری طرف دیکھ کر کیوں کہہ رہی ہو۔'' ان کے گھورنے پر وہ گڑبڑا گئی۔

''نن، نہیں آپ غلط سمجھ رہے ہیں میں تو۔'' اسی دوران انہوں نے گاڑی لائبریری کے سامنے روکی تو ارم تیز تیز قدم اٹھاتی گاڑی میں آ بیٹھی۔ علیزہ نے فوراً ان کی طرف سے رخ موڑ لیا۔

''اسے کہتے ہیں چور کی داڑھی میں تنکا۔'' اس نے بند مٹھی ہونٹوں پر جما کر مسکراہٹ روکی اور گاڑی سے باہر دیکھنے لگی۔

☆☆☆

''علیزہ تم نے ایف اے کے بعد کالج میں ایڈمیشن کیوں نہیں لیا۔'' فرح نے پام کے خشک پتوں کو کترتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''جن دنوں ایڈمیشن ہو رہے تھے ان دنوں نانی امی کی طبیعت سخت خراب تھی۔ پورے گھر میں بے حد ٹینشن تھی۔ اس لیے ایڈمیشن کا خیال ہی نہ آیا اور جب ان کی صحت ٹھیک ہوئی تب وقت گزر چکا تھا۔'' وہ پوری دل جمعی سے گلابوں کی کیاری صاف کر رہی تھی۔

''بہرحال اب تم ایڈمیشن ضرور لے لینا۔'' فرح نے اسے تاکید کی تو اس نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

''السلام علیکم۔'' کی آواز نے اچانک ہی ان کی محویت کو توڑا تھا۔ علیزہ سر اٹھا کر اس اجنبی لڑکی کو دیکھنے لگی جو شولڈر کٹ بالوں کے ساتھ خاصی دل فریب لگ رہی تھی۔

''ارے سبرینہ آپی۔'' فرح فوراً ہی آگے بڑھ کے اس سے ملنے لگی تھی۔ اس کے ہاتھ چونکہ خاصے خراب ہو رہے تھے اس لیے اس نے کھڑے ہو کر صرف سلام کا جواب دینے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

''علیزہ، یہ میری خالہ کی بیٹی سبرینہ ہیں۔'' فرح نے فوراً اس کا تعارف کروایا۔

''اور یہ علیزہ ہے، مراد چچا کی بیٹی۔'' فرح کے کہنے پر سبرینہ نے سر تا پا اس کا جائزہ لیا تھا نجانے کیوں علیزہ کو اس کی نظروں میں ناگواری سی محسوس ہوئی تھی۔

''سبرینہ آپی آپ اندر چلیں ہم لوگ ابھی آتے ہیں۔'' فرح کے کہنے پر سبرینہ نے قدم آگے بڑھا دیے۔

''معلوم ہے یہ صرف ہماری کزن ہی نہیں بلکہ......'' اس کے جانے کے بعد فرح بڑے راز دارانہ انداز میں اسے کچھ بتانے والی تھی کہ اسی وقت روبینہ بھابھی کی آواز نے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالی۔

''صوما اور فرہاد ہوں گے نیچے انہیں بھیجنا ذرا، ابھی تک انہوں نے ہوم ورک ہی نہیں کیا۔'' وہ گرل سے لگی انہیں کہہ رہی تھیں۔

''اچھا بھابھی......ابھی بھجواتی ہوں۔'' فرح اسے لے کر اندر کمرے کی طرف بڑھ گئی اور جو بات وہ کہنے جا رہی تھی وہ نامکمل ہی رہ گئی۔

☆☆☆

زیتون بوا کے آ جانے سے ارم کی گھریلو ذمہ داریوں میں تو کسی حد تک کمی واقع ہو گئی تھی مگر اب وہ ٹریننگ کے لیے نفسیاتی امراض کے ہاسپٹل میں جایا کرتی تھی، اس لیے مصروفیت کا عالم اب بھی وہی تھا بلکہ اس میں کچھ اضافہ ہی ہوا تھا کیونکہ اب وہ اخبار میں ہفتہ وار کالم میں لکھ رہی تھی جس میں نفسیاتی امراض کے ہاسپٹل کے مسائل کو زیر بحث لایا جاتا

تھا۔ ارم کو اس قدر متحرک دیکھ علیزہ کو اس پر رشک آنے لگتا تھا۔

رافع کے فائنل ایئر کے ایگزام ہو رہے تھے سو ان کی شکل بھی کبھار ہی دیکھنے کو ملتی تھی۔ تایا جان گوجرانوالہ میں نئی فیکٹری لگا رہے تھے اس لیے ایک ہفتے بعد ہی گھر واپس آتے تھے' لے دے کر علیزہ اور فرح ہی رہ جاتی تھیں۔ دونوں کی عمروں میں کوئی ڈھائی، تین سال کا ہی فرق تھا اس لیے ایک دوسرے کی کمپنی کو بہت انجوائے کرتیں۔

اس روز بھی وہ دونوں بچوں کی ساتھ لاؤنج میں بیٹھی بھرپور فراغت کا مزا لے رہی تھیں' ایک دوسرے سے مشکل مشکل سوال کیے جا رہے تھے۔ سوال بھی ایسے جن کا جواب ڈھونڈنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

اب وہ کوئی گھنٹے بھر سے اس کم بخت چیونٹی کو کوس رہی تھیں جس کے سامنے چینی پڑی ہے مگر وہ اسے کھا نہیں رہی۔ یہ سوال صوما نے کیا تھا اور اب وہ بڑے مزے سے مسکراتے ہوئے ان کی جھنجھلاہٹوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"بھئی سیدھی سی بات ہے اس — چیونٹی کے دانت نہیں ہوں گے۔" آخر کار یہ ہی وجہ علیزہ کی سمجھ میں آئی تھی سو اس نے وہی بتا دی۔

"جی نہیں۔" صوما نے فوراً اس کا جواب مسترد کر دیا۔

"پھر اس کو بھوک نہیں لگی ہو گی۔"

"غلط۔"

"اچھا پھر تم ہی بتا دو۔ اس کو بھوک بھی لگی ہے، اس کے منہ میں دانت بھی ہیں اس کے باوجود آخر وہ چینی کیوں نہیں کھا رہی۔" فرح نے ہار مان لی تھی۔

"پھپھو سیدھی سی بات ہے اس چیونٹی کو شوگر تھی۔" اس کا جواب سن کر ان دونوں کا دل چاہا کہ اپنا سر دیوار پہ دے ماریں۔

"ٹھیک ہے فرہاد اب تمہاری باری ہے مگر خدا کا واسطہ کوئی آسان سا سوال کرنا۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں پھپھو انتہائی آسان سوال ہے۔" فرہاد نے تسلی دی۔

"ایک آدمی جہاز میں سفر کر رہا ہے۔ جہاز میں ٹی وی چل رہا ہے مگر وہ دیکھنا نہیں چاہتا۔ اب بتائیں کہ وہ کیا کرے؟" اس کے سوال پر ان دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"اب اتنا آسان بھی نہیں کہا تھا۔" علیزہ نے منہ بنایا۔

"اچھا پھر بھی آپ بتائیں تو سہی۔" فرہاد نے اصرار کیا۔

"ظاہری سی بات ہے وہ ٹی وی بند کروا دے گا۔"

"نہیں۔"

"پھر اپنی آنکھیں بند کر لے گا۔" علیزہ نے کشن سر کے نیچے رکھتے ہوئے جواب دیا مگر فرہاد نے فوراً نفی میں سر ہلا دیا۔

"پھر ٹی وی اٹھا کر جہاز سے نیچے دے مارے گا۔" فرح نے تپ کر جواب دیا۔

"بالکل ٹھیک جواب ہے۔"

"اچھا اب ایک اور سوال کا جواب دیں۔"

"نہیں بھئی بس اب۔"

"پھپھو پلیز۔ بہت مزے کا ہے بس آخری سوال۔" فرہاد نے لجاجت سے کہا۔

"او کے پھر جلدی کرو۔"

"تین افراد صحرا میں جا رہے تھے اچانک ایک شخص مر جاتا ہے۔ بتائیں وہ کیسے مرا؟"

"ہارٹ اٹیک۔"

"بالکل نہیں۔" فرہاد نے منہ بنایا۔

"سانپ نے ڈس لیا ہو گا۔"

"جی نہیں۔"

"پیاس سے مر گیا ہو گا۔" فرح کی بے چارگی قابل دید تھی۔

"پھپھو آپ تو بہت ہی کند ذہن ہیں۔" فرہاد نے اس کی ذہانت پر جی بھر کے افسوس کیا۔

"اچھا فرہاد' پلیز تم ہی بتا دو کیسے مر گیا۔" انہیں ہار ماننی پڑی۔

"بھئی سیدھی سی بات ہے، جہاز سے جو ٹی وی پھینکا گیا تھا وہ اس شخص کے سر پہ لگا اور وہ مر گیا۔"

"علیزہ میرا خیال ہے ہمیں ان بچوں کی شاگردی اختیار کر لینی چاہیے۔" فرح بالکل سنجیدہ تھی۔

"پھپھو آپ دونوں ہار گئی ہیں اب لائیے ہمارا انعام۔" صوما نے ان کے سامنے ہاتھ کیا۔

"کون سا انعام؟ کوئی انعام وغیرہ نہیں بھاگو یہاں سے۔" فرح فوراً مکر گئی۔

"پھپھو یہ فاؤل ہے ہمارا انعام دیجیے۔" دونوں بچے ان کی اس بے انصافی پر شور مچانے لگے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" انتہائی گرجدار آواز پر بڑوں کے قہقہے اور بچوں کا احتجاج درمیان میں ہی دم توڑ گیا تھا۔

"کوئی گھنٹے بھر سے میں آپ کو برداشت کر رہا ہوں میری سمجھ میں نہیں آ رہا ان بے تکے سوالوں سے آپ کی نالج میں کیا اضافہ ہو رہا ہے؟ یہ دونوں تو خیر بچے ہیں مگر فرح تم بھی بعض اوقات حد سے زیادہ لاپروا ہو جاتی ہو۔"

علیزہ نے ڈرتے ڈرتے چور نظروں سے رافع کو دیکھا۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ چہرے پہ برہمی کے آثار لیے وہ اپنے کمرے کے دروازے پہ کھڑے انہیں گھور رہے تھے۔

"اب فوراً سے پیشتر یہاں سے کھسکو تم لوگ اور خبردار اگر مجھے دوبارہ کوئی آواز سنائی دی۔" وہ کہہ کر کمرے میں گھس گئے دروازہ زوردار طریقے سے بند کیا گیا تھا۔

"اوہ۔" فرح نے جیسے رکی ہوئی سانس خارج کی تھی۔

"اب بیٹھے منہ کیا دیکھ رہے ہو اٹھو یہاں سے۔" فرح نے سارے کشن اٹھا کر ترتیب سے رکھتے ہوئے تقریباً سرگوشی کی۔ صوما اور فرہاد منہ پہ ہاتھ رکھے کھی کھی کرتے اوپر بھاگ گئے اور وہ دونوں کمرے میں آ گئیں۔

"کمال ہے رافع بھائی تو اچھا خاصا گرجتے ہیں۔" علیزہ نے حیرت کا اظہار کیا۔

"جی اور آپ نے صرف گرجتے دیکھے ہیں۔ چمکتے اور برستے نہیں دیکھا۔" فرح کا منہ بنا ہوا تھا۔

"ویسے ہم لوگوں کو بھی غلطی تھی ہمیں خیال کرنا چاہیے تھا کہ کل ان کا پیپر ہے۔" علیزہ نے اس کا موڈ درست کرنے کی کوشش کی۔

"اچھا خیر چھوڑو آؤ دیکھتے ہیں زیتون بوا کچن میں کیا کر رہی ہیں۔" فرح نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ بھی اس کے پیچھے چل دی۔

☆☆☆

ادھر رافع اپنے پیپرز سے فارغ ہوئے ادھر بابا جان نے انہیں گوجرانوالہ میں فیکٹری سنبھالنے کا حکم دے دیا۔

"بابا جان ابھی کچھ دیر فراغت کا مزا تو لینے دیں۔" انہوں نے جان بچانی چاہی۔

"برخوردار' وہاں آپ کی فراغت پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ منیجر صاحب ہی وہاں کام شروع کروا چکے ہیں۔ تمہیں صرف نگرانی کرنی ہے اور بس۔" بابا جان پہلے ہی سارا پروگرام طے کر چکے تھے اس لیے انہوں نے بھی فرماں بردار بیٹے کی طرح اپنا بوریا بستر سمیٹ لیا۔

"آپ بھی کمال کرتے ہیں بھلا گوجرانوالہ میں فیکٹری لگانے کی کیا ضرورت تھی؟" زہرہ بیٹے کی جدائی پر رنجیدہ ہو رہی تھیں۔

"ارے بھئی وہ کون سا بہت دور جا رہا ہے' ہر دوسرے تیسرے دن با آسانی یہاں کا چکر لگا سکتا ہے۔"

"پھر بھی ہے تو دوسرا شہر ناں؟ یہاں واسع کے ساتھ اسے بھی کام پہ لگا دیتے۔"

"بھئی آپ ان کاروباری باتوں کو نہیں سمجھ

سکتیں۔ وہاں زمین انتہائی سستے داموں مل رہی تھی اور پھر کاروبار کو یونہی وسعت دی جاتی ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ خود اپنی ذمہ داری سنبھالے اور اپنے بل بوتے پر کاروبار کو ترقی دے اگر یہاں رہے گا تو واسع کی موجودگی میں کبھی جم کر کام نہیں کر سکے گا۔ اس لیے کچھ عرصہ اسے وہاں رہنے دو اس کے بعد کچھ اور سوچیں گے اور اس کو یہاں سے بھیجنے کا ایک اور قصہ بھی ہے جو وقت آنے پر آپ خود ہی سمجھ جائیں گی۔''

زہرہ نے چونک کر ظفر صاحب کو دیکھا وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

☆☆☆

وہ شام کو آفس سے گھر آئے تو ملازم فوراً ہی ان کے سر پہ آ کھڑا ہوا۔

''صاحب جی! آپ کے والد صاحب کا فون آیا تھا۔''

''اچھا کیا کہہ رہے تھے؟'' رافع نے گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

''کہہ رہے تھے جب آپ گھر آئیں تو ان سے بات کر لیں۔'' ملازم پیغام دے کر چلا گیا تھا۔ رافع نے فون اپنے طرف کھسکایا اور نمبر ملانے لگے۔ دوسری طرف ارم نے فون ریسیو کیا تھا۔

''آپ تو لگتا ہے ہمیں بھول ہی گئے ہیں۔ کچھ یاد ہے تین ہفتے ہو گئے ہیں آپ کو شکل دکھائے۔''

''بس کیا کروں نئی نئی فیکٹری ہے ذرا زیادہ ہی کام کرنا پڑ رہا ہے۔ تم یہ بتاؤ بابا جان کہاں ہیں آج انہوں نے فون کیا تھا۔''

''وہ تو کچھ دیر پہلے ہی کہیں گئے ہیں۔''

''مجھ سے کوئی خاص کام تھا۔'' رافع نے کہا تو ارم ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئی۔

''ہاں غالباً کوئی خاص کام ہی ہے۔ آپ کو پہلی فرصت میں گھر بلوانا چاہ رہے تھے۔''

''اچھا لیکن ایسا کون سا کام پڑ گیا انہیں مجھ سے۔'' وہ قدرے سوچ میں پڑ گئے۔

''یہ تو آپ کو بابا جان ہی بتائیں گے تو پھر آپ آ رہے ہیں ناں؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں اس خالی گھر میں تنہا رہنا کسی مصیبت سے کم نہیں میں صبح ہی آؤں گا۔'' انہوں نے بشاشت سے جواب دیا۔

''تو ٹھیک ہے آپ پہلی فرصت میں گھر پہنچیں ہم آپ کی اس ''تنہائی'' کا بھی کوئی بندوبست کرتے ہیں۔'' ارم نے شوخی سے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

وہ بھی بے اختیار مسکرا دیے تھے۔ ہنستا مسکراتا چہرہ خود بخود ذہن کے پردے پر ابھر آیا تھا اور پھر وہ کتنی ہی دیر کسی کے خوش گوار تصور میں کھوئے رہے۔

☆☆☆

''کیا؟'' بابا جان نے بات ہی ایسی کہی تھی کہ وہ بے اختیار ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''بابا جان یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' حیرت کی انتہا کو چھوتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

''میں نے وہی کہا ہے رافع جو تم نے سنا۔'' بابا جان کے لہجے میں بلا کا ٹھہراؤ تھا۔

''مگر۔'' انہوں نے گھبرا کر امی کی طرف دیکھا تو وہ بھی آنکھیں چرا گئیں۔ ان کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ یکا یک ان سب لوگوں کو کیا ہو گیا تھا۔ وہ سر تھام کر دوبارہ کرسی پر گر گئے تھے۔ بابا جان نے ایک نظر ان کے حیران پریشان چہرے پہ ڈالی اور دھیرے دھیرے چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔

''امی جان یہ کیا فیصلہ کیا ہے آپ لوگوں نے؟'' کتنی ہی دیر بعد وہ اٹھ کر امی کے سامنے جا بیٹھے۔

''یہ بہت ضروری ہے بیٹا! علیزہ اس گھر کی عزت ہے۔ بہت عرصے تک ہم نے اس کی خیر خبر ہی نہ لی تھی حالانکہ یہ ہمارا فرض اور اس کا حق تھا۔ اب تمہارے بابا جان چاہتے ہیں کہ......''

''جی اب وہ میرے جذبات کا خون کر کے اپنی ساری عمر کی کوتاہیوں کا بدلہ اتارنا چاہتے ہیں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی رافع کے لہجے میں تلخی گھل گئی تھی۔

''انہوں نے تم پر اپنا فیصلہ مسلط نہیں کیا۔ آخری رائے بہرحال تمہاری ہی مانی جائے گی۔''

زہرہ نے بڑے ضبط سے اس کی گستاخی کو نظر انداز کیا تھا۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور ارم کمرے میں داخل ہو گئی۔ رافع نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا مگر وہ نظریں جھکا گئی۔

''تو گویا یہ سب کی ملی بھگت ہے۔'' انہوں نے تلخی سے سوچا اور اٹھ کر باہر آ گئے۔ لان میں ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ فرح اور علیزہ پانی کا پائپ پکڑے ایک دوسرے کو بھگونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بچے تالیاں بجا بجا کر ان کا حوصلہ بلند کر رہے تھے۔

''اف یہ بیوقوف لڑکی۔'' انہیں خواہ مخواہ ہی علیزہ پر غصہ آنے لگا۔

''بابا جان کو خود نہیں معلوم کہ وہ کیا فیصلہ کر رہے تھے۔'' وہ سامنے آتی ہر چیز کو ٹھوکر لگاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

وہ کھڑکی میں کھڑے رات کی سیاہی میں نہ جانے کیا کھوج رہے تھے۔ اچانک ہی اپنے کندھے پر کسی نرم ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا تو وہ بری طرح چونک گئے۔

''کیا سوچ رہے ہیں؟'' ارم کا مطمئن چہرہ ان کے سامنے تھا۔ وہ اسے کوئی جواب نہیں دے سکے تھے۔

''مجھے معلوم ہے۔ آپ مجھ سے بھی خفا ہیں شاید مجھے بھی قصوروار سمجھ رہے ہیں۔'' وہ ان کے برابر آ کھڑی ہوئی تھی اور غور سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''پتا ہے رافع بھائی آپ کی غیر موجودگی میں، میں نے آپ کا مقدمہ لڑنا چاہا تھا میں نے بہت سے دلائل دیے تھے۔ آپ کے اور علیزہ کے مزاج کے فرق کو واضح کیا تھا۔ ہر طرح سے بابا جان کو قائل کرنے کی کوشش کی تھی انہیں یہ بھی بتایا تھا کہ آپ کی اور سبرینہ کی شادی کا خیال صرف بزرگوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ آپ دونوں کی خواہش بھی بن چکا ہے اور معلوم ہے ان سب باتوں کے جواب میں انہوں نے کیا کہا تھا؟'' ارم چند لمحے کے لیے رک گئی تھی۔

''انہوں نے کہا تھا میں نے ہمیشہ ہر معاملے میں تم لوگوں کی خواہش کا احترام کیا ہے۔ جہاں کسی معاملے میں ضرورت محسوس ہوئی، وہاں باپ کی حیثیت سے حکم بھی دیا مگر یہ معاملہ ایسا ہے کہ میں رافع کے سامنے دامن پھیلا کر اس سے بھیک مانگوں گا۔ اب یہ رافع کی مرضی کہ وہ مجھے خالی ہاتھ لوٹاتا ہے یا میری عزت بڑھاتا ہے۔''

ارم خاموش ہو گئی تھی اور رافع کو لگا ان کے سارے لفظ ایک ایک کر کے ان کے اندر دم توڑ گئے ہیں۔

''سبرینہ کا کیا ہو گا۔'' بہت دیر بعد رافع کی آواز کسی کھائی سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

''رافع بھائی آپ سبرینہ سے محبت کرتے ہیں؟'' ارم نے ان کی آنکھوں میں رات کو اترتے دیکھا تو پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''شاید وہ برداشت نہیں کر پائے گی۔'' رافع نے گویا خود کلامی کی تھی۔ پھر نجانے کتنی دیر وہ خود کو کسی فیصلے کے لیے تیار کرتے رہے تھے اور جب شدید ذہنی انتشار کے باعث وہ کھڑکی سے پلٹ کر بیڈ تک آئے تو ارم کب کی جا چکی تھی۔

☆☆☆

''تم نے مجھے مالا مال کر دیا ہے رافع...... یہ پہلا اور آخری موقع تھا آج کے بعد میں تم سے کچھ نہیں مانگوں گا۔'' بابا جان کی آواز خوشی سے کپکپا رہی تھی۔

''اس فیصلے کے بعد میرے پاس بچا ہی کیا ہے جو میں کسی کو دے سکوں۔'' رافع نے دل میں کہا تھا۔ بابا جان بیٹے کے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کرتے رہے کہ علیزہ ان کے لیے بہترین بیوی ثابت ہو گی اور رافع کے ذہن میں صرف ایک ہی بات گونج رہی تھی کہ وہ سبرینہ کا سامنا کس طرح کر سکیں گے۔

☆☆☆

''جی مگر تائی امی۔'' علیزہ حیران پریشان ان کا منہ دیکھتی رہ گئی تھی۔

''بھئی اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے شادی تو سب لڑکیوں کی ہوتی ہے ناں؟'' انہوں نے بالکل نارمل سے انداز میں کہا۔

''مگر تائی امی یہ بہت جلدی ہے میں تو ابھی پڑھنا چاہتی ہوں۔'' اس نے لجاجت سے کہا۔

''ارے چندا تم شادی کے بعد جتنا چاہو پڑھ لینا۔ رافع تمہیں منع تھوڑی کرے گا۔'' تائی امی کے کہنے پر وہ پریشانی سے انگلیاں چٹخانے لگی۔

''اچھا تم ادھر آؤ میرے پاس۔'' وہ اٹھ کر ان کے برابر جا بیٹھی۔

''علیزہ بیٹی۔ ہم نے تم سے ذکر نہیں کیا مگر تمہاری نانی اماں کئی بار تمہارے تایا کو فون کر چکی ہیں۔ وہ جلد از جلد تمہیں محفوظ ہاتھوں میں دیکھنا چاہتی ہیں اور پھر تمہارے ماموں' ان کا خیال ہے ہم نے تمہیں زبردستی یہاں روک رکھا ہے۔ بس یوں سمجھو کہ مزید پیچیدگیوں سے بچنے کے لیے ہی ہم تمہاری شادی کر رہے ہیں۔'' وہ ہولے ہولے اسے سمجھا رہی تھیں۔

علیزہ کا دل نجانے کیوں بھر بھر آ رہا تھا۔ اس نے تو آج تک اس بارے میں سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ جس عمر میں لڑکیاں ایسے سندر خواب دیکھا کرتی ہیں اس عمر کو اس نے بیمار نانی کی دیکھ بھال کرتے ہوئے گزار دیا تھا۔

پھر یہاں آ کر وہ ارم سے اس حد تک متاثر ہوئی تھی کہ بہت کچھ کرنے کا جذبہ دل میں خود بخود ابھر آیا تھا۔ ابھی تو بہت سی خواہشیں تھیں جنہیں وہ ایک ایک کر کے پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتی تھی مگر اب......

اور رافع بھائی۔'' ان کا خیال ذہن میں آتے ہی وہ مزید پریشان ہو گئی تھی۔

☆☆☆

رافع اور علیزہ کی شادی کی خبر پورے خاندان میں آگ کی طرح پھیلی تھی۔ اس روز رافع گاڑی لے کر گوجرانوالہ جانے کے لیے نکلے تھے مگر گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے بے اختیار ہی وہ گاڑی روک کر نیچے اتر آئے تھے۔

سبرینہ اجڑے سے روپ میں ان کے عین سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

''کاش یہ لمحہ میری زندگی میں آئے بغیر گزر جاتا۔''

''رافع کیا یہ سچ ہے کہ تمہاری شادی علیزہ سے ہو رہی ہے۔'' وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

وہ چند لمحے اس کے چہرے پر نظریں جمائے کھڑے رہے۔

''ہاں۔'' بالآخر اپنے ہاتھوں انہوں نے سبرینہ کی طرف خنجر اچھالا تھا۔

سبرینہ کی آنکھوں میں یکلخت ہی بے یقینی سی ابھری تھی۔ بے اختیار کچھ کہنے کے لیے اس نے لب کھولے مگر پھر منہ پہ ہاتھ رکھ کر سسکیاں دباتی ہوئی وہ بجلی کی سی تیزی سے پلٹ کر اپنی گاڑی میں جا بیٹھی تھی۔ آخر لمحے میں کتنے ہی آنسو اس کی آنکھوں سے گالوں تک پھسلتے ہوئے دیکھنے کے بعد بھی رافع نہ اسے پکار سکے تھے نہ اس کے پیچھے قدم بڑھا سکے تھے کہ ایسا کوئی بھی حق اب ان کے پاس نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

''علیزہ جانو' تم تو ہماری سونی زندگی میں بہار بن کر اتری ہو جانے کتنا مزا آئے گا۔ ڈھولک بجے گی گانے گائے جائیں گے' نئے نئے کپڑے بنیں گے اور سب سے مزے کی بات یہ کہ دلہن گھر میں ہی موجود ہے۔ بارات لے جانے کی زحمت نہیں ہو گی ہمیں۔'' فرح کوئی گھنٹے بھر سے اس کے کان کھا رہی تھی۔

''خدا کا واسطہ ہے فرح خاموش بھی ہو جاؤ تمہیں اٹھکیلیاں سوجھ رہی ہیں اور......'' علیزہ نے چڑ کر کہا تو فرح نے اسے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

''اور آپ یقیناً بے زار بیٹھی ہیں۔'' اس نے کشن گھسیٹ کر گود میں رکھا۔

''صرف بے زار ہی نہیں مجھے تو ڈر بھی لگ رہا ہے۔''

''ہائیں کس سے؟ شادی سے یا رافع بھائی سے۔'' فرح نے حیرت سے پوچھا۔

''دونوں سے۔''

''ہوں شادی کی تو خیر ہے' ہاں البتہ رافع بھائی سے تمہیں واقعی ڈرنا چاہیے۔'' فرح کی سنجیدگی دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی تھی۔ مگر فرح نے اپنی بات جاری رکھی۔

''وہ اس لیے بنو کہ اگر کوئی بات ان کے مزاج کے خلاف ہو جائے تو وہ بندے کو الٹا لٹکانے میں ایک منٹ کی بھی دیر نہیں کرتے اور اگر کھانا پسند نہ آئے پھر تو سمجھو خیر نہیں' وہی برتن اٹھا کر آپ کے سر پر دے ماریں گے اور تو اور......'' فرح کی بات سن کر اس کا سانس سینے میں اٹکنے لگا تھا۔ پوری آنکھیں کھولے وہ گویا صدمے کے عالم میں فرح کو دیکھ رہی تھی۔

کمرے میں داخل ہوتی ارم سے مزید برداشت نہ ہو سکا تھا۔

''فرح! کیا فضول بک رہی ہو تم گھنٹے بھر سے۔''

''فضول کیوں بھلا اسے رافع بھائی کے مزاج سے آگاہ کر رہی ہوں آخر ان کے ساتھ پوری زندگی گزارنی ہے علیزہ نے۔'' فرح نے ارم کو آنکھ مارتے ہوئے شرارت سے کہا۔

''مگر اتنے دنوں سے میں نے تو ان کی کوئی ایسی عادت نہیں دیکھی۔'' علیزہ نے بڑی امید سے ارم کو دیکھا مگر جواب فرح کی جانب سے آیا تھا۔

''ابھی تمہیں یہاں آئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں پھر تم تو مہمان تھیں۔ تمہارا انہوں نے کچھ تو لحاظ کرنا تھا ناں؟''

''بس بہت ہو گئی ہے فرح۔ اب مزید کچھ کہو گی تو بہت ماروں گی تمہیں۔'' ارم نے بالکل سنجیدگی سے اسے ڈانٹا تھا۔

''اب جلدی سے اٹھو تم اور اچھی سی چائے بنا کر لاؤ میرے اور علیزہ کے لیے' آج میں بہت تھک گئی ہوں۔'' ارم نے بیڈ پہ دراز ہوتے ہوئے فرح سے کہا تو اس کا منہ بن گیا۔

''سچ ارم' آج کل آپ جس حساب سے مجھ سے کام کروا رہی ہیں ناں میں تو بس ایک ہی دعا مانگتی ہوں کہ اللہ میاں یا تو مجھے اٹھا لے یا...... یا مجھے ہی اٹھا لے۔'' ارم کو گھورتے دیکھ کر اس نے آخری فقرہ بدلا اور جلدی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

ارم نے طویل سانس لے کر سر جھٹکا اور خاموش بیٹھی علیزہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

''تم اس کی باتوں پر پریشان مت ہونا' اس کو فضول بولنے کی عادت ہے۔ رافع بھائی بہت اچھے ہیں اور تم تو ہو ہی اتنی پیاری خود بخود ان کے دل میں اتر جاؤ گی۔''

ارم نے آخری جملہ مسکراتے ہوئے شرارت سے کہا تو وہ بھی جھینپ کر رہ گئی۔

☆☆☆

گھر میں ڈھولک رکھی جا چکی تھی۔ فرح کی زیتون بوا کے ساتھ گاڑھی چھن رہی تھی۔ وہ اپنے زمانے کی رسمیں اسے بتاتیں اور وہ بضد ہو جاتی کہ ہم بھی ایسے ہی کریں گے۔

رافع نے گوجرانوالہ سے فون کر دیا تھا کہ وہ شادی سے دو روز قبل پہنچ جائیں گے۔ علیزہ نے سکون کا سانس لیا تھا ورنہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے کافی مشکل ہو جاتی۔

''بھئی ہم تو علیزہ کو اپنے پورشن میں لے جائیں گے' بارات وہیں لے کر آ جائیے گا۔'' بھابھی آتے جاتے کہنے لگتیں۔

''جی نہیں ہم اپنی بہن کو یہیں سے رخصت کریں گے' آپ اپنے دیور کی بارات یہیں لے آئیے گا۔'' فرح فوراً علیزہ کے ساتھ لپٹ جاتی۔

''میرا خیال ہے ہم لوگ آپس میں جھگڑتے رہ جائیں گے اور دولہا میاں گوجرانوالہ سے بینڈ باجے

بجاتے ہوئے آئیں گے اور دلہن لے کر وہیں لوٹ جائیں گے۔'' ارم ہمیشہ تیسرا نکتہ نکال لاتی۔ علیزہ بظاہر ان کی باتیں سن کر مسکراتی رہتی مگر اندر ہی اندر اس کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ عام لڑکیوں کی طرح خوش گوار جذبات دل میں جاگزیں نہیں ہوئے تھے۔ ماضی میں اس نے بہت سادہ اور محدود زندگی بسر کی تھی' نہ دوستی کے جھنجٹ میں پڑی' نہ گھر میں ٹی وی ڈش جیسی سہولیات سے دل لگایا۔ بس زیادہ ہی ہوا تو نانی اماں کی کوئی کتاب نکال کر پڑھ لیتی اور بس...... اس پر شادی شدہ زندگی کی جو مثالیں اس کے سامنے تھیں وہ بھی کچھ ایسی متاثر کن نہیں تھیں۔ ماں کی وفات کے بعد سب کو یہ ہی کہتے سنا کہ۔

''بے چاری کی شادی کیا ہوئی سمجھو بد نصیبی کا آغاز ہو گیا۔'' یہاں آئی تو تائی امی اور زیتون بوا کو ہمیشہ یہ ہی کہتے پایا کہ۔

''مراد میاں کو شادی راس نہیں آئی۔'' اور پھر یہ سب اتنی جلدی ہو رہا تھا کہ وہ خود کو ذہنی طور پر تیار ہی نہ کر پائی تھی۔

ایسے موقعوں پر ہر لڑکی کو کسی راز داری کسی اپنائیت بھرے رشتے کی ضرورت ہوتی ہے' جس سے وہ اپنے دل کی بات کہہ سکے اور تو اور نانی اماں کا ساتھ بھی میسر نہ تھا جن کے سامنے وہ اپنا دل کھول کر رکھ دیتی۔ ارم آج کل بے حد مصروف تھی۔ تائی امی اسے اپنے پاس بٹھا کر پیار کرتیں سمجھاتی رہتیں۔ وہ چپ چاپ سنتی رہتی کچھ کہنے کا حوصلہ نہ پڑتا۔

اس روز بے کلی زیادہ ہی بڑھی تو وہ زیتون بوا سے چابی لے کر اس کمرے میں چلی آئی جو کبھی اس کے ماں باپ کا ہوا کرتا تھا۔ یہ کمرہ اب اسٹور روم کی شکل اختیار کر چکا تھا ہر چیز دھول مٹی سے اٹی ہوئی تھی۔ ضروری سامان نکال کر استعمال میں لایا جا چکا تھا اور گھر بھر کا کاٹھ کباڑ یہاں جمع کر دیا گیا۔ وہ کتنی ہی دیر کمرے کے عین وسط میں کھڑی رہی۔

''کبھی یہ کمرہ آباد ہوتا ہوگا' یہاں ماما کے پرفیوم کی خوشبو اور چوڑیوں کی کھنک گونجتی ہوگی' بابا کے سگار کی خوشبو آنے والوں کا استقبال کرتی ہوگی مگر اب......'' وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی بوسیدہ سے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا رکی' اس کا آئینہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اس نے یونہی ایک دراز کھولنے کی کوشش جو لاک نہ ہونے کے باعث فوراً کھل گئی۔ اس میں ایک ٹوٹا ہوا بریسلٹ تھا اس نے بریسلٹ اٹھا کر دیکھا شاید یہ کسی زمانے میں گولڈن ہوگا مگر اب سیاہ پڑ چکا تھا۔ اس نے بریسلٹ وہیں رکھا اور دوسری دراز کھولی اس میں ایک تصویر کا فریم پڑا تھا۔ غالباً اس میں تصویر بھی موجود تھی جو بے تحاشا گرد کے باعث نظر نہیں آ رہی تھی۔

دل کی بے چینی کچھ مزید بڑھ گئی تھی اس نے فوراً اٹھا کر پہلے ہاتھوں سے گرد جھاڑی اور پھر دوپٹے کے پلو سے اچھی طرح صاف کی۔ بلاشبہ وہ تصویر اس کے ماما پاپا کی ہی تھی۔ اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔ اس کے لیے کتنی قیمتی تصویر تھی یہ مگر یہاں کسی فالتو چیز کی طرح پڑی تھی۔

''اگر انسان ہی باقی نہ رہیں تو ان چیزوں کی پروا کون کرتا ہے۔'' اس نے تصویر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے غور سے دیکھا۔ یہ شادی کی تصویر تھی اور دونوں کے چہروں پہ جاندار مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''ساتھ ساتھ کھڑے کتنے پیارے لگ رہے ہیں لگ ہی نہیں رہا کہ اب یہ دونوں ہستیاں منوں مٹی تلے جا سوئی ہیں۔'' اسے پتا ہی نہیں چلا کب اس کے آنسو پلکوں کی باڑھ توڑ کر اس کا چہرہ بھگونے لگے تھے چونکی تو اس وقت جب کوئی بھاری ہاتھ اس کے سر پر آ کر ٹھہر گیا تھا۔

''تایا ابو۔'' وہ بے اختیار ہی ان کے سینے سے لگی روئے چلی گئی۔

تایا جان نے بمشکل خود پہ ضبط کیا تھا ورنہ جب سے وہ یہاں آئی تھی وہ اپنے بھائی کو یاد کر کے راتوں کو اٹھ کر کتنے ہی آنسو بہا چکے تھے۔ وہ چپ چاپ اس کو تھپکتے رہے اور آنسوؤں کو کھل کر بہنے کا موقع دیا یہاں تک کہ وہ خود ہی پر سکون ہو گئی۔

☆☆☆

''مولوی صاحب آ رہے ہیں۔'' ارم نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اطلاع دی۔

''کیا کرنے؟''

''ختم پڑھانے۔'' علیزہ کے بے تکے سوال پر بے تکا جواب ہی دیا گیا تھا۔

''بھئی ظاہر ہے نکاح پڑھانے آ رہے ہیں۔''

''اچھا کیسے پڑھائیں گے؟'' علیزہ کی حالت دیدنی تھی۔

''سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کر کے۔'' ارم نے اطمینان سے جواب دیا۔

''کمال کرتی ہو علیزہ۔ کیا کبھی نکاح ہوتے نہیں دیکھا۔'' روبینہ بھابھی نے اسے چادر اوڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھا ہے بھابھی مگر وہ میرا تھوڑی تھا۔'' اس نے بے چارگی سے جواب دیا تو وہ مسکرا دیں۔

ذرا دیر میں مولوی صاحب دوسرے لوگوں کے ساتھ کمرے میں آ گئے۔ علیزہ نے پوری قوت سے بھابھی کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ رکھا تھا۔

''تم تو یوں گھبرا رہی ہو جیسے وہ نکاح نہیں قربانی کرنے آ رہے ہیں۔'' بھابھی نے سرگوشی کی مولوی صاحب آ کر بیٹھے، کھنکارے اور بولے۔

''بیٹا جیسے میں پڑھوں ویسے ہی آپ بھی پڑھیں۔'' یہ کہتے ہی انہوں نے پہلا کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔

''بھابھی مجھے تو چھ کے چھ کلمے آتے ہیں پھر یہ۔'' بھابھی کی چٹکی پر اس کی سرگوشی درمیان میں دم توڑ گئی اور پھر وہ ہدایت کے مطابق چپ چاپ عمل کرتی رہی' یہاں تک کہ نکاح نامے پر سائن بھی کروا لیے اور ان کے جانے کے بعد بیوٹیشن کے ماہر ہاتھ اس کا روپ سنوارنے لگے اور جب تمام زیور پہنا کر، زعفرانی بھاری کام والا دوپٹا اس کے اوپر ڈال کر اسے آئینے کے سامنے کھڑا کیا گیا تو وہ پلکیں جھپک جھپک کر خود کو دیکھے گئی۔

''ارم کیا یہ واقعی میں ہوں؟''

''ہاں بالکل تم ہو' کبھی میک اپ کو چھوا بھی نہیں تھا اسی لیے آج اتنا روپ آیا ہے۔'' کھانے کے بعد اسے کمرے سے باہر لے جانے لگے تو وہ دروازے کے درمیان ہی میں رک گئی۔

''ہائے بھابھی مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔''

''خدا کا واسطہ لڑکی اب یہاں بے ہوش نہ ہو جانا۔'' انہوں نے اسے پیچھے سے دھکیلا اور جب اسے رافع کے برابر بٹھایا گیا تو اس کا دل چاہ رہا تھا اپنے بے تحاشا دھڑکتے دل کو سینے سے نکال کر اپنے گولڈن پرس میں رکھے اور خود سکون سے بیٹھ جائے۔ رات گئے مہمان رخصت ہونے سے پہلے اسے اس کے کمرے سے نکال کر رافع کے کمرے میں پہنچا کر رخصتی عمل میں لائی گئی تھی۔

☆☆☆

''میرے ساتھ تو تم کبھی کافی پینے بھی نہیں گئے۔'' شکایت سبرینہ کے لہجے سے ہی نہیں آنکھوں سے بھی چھلک رہی تھی۔

''بھئی بتایا تو ہے میں اس کے ساتھ تفریح پر نہیں گیا تھا۔ اس کے پاؤں میں موچ آ گئی تھی امی کے اصرار پر ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تھا۔'' رافع نے کتاب بند کرتے ہوئے اس پر واضح کیا۔

''او جبھی اسے بازو سے تھام کر گاڑی تک لے جا رہے تھے۔'' وہ جو کہنا چاہ رہی تھی رافع نے خوب سمجھ لیا تھا مگر دانستہ کچھ بولے نہیں۔

''کب تک رہے گی وہ یہاں؟''

''معلوم نہیں مگر تم اس قدر فکر مند کیوں ہو رہی ہو؟ تمہیں اس بے ضرر سی لڑکی سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے۔ وہ بیوقوف سی لڑکی ہے۔ بھلا میرا اور اس کا کیا جوڑ؟'' رافع نے قدرے جھنجلا کر کہا۔ سبرینہ چند لمحے کے لیے خاموش ہو گئی تھی اور تھوڑی دیر بعد جب اس نے پلکیں اٹھائیں تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

"سنو رافع تم اگر کسی لڑکی کو آنکھ بھر کر بھی دیکھ لو تو میرے دل کو کچھ ہونے لگتا ہے اور اگر تم نے میرے علاوہ کسی لڑکی کے بارے میں سوچنے کی زحمت بھی کی تو یاد رکھنا میں خودکشی کرلوں گی۔" اس کی بات پر رافع نے اپنا سر تھام لیا تھا۔

"لڑکی اگرچہ میں تم سے محبت نہیں کرتا مگر تمہاری یہ زورآور محبت مجھے کہیں اور دیکھنے بھی نہیں دیتی۔" انہوں نے بےچارگی سے کہا۔

"کیا؟ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے؟" سبرینہ ایک دم چیخ اٹھی تھی اور انہوں نے ہنستے ہوئے کتاب اٹھالی تھی۔

رافع نے طویل سانس لے کر ماضی سے حال تک کا سفر طے کیا تھا۔

"اور اب اس نے یہ سب کیسے برداشت کیا ہوگا۔ محض ایک دفعہ علیزہ کو میرے ساتھ دیکھ کر سبرینہ نے کس قدر جھگڑا کیا تھا مجھ سے اور اب جب یہ ساری زندگی کے لیے مجھ پر مسلط کردی گئی ہے تو اب سبرینہ کا کیا حال ہوگا؟ اور اگر جو اس نے کوئی غلط قدم اٹھالیا تو کیا میں خود کو معاف کرسکوں گا؟" تھک کر انہوں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں پہ گرا لیا۔

رات کے تیسرے پہر وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ علیزہ ان کا انتظار کرتے کرتے یونہی تکیے سے ٹیک لگائے سو گئی تھی۔ حتیٰ کہ ابھی تک لباس بھی وہی تھا۔ رافع کتنی ہی دیر تک ان تکلیف دہ سوچوں میں الجھے رہے تھے اور جب کنپٹیاں بے تحاشا دکھنے لگیں تو انہوں نے دراز کھول کر سردرد کی گولیاں نکالیں اور کھا کر لیٹ گئے تھے۔

"کیا ہی اچھا ہوتا سبرینہ اگر تم یہاں ہوتیں میرے پاس۔" انہوں نے ایک نظر بےخبر سوئی علیزہ پر ڈالی۔

"مجھے افسوس ہے سبرینہ' میں بھی ایک بہت عام، بہت روایتی سا مرد نکلا۔ اسی روایتی ایموشنل بلیک میلنگ کا شکار مرد جو ہمارے مشرقی والدین کا خاصہ ہے۔ کاش میں اتنا بےحس ہوتا کہ بابا جان کا جھکا ہوا سر دیکھ سکتا یا پھر ماں کی آنکھوں سے ساری امیدیں نوچ کر پھینک دیتا مگر میں ایسا نہیں کرسکا سبرینہ' شاید اس لیے کہ مجھے تم سے ویسی محبت نہ تھی جیسے تمہیں مجھ سے تھی اور یہ تمہاری محبت ہی تو ہے سبرینہ جو مجھے کسی اور طرف دیکھنے بھی نہیں دیتی۔"

وہ حسن و نزاکت کے مجسم سے رخ موڑے دل ہی دل سبرینہ سے مخاطب تھے اور اسی کیفیت میں نجانے کب ان کی آنکھ لگ گئی تھی۔

☆☆☆

ایک ہفتے بعد وہ گوجرانوالہ جانے کے لیے تیار ہوئی تو زہرہ نے جھٹ علیزہ کا ضروری سامان پیک کروا کر گاڑی میں رکھوا دیا۔ اس کی سہولت کے پیش نظر زیتون بوا کو ساتھ کردیا گیا تھا۔ اور جب وہ دونوں گاڑی میں آکر بیٹھیں تو رافع کا پارہ آسمان تک پہنچ چکا تھا۔ اسی سے بچ کر وہ بھاگ رہے تھے جو بڑے مزے سے پچھلی سیٹ پر بیٹھی ان کے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔ گاڑی میں بیٹھ کر پوری قوت سے دروازہ بند کیا تھا اور اتنی ہی تیز رفتاری سے گاڑی گیٹ سے باہر نکالی تھی اور جب ایک موڑ مڑتے ہوئے گاڑی کے پہیے چرچرائے تو زیتون بوا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

"ارے رافع بیٹا! ہمیں ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تو گاڑی سے اتار کر سامنے کھڑا کرو اور چڑھا دو ہم پر گاڑی' یوں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے تو ہم مرنے والوں میں سے نہیں۔" ان کی بات پر علیزہ کو ہنسی تو بہت آئی مگر کنٹرول کرگئی۔

"ان کا کیا پتا؟ ہنستے دیکھ کر سچ مچ ہی بوا کی بات پر عمل کر دیں۔" وہ سڑک کے کنارے بھاگتے دوڑتے درختوں کو دیکھنے لگی۔ کبھی کبھار نظر اٹھا کر انہیں دیکھ لیتی۔ کھڑکی سے آتی ہوا نے کچھ بال ماتھے پہ بکھیر دیے تھے۔ ایک ہاتھ اسٹیرنگ پہ جمائے وہ بڑے انہماک سے ڈرائیونگ کر رہے تھے۔ آنکھوں پر سیاہ گلاسز لگا رکھے تھے مگر وہ اپنی جانب سے ان کی آنکھوں کو بخوبی دیکھ رہی تھی جو اس وقت بھی برہمی کا تاثر لیے ہوئے تھیں۔

"ارم یونہی فرح کو جھٹلا رہی تھی۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی وہ پہلے مہمان سمجھ کر لحاظ کر رہے تھے اب تو ہفتے بھر سے ڈھنگ سے بات بھی نہیں کی۔" اس نے گہری سانس لے کر ان پر سے نظریں ہٹائیں۔

ابتدائی چند دنوں میں وہ ان کے رویے کو محسوس ہی نہ کرسکی تھی۔ ان کے گریز۔ اور لیے دیے رہنے والے انداز پر بجائے پریشان ہونے کے مطمئن ہوگئی تھی۔

"میں خوامخواہ گھبرا رہی تھی۔ شادی سے پہلے اور بعد کی زندگی میں کوئی خاص فرق تو نہیں ہوتا۔" وہ پوری طرح مطمئن تھی اگر اسے کسی غیر معمولی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا تو یقیناً اس کا خیال کچھ اور ہوتا۔ لیکن پھر ان چند دنوں میں ہی روبینہ بھابھی کے معنی خیز جملوں اور نگاہوں نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ فرح اس کے لیے بہترین سے بہترین سوٹ کا انتخاب کرتی اور وہ پہن کر گھر بھر کی داد سمیٹتی اور ایسے میں اگر روبینہ بھابھی مسکراتے ہوئے اس سے کہتیں۔

"رافع تو مرمٹا ہوگا تم پر، کیا کیا تعریفیں ہوئیں؟" تو وہ گھبرا جاتی۔

"انہوں نے تو شاید اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا بھی نہیں ہوگا۔" وہ دل میں سوچتی اور مسکرا کر اٹھ جاتی۔ بھابھی اسے شرم و حیا پر محمول کرتیں اور وہ بجھ کر رہ جاتی۔

"اب بندے کو اتنا بھی سنجیدہ نہیں ہونا چاہیے۔" گاڑی ایک دم رکی تو وہ چونک گئی۔ رافع کو اترتے دیکھ کر اس نے اونگھتی ہوئی زیتون بوا کو جھنجوڑا اور خود بھی دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

☆☆☆

"تم بھی؟" بےبسی کے احساس سے اس کی آنکھیں بھر آئیں اور اب وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اس تیسری روٹی کو بڑی حسرت سے دیکھ رہی تھی جو پہلی دو روٹیوں کی طرح توے پر منتقل کرتے ہوئے کچھ ایسی ہیئت اختیار کرگئی تھی جسے سب کچھ کہا جاسکتا تھا سوائے روٹی کے۔

"اب کیا ہوگا؟ وہ تو آنے والے ہوں گے۔" اس نے فکرمندی سے سوچا۔ اسی وقت برآمدے سے چپل گھسیٹتے ہوئے زیتون بوا کچن میں داخل ہوئیں تو وہ خوشی سے چلا اٹھی۔

"تھینک گاڈ زیتون بوا آپ آگئیں۔" اس نے جھٹ ان کے ہاتھ سے سارے شاپرز لے کر میز پر رکھے اور انہیں چولہے کی طرف دھکیل دیا۔

"ارے بٹی! کچھ دم تو لینے دو۔" وہ ابھی ابھی بازار سے خریداری کرکے آئی تھیں۔

"کیسے دم لینے دوں بوا کوئی ایک روٹی بھی تو ڈھنگ کی نہیں بنی اور اگر جو "وہ" آجاتے آپ سے پہلے تو ایسی روٹی دیکھ کر الٹا لٹکا دیتے مجھے۔" اسے ایک دم فرح کی بات یاد آگئی تھی۔

"لو خوامخواہ اب ایسا غصے والا بھی نہیں رافع۔" بوا نے برا سا منہ بنایا۔

"آپ کو نہیں پتا بوا' وہ ایسے ہی ہیں۔ ان کے آنے سے پہلے کھانا تیار نہیں ہوا تو ہم دونوں کو ہی کچا چبا جائیں گے۔" اس نے سلاد کے لیے سبزیاں فریج سے نکالتے ہوئے کہا۔

"لیجیے آگئے وہ۔" پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز سن کر اس نے بوا کو خبردار کیا۔

"کھانا میں لگاتی ہوں تم جاکر دیکھو' اسے کسی چیز کی ضرورت نہ ہو۔" بوا نے روٹیاں ہاٹ پاٹ میں رکھتے ہوئے کہا تو وہ اس کے کمرے میں چلی آئی۔ کل رافع کے کپڑے نکال کر نہیں رکھے تھے تو ان کا موڈ خوب خراب ہوا تھا۔ زیتون بوا اور وہ چپ چاپ ان کی بڑبڑاہٹیں سنتی رہیں۔ جب ذرا سکون ہوا بوا نے فوراً اس سے کہہ دیا۔

"شوہر کی ضرورتوں کا خیال رکھنا تمہارا کام ہے بٹی، مجھ سے توقع مت رکھنا۔" ان کے صاف صاف کہہ دینے پر علیزہ نے آج پہلے سے رافع کا سوٹ پریس کردیا تھا۔ لہٰذا جاتے ہی انہیں اپنے کارنامے کی اطلاع دے کر داد سمیٹنی چاہی مگر انہوں نے بغیر

کوئی جواب دیے جرابیں اتار کر بوٹوں میں گھسائیں اور باتھ روم میں چلے گئے۔

"ہونہہ۔" اس نے پاؤں پٹخے بیڈ پر پڑا کوٹ اٹھا کر ہینگر میں لٹکایا اور وارڈ روب میں رکھ کر واپس کچن میں چلی آئی۔

"ارے علیزہ بیٹی! تم ابھی تک اسی طرح گندے حلیے میں گھوم رہی ہو۔" بوا نے سرتاپا اس کا جائزہ لے کر حیرت سے کہا تو وہ چڑ گئی۔

"تو کیا سولہ سنگھار کر کے پھروں؟"

"ہاں تو بے شک سولہ سنگھار ہی کرلو اس میں حرج ہی کیا ہے آخر دن ہی کتنے ہوئے ہیں تمہاری شادی کو، جاؤ جا کر کوئی اچھا سا جوڑا پہن لو۔" انہوں نے پانی کا جگ اس کے ہاتھ سے لے کر اسے دھکیلا تو وہ ڈریسنگ روم میں چلی آئی۔

☆☆☆

زیتون بوا نے بتایا تھا کہ رافع اچھے کھانوں کے بڑے شوقین ہیں۔ آج اس نے ڈنر کے لیے اچھا خاصا اہتمام کرلیا تھا۔ بوا سے پوچھ پوچھ کر اس نے رافع کی پسند کی کئی ڈشز تیار کرلی تھیں۔

"علیزہ بیٹی۔ سچ کہوں پہلے تو میرا خیال یہ ہی تھا کہ تم شادی کے بعد بھی یونہی کدکڑے لگاتی پھرو گی۔ گھر بار کی تمہیں کوئی پروا نہیں ہوگی' بچوں کے ساتھ بچی بنی رہو گی پر اب دیکھتی ہوں چندا! ہر کام بڑے شوق سے کرتی ہو۔"

بوا نے اسے بلا تکان کام کرتے دیکھا تو بے اختیار دل کی بات اس سے کہہ دی تو وہ مسکرادی۔

"آپ نے بالکل ٹھیک سوچا تھا بوا۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا گھر کسے کہتے ہیں اور گرہستی کیا چیز ہے یہ تو بعد میں پتا چلا کہ اپنے گھر کا مان ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ ساری عمر یہ ہی احساس دلایا جاتا رہا کہ میں اپنے مقام پر نہیں ہوں، اپنے ماموؤں پر بوجھ ہوں اور معلوم ہے بوا یہ گھر مجھے ملا ہے تو لگتا ہے ساری کائنات میرے قدموں تلے سمٹ آئی ہے۔ اب تو خود بخود دل چاہنے لگتا ہے اسے سنوارنے کو چھوٹے چھوٹے کام کرنے کو۔" زیتون بوا نے اس مگن سی لڑکی کو حیرت سے دیکھا۔

"بٹیا تم تو واقعی بہت سیانی ہو۔"

"تھینک یو آپ کو اب پتا چلا؟" اس نے دیگچی پر ڈھکن رکھتے ہوئے شرارت سے انہیں دیکھا اور پھر رات کو رافع کے آنے سے پہلے اس نے میرون اور آف وہائٹ خوب صورت سا سوٹ پہنا اور بے چینی سے رافع کی آمد کا انتظار کرنے لگی۔ زیتون بوا نے رافع کے آتے ہی میز پہ کھانا لگا دیا تھا اور اب وہ رافع کے عین سامنے والی کرسی پر براجمان کھانے کے بارے میں اس کے تاثرات جاننے کی کوشش کررہی تھی۔ ہر لقمے پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے ابھی کوئی تعریف کریں گے۔

پھر وہ کن انکھیوں سے ان کے چہرے کو کھوجتی۔ پسندیدگی کی کوئی جھلک ہی نظر آجائے۔ مگر وہاں ایسی کوئی صورت حال نہیں تھی۔ ادھر ادھر دیکھے بغیر انہوں نے جیسے ضرورتاً کھانا کھایا تھا اس کے بعد پانی کا گلاس چڑھایا اور کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ علیزہ اپنی جگہ بیٹھی حیرت سے بھری ہوئی ڈائننگ ٹیبل کو دیکھتی رہی۔ میٹھے کو انہوں نے چھوا بھی نہیں تھا۔ سلادجوں کا توں سجا سجایا پڑا تھا۔ ناگواری کی شدید لہر اس کے دل میں اٹھی تھی۔

"رافع نے کھانا کھالیا؟" بوا اس کے پاس کھڑی پوچھ رہی تھیں۔

"پتا نہیں کھایا ہے کہ بس سونگھ کر چلے گئے ہیں۔" اس نے جل کر کہا۔

"جاؤ جا کر چائے کا پوچھ آؤ میں بنا دیتی ہوں۔" انہوں نے برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔

"اگر انہیں پینی ہوگی تو خود ہی کہہ دیں گے۔"

"اے لو خود ہی کیوں کہہ دیں گے بھئی دفتر سے تھکا ہارا آیا ہے تمہارا تو فرض ہے کہ......" وہ حسب معمول اسے نصیحت کرنے جارہی تھیں کہ اس نے درمیان ہی میں ٹوک دیا۔

"رہنے دیں زیتون بوا سارے فرائض میرے لیے ہی رہ گئے ہیں۔" وہ روہانسی ہوگئی۔ "میاں صاحب آنے والے ہیں گھر صاف ستھرا ہونا چاہیے۔ شوہر کے آنے سے پہلے اپنا حلیہ بھی درست ہونا چاہیے۔ کھانا اچھا ہونا چاہیے۔ یہ ہونا چاہیے وہ ہونا چاہیے سارے سبق مجھے ہی پڑھاتی ہیں آپ۔"

"بٹی کیا ہوگیا تمہیں؟" بوا حیران پریشان اسے دیکھتی رہ گئیں۔

"سارا دن لگا دیا میں نے کچن میں مجال ہے جو ایک لفظ بھی کہا ہو تعریف کا، چلو پسند نہیں آیا تھا تب بھی کچھ کہتے تو سہی۔" اس نے آنکھیں مسل کر دل کی بات کہہ دی۔

"ارے بیٹی بس اتنی سی بات۔" انہوں نے ہنس کر اس کی بات ٹالنی چاہی۔

"یہ اتنی سی بات ہے؟" اس نے شکایتی نظروں سے بوا کو دیکھا۔

"چندا تم اس کی طبیعت سے واقف نہیں ہو وہ ایسا ہی ہے شروع سے کام کے علاوہ کبھی کوئی بات ہی نہیں کی اس نے بہت کم گو ہے وہ۔" بوا نے اسے پیار کرتے ہوئے تسلی دی مگر اس کا منہ بنا رہا۔

"اب اتنے کم گو بھی نہیں ہیں وہاں لاہور میں تو ٹھیک ٹھاک رہتے تھے۔ اب گوجرانوالہ آ کر ہی چپ کا روزہ رکھ لیا ہے۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھ گئی تھی

زیتون بوا چپ چاپ کھڑی اسے جاتا دیکھتی رہی تھیں۔ رافع کا مزاج ان کی سمجھ میں خوب آرہا تھا۔ پہلے وہ اس لیے خاموش تھیں کہ علیزہ محسوس نہیں کررہی تھی مگر اب وہ دیکھ رہی تھیں کہ علیزہ رافع کو اپنے طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتی ہے اور پھر شوہر کی بے نیازی کو بھی پوری طرح محسوس کرتی ہے۔ چنانچہ بوا نے موقع پاتے ہی زہرہ خاتون کو فون کر ڈالا۔

"رافع میاں، سبرینہ کو اب تک بھول نہیں پائے۔ انہوں نے تو کبھی بھولے سے بھی علیزہ سے بات نہیں کی۔ آنے جانے کے اوقات کا کچھ پتا نہیں کبھی رات گئے ــــ تو کبھی شام کو ہی آکر کمرے میں گھس جاتے ہیں۔"

"میں اس سے بات کروں گی بوا لیکن خیال رہے ظفر صاحب کے کان میں ان باتوں کی بھنک بھی نہ پڑے اور تم علیزہ کا خیال رکھنا۔" زہرہ خاتون قدرے پریشان ہوگئی تھیں۔

☆☆☆

فائل ان کے سامنے کھلی پڑی تھی۔ پین ہاتھ میں پکڑے وہ گہری سوچ میں کھوئے ہوئے تھے۔ آج صبح جب وہ آفس آنے کے لیے گھر سے نکل رہے تھے اسی وقت فرح کا فون آگیا تھا۔ علیزہ سے بات کرنے کے بعد وہ ان کے کان کھانے لگی تھی۔

"ارے ہاں رافع بھائی۔" وہ اپنی بات درمیان میں ہی چھوڑ کر چیخی تھی۔

"وہ ہیں ناں اپنی سبرینہ آپی ان کی بہن کا فون آیا تھا۔ بتا رہی تھیں کہ سبرینہ تو رافع کی شادی کے بعد نڈھال ہو کر رہ گئی ہے۔ کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے۔ حالت مردوں سے بھی بدتر ہوگئی ہے اور ہر وقت اپنے کمرے میں......" وہ مزید نجانے کیا کہنے والی تھی کہ لائن کٹ گئی اور انہیں یقین تھا کہ لائن کٹی نہیں بلکہ کاٹی گئی ہے۔ وہ چند لمحے یونہی ریسیور کو گھورتے رہے اس کے بعد سبرینہ کے گھر کا نمبر ملایا جواباً ان کی آواز سنتے ہی ریسیور پٹخ دیا گیا تھا اور صبح سے اب تک وہ سوائے سوچنے کے اور کچھ نہیں کرسکے۔

"یہ تم نے مجھے کس مشکل میں ڈال دیا ہے سبرینہ! نہ مجھے اپنے خیال سے آزاد کرتی ہو اور نہ مجھ سے کوئی رابطہ رکھنا چاہتی ہو۔ کاش تم صرف ایک بار مجھ سے مل لو تو میں......"

وہ ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ اچانک ہی ایک خیال ان کے ذہن میں آیا تھا۔ انہوں نے گھر فون کر کے زیتون بوا کو اپنے لاہور جانے کی اطلاع دی اور گاڑی کی چابیاں اٹھا کر باہر نکل گئے۔ انہیں یقین تھا کہ اگر سبرینہ ان سے ایک بار بھی مل لے تو وہ اسے ہر طرح سے سمجھا بجھا کر ایسی کسی بھی حرکت سے باز رکھ سکتے ہیں جو خود اس کے لیے مصیبت کا باعث

بنے اور اس کام کے لیے انہوں نے ارم سے مدد لینے کا فیصلہ کیا تھا۔

جب وہ گھر پہنچے تو اس وقت صرف ارم اور امی گھر میں موجود تھیں۔ ارم ان کے لیے چائے بنانے چلی گئی اور وہ امی کے پاس ہی بیٹھ گئے۔

''بابا جان نظر نہیں آ رہے؟''

''کسی کام سے باہر گئے ہیں۔'' انہوں نے چونک کر ان کا چہرہ دیکھا نجانے کیوں آج ان کے لہجے میں پہلے کی سی گرم جوشی نہ تھی۔

''علیزہ کیسی ہے اس کا وہاں دل تو لگ گیا ہے ناں؟'' امی نے بغور انہیں دیکھتے ہوئے سوال کیا تو وہ بس اثبات ہی میں سر ہلا سکے۔

''اور تمہارا؟'' بڑا غیر متوقع سوال تھا۔ وہ نا سمجھی کے عالم میں ماں کو دیکھے گئے۔

''میں دیکھ رہی ہوں رافع تم ہر دوسرے روز یہاں موجود ہوتے ہو۔

اس کی وجہ بھی میری سمجھ سے باہر نہیں لیکن اب تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تم شادی شدہ ہو۔''

''تو؟ شادی شدہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ میرا اس گھر سے کوئی تعلق نہیں رہا؟'' وہ حیران ہو کر ماں کا سپاٹ چہرہ تکنے لگے۔

''اس گھر سے تمہارا تعلق کبھی بھی ختم نہیں ہو سکتا رافع بیٹا لیکن بہتر ہوگا کہ تم علیزہ کے ساتھ مل کر اپنا گھر بساؤ اسے وہ تمام خوشیاں دو جن کی وہ حق دار ہے اس گھر کو گھر سمجھو سرائے مت بناؤ۔'' زہرہ خاتون بوا کی بات سن کر بھری بیٹھی تھیں سو اب بیٹے کو دیکھتے ہی شروع ہو گئی تھیں۔

''میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' وہ جھنجلا کر رہ گئے تھے۔

''دیکھو بیٹا! وہ یتیم بچی ہے اس کو کوئی دکھ پہنچے میں یہ بات سوچ کر ہی خوف زدہ ہو جاتی ہوں باقی سب کچھ بھول جاؤ بس اس کو خوش رکھو اللہ تعالیٰ تمہیں......'' امی کا لہجہ نرم پڑ گیا تھا مگر وہ تپ کر رہ گئے تھے۔

''کیسے بھول جاؤں؟ اور یہ بھولنا اتنا آسان ہوتا ہے؟ تین سال سے سبرینہ صرف میرے بارے میں سوچتی آئی ہے اب اگر اس نے کوئی انتہائی قدم اٹھا لیا تو کون ہوگا اس کا ذمہ دار......'' نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی آواز بلند ہو گئی تھی مگر پھر نجانے کس طرح وہ خود پر قابو پاتے باہر نکل گئے تھے مبادا ماں کی سامنے مزید گستاخی کر ڈالیں۔

''ہونہہ یتیم بچی! سارے فساد کی جڑ وہ بچی ہی تو ہے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر بابا جان ہمیشہ اس سے بے خبر ہی رہتے' وہ کبھی ہماری زندگیوں میں نہ آئی ہوتی' کم از کم آج یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتا' ایک ذہنی مریض پہلے ہی چھوڑ کر آئی ہے اور دوسرا مریض مجھے بنا کر چھوڑے گی۔''

انہوں نے سارا غصہ دل ہی دل میں علیزہ پر نکالا تھا جو منصوبہ وہ گوجرانوالہ سے بنا کر آئے تھے' وہ اسی غصے کی نذر ہو گیا تھا۔

''ٹھیک ہے مجھے کیا؟ سبرینہ جو بھی کرتی ہے کرتی رہے میری بلا سے میں نے ساری دنیا کو خوش رکھنے کا ٹھیکا نہیں لے رکھا' اور سے والدہ محترمہ کو بیٹے کی کوئی پروا نہیں بس ''یتیم بچی'' کی خوشیاں عزیز ہیں انہیں۔ سب سے زیادہ فالتو تو میں ہی ہوا ناں؟''

غصے کی انتہا پر پہنچ کر وہ کچھ ایسی ہی بے معنی باتیں سوچنے لگے تھے اور پکا ارادہ کر لیا تھا۔ اب کئی ماہ تک لاہور میں اپنی شکل نہیں دکھائیں گے۔

☆☆☆

وہ کوئی تیسری مرتبہ انہیں دیکھنے کمرے میں آئی تھی مگر پھر انہیں جوں کا توں سوتے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ وہ تو بہت صبح سویرے اٹھ جایا کرتے تھے لہٰذا اب اس کا پریشان ہونا لازمی تھا۔ یوں بھی کل لاہور سے واپسی کے بعد وہ سخت ڈسٹرب نظر آ رہے تھے۔ اس نے پوچھنے کی کوشش کی مگر جواباً اسے ایسی قہر آلود نظروں سے گھورا گیا تھا کہ وہ چپ چاپ وہاں سے کھسک گئی تھی۔

کچھ لمحے وہ یونہی انگلیاں چٹخاتی شش و پنج میں پڑی رہی پھر ہمت کر کے آگے بڑھی بازو ہلا کر اٹھانا چاہا مگر دوسرے ہی لمحے ہاتھ کھینچ لیا۔ بخار کی شدت سے بازو تپ رہا تھا۔

''ہیں انہیں تو بخار ہے۔'' اس نے فوراً نبض دیکھی پھر ماتھے پہ ہاتھ رکھا۔ اسی لمحے انہوں نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ علیزہ نے لمحے کے ہزارویں حصے میں اپنا ہاتھ کھینچا اور پھر پلٹ کر ناک کی سیدھ میں چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

''توبہ ہے کتنا تیز بخار ہو رہا ہے اسی لیے اتنی دیر تک سوتے رہے۔'' اس نے جلدی سے سلائس گرم کیے، چائے کا کپ بنایا، جیم، فرائی انڈے اور بخار کی گولیوں کے ساتھ ایک گلاس پانی بھی ٹرے میں رکھ کر گویا پورا ناشتا تیار کیا اور کمرے میں چلی آئی۔

''ارے یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟'' رافع کو وارڈ روب سے استری شدہ سوٹ نکالتے دیکھ کر وہ حیران ہو گئی تھی۔ انہوں نے یوں پلٹ کر دیکھا گویا پوچھ رہے ہوں۔

''نظر نہیں آتا؟''

''آپ جا کہاں رہے ہیں؟'' اس نے ٹرے تپائی پہ رکھ دی۔

''روز کہاں جاتا ہوں؟'' سوال کے جواب میں سوال ہی آیا تھا۔

''روز تو آفس جاتے ہیں۔'' اس کے کہنے پر کڑے تیوروں سے اسے گھورا گیا تھا۔

''تو آج کیا ہڑتال ہے؟'' سخت لہجے پر علیزہ روہانسی ہو گئی۔

''لگتا ہے بخار نے دماغ پر بھی اثر کر دیا ہے۔''

''مگر آج تو آپ کو بخار ہے۔ آج آفس سے چھٹی کر لیں۔'' اس نے تھوک نگلتے ہوئے بمشکل کہا۔

''مائنڈ یور اون بزنس علیزہ مراد! میں نے آپ سے مشورہ نہیں مانگا۔'' اس کے عین سامنے رک کر انہوں نے اپنی سرخ آنکھیں اس پر جما کر کہا تو وہ کپکپا کر رہ گئی۔

''مم مگر میں آج آپ کو آفس نہیں جانے دوں گی' حد ہوتی ہے بھلا اتنے بخار میں بھی کوئی آفس جاتا ہے۔'' وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی دروازے تک آ گئی تھی۔ اس کی بات پر باتھ روم کی طرف جاتے رافع بھنا کر پلٹے تھے مگر وہ فوراً ہی باہر نکل گئی تھی۔ دروازہ بند ہونے کے ساتھ ہی کلک کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے دروازے تک پہنچے اور ہینڈل گھماتے ہی ان کے شبے کی تصدیق ہو گئی۔ دروازہ باہر سے لاک تھا۔ ان کا تو جیسے دماغ ہی گھوم گیا تھا۔

''احمق لڑکی' دروازہ کھولو باہر سے۔'' وہ دھاڑے تھے اور دروازے کے باہر کھڑی علیزہ نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے تھے۔ اس کے بعد دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا تھا۔

''ہائے یہ تو زیادہ ہی غصے میں آ گئے ہیں کھول ہی دیتی ہوں۔'' وہ ایک قدم آگے بڑھی مگر پھر ٹھٹک گئی۔

''زیتون بوا بھی گھر پہ نہیں کیا معلوم اتنے غصے میں کیا کر ڈالیں' ایسا نہ ہو دروازہ کھولوں اور وہ بدلے میں مجھے ہی شوٹ کر دیں۔'' اس نے دروازہ کھولنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔

زیتون بوا گھر میں داخل ہوئیں تو غیر معمولی خاموشی نے انہیں چونکا دیا۔ وہ جلدی سے لاؤنج میں داخل ہوئیں اور پھر ایک دم رک گئیں۔ علیزہ صوفے پہ گھٹنوں میں منہ دیے۔ دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے پنڈولم کی طرح ہل رہی تھی۔

''علیزہ بیٹی۔'' انہوں نے پکارا تو دائیں بائیں جھولتا ہوا پنڈولم اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ دھیرے دھیرے سر اٹھا کر اس نے بوا کو دیکھا اور پھر ایک دم پھٹ پڑی۔

''کمال ہے بوا آپ کچرا پھینکنے گئی تھیں اور دو گھنٹے لگا دیے ہیں واپس آنے میں، کبھی تو جلدی لوٹ آیا کریں۔''

''ارے کیا ہو گیا بیٹی؟'' انہوں نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

''ادھر آئیں پہلے'' ان کا ہاتھ پکڑ کر وہ رافع کے کمرے کے سامنے آ گئی۔

''دروازہ کھولیں۔'' اس نے نظریں چرا کر کہا تو بوا سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگیں اس نے سر جھکا کر سارا واقعہ ان سے کہہ دیا۔

''ارے دماغ تو ٹھیک ہے بھلا اس لڑکے کا' ابھی دیکھتی ہوں میں۔'' انہوں نے جھٹ کمرے کا دروازہ کھولا وہ بھی ان کے پیچھے ہی کمرے میں داخل ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس نے کب کی رکی ہوئی سانس بڑے سکون اور اطمینان سے خارج کی تھی۔

کمرے کی حالت اگرچہ بے ترتیب تھی مگر ناشتے کی ٹرے اٹھاتے ہوئے وہ بے اختیار مسکرا دی تھی۔ آدھا سلائس اور ایک انڈا غائب تھا۔ چائے کا پورا کپ خالی تھا اور بخار کی گولیاں بھی موجود نہ تھیں۔ ٹرے اٹھا کر کمرے سے نکلتے ہوئے اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ بیڈ پر آڑے ترچھے، تکیے میں منہ دیے غافل پڑے تھے۔

''اتنے بڑے ہو گئے ہیں مگر غصہ ابھی تک بچوں والا ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے سوچا تھا۔

☆☆☆

رات کا کھانا کھا کر رافع ٹی وی کے سامنے جا بیٹھے تھے۔ وہ دبے پاؤں لاؤنج میں آئی تھی ایک نظر ان کے سنجیدہ چہرے پہ ڈالی اور پھر مڑ کر دیکھا۔ زیتون بوا دروازے سے باہر کھڑی اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کر رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی صوفے پہ آ بیٹھی۔

کوئی انتہائی فضول اور بور سا انگلش پروگرام تھا۔ اس نے چند لمحے اسکرین پر نظریں جمائے رکھیں اور جب کچھ پلے نہ پڑا تو ان کے چہرے پہ نظریں گاڑ دیں۔ ہونٹوں کے بالکل برابر، گال سے ذرا نیچے سیاہ تل نے اسے بھلا ہی دیا کہ وہ کیا کہنے آئی تھی اور شاید اس کی نظروں کی تپش ہی تھی کہ رافع نے ٹی وی اسکرین سے نظریں ہٹا کر حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

دوسرے معنوں میں اسے ماورائی دنیا سے واپس کھینچا تھا۔ ''وہ مم' میں آپ سے کچھ کہنے آئی تھی۔'' اس نے قدرے گھبرا کر کہا تھا۔ رافع نے ریموٹ کنٹرول اٹھا کر آواز قدرے کم کر دی تھی۔ گویا بولنے کی اجازت تھی۔

''وہ دراصل میں ......وہ قدرے جھجک گئی (کہیں ناراض ہو نہ جائیں)۔

''وہ میں اصل میں گھر میں سارا دن فارغ ہوتی ہوں تو اگر میں کالج میں ایڈمیشن لے لوں تو۔'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر انہیں دیکھنے لگی۔

''میں نے آپ کو منع تو نہیں کیا۔''

''ہائیں۔'' اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا اتنی جلدی اجازت مل جائے گی۔ جھٹ اٹھ کر زیتون بوا کو خوش خبری سنانے بھاگی۔

''تو مسٹر رافع ایاز' تم اس لڑکی کو کس بات کی سزا دے رہے ہو جسے اس کی مجبوری تمہاری زندگی میں لے آئی ہے؟'' ٹی وی پہ نظریں گاڑتے ہوئے انہوں نے خود سے سوال کیا تھا اور شاید اس ایک لمحے کی سوچ کا ہی نتیجہ تھا کہ چند دن بعد فیکٹری سے واپسی پر انہوں نے کالج فارم کے ساتھ اس کے تمام ڈاکومنٹس لا کر میز پر رکھے تو وہ حیرت اور خوشی سے چیخ پڑی تھی۔

''یہ آپ کو کہاں سے ملے؟'' اس کے چیخنے پر انہوں نے ناگواری سے اسے دیکھا تو اس نے جھٹ منہ پہ ہاتھ رکھ لیا۔

''سڑک پہ جا رہا تھا' راستے میں مل گئے۔'' طنزیہ انداز میں جواب دے کر وہ باتھ روم میں گھس گئے تھے۔ وہ چند لمحے ان کے جواب پہ غور کرتی رہی جب کوئی سرا ہاتھ میں نہ آیا تو زیتون بوا کو خوش خبری سنانے باہر چل دی۔

''ویسے زیتون بوا' آپ نے ٹھیک ہی کہا تھا مزاج کے کڑوے ہیں مگر دل کے بہت اچھے ہیں۔'' وہ بے حد خوش تھی۔

رات کو بابا جان نے فون کر کے بتایا کہ وہ خود اس کے ڈاکومنٹس لے کر آئے تھے۔ نانی اماں بہت خوش تھیں علیزہ کے بارے میں سن کر۔

''بس یوں سمجھو کسی حد تک حالات درست کر آیا ہوں کچھ وقت بیت جائے پر تم خود جا کر اپنی نانی اماں سے مل آنا' وہ تمہیں بہت یاد کر رہی تھیں۔'' بابا جان نے فون پر بتایا تھا اور اس رات وہ دیر تک نانی اماں کو یاد کرتی رہی تھی۔

☆☆☆

''علیزہ۔'' وہ گیٹ میں داخل ہوئی ہی تھی جب صائمہ کی آواز پہ وہ رک گئی۔ کالج میں ایڈمیشن کے بعد سے صرف یہ ہی ایک لڑکی تھی جس سے دوستی کی حد تک جان پہچان تھی۔

''علیزہ آج کس کے ساتھ آئی ہو؟'' وہ بڑے اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔

''کیوں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا تھا۔ آج کالج وین نہ آنے کے باعث رافع اسے ڈراپ کر کے گئے تھے۔

''یار بڑا ہینڈسم بندہ تھا۔'' صائمہ نے متاثر کن لہجے میں کہا۔

''او ہو زیادہ متاثر ہونے کی ضرورت نہیں' وہ صاحب شادی شدہ ہیں۔'' علیزہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ریئلی ہاں بھئی اتنا پیارا شخص اب تک کنوارا ہو بھی کیسے سکتا تھا؟ ویسے کون ہے وہ خوش قسمت لڑکی' دیکھنے میں کیسی ہے؟'' صائمہ کو ہمیشہ سے ایسے موضوعات میں دلچسپی ہوتی تھی۔

''بھئی' وہ لڑکی تو ان سے بھی زیادہ پیاری ہے۔'' کوریڈور سے گزرتے ہوئے اس نے قد آدم آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے پہلا سوال دانستہ نظر انداز کر دیا تھا۔

''ماشاء اللہ' کتنا خوب صورت کپل ہو گا ناں۔ ایک ہمارے منگیتر ہیں ایک سے ایک خوب صورت لڑکی موجود تھی خاندان میں پھر بھی نظر انتخاب ہم پر ہی پڑی نہ گھٹاؤں جیسے بال نہ غزالی آنکھیں نہ دودھ جیسا سفید رنگ۔''

''فار گاڈ سیک صائمہ! بس کرو اب ایسی بھی گئی گزری نہیں ہو تم۔'' اس سے پہلے کہ صائمہ مزید کچھ کہتی علیزہ نے فوراً اسے ٹوک دیا۔

''ویسے بھی مجھے معلوم ہے' انہوں نے تمہیں کیوں پسند کیا تھا۔''

''ہیں پھر جلدی سے بتاؤ؟'' صائمہ نے چلتے چلتے رک کر اشتیاق سے پوچھا۔

''صائمہ ڈیئر! تمہاری آنکھیں غزالی نہ سہی مگر ان میں ہمیشہ ایک تاثر رہتا ہے خوشی اور امید کا تاثر جو تمہارے چہرے کو نہایت خوب صورت بنا دیتا ہے اور بے شک تمہارا رنگ دودھ جیسا سفید نہیں مگر اس سلونی رنگت میں بھی مکھن ملائی جیسی ملائمت ہے۔'' علیزہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا تو صائمہ بے اختیار مسکرا دی۔

''اگلے جمعے وہ آ رہے ہیں' ان سے پوچھ کر بتاؤں گی کہ تمہارا اندازہ کس حد تک درست ہے۔ ارے ہاں یاد آیا پلیز' مجھے یہ تو بتاؤ مجھ پہ کون سا کلر زیادہ سوٹ کرتا ہے جمعہ کو اسی کلر کا سوٹ پہنوں گی۔''

صائمہ کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ علیزہ نے اپنے خیالوں سے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کا من پسند ٹاپک شروع ہو چکا تھا اور اب وہ کئی گھنٹے بلا تکان بول سکتی تھی۔

''انہوں نے مجھ سے یہ کہا، مجھے فلاں گفٹ کیا، برتھ ڈے پہ سب سے پہلا فون ان کا آیا تھا۔'' صائمہ اسے نجانے کون سے واقعات سنا رہی تھی مگر اس کا ذہن کہیں اور ہی بھٹک رہا تھا۔ فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ پہنچنے پر صائمہ نے اسے چونکایا تو وہ سر جھٹک کر کلاس روم میں داخل ہو گئی۔

☆☆☆

''سمجھ میں نہیں آتا' میرا اس شخص کے ساتھ رشتہ کیا ہے؟ صائمہ کی باتوں نے مجھے احساس دلایا ہے کہ شادی محض دو افراد کا ایک چھت کے نیچے رہنا ہی نہیں ہوتا۔ اس بندھن کو پروان چڑھانے کے لیے تو بہت کچھ چاہیے ہوتا ہے، پیار، محبت، چاہت،

اپنائیت، اعتماد ———— ایک دوسرے کے دکھ، سکھ میں شراکت، مگر ہم دونوں کے بیچ تو ایسا کچھ بھی نہیں۔" اس نے پلٹ کر بیڈ کے آخری کنارے پر دنیا و مافیہا سے غافل اس شخص کو دیکھا "صائمہ کی تو صرف منگنی ہوئی ہے اور اس کے پاس بتانے کے لیے ایک ہزار باتیں ہوتی ہیں اور میرے پاس کیا ہے؟ دامن دل پہ خوشبو کا کوئی ایک لمحہ بھی ثبت نہیں۔ میری سماعتیں آج بھی خواب آسا سرگوشیوں سے ناآشنا ہیں۔" وہ بے قرار ہو کر اٹھ بیٹھی تھی۔

"میں بھی کتنی بے وقوف ہوں نجانے کیوں یہ سمجھ بیٹھی کہ ضروریات زندگی کا پورا ہونا یا پورا کرنا ہی ازدواجی زندگی ہے، کبھی یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ رافع اتنے اکھڑ مزاج، اتنے چڑچڑے پن کا مظاہرہ کیوں کرتے ہیں؟ بوا کہتی ہیں ان کی عادت ہی ایسی ہے مگر شادی سے پہلے اتنے بدمزاج تو ہرگز نہیں تھے ہنسی مذاق بھی کرتے تھے۔

ارم کے ساتھ ڈسکشن بھی ہوتی ہی رہتی تھی پھر اب..... کہیں ایسا تو نہیں کہ میں انہیں ناپسند ہوں اور یہ....." اس سے آگے وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی مگر دماغ تھا کہ مسلسل اسے گڑبڑ کا احساس دلائے جا رہا تھا۔ نیند آنکھوں سے پوری طرح غائب ہو چکی تھی۔

اس نے لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے، آخیر اکتوبر کی خنک رات تھی۔ اوس سے بھیگتی ہوا میں موتیے کی خوشبو بھی شامل تھی وہ کتنی ہی دیر کھڑکی میں کھڑی رہی یہاں تک کہ صبح کا تارہ نمودار ہو گیا تھا۔

☆☆☆

علیزہ کے روز و شب میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں، انہوں نے رافع کو چونکا کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ ان کے گریز ———— پر مطمئن نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کی نظریں ہمہ وقت رافع کے چہرے کو کھوجتی رہتی تھیں۔ وہ دیر سے گھر لوٹتے تو اسے اپنے انتظار میں ٹہلتے دیکھتے۔ اپنے حلیے سے وہ پہلے کی طرح لاپروا نہیں رہتی تھی، بہترین سوٹ پہن کر ان کی توجہ اور ستائش سمیٹنا چاہتی تھی۔

وہ کسی فطری جذبے کے تحت اس کی طرف بڑھنا چاہتے مگر سبرینہ کا آنسوؤں سے تر چہرہ ان کے جذبات کو سرد سے احساس میں بھگو دیتا۔ وہ اس کے خوشبوؤں میں بسے سراپے کو چھونا چاہتے مگر آہستہ آہستہ اس کا وجود سبرینہ کے وجود میں چھپنے لگتا۔

"جو حقیقت ہے اسے تسلیم کر لینا ہی دانش مندی ہے۔ سبرینہ کی محبت قصہ پارینہ بن چکی ہے۔ علیزہ میری بیوی ہے اس کو اس کے حق سے محروم رکھنا انسانیت نہیں اسے مزید دکھ دینا بہت بڑی غلطی ہوگی مجھے اس کے حصے کی خوشیاں اسے دے دینی چاہئیں۔"

نہ جانے امی کی باتوں کا اثر تھا یا علیزہ کی قربت کا، بہت سوچ سمجھ کر انہوں نے فیصلہ کیا تھا مگر شاید علیزہ کی خوشیوں کا وقت نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

کینیڈا جانے والی فلائٹ میں ابھی کچھ وقت تھا۔ وہ اسد کے ساتھ لاؤنج میں آ بیٹھے۔ اسد ان کا بہترین دوست تھا۔ چار سال پہلے اس کی فیملی مستقل طور پر کینیڈا میں شفٹ ہو گئی تھی، وہ خاص طور پر رافع سے ملنے گوجرانوالہ آیا تھا۔ دو روز قیام کے بعد آج اسے روانہ ہونا تھا سو رافع اسے الوداع کہنے اور رخصت کرنے کے لیے اس کے ساتھ ایئرپورٹ تک آئے تھے۔ وہ دوسرے مسافروں پر تبصرہ کرنے، ادھر ادھر کی باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ باتیں کرتے ہوئے انہوں نے یونہی گردن موڑ کر دائیں طرف بیٹھے مسافروں کا جائزہ لیا تھا مگر اگلے ہی لمحے وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ سبز رنگ کے سوٹ میں کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے وہ بلاشبہ سبرینہ ہی تھی۔

"کیا ہوا؟" اسد نے ان کے یوں اچانک ردعمل پر حیرت سے پوچھا۔ وہ اسے رکنے کا اشارہ کر کے تیزی سے چلتے ہوئے سبرینہ تک پہنچے۔

"سبرینہ یہ تم ہو ناں؟" میک اپ کے باوجود اس کے چہرے پر مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ انہیں یوں اچانک سامنے دیکھ کر سبرینہ جیسے پتھر کی ہو گئی تھی۔ تکتے ہی لمحے وہ چپ چاپ آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھتی رہی۔

"سبرینہ۔" انہوں نے آہستگی سے پکارا۔

سبرینہ نے چونک کر ان پر سے نظریں ہٹالیں، وہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ یونہی کھڑے اس کے جھکے سر کو دیکھتے رہے۔ اسی ایک ملاقات کے تو وہ خواہش مند تھے لیکن اب وہ سامنے بیٹھی تھی تو ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں سے بات شروع کریں۔

"رافع تمہیں معلوم ہے؟" چند لمحوں بعد سبرینہ نے سرخ ہوتی ———— آنکھیں، اٹھا کر دیکھا۔

"میں..... میری شادی ہو گئی ہے رافع۔" اس نے ہاتھ ملتے ہوئے جیسے کسی جرم کا اعتراف کیا تھا۔

وہ حیران پریشان اپنی جگہ کھڑے رہ گئے۔

"لیکن کب؟ مجھے تو ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی؟"

"میں نے فیصلہ کر لیا تھا رافع میں ساری عمر شادی نہیں کروں گی، میں تمہارے علاوہ کسی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی رافع۔" وہ مضطرب ہو کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"لیکن صرف خالہ امی کی وجہ سے میں مجبور ہو گئی تھی۔"

"امی کی وجہ سے؟ مگر کیوں؟"

"ان کا خیال تھا جب تک میری شادی نہیں ہو گی تم علیزہ کو اس کی اصل جگہ اور دل میں مقام نہیں دے پاؤ گے۔ میں تم سے کہا کرتی تھی تم نے کسی اور کے بارے میں سوچا بھی تو میں خودکشی کر لوں گی دیکھ لو رافع، تمہاری خاطر میں بار بار مر رہی ہوں۔"

آنسو سبرینہ کی پلکوں سے ٹوٹ کر اس کے گالوں پہ پھسل آئے تھے۔

"مگر ایک بات یاد رکھنا میں یہاں سے جا تو رہی ہوں مگر اپنا دل، اپنی روح اپنا آپ یہیں چھوڑے جا رہی ہوں تمہارے پاس۔" وہ نم آنکھوں سے انہیں تکے جا رہی تھی گویا ان کے نقوش اپنے دل میں محفوظ کر لینا چاہتی ہو۔ خود رافع کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ زمین اور آسمان کے بیچ کسی خلا میں لٹک رہے ہیں اور پھر اسی خلا میں ڈولتے ہوئے سنا کوئی سبرینہ کو پکار رہا تھا۔ سبرینہ نے جھک کر بیگ اٹھاتے ہوئے اپنا چہرہ صاف کیا اور ان کے قریب سے ہو کر آگے بڑھ گئی۔

"خدا حافظ۔" کی آواز انہیں کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

☆☆☆

یہ محض علیزہ کی بدقسمتی ہی تھی کہ جب مالی کے بیٹے نے آ کر اسے اطلاع دی کہ لان میں ایک انتہائی خوب صورت کبوتر زخمی حالت میں پڑا ہے تو وہ اپنی کتاب ایک طرف پھینک کر بھاگتی ہوئی باہر نکلی تھی۔

وہ تو خیر اندھا دھند بھاگی ہی تھی مگر شاید برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے رافع بھی اپنے حواسوں میں نہیں تھے نتیجتاً وہ خود کو سنبھالتے سنبھالتے بھی ان سے بری طرح جا ٹکرائی تھی۔ رافع نے بے اختیار و بلا ارادہ ہی اسے تھام کر گرنے سے تو بچا لیا تھا مگر اس کے ساتھ ہی ایک زناٹے دار تھپڑ بھی اس کے منہ پہ دے مارا تھا۔

ایک تو گرنے کے خوف سے اس کے حواس جھنجھنا گئے تھے۔ اوپر سے ان کا بھاری ہاتھ علیزہ کو اپنے پیروں تلے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

وہ اسے دونوں بازوؤں سے جکڑے قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے، شدید غیض و غضب کے عالم میں نجانے کیا کچھ کہہ رہے تھے۔ سائیں سائیں کرتے کانوں سے اس کے پلے کچھ نہیں پڑا تھا اور جب وہ اسے ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا کر تیزی سے آگے بڑھ گئے تو وہ لڑکھڑا کر وہیں سیڑھیوں پر ہی بے دم ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ زیتون بوا کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی اور وہ بھاگ کر اس تک پہنچیں۔

"بیٹی کیا ہو گیا؟ یہ رافع کو کیا ہوا ہے؟"

وہ دھندلی آنکھوں سے انہیں دیکھے گئی۔

''بیٹی تم ٹھیک تو ہو؟'' علیزہ کے حواس کچھ دیر بعد بحال ہوئے تو توہین اور ذلت کے احساس سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ زیتون بوا کے ہاتھ کو جھٹک کر وہ تیزی سے کمرے میں جا کر بند ہو گئی تھی۔

زیتون بوا ہولتی ہوئی پہلے رافع کے کمرے کی طرف گئیں۔ دروازہ دھڑ دھڑایا کوئی جواب نہ آیا تو علیزہ کے کمرے کا دروازہ پیٹ ڈالا۔ وہاں سے سوائے سسکیوں کے اور کچھ جواب میں نہ سنائی دیا۔ وہ پریشان پریشان سی ایک سے دوسرے کمرے تک چکرائی رہیں اور جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو فوراً ریسیور اٹھا کر لاہور کا نمبر ڈائل کرنے لگیں۔

☆☆☆

صبح سے کتنا رو چکی تھی وہ مگر آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔

''کیا سمجھ کر انہوں نے ہاتھ اٹھایا مجھ پر، میں جان بوجھ کر ٹکرائی تھی ان سے یا کوئی ناقابل تلافی نقصان ہو گیا تھا جو وہ برداشت نہیں کر سکے تھے۔ معلوم ہے ناں انہیں کہ لاوارث ہے یتیم ہے بے آسرا ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں جیسا دل چاہے سلوک کریں مگر اب بہت برداشت کر چکی ہوں، خریدا نہیں تھا مجھے' بیاہ کر لائے تھے اگر بیوی کا مقام نہیں دے سکتے تو غلاموں کا سا سلوک بھی نہیں کرنے دوں گی۔ اب بہت مشکل ہے یہاں رہنا واپس چلی جاؤں گی جہاں اتنے برس گزار دیے وہاں مزید احسان بھی برداشت کر لوں گی۔''

زیتون بوا بمشکل دروازہ کھلوانے میں کامیاب ہو سکی تھیں۔ اب وہ حیران پریشان منہ پہ ہاتھ رکھے اس کی باتیں سن رہی تھیں۔ رونے سے آنکھیں بے تحاشا سرخ ہو رہی تھیں بے بسی اور غصے کا احساس مزید سلگائے دے رہا تھا۔ بوا نے ٹھنڈے پانی کا گلاس پلایا ہاتھوں سے اس کے بے ترتیب بال سنوارے اور سمجھانے بجھانے میں لگ گئیں۔

☆☆☆

''یہ مت بھولو رافع کہ آخری فیصلہ تمہارا اپنا تھا۔'' زہرہ خاتون اس کے سامنے بیٹھی تھیں۔

''جی ہاں آپ لوگوں نے تو صرف پر کالے تھے میرے اور اس کے بعد اجازت دے دی تھی کہ جدھر چاہو اڑان بھر لو۔'' رافع کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''مگر امی آپ کو صرف میرے پر کاٹنے کا حق تھا سبرینہ کو کیوں مجبور کیا آپ نے؟''

''اس کو میں نے نہیں اس کے گھر والوں نے مجبور کیا تھا اور پھر شادی تو ہر لڑکی کی ہوتی ہے اگر سبرینہ کی ہو گئی تو کیا قیامت آ گئی؟'' زہرہ خاتون کو بیٹے کی گستاخی پر غصہ آ گیا۔

''ہاہ شادی۔'' وہ تمسخرانہ انداز میں کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''آپ کو معلوم ہے امی مجبوری کے تحت ہونے والی شادیاں کتنا دکھ دیتی ہیں؟ اس منافقت بھرے روز و شب میں انسان ہر روز مرتا ہے اور ہر روز جیتا ہے۔'' نجانے کب کا رکا ہوا لاوا آج بہہ نکلا تھا۔

''اس ایک لڑکی کی خاطر آپ نے دو زندگیاں برباد کی ہیں امی۔''

''وہ محض ایک لڑکی نہیں ہے رافع...... تمہارا باپ جان دیتا ہے اس پر۔ علیزہ میں انہیں اپنے بھائی کی جھلک نظر آتی ہے جسے وہ اپنے بچوں کی طرح چاہتے تھے۔'' زہرہ نے رافع کو رسان سے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اب اگر تم نے باپ کی خاطر یہ رشتہ جوڑا ہے تو اسے نبھانے کا حوصلہ بھی خود میں پیدا کرو۔''

''نہیں پیدا کر سکتا میں خود میں یہ حوصلہ۔'' وہ ایک دم چیخ اٹھے تھے۔

''اس لڑکی کا وجود ہمیشہ مجھے یہ احساس دلاتا رہتا ہے کہ محض اس کی وجہ سے سبرینہ نامراد رہی ہے اور ایک بات میں آپ کو بتاؤں جو خوشیاں سبرینہ کا مقدر نہیں بن سکیں وہ میں علیزہ کی جھولی میں کبھی نہیں ڈالوں گا اسے بھی اتنا ہی محروم رہنا ہو گا جتنی محرومی سبرینہ کے حصے میں آئی ہے۔'' وہ غصے سے سرخ آنکھیں ان کے چہرے پر جما کر کہتے ہوئے

مالگا یہ بھول گئے تھے کہ وہ کس سے مخاطب ہیں۔

''اور اگر اس سلسلے میں کسی نے مجھے مجبور کرنے کی کوشش کی تو نتائج کی ذمہ داری خود اسی پر ہو گی۔''

وہ کہہ کر بجلی کی سی تیزی سے باہر نکل گئے تھے اور زہرہ خاتون بے یقینی کے عالم میں بند دروازے کو تکتی رہ گئی تھیں۔

زہرہ خاتون لاہور واپس آتے ہوئے علیزہ کو ساتھ ہی لے آئی تھیں۔ لیکن رافع کو یہ ہی جتلایا کہ ارم کا منگیتر جرمنی سے واپس آ گیا ہے اور وہ شادی کی تاریخ مانگ رہے ہیں۔ کام بہت بڑھ گیا ہے اسی لیے علیزہ کو ساتھ لیے جا رہی ہوں۔ علیزہ' تائی امی اور رافع کے درمیان ہونے والی تلخ کلامی سے بے خبر تھی۔ راستے میں انہوں نے بڑے پیار سے اسے سمجھایا کہ اپنے بابا جان کے سامنے ایسی کسی بات کا ذکر مت کرنا۔ لہٰذا جب وہ لاہور پہنچی تو اتنے مطمئن طریقے سے بابا جان سے ملی کہ ان کے تمام شکوک جاتے رہے۔ علیزہ البتہ رافع سے بددل ہو چکی تھی۔

''ابھی بھی آنے کی کیا ضرورت تھی؟ کچھ روز بعد آ جاتے۔''

ارم کے لہجے میں خفگی ہی خفگی تھی۔ علیزہ نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا تو دل ایک لمحے کے لیے بہت تیزی سے دھڑکا تھا' وہ تیزی سے پلٹ کر ہاتھ میں پکڑے جوڑے کو تہ کرنے لگی۔ ارم کو مایوں بٹھانا تھا اور وہ گوجرانوالہ سے آج ہی یہاں آئے تھے۔ اس نے کن انکھیوں سے دیکھا وہ ارم کے سامنے بیٹھے نجانے کون سی صفائیاں پیش کر رہے تھے۔

''مجھ پر تو ایک نظر ڈالنی بھی گوارا نہیں کی۔'' اس کا دل بجھ کر رہ گیا تھا۔ نجانے کیوں وہ ان سے امید لگائے بیٹھی تھی کہ وہ اپنے سابقہ رویے پر نادم ہوں گے۔ اتنے دنوں بعد سامنا ہو گا' کچھ کہنے کچھ سننے کا موقع دیں گے۔ مگر دوسری طرف تو مکمل بے نیازی تھی۔ وہ اپنا کام ادھورا چھوڑ کر اوپر چلی آئی۔ نیچے کافی مہمان جمع تھے۔ روبینہ بھابھی وہیں کام میں مصروف تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر وہاں ٹہلتی اپنے آنسو پیتی رہی۔

ارم کے شادی کے بعد ایک چھوٹی سی پارٹی ارینج کی گئی تھی۔ قریبی رشتے دار جمع تھے ایک روز بعد ارم، نوید کے ساتھ ہی جرمنی روانہ ہو رہی تھی سو ایک طرح سے یہ الوداعی پارٹی تھی۔ خوشی کا ہر رنگ ارم کے چہرے پہ جھلملا رہا تھا اور جس روز وہ سب کو اداس چھوڑ کر جرمنی روانہ ہوئی، گھر ایک دم جیسے خالی محسوس ہونے لگا تھا۔

رافع کو گوجرانوالہ جانے کی تیاری کرتے دیکھ کر تائی امی نے اسے جانے کے لیے کہا مگر اس نے انکار کر دیا۔

''فرح بھی بہت اداس ہے ارم کے جانے سے اور وہاں اکیلے میں میرا دل بھی گھبراتا رہے گا چند روز بعد چلی جاؤں گی۔'' تائی امی اس کا گریز سمجھتی تھیں سو زیادہ اصرار نہیں کیا تھا۔ بابا جان تو اس کی خواہش کو اولیت دیتے تھے۔ اس لیے وہ بڑے اطمینان سے یہاں رک گئی تھی۔ مگر نجانے کیوں آخری لمحے تک اس کے دل میں بار بار یہ خواہش ابھرتی رہی کہ رافع سرسری ہی سہی مگر ایک بار اسے ساتھ چلنے کو کہیں مگر یہ خواہش، خواہش ہی رہی اور وہ اطمینان سے گوجرانوالہ روانہ ہو گئے۔

نانی اماں کا ٹیلی فون آیا تھا۔ وہ اصرار کر رہی تھیں کہ ایک بار وہ ان سے ملنے آئے' وہ اسے دیکھنا چاہتی تھیں۔

''کتنا عرصہ ہو گیا چندا میں ہر روز خواب میں تمہیں دیکھتی ہوں زندگی کا کیا بھروسا ہے آج ہوں کل نہیں' بس ایک بار آ جاؤ۔''

ان کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔ وہ بھی بے قرار ہو گئی۔ بابا جان سے ذکر کیا تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔

''دیکھ لو بیٹا تمہاری مرضی ہے اگر ان لوگوں کا رویہ تمہارے ساتھ بہتر ہے تو۔''

''بابا جان ان کی کڑوی کسیلی باتیں ان کے طعنے، تمسخر تو پہلے سے بھی بڑھ گئے ہوں گے مگر میں نانی اماں کے لیے سب کچھ برداشت کرلوں گی۔'' اسے راضی دیکھ کر بابا جان خود اسے نانی اماں کے پاس چھوڑنے گئے تھے۔ نانی پہلے سے بھی کمزور ہو گئی تھیں۔ پہلے تو وہ ان کی خدمت کیا کرتی تھیں مگر اب وہ نوکروں کے رحم و کرم پر تھیں۔ علیزہ کو سامنے دیکھا تو اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھامے آنسو بہاتی رہیں۔

''آج زرینہ بہت یاد آ رہی ہے علیزہ! وہ ہوتی تو تمہاری آؤ بھگت کرتی، تمہارے لیے اچھے اچھے کھانے بنواتی۔''

''آپ ہیں ناں نانی اماں! مجھے خوب پیار کریں خوب دعائیں دیں۔ رہی بات اچھے کھانوں کی تو وہ میں آپ کو کھلاؤں گی بتائیں کیا کھائیں گی آپ؟''

''ارے چندا تم نے کھانے پکانے بھی سیکھ لیے۔'' اس کی بات پر وہ حیران رہ گئی تھیں اور پھر رات گئے تک نانی اماں اس سے بات کرتی رہیں۔

''تمہارا شوہر کیسا ہے علیزہ؟'' نانی اماں نے اچانک ہی پوچھا۔

''بہت اچھے ہیں اماں۔'' (پورے جلاد ہیں۔)

''تمہاری شرارتوں پر زیادہ ڈانٹتا تو نہیں؟''

''بالکل نہیں۔'' (بس مارتے ہیں۔)

''اس کا خیال رکھا کرو بیٹی۔'' (رکھنے دیں تب ناں) نانی اماں اسے سمجھا رہی تھیں۔

''گھر بنتے بہت مشکل سے ہیں مگر ٹوٹنے میں ایک پل بھی نہیں لگتا۔'' نانی اماں کی آواز دکھ سے آشنا تھی۔

''جو گھر ابھی بنا ہی نہ ہو اس کے ٹوٹنے کا کیا ڈر؟'' اس نے چڑ کر سوچا تھا۔

☆☆☆

ارم کا فون جرمنی سے آیا تھا۔ وہ اپنی کھنکتی ہوئی آواز میں اسے شادی کی سالگرہ کی مبارک باد دے رہی تھی۔ اس کے حلق میں آنسوؤں کا گولا سا آ پھنسا تھا۔

''تو اتنے ڈھیر سارے روز و شب میں کیا آج کا دن بھی ایسا نہ تھا کہ تم مجھے یاد کرتے؟'' ریسیور آہستگی سے کریڈل پر رکھ کر وہ باہر لان میں آ گئی۔ شاید اس وقت وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سنگی بنچ پر بیٹھتے ہوئے اس نے ایک طویل اور گہری سانس لی تھی۔ عجیب، سردسی کیفیت نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔

نجانے کتنی دیر وہ چاند ستاروں اور گزرتی گھڑیوں سے بے نیاز، دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے وہاں بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔

★ ★ ★

نہ فکر فردا نہ یاد ماضی
نہ چین دل کو نہ بے قراری
نہ وصل کی لرزشیں نظر میں
نہ بے بسی ہجر کے سمے کی
نہ حد سے گزرا ہوا جنوں وہ
نہ بے کلی وہ پہلے جیسی
بس اک اداسی ہے دھیمی دھیمی
بس اک خاموشی ہے بیکراں سی
بس اک بے نام سی جلن ہے
بس اک بے درد سی تھکن ہے
جو زندگی کے ادھورے پن کو
حدوں سے آگے بڑھا رہی ہے

''چلو علیزہ بیٹی گھر چلنے کی تیاری کرو۔'' نانی اماں کے سوئم کے بعد بابا جان نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر شفقت سے کہا تو وہ چپ چاپ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس سے پہلے کئی بار اس نے اس جملے کے جواب میں نانی اماں کی صحت کا بہانہ بنا کر انہیں ٹال دیا تھا مگر اب یہاں رکنے کا کوئی جواز ہی نہ تھا۔

''یہ بھی اچھا ہی ہوا بیٹی، تم نے آخری وقت میں ان کی خوب خدمت کرلی۔ وہ بھی آخری وقت تمہیں اپنے پاس پا کر پرسکون رہی ہوں گی اور تمہارے دل میں بھی کسک باقی نہ رہی۔'' تائی امی اسے سینے سے لگائے دلاسا دے رہی تھیں۔

ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے واسع بھائی کے بارے میں پوچھا۔

''کہیں سر کھپا رہے ہوں گے بزنس ڈیلنگ کے سلسلے میں۔'' وہ خاصی جلی بھنی بیٹھی تھیں۔

''یہ جو بزنس مین ہوتے ہیں ناں ان کے پاس ہر کسی کے لیے وقت نکل آتا ہے سوائے بیویوں کے۔'' بھابی اپنا دکھڑا رونے لگی تھیں اور وہ خاصی محظوظ ہو رہی تھی۔

واسع بھائی اپنا ضروری کام نبٹانے کے بعد اسے لے کر گوجرانوالہ پہنچے تو دوپہر کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ گھر میں چوکیدار کے سوا کوئی بھی موجود نہ تھا۔ وہ کھانا بنانے کچن میں چلی آئی۔ مگر فریج میں سبزی گوشت نامی کوئی چیز بھی موجود نہ تھی۔ اس نے پیسے نکال کر ضروری چیزوں کی لسٹ بنا کر چوکیدار کو بھیجا اور خود گھوم پھر کر گھر کا جائزہ لینے لگی۔ صفائی غالباً روزانہ کی جاتی تھی اس لیے سب کمرے ٹھیک ٹھاک تھے۔

وہ رافع کا کمرہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو اس کی مخصوص خوشبو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا دل گداز ہونے لگا۔

ان کے قدموں کی مخصوص چاپ اجنبیت کا تاثر لیے، سیاہ خمار آلود آنکھیں، اس کے چہرے کا سیاہ تل، اس کی جھلی سی مسکراہٹ (جو صرف دوسروں کے لیے تھی) وہ بے بس سی ہو کر بیڈ پر گر گئی۔

''تم یہاں موجود نہ ہوتے ہوئے بھی یہیں ہو اور میں یہاں ہونے کے باوجود کہیں نہیں ہوں۔''

''بی بی جی۔'' شاید چوکیدار نے پکارا تھا۔

''کتنے بے رحم ہو رافع، بھلا جرم بتائے بغیر بھی کوئی اتنی کڑی سزا دیتا ہے؟'' وہ نڈھال سی اٹھ کر باہر آ گئی۔

''اس سے تو بہتر تھا گڑیا، تم زیتون بوا کو ساتھ ہی لے آتیں۔'' واسع بھائی نے اسے کھانا تیار کرتے دیکھا تو بے اختیار کہہ اٹھے۔ ان کے پکارنے کا اپنا ہی انداز تھا۔

''ارے نہیں بھیا بس ذرا سا تو کام ہے ویسے بھی زیتون بوا کی وہاں ضرورت ہے ارم کے جانے سے پہلے جیسی بات تو نہیں رہی ناں۔'' اس نے کٹا ہوا سبز دھنیا ہنڈیا میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''چوکیدار بتا رہا تھا رافع تو رات گئے گھر لوٹتا ہے۔ میں نے آفس فون کر کے میسج دے دیا ہے ہوسکتا ہے کھانے تک آ جائے۔'' انہوں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا اور جب واسع بھائی کے کہنے پر وہ میز پہ کھانا لگا رہی تھی تب اچانک ہی دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئے تھے۔ علیزہ کی بے قرار نظریں ان کے قدموں کو چھو کر واپس لوٹ آئی تھیں۔ تیزی سے دھڑکتے دل کو اس نے سختی سے ڈانٹا تھا۔

رافع نے واسع بھائی سے ملتے ہوئے اس کی بے توجہی کو پوری طرح نوٹ کیا تھا۔ کھانے کے بعد وہ چائے لے کر آئی تو دونوں بھائی اپنے کاروباری معاملات ڈسکس کر رہے تھے۔

''بھئی کہتے ہیں دولت عورت کی قسمت سے گھر میں آتی ہے اس لحاظ سے ہماری علیزہ تو بھاگوان ثابت ہوئی ہے۔'' واسع بھائی نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''جی ہاں، اس میں کیا شک ہے۔'' وہ جواباً بڑے اطمینان سے بولی تھی۔ رافع نے اپنی پوری توجہ چائے کے کپ پر مرکوز کردی تھی۔

واسع بھائی کے جانے کے بعد اس نے اپنے لیے ایک الگ کمرہ سیٹ کیا۔ دل کسی ضدی بچے کی طرح ایک مرتبہ پھر اٹھنے لگا تھا۔ اس نے بڑی بے رحمی سے تمام سر اٹھاتے جذبوں خواہشوں کو کسی نہاں خانے میں دھکیلا اور دل پر سرد مہری کا قفل لگا دیا۔ اس کے تڑپنے، مچلنے پکارنے کی صدا اسے برابر ستاتی رہی مگر اس نے کان بند کرلیے۔

''بہت بھاگ لیے تم اس بے مہر شخص کے پیچھے اب مزید نہیں برداشت کروں گی تمہاری گستاخیاں۔'' اس نے خوب طعنے دیے اس باغی کو جو سینے میں مچل رہا تھا۔ اس کے بعد اطمینان سے صائمہ کا نمبر گھمانے

لگی۔

فائن آرٹ اس کا خاص مضمون تھا۔ اس نے ایک قدرے الگ تھلگ کمرے میں اپنا سارا سامان سیٹ کرلیا۔ کالج سے واپسی پر اس کا زیادہ وقت اسی دلچسپ سرگرمی کی نظر ہوتا تھا۔ رافع اس کے چہرے پہ بلا کا اطمینان دیکھ رہے تھے اس کی کھوجتی نگاہیں اب مکمل جھجکی رہتی تھیں۔ پہلے وہ ٹی وی لاؤنج میں اس کی نظروں کے حصار میں رہتے تھے مگر اب تنہا بیٹھے چینل بدلتے رہتے علیزہ ان کو کھانا وغیرہ دے کر اپنے اسٹوڈیو میں گھستی تو پھر صبح ہی اپنی شکل دکھاتی اب تو ان کے درمیان وہ معمولی بات چیت بھی تعلق کا ذریعہ نہ رہی تھی جو اس سے پہلے سراسر علیزہ کی کوششوں کا شاخسانہ تھی۔

یوں لگتا تھا جیسے ان دونوں کے درمیان کوئی خاموش معاہدہ ہوا ہے جسے کوئی فریق توڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ رافع نے اگر اپنے گرد انتقام کی آگ سے جلتی فصیلیں کھڑی کی تھیں تو علیزہ برف کے قلعے میں مقید ہو کر رہ گئی تھی

★ ★ ★

شاہ خاور ہر روز نئی امید لے کر آتا مگر اس کی تپش برف کے قلعے کو پگھلا نہ سکی۔ رات ہر روز نم آلود چاندنی لیے اترتی مگر دہکتا الاؤ سرد نہ کرسکی۔ موسموں نے تھک ہار کر انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا اور گردن نیہوڑائے وقت کے منصف کو دیکھنے لگے' اب سارا فیصلہ اس کا تھا۔

گھر میں داخل ہوتے رافع کی سماعتوں سے کوئی جان دار قہقہہ ٹکرایا تھا اور ان کے قدم ایک لمحے کے لیے رک گئے تھے۔

''شاید زندگی ادھر آ بھٹکی ہے۔'' انہوں نے فٹ میٹ پر جوتوں کی گرد جھاڑتے ہوئے سوچا اور اندر داخل ہوگئے اگلا لمحہ شدید حیرت کا تھا۔ پر منگ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سیاہ نیٹ کے سوٹ میں کھلتی رنگت اور بے تحاشا ہنستی ہوئی وہ لڑکی۔

تُو قریب آ تجھے دیکھ لوں
تُو وہی ہے یا کوئی اور ہے

''سبرینہ۔'' ان کے منہ سے بے ساختہ ہی نکلا تھا اور ہنستی ہوئی سبرینہ ایک دم چونک گئی تھی۔

''ارے رافع۔'' وہ انہیں دیکھ کر بے اختیار ہی اٹھ کر قریب چلی آئی۔

''کتنی دیر سے آئے ہو تم! ہم کب سے تمہارا انتظار کر رہے تھے کیسے ہو تم؟''

وہ ان کے سامنے کھڑی مسلسل بول رہی تھی اور وہ اس کی آنکھوں کی نمی میں کھو گئے تھے۔

''بھئی علیزہ' اب تو کھانا لگا ہی دو بھوک سے جان نکل رہی ہے' کیوں رافع' کھانا تو کھاؤ گے ناں؟'' وہ پہلے علیزہ سے اور پھر رافع سے مخاطب ہوئی تھی۔

انہوں نے بغیر کچھ کہے بریف کیس رکھا علیزہ ان کے پاس سے گزر کر باہر چلی گئی تھی۔

''بیٹھو ناں تم کھڑے کیوں ہو؟'' سبرینہ کہتی ہوئی سامنے صوفے پہ جا بیٹھی تھی وہ جیسے گرنے کے سے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئے۔ خون جیسے رگوں میں رک رک کر دوڑ رہا تھا۔

''آنے سے پہلے اطلاع تو کر دی ہوتی۔'' وہ سر جھکائے کہہ رہے تھے۔

(خود کو سمیٹ لیتا تیار ہو جاتا تمہارا سامنا کرنے کو۔)

''بس سرپرائز دینے کے چکر میں ہی اطلاع نہیں دی۔ تم سناؤ کیسے ہو؟'' وہ ٹانگ پر ٹانگ جمائے مطمئن انداز میں پوچھ رہی تھی جواباً وہ بمشکل مسکرائے تھے۔

''ٹھیک ہوں (جی رہا ہوں) تم واپس کب آئیں؟''

''ایک ڈیڑھ ماہ تو ہوگیا ہے مجھے معلوم تھا تم تو ملنے کی زحمت نہیں کرو گے اس لیے خود ہی چلی آئی۔''

...ارہی تھی۔

''میرا خیال ہے علیزہ پکار رہی ہے۔'' وہ دونوں ...ر ڈائننگ ٹیبل تک چلے آئے۔ کھانے کے ...ان وہ مسلسل الجھتے رہے۔

''کیا یہ ضروری تھا سبرینہ تم یہاں آتیں اور ...کا احساس دلاتیں کہ تم نے ساری اذیتیں......''

''ارے رافع تم ٹھیک طرح سے کھا کیوں نہیں ...ہے؟'' سبرینہ نے انہیں خیالات سے چونکا دیا تھا ...علیزہ نے بڑے دھیان سے ان کی غائب دماغی کو ...محسوس کیا تھا۔

کھانے کے بعد علیزہ کافی بنالائی۔

''مجھے ذرا کچھ کام ہے آپ لوگ تو ابھی بیٹھیں ...گے ناں؟'' علیزہ نے مگ سبرینہ کے ہاتھ میں ...دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں مگر تم اطمینان سے اپنا کام نمٹاؤ' ویسے بھی ...آج پورا دن میں نے تمہیں خوب تنگ کیا ہے۔'' ...سبرینہ کھل کر مسکرائی تھی۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں میں نے بہت انجوائے ...کیا ہے۔'' علیزہ نے کھلے دل سے اعتراف کیا۔

''اور ہاں۔'' وہ دروازے کی طرف جاتے ...ہوئے پلٹی۔

''دودھ ابال کر میں نے فریج میں رکھ دیا ہے۔'' ...سبرینہ نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ اپنے اسٹوڈیو کی ...طرف چلی گئی۔

''علیزہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ مگر بولتی بہت کم ...ہے اور میں دیکھ رہی ہوں جب سے تم آئے ہو تم ...دونوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی کیا کوئی ناراضی ...ہے؟''

سبرینہ شرارت سے ان کی آنکھوں میں جھانک ...رہی تھی۔ رافع نے بے حد حیرت اور تعجب سے اس کو ...دیکھا تھا۔

''کیا یہ صرف پوز کر رہی ہے یا واقعی سب کچھ ...بھول گئی ہے۔'' وہ الجھ گئے تھے۔

''سبرینہ تمہیں یاد ہے تم کہا کرتی تھیں۔ رافع اگر تم نے میرے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچا تو میں خودکشی کرلوں گی۔'' ایک طویل چپ کے بعد انہوں نے کہا تھا۔

''اور یاد ہے تم نے آخری مرتبہ مجھ سے کہا تھا۔

''میں یہاں سے جا تو رہی ہوں مگر اپنا دل' اپنی روح' اپنا آپ یہیں چھوڑے جا رہی ہوں تمہارے پاس۔'' رافع نے اس کے چہرے پہ کسی دکھ، بے بسی کی تحریر پڑھنے کی کوشش کی تھی۔

''ارے ہاں۔'' سبرینہ کی ہنسی بہت بے ساختہ تھی۔

''وہ بھی کتنے مزے کے دن تھے' ہم کتنے جذباتی ہوا کرتے تھے۔ رافع' معلوم ہے جب تمہارے شادی ہوگئی تھی تو میں بھوک ہڑتال کر کے کمرے میں بند ہوگئی تھی' میرا خیال تھا اب زندگی میں کچھ باقی نہیں رہا اس لیے مجھے مرجانا چاہیے اور پتا ہے بعد میں یہ بات میں نے عامر کو بتائی تو مت پوچھو انہوں نے میرا کتنا مذاق اڑایا۔'' وہ کھل کر مسکرا رہی تھی۔

''میری ذرا سی جذباتیت نے سب کو پریشان کر کے رکھ دیا تھا سچ آج بھی میں ان دنوں کو یاد کر کے خوب ہنستی ہوں۔''

سبرینہ جیسے اپنے بچپن کی کسی شرارت کو یاد کر کے محظوظ ہو رہی تھی اور رافع کو محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کے پورے وجود میں تیز، نوکیلی سوئیاں پیوست ہوگئی ہیں اور وہ پتھر ہو چکے ہیں۔

''اوہ ایک منٹ میں ابھی آئی۔'' سبرینہ ایک دم چونک کر اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ رافع نے پوری قوت سے اپنے پھیپھڑوں میں اٹکا ہوا سانس کھینچا تھا۔

''جذباتیت ذرا سی جذباتیت محض جذباتیت۔''

انہیں لگا جیسے کمرے کی چھت کے پرخچے اڑ گئے ہوں اور چاروں دیواریں پھیلتی جا رہی ہوں' اس قدر

تیزی سے کہ چند لمحوں میں بھی اس کے اطراف سے غائب ہو گئی ہوں اور وہ تنہا لق ودق صحرا میں کھڑے رہ گئے ہوں حیران اور پریشان۔

''ارے کہاں کھو گئے بھئی؟'' سبرینہ کی آواز پر صحرا یک لخت سمٹ آیا تھا۔

''یہ دیکھو ذرا' میرا پیارا سا بیٹا۔ علی حسن۔'' سبرینہ ایک انتہائی خوب صورت بچے کو گود میں لیے سامنے بیٹھی تھی۔

''میرا تو خیال تھا اسے یہاں ایک ننھا سا دوست مل جائے گا مگر تم لوگ تو لگتا ہے ''اک میں اور اک تو'' کی مثال بننا چاہتے ہو۔

اچھا خیر چھوڑو یہ بتاؤ اس سے پہلے ہم کیا بات کر رہے تھے؟'' وہ اپنے بچے میں پوری طرح مگن تھی طمانیت اور سرخوشی اس کے چہرے، اس کے انداز و اطوار سے چھلک رہی تھی۔

''ہم؟'' رافع نے غائب دماغی سے اسے دیکھا۔

''ہاں ہم بات کر رہے تھے جذباتیت کی محض ذرا سی جذباتیت کی۔'' رافع کے وجود میں گڑی سوئیاں ایک ایک کر کے نکلنے لگی تھیں۔

''ہم اس جذباتیت کی بات کر رہے تھے جس پر تم اور تمہارا شوہر ہنستے رہے ہیں۔ اس جذباتیت کی جس کے عوض نجانے کتنے روز و شب کتنے ماہ و سال میرے وجود کو تلواروں کی طرح کاٹتے رہے۔ جس کے دھوکے میں، میں نجانے کس کس کا مجرم ٹھہرا۔ جس کی وجہ سے وہ علیزہ سزاوار نہ ہوتے ہوئے بھی تنہائی کی قید کاٹنے پر مجبور ہوئی۔ ذرا بتاؤ تو سبرینہ جن جذبات پر آج تم خود ہنس رہی ہو کیا وہ اس لڑکی کے وہ دن اسے لوٹا دیں گے جو پھول کی پتیوں سے نازک اور تتلی کے رنگوں سے رنگین تھے۔''

رافع نے ہنستی مسکراتی سبرینہ سے چیخ چیخ کر یہ سب کہنا چاہا تھا۔ پوچھنا چاہا تھا مگر سارے لفظ چپ کی گود میں کراہ کر رہ گئے تھے۔ رافع کو لگا یہ گونگا پن ابدی ہے اب وہ کبھی بول نہیں سکیں گے۔

''کیا یہ سب اس سے کہہ کر اسے مزید ہنسنے کا موقع دوں؟'' رافع نے آنکھ کی پتلیوں کو حرکت دی سبرینہ بچے کو گود میں ڈالے تھپک تھپک کر سلا رہی تھی بھری نظریں بچے کے چہرے پہ جمی ہوئی تھیں۔

رافع نے بدقت خود کو حرکت دی اور ہاتھ میں مگ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اس میں موجود کافی ٹھنڈی رنگ ہو چکی تھی وہ دونوں ہاتھوں پر زور دے کر اٹھے۔

''سونے جا رہے ہو؟'' سبرینہ نے رافع کو دیکھ کر کہا مگر وہ جواب دیے بغیر باہر نکل آئے تھے۔

''عورت اپنا پہلا پیار کبھی فراموش نہیں کر سکتی رافع نے کہیں پڑھا تھا...... ایک اور جگہ لکھا تھا۔

''کچی عمر میں دیکھا گیا خواب ٹوٹ جائے تو اس کی کرچیاں تا عمر روح میں گڑی رہتی ہیں۔'' اور انہوں نے تو یہ بھی سنا تھا۔

''مرد کلی کلی منڈلانے والا بھنورا ہے۔''

''تو پھر یہاں سب الٹ کیسے ہو گیا؟ کیا لکھنے والوں نے سب جھوٹ لکھا ہے۔

یا وہ اس تجربے سے آشنا ہی نہیں ہوئے جس سے آج میں گزرا ہوں۔'' وہ ابھی تک عالم بے یقینی میں تھے۔

''اور یہ عورت اس کے کس روپ کو تسلیم کروں کس روپ کو جھٹلاؤں؟ ایک سبرینہ ہے۔ جس نے تمام سال تک مجھے اپنی محبت کی زنجیر میں جکڑے رکھا اور آج وہ خود ان جذبوں کا مذاق اڑا رہی ہے۔''

اور دوسری وہ علیزہ ہے! پیار، محبت کا کوئی قول کہے سنے بغیر خود کو مجھ سے وابستہ کیے بیٹھی ہے۔ یا خدا کیا انسان ایسی ہی پیچیدہ اور گنجلک چیز ہے کہ صدیاں گزارنے کے بعد بھی کوئی نیا روپ لیے حیران کرنے چلا آتا ہے۔'' رافع نے دونوں ہاتھوں پہ سر گرا لیا۔

''اور اور کون کہتا ہے؟ مرد کی فطرت میں وفا نہیں اس کی سرشت میں بے وفائی ہی بے وفائی ہے' جھوٹ ہے سفید جھوٹ اگر ایسا ہے تو میں نے کس جذبے کے تحت اتنا وقت گزار دیا۔'' ان کا دل چاہا وہ چلا چلا کر لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کر لیں اور ان سے کہیں۔

''سنو ایک نئی بات سنو بے وفائی مرد سے منسوب ہے اگر ایسا ہوتا تو آج سبرینہ کے بجائے میں اس کے جذبوں پر ہنس رہا ہوتا۔'' وہ وحشت زدہ ہو کر لان میں یوں بیچ چکرا رہے تھے پھر جیسے تھک اس زمین پہ ٹیک دیے۔

سبرینہ اگلے روز ہی واپس چلی گئی تھی وہ پیپرز سے فارغ ہو گئی تھی اور اب اس حد تک فراغت تھی کہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے دیواروں کو تکتی رہ جاتی تھی مگر دن کسی طرح ختم ہونے میں نہ آتا تھا رافع ضرورت سے زیادہ ہی مصروف نظر آنے لگے تھے گھر میں موجود بھی ہوتے تو یوں گم صم کہ دوسراہٹ کا احساس تک جنم نہ لیتا۔

وہ ایسی ہی ایک بے حد اداس شام تھی درختوں کے سائے لمبے ہو گئے تھے پرندے ڈاروں کی صورت اپنے آشیانوں کی سمت جا رہے تھے وہ برآمدے کی سیڑھیوں پہ بیٹھی آسمان کے کناروں پر اترتے اندھیرے کو دیکھ رہی تھی اور اسی شام کا ایک حصہ لگ رہی تھی۔

اسی لمحے رافع کی کار کا ہارن سنائی دیا تو وہ اپنے خیالات کی دنیا سے لوٹ آئی چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا۔ گاڑی گیراج میں کھڑی کر کے وہ ہاتھ میں کچھ شاپر لیے اترے تھے۔ وہ یونہی بے دھیانی میں ان پہ نظریں جمائے انہیں اپنی طرف آتے دیکھتی رہی اور جب وہ عین اس کے قریب آ کر رکے تب وہ چونک گئی۔

''کل ایک پارٹی میں جانا ہے یہ سوٹ پہن کر تیار ہو جانا۔'' انہوں نے شاپر اس کے قریب رکھ کر کہا اور آگے بڑھ گئے۔

''یا اللہ ہمارے ایسے نصیب۔'' اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے شاپر میں سے سوٹ نکال کر دیکھا۔

ڈارک براؤن اور گولڈن کنٹراسٹ کا بے حد خوب صورت کرش سلک کا سوٹ تھا' اسے دل ہی دل میں داد دینی پڑی۔ ''چوائس تو بہت اچھی ہے۔''

''پارٹی کس وقت ہو گی؟'' انہیں چائے کا کپ پکڑاتے ہوئے اس نے سرسری سے انداز میں پوچھا تھا۔

''غالباً رات کا وقت ہے تم شام کو تیار ہو جانا۔''

عجیب کترائے سے انداز میں جواب ملا تھا۔ وہ کندھے اچکا کر وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

اگلے روز شام کو وہ اندازے سے ہی وقت دیکھ کر تیار ہوئی تھی۔ بہت عرصے بعد اس نے میک اپ کیا تھا کرلی بالوں کو اس نے یونہی کھلا چھوڑ دیا تھا اور گولڈن کلر کے خوب صورت جھمکے بھی پہن لیے تھے۔

معلوم نہیں کس قسم کی پارٹی ہے؟ کتنے لوگ ہوں گے؟'' وہ تیار ہوتے ہوئے مسلسل سوچ رہی تھی۔

''اور ان کے سنگ چلتی ہوئی کیسی لگوں گی میں۔''

اس نے آئینے میں اپنا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے بے اختیار ہی سوچا تھا۔ تیار ہونے کے بعد وہ یونہی ٹہلنے لگی تھی۔

''معلوم نہیں انتظار کی کیفیت اتنی تکلیف دہ کیوں

ہوتی ہے؟'' اس نے جھنجلا کر سوچا۔

''بندہ وقت تو ٹھیک طرح سے بتا دے۔ اب پارٹی بے شک گیارہ بجے ہو اور میں سات بجے سے تیار ہو کر بیٹھی ہوں۔'' اس نے کچھ لمحے سوچا اور رافع کے آفس فون کرنے لگی معلوم ہوا۔ کچھ دیر پہلے آفس سے نکلے ہیں۔ وہ مزید انتظار سے بچنے کے لیے ٹی وی کے سامنے آ بیٹھی۔ خاصے دلچسپ پروگرام آ رہے تھے وہ یونہی چینل بدل بدل کر دیکھتی رہی۔

''گھر سے آفس اتنی دور بھی نہیں کہ ڈیڑھ گھنٹے میں بھی نہ پہنچ سکیں۔'' اس نے گھڑی دیکھی اور پھر بور ہو کر ٹی وی بھی بند کر دیا۔ اب تو میک اپ، جیولری اور کپڑوں سے بھی کوفت ہونے لگی تھی۔ وہ باہر آ کر برآمدے میں ٹہلنے لگی اور چلتے چلتے لان میں آ گئی۔

''آخر ضرورت ہی کیا تھی اتنی جلدی تیار ہونے کی؟ بہت شوق ہو رہا تھا پارٹی میں جانے کا، وہ صاحب بے شک وہاں پارٹی میں ہنستے مسکراتے، ٹھنڈے ٹھار مشروب سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ مجھے بھول بھال کر۔'' وہ سارا غصہ اپنے اوپر نکالنے لگی تھی۔ ابھی نجانے وہ کتنی دیر خود کو اور رافع کو کوستی اگر ٹیلی فون کی گھنٹی شور نہ مچا دیتی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی لاؤنج میں پہنچی۔

''ہیلو۔''

''شادی کی دوسری سالگرہ مبارک۔'' دوسری طرف سے ارم کی جانی پہچانی آواز ابھری تو وہ چپ چاپ اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔ ارم نے جلدی جلدی نجانے اسے کتنی دعائیں دے ڈالیں۔ پھر اپنے شوہر کی طرف سے بیسٹ وشز کا پیغام دیا اور اس کے بمشکل کہے گئے۔

''تھینک یو۔'' کے جواب میں خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔

''کیا یہ دن ایسا تھا کہ ہم دونوں کی یادداشت سے خارج ہو جاتا۔'' اسے جیسے کسی زیاں کا احساس ہوا تھا۔

''مگر اس دن کی وقعت ہی کیا ہے؟ ایسا کون سا خاص واقعہ ہوا تھا اس روز بس چند کاغذات پر سائن ہی تو کیے تھے ہم دونوں نے۔'' اس نے اپنی بھیگی آنکھ بے دردی سے مسل ڈالا۔

''بہتر ہوگا ان کے آنے سے پہلے ہی یہ جوڑا پھینکو کیا اوقات رہ جائے گی تمہاری جب وہ پارٹی واپس آ کر کہیں گے۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔'' اس دل نے اسے وارننگ دی تھی۔

''ہاں میں نے بھی شاید اپنی ماں کی قسمت ہے۔'' اس کا دل بھر بھر آ رہا تھا۔

مگر کاش اے کاش۔

کبھی یوں بھی آ میری آنکھ میں
کہ میری نظر کو خبر نہ ہو
مجھے ایک رات نواز دے
پھر اس کے بعد سحر نہ ہو

اس نے دل کی گہرائیوں سے دعا کی تھی۔ اس لمحے قریب کوئی کھٹکا ہوا تھا اس نے بازوؤں میں سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اپنے کمرے میں جا رہے تھے ایک نظر بھی اس پر ڈالے بغیر وہ سخت آزردہ ہو کر کمرے میں جانے کے لیے اٹھی تھی۔

''علیزہ۔'' رافع نے اسے پکارا تھا۔ معلوم نہیں اس نے سنا نہیں یا جان بوجھ کر نظر انداز کر کے آگے بڑھی تھی۔

''علیزہ۔'' لہجے میں اتنی تکرار تھی کہ وہ پلٹے بغیر نہیں رہ سکی وہ دروازے میں کھڑی اس کے منتظر تھے۔

''یہاں آؤ۔'' وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ان کے قریب چلی گئی۔ انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر گویا اسے کمرے میں آنے کی دعوت دی تھی وہ نا سمجھی کے عالم میں انہیں دیکھنے لگی۔ تب وہ دروازہ کھول کر اسے ساتھ لیے کمرے میں داخل ہو گئے۔ پہلی نظر میں اسے یونہی محسوس ہوا تھا جیسے کمرے میں مکمل تاریکی ہو مگر چند لمحوں میں ہی کمرے کا ماحول پوری طرح واضح ہو گیا تھا اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تھی مگر وہ حیرت کے اس مقام پر تھی جہاں گرد و پیش کا ہوش نہیں رہتا۔ وسیع و عریض بیڈ گلاب کی پتیوں سے سجایا گیا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے سرخ گلابوں کی چادر یہاں سے وہاں تک بچھی ہوئی ہو، بائیں طرف پہ ایک میز انہی پتیوں سے سجائی گئی تھی۔ میز کے عین درمیان میں ایک بڑا سا کیک تھا جس پر ان دونوں کے نام کے پہلے حروف درج تھے۔ اس کے ساتھ کینڈل اسٹینڈ پر فل سائز کی دو موم بتیاں اپنی ہموار لو کے ساتھ کمرے میں روشنی پھیلا رہی تھیں۔

علیزہ نے بے حد آہستگی سے گردن موڑ کر رافع کو دیکھا گویا ذرا سی آہٹ پر یہ خواب ٹوٹ جائے گا رافع کے لبوں پر اس لمحے کتنی خوب صورت مسکراہٹ تھی۔

''رافع۔'' اس نے کچھ کہنا چاہا۔

''صرف تمہارے لیے۔'' انہوں نے بہت پیار سے اس کے جھمکے کو چھوا اس میں لگے نگینوں کی ست رنگ روشنیوں نے علیزہ کے چہرے کا احاطہ کیا تھا۔ وہ ایک ٹک ان کا چہرہ دیکھنے کو کتنا ترسی تھی وہ ان لمحوں کو اور ان کے ہونٹوں سے نکلنے والے ان لفظوں کو اور آج یہ سب ہو رہا تھا تو یقین کا کوئی سرا اس کے ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اور پھر نجانے کہاں سے ایک ننھا سا آنسو اس کی آنکھ میں جگمگایا اور پلکوں کی دہلیز پار کر کے گال پر آ ٹھہرا۔

وہ مہکتی پلکوں کی اوٹ سے
کوئی تارا چمکا تھا رات میں
میری بند مٹھی نہ کھولیے
وہی کوہ نور ہے ہاتھ میں

رافع نے اپنی پوروں سے اس آنسو کو چنتے ہوئے گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سرزنش کی اور پھر اسے لیے میز تک آ گئے۔ اسے کرسی پر بٹھایا اور خود عین اس کے سامنے کرسی سنبھالتے ہوئے سیاہ مخملیں ڈبیا میز پر سے اٹھائی۔ اسے کھولتے ہی انگوٹھی میں موجود ڈائمنڈ جگمگا اٹھا تھا۔ رافع نے نظر اٹھا کر اس کی لرزتی پلکوں کو دیکھا اور اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا تھا۔ انگوٹھی پہناتے ہوئے اس کے نازک ہاتھ کی لرزش رافع سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔

''علیزہ میں......'' علیزہ نے دیکھا وہ اس سے کچھ کہنا چاہتے تھے مگر الجھ بھی رہے تھے۔

''کچھ مت کہیں رافع بس خاموش رہیں اس لمحے بیتے ہوئے پل کا ذکر مت کریں کوئی سوال کوئی جواب کوئی وضاحت نہیں۔'' اس نے جیسے انہیں کسی مشکل گھڑی میں سہارا دیا تھا۔

''میں نے ہمیشہ آپ کا چہرہ پڑھ کر آپ کے دل کی بات جانی ہے۔ آج بھی لفظوں کا سہارا مت لیجیے گا۔'' اس نے بڑے سبھاؤ سے ان کی مدد کی تھی۔ وہ طمانیت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگے۔

''بس اتنا کہنے دو علیزہ کہ آج کی رات سہاگ رات ہے آج ہم دونوں مل کر ایک نئی زندگی کی ابتدا کریں گے۔ جس میں نہ پھول مرجھائیں گے اور نہ تتلیوں کے رنگ ماند پڑیں گے ٹھیک ہے ناں؟''

علیزہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بے اختیار مسکرا دی تھی اور پھر رات گئے تک ان سے سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہوئے مسکراتے ہوئے اور ان کے کندھے پہ سر رکھ کر غافل ہونے سے ایک لمحہ قبل اس نے سوچا تھا۔

''اس رات کی صبح کتنی حسین ہو گی من چاہی خوشبوؤں بھری صبح۔''

ابھی شام تک میرے باغ میں
کہیں کوئی پھول کھلا نہ تھا
مجھے خوشبوؤں میں بسا گیا
تیرا پیار ایک ہی رات میں



سویرا فلک

ایک قدم

ارسلہ نے چائے کی ٹرے لا کر درمیانی میز پر رکھ کر صوفے پر بیٹھنے کا قصد کیا ہی تھا کہ امی کی آواز نے اسے دہری ہوتی کمر کو زبردستی سیدھا کرنے پر مجبور کر دیا۔

"پھر خالی چائے لے کر چلی آئی ہو، پتا بھی ہے کہ شوگر کی وجہ سے میں زیادہ دیر تک خالی پیٹ نہیں رہ سکتی مگر یہاں پروا ہے کسے بھئی۔"

"سوری امی! اصل میں مجھے لگا ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے سیب کھایا تو شاید آپ......" ارسلہ نے وضاحت کر کے ان کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی تو انہیں مزید تاؤ آ گیا کہ بہو کی ہمت کیسے ہوئی، ان کی بات پر "اگر مگر" کرنے کی۔

"ہاں، ہاں۔ اب یہ ہی تو رہ گیا ہے کہ میرے کھانے پینے پر نظر رکھی جائے۔ دیکھو ذرا آدھا سیب تک گنوا دیا گیا ہے مجھے۔ بات سنو بی بی! تمہارا شوہر پہلے میرا بیٹا ہے، اس کی کمائی سے میں جو چاہوں کروں اور جتنا چاہوں کھاؤں پیوں۔ تم کون ہوتی ہو حساب کتاب رکھنے والی۔"

"قسم خدا کی امی! میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ میں کیوں چاہوں گی ایسا۔"

اب کی بار ارسلہ کی آنکھیں بھر آئیں اور اس نے ملتجی نگاہوں سے فرحین کو دیکھا تو وہ نظریں چرا گئی۔

ایسا نہیں تھا کہ اسے صحیح غلط کا فرق نظر نہیں آ رہا تھا مگر اس وقت امی کو کچھ کہنا، شعلے کو ہوا دینے کے مترادف تھا کیونکہ امی کو اپنے معاملات میں کسی کا بولنا، خصوصاً روک ٹوک کرنا قطعاً ناپسند تھا اور اس وقت تو وہ ویسے ہی غصے میں تھیں۔ ایسے میں فرحین کا کچھ بھی کہنا معاملے کو سدھارنے کے بجائے مزید بگاڑ دیتا۔ سو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی خاموش تماشائی بنی بیٹھی تھی۔ اپنی اور ارسلہ کی مشترکہ صورت حال کے باعث اس نے زبان کو فی الحال پابند ضرور کیا تھا مگر دل و دماغ کو تدابیر سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کیونکہ تین سالوں میں آج پہلی بار اسے اپنا اور ارسلہ کا درد مشترک لگا تھا۔ ایسے میں اس کا ضمیر اب اسے اکثر جھنجوڑتا تھا۔ حق کی جانب پہلا قدم اٹھانے کا فیصلہ اس نے کر ہی لیا تھا۔ بس مناسب وقت کے انتظار میں تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ لوہے پر چوٹ اسی وقت لگانی چاہیے جب وہ گرم ہو۔ فی الحال اس نے ارسلہ کو فرار کی راہ دکھائی۔

"ارسلہ! اب تم جو بھی سمجھی ہو۔ فی الحال اس بات پر دھیان دو کہ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ جا کر بسکٹ لے آؤ پھر تمہیں ہانڈی روٹی بھی دیکھنی ہو گی۔ بچے بھی اسکول سے آنے والے ہوں گے۔"

تب ارسلہ نمکین پانی حلق سے اتارتے ہوئے پلٹ گئی۔ اسے بھی فی الحال جائے وقوع سے غائب ہونے میں ہی اپنی عافیت نظر آئی مگر پلٹتے پلٹتے اس کے ذہن میں خیال آیا تو شامت کی ماری، بے چاری، دوبارہ امی سے مخاطب ہو گئی۔

"وہ امی! آٹا ختم ہو گیا ہے۔ رات کی روٹیاں تو ڈل جائیں گی البتہ ناشتے کے پراٹھوں کے لیے آٹا نہیں بچے گا۔"

"اللہ کی پناہ! ابھی تو چھ کلو منگوا کر دیا تھا۔ ہاں بھئی، اب کچن تو تمہارے حوالے ہے، سیاہ کرو یا سفید۔ جلدی جلدی الٹی سیدھی، بڑے بڑے پیڑے کر کے موٹی روٹیاں ڈالو گی تو آٹا ختم ہونا ہی ہے۔ یہ نہیں کہ نفاست سے چھوٹے پیڑوں کی پتلی روٹیاں ڈالو مگر ایسا سلیقہ ہوتا تو رونا کس بات کا تھا۔ جاؤ بی بی! تم سے تو کچھ کہنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے اور ہاں سنو! رات کے کھانے میں امجد بھی ہو گا۔ ماش کی دال کے دہی بڑے بنانا نہ بھولنا۔ بہت پسند ہیں اسے اور باقی پلاؤ تازہ دم لگانا۔ کوفتے میں خود بناؤں گی۔ میٹھا بھی شام سے پہلے تیار کر کے رکھو تاکہ کھانے کے وقت تک ٹھنڈا ہو جائے۔ اب جاؤ سر میں درد کر کے رکھ دیا میرے تو......"

امی نے منہ پھیر کر چائے کا کپ اٹھا کر لبوں سے لگایا تو ارسلہ بھیگی آنکھوں سے فرحین کو دیکھنے لگی اور پھر فرحین کے ہی خاموش رہنے کے اشارے پر ہمیشہ کی طرح دل کی بات دل میں لیے، بنا کوئی صفائی دیے منظر ہٹ سے گئی ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بھی امی کی طرح بدلحاظ ہو کر اپنے دل کی کہے۔ کم از کم خود پر لگے بے بنیاد الزاموں کی نفی تو کرے کہ اب اس گھر میں موجود لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو چکا ہے۔ کل آپ کے پوتا پوتی جو دلیہ اور کسٹرڈ کھاتے تھے، آج پوری روٹی اور پراٹھا کھاتے ہیں مگر وہ ان پچانوے فی صد بہوؤں میں سے تھی، جو اپنا مقدمہ نہیں لڑتیں کیونکہ جو پانچ فی صد لڑتی ہیں، ان کا انجام بھی ہار ہی ہوتا ہے۔

☆☆☆

آج امی کو فرحین کی طرف آنا تھا۔ امجد نے اسے خاص تاکید کی تھی کہ امی کی خاطر مدارت میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ خود اسے بھی احساس تھا، امی بہت خیال رکھتی تھیں اس کا۔ سو وہ صبح سے کچن میں لگی ہوئی تھی، دن کے بارہ بجے تک وہ کوفتے فرائی کر کے، پلاؤ دم کر کے اور ٹرائفل تیار کر کے رکھ چکی تھی۔ سلاد، رائتہ اور کوفتوں کی گریوی اس نے شام میں تیار کرنا تھی کیونکہ امی کو کسی عزیز کے یہاں سے ہوتے ہوئے اس کی طرف آنا تھا۔ وہ چولہا بند کر کے کچن سے باہر نکلی تھی کہ دروازے پر دستک کی آواز نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ وہ دوپٹہ شانوں پر پھیلا کر داخلی دروازے کی طرف آئی اور دروازہ کھولا تو امی کو دیکھ کر حیرت میں مبتلا ہو گئی۔

"ارے امی آپ...... آپ کو تو سمیرا آنٹی کی طرف سے ہوتے ہوئے آنا تھا ناں؟"

"ہاں بھئی۔ نکلنے سے پہلے فون کیا تو پتا چلا وہ اپنا نیا شناختی کارڈ بنوانے نادرا جا رہی ہے، میں تیار ہی تھی سو سوچا اب نکل ہی جاؤں۔ اب تم راستہ دو گی یا سارے سوال یہیں پوچھ لو گی۔" امی نے اسے گھورا تو وہ جھینپ کر فوراً پیچھے ہٹی۔

"اوہ، معاف کیجیے گا امی! خیال ہی نہیں رہا۔ آپ کو یوں غیر متوقع طور پر دیکھ کر۔ آپ آئیں بیٹھیں۔" اس نے امی کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔



پنکھا چلایا اور خود تیزی سے ٹھنڈا شربت بنا لائی۔ امی نے چادر اتار کر شربت کے چند گھونٹ لے کر اسے دیکھا۔ اس کی شرٹ پسینے میں بھیگی ہوئی تھی۔

”تم کیا کر رہی تھیں جو اتنی ہلکان ہو گئی ہو؟“

”کچھ نہیں امی! کھانا بنا رہی تھی۔“

”اتنی گرمی میں چولہے کے آگے کھڑے ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ تم اکیلی تو ہوتی ہو اور امجد نے ماسی کا انتظام کیا یا نہیں۔ ایک تو ایسی حالت ہے تمہاری، اوپر سے گرمی۔ جاؤ، جا کر نہاؤ اور سکون سے لیٹو۔ کھانا میں دیکھ لوں گی۔“

”ارے امی! اتنے دنوں بعد تو آنا ہوتا ہے آپ کا۔ امجد بھی کہہ رہے تھے کہ کوئی کمی نہ رہ جائے اور ماسی تو کئی دن سے ہے۔ میں تو رات کا بنا ہی کھا لیتی ہوں یا سیلڈ اور شیک یا لسی لے لیتی ہوں۔ شام میں ٹھنڈے وقت ہی بناتی ہوں۔“ اس نے انہیں مطمئن کیا۔

”امجد کو کہنا تھا کہ میں کوئی غیر نہیں۔ احساس کر لیتا ہے یہی بہت ہے اور تم اب آرام کرو بس۔“ امی نے اسے تقریباً دھکیلتے ہوئے نہانے بھیجا۔

وہ نہا کر نکلی تو اسے لٹا دیا اور پھر اس کے لاکھ منع کرنے پر بھی رات کا کھانا مکمل کرنے کے ساتھ ساتھ چکن کا سالن، کبابوں کا مسالا اور قیمہ مٹر بنا کر فریز کر دیا تاکہ اس گرمی میں چولہے کے آگے زیادہ دیر کھڑا نہ رہنا پڑے۔

رات کے کھانے کے بعد وہ چائے بنا کر لائی تو ان کے شانے سے سر ٹکا کر بیٹھ گئی۔

”سچ کہتے ہیں ماں واقعی ماں ہوتی ہے۔ کتنی طبیعت خراب رہتی ہے آپ کی مگر پھر بھی جب آتی ہیں مجھے ملنے نہیں دیتیں ورنہ امی جی تو جب بھی آتی ہیں کوئی نہ کوئی فرمائش سوچ کر آتی ہیں۔ بہو تمہارے ہاتھ کے ہانڈی کباب نہیں کھائے کب سے یا آج تو مٹن قورمہ کھلا دو۔“

”حد ہے امجد کی ماں کو یہ احساس نہیں کہ تم ماں بننے والی ہو‘ خود تو جیسے وہ انجان ہے اس تکلیف سے۔ اللہ ہدایت دے اس بے حس عورت کو۔“

امی نے اپنی اکلوتی بیٹی کا ماتھا بہت محبت سے چوما تھا، تب فرحین کو لگا کہ یہی موقع غنیمت ہے اپنے دل کی بات کو زبان پر لانے کا۔ اس نے امی کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور انہیں اپنی گود میں رکھ لیا اور اپنی تمام ہمت جمع کر کے گویا ہوئی۔

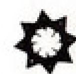
”صحیح کہا آپ نے، افسوس کا مقام تو یہی ہے کہ ہم عورتیں ہی عورتوں کا دکھ درد نہیں سمجھ پاتیں۔ ان کے دل کا حال نہیں دیکھ پاتیں۔ لیکن امی! میں نے ارسلہ کی تکلیف دیکھی ہے‘ وہ بھی تو تخلیق کے مرحلے سے گزر رہی ہے۔ وہ بھی یوں ہی ہلکان ہوتی ہوگی۔ اس کی امی بھی اپنی چھوٹی لاڈلی بیٹی کے لیے وہی محسوس کرتی ہوں گی جو آپ میرے لیے کرتی ہیں۔ امی! کیوں نہ آپ ارسلہ کے لیے بھی ویسا ہی سوچنا شروع کر دیں، جیسا کہ آپ چاہتی ہیں کہ امجد کی امی میرے لیے سوچنا شروع کر دیں۔“

فرحین نے جھکی نظروں سے اپنی بات مکمل کر کے سانس روک لی۔ وہ امی کے مزاج سے واقف تھی مگر آج ضمیر کے ہاتھوں حق بات کہنے پر مجبور ہوا ٹھی تھی۔

”فرحین میری بچی! تمہارا شکریہ۔ تم نے مجھے اللہ کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچا لیا۔ تم نے صحیح کہا بیٹا! کڑی سے کڑی ملتی ہے۔ اچھائی کا بدلہ اچھائی ہوتا ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں ارسلہ کا بھی ایسا ہی خیال رکھوں گی، جیسا تمہارا رکھتی ہوں۔“

فرحین کی آنکھوں میں حیرت اور چہرے پر خوشی کے رنگ چھا گئے اور دل رب کی گواہی پر اش اش کر اٹھا۔

”تم نیکی کی جانب ایک قدم بڑھاؤ میں دس قدم تمہاری جانب بڑھاؤں گا۔“



آمنہ ریاض

دشتِ جنوں

آئے کت کے ڈراموں نے اسامہ کو اس حد تک متاثر کیا کہ اس نے خود کو الماری میں بند کرلیا جہاں وہ دم گھٹنے سے مرگیا۔ آئے کت نے اسے بچانے کی کوشش بھی نہیں کی۔

اسامہ کی موت نے پاشا کی آنکھیں کھول دیں اور اس نے ساری سچائی کبیر کو اور کبیر نے معاویہ کو بتادی۔ آئے کت نے منصوبہ کے تحت معاویہ کو احساس جرم میں مبتلا کرنا چاہا مگر ناکام رہی۔ اپنی جھوٹی پریگنینسی اور مس کیرج کے ڈرامے سے اس نے معاویہ کی ہمدردی جیت لی۔ معاویہ کو پاشا جھوٹا لگنے لگا۔ اور اس نے محض آخری کال کرنے کی بنا پر شیرازی کو اسامہ کی موت کا ذمہ دار قرار دے دیا۔ معاویہ نے آئے کت کا چیک اپ کروایا جس سے اس کا جھوٹ سامنے آگیا وہ ماں بن ہی نہیں سکتی تھی مگر اس سے پہلے ہی آئے کت معاویہ کا رشتہ ٹھکرا کر ترکی چلی گئی تھی۔

آئے کت سمجھ رہی تھی کہ معاویہ اس کی حقیقت سے ابھی تک ناواقف ہے۔ اس لیے صاعقہ ممانی کے بھتیجے کی شادی میں شریک ہونے پاکستان آ گئی۔ جہاں معاویہ نے اپنے منصوبے کے تحت اسے شادی کے لیے راضی کر لیا۔ پاشا کا احساس جرم بڑھتا گیا جبکہ شہربانو نے جو اس کے باپ کے دشمن کی بیٹی تھی پاشا سے خفیہ نکاح کرنے سے انکار کردیا۔

اُنتیسویں قسط



"میں بتاؤں آئے کت کہاں ہے؟" منفرا نے پوچھا۔

خوش نصیب نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ "آپ جانتی ہیں؟"

منفرا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کرسی کی جانب اشارہ کیا اور بولی۔

"یہ ہے آئے کت! ہمارے سامنے بیٹھی ہے۔" خوش نصیب نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ ہونق نظر آرہی تھی۔ کیف کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ بھی یہ بات جان چکا ہے۔ وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

اور وہ...... آیو شمتی یا آئے کت...... وہ جو بھی تھی...... اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

"کوئی مجھے سمجھائے گا پلیز کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" کمرے میں چھائی خاموشی میں خوش نصیب کی آواز نے دراڑ ڈالی تھی۔

ان دونوں نے ہی کوئی جواب نہیں دیا۔

خوش نصیب کچھ لمحے باری باری ان کی شکل تکتی رہی اور جب اسے احساس ہوا کہ وہ دونوں ہی اس کی بات کا جواب نہیں دیں گے تو وہ منفرا کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"منفرا! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اگر...... اگر یہ لڑکی آئے کت ہے تو آیو شمتی کی سچائی کیا ہے؟ اور آپ کو کیوں لگ رہا ہے کہ یہ لڑکی آئے کت ہے؟" خوش نصیب کی آواز سے الجھن نمایاں تھی۔

منفرا نے بے بسی سے اس کی شکل دیکھی اور محض کندھے اچکا کر رہ گئی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے جنہیں وہ بہنے سے روکنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

"تمہارا کیا خیال ہے اگر یہ آئے کت نہیں ہے تو آئے کت کہاں ہے؟ اور یہ لڑکی کون ہے؟" فلور کشن پر بیٹھے کیف نے بے حس انداز میں پوچھا۔

"آ...... ظاہر ہے یہ آیو شمتی ہے اور آپ دونوں یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ آیو شمتی تو بہت...... بہت پہلے سے فلک بوس میں تھی۔" وہ کنفیوز ہو کر بولی۔

کیف نے اس کی لاعلمی پر سر جھٹکا۔

"ہے نا کیف؟ تم نے ہی تو آیو شمتی کی کہانی کے بارے میں بتایا تھا مجھے۔" خوش نصیب کو اس کے تاثرات پر غصہ آرہا تھا۔

"کم آن خوش نصیب۔ تھوڑا سوچنے کی کوشش کرو۔" کیف نے کہا تھا۔

"سچ تو یہ ہے کہ آیو شمتی کا کبھی کوئی وجود تھا ہی نہیں۔ آیو شمتی تو صرف ایک خوف کا نام تھا جو اس وادی کے لوگوں کے دل میں بٹھا دیا گیا تھا۔ ہر ایک کی اپنی کہانی...... اپنی سوچ...... اپنا ڈر اور اسی چیز کا فائدہ اٹھایا معاویہ اردشیر ازی نے۔" کیف پرسوچ انداز میں بول رہا تھا۔

"منفرا! کیا آپ کو بھی یہی لگتا ہے؟" وہ منفرا کی طرف مڑی جو کھڑکی کے پاس اپنا سر پکڑے کھڑی تھی۔

"واؤ۔" کیف کی آواز پر خوش نصیب مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

"یہ کہانی تو میری سوچ سے بھی آگے کی چیز نکلی۔ کس قدر چالاکی سے معاویہ اردشیر ازی سب کو بے وقوف بناتا رہا ہے۔" کیف استہزائیہ انداز میں بولا۔

منفرا اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

"تمہارا خیال ہے کہ معاویہ سر نے پچھلے آٹھ دس سالوں سے آئے کت کو یہاں بند کر رکھا ہے۔"

"میرا خیال نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہے۔"

"کیف! بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ آٹھ دس سالوں میں کسی کو معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ یہاں کوئی بدروح نہیں بلکہ جیتا جاگتا انسان قید ہے۔ دوسری بات یہ کہ منفرا اس سے پہلے بھی یہاں کئی بار آچکی ہیں، انہیں کیوں نہیں معلوم ہو سکا کہ یہاں کوئی قید ہے اور تیسری سب سے اہم بات یہ کہ وہ لڑکی یا بدروح۔ اپنے منہ سے بتا رہی ہے کہ وہ آیو شمتی ہے۔ اگر وہ آئے کت ہے تو وہ ایسا کیوں کہے گی؟"

"فرٹزل کیس کے بارے میں سنا ہے تم نے بھی؟" کیف نے پوچھا تھا۔

منفرا چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگی۔ "ہاں میں نے سنا ہے اس کیس کے بارے میں۔" اس نے تھکے ہوئے انداز میں کہا تھا۔ خوش نصیب سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

"دو ہزار آٹھ میں یہ کیس سامنے آیا تھا جب آسٹریا میں الزبتھ فرٹزل نامی بیالیس سالہ ایک عورت نے پولیس کے سامنے بیان دیا تھا کہ اسے پچھلے چوبیس سال سے اس کے باپ نے گھر کی بیسمنٹ (تہہ خانے) میں محصور کر رکھا تھا۔ بچپن میں وہ بچی باپ کی سختیوں کا شکار رہی تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں جب اس نے ایک انڈیپنڈنٹ لائف (آزاد زندگی) گزارنے کا فیصلہ کیا تو اس کے باپ نے اسے بیسمنٹ میں قید کر دیا اور پھر اگلے چوبیس سال اس لڑکی نے اپنی زندگی ایک قیدی کی حیثیت سے دنیا سے کٹ کر گزاری تھی۔" اتنا بتا کر منفرا خاموش ہو گئی۔

"مجھے یاد ہے کہ پاکستان میں بھی دس بارہ سال پہلے ایک ایسا کیس سامنے آیا تھا۔ جس میں ایک بھائی نے اپنی بہنوں کو کئی سالوں تک گھر کے اندر محصور کر کے رکھا۔ اس کیس کا کیا بنا، اس کا کیا نتیجہ نکلا تھا یہ تو مجھے یاد نہیں ہے لیکن۔ میرے اندازے کے مطابق یہ تب ہی کی بات ہے جب وسامہ طالب کو قتل کیا گیا تھا۔ عین ممکن ہے اسی کیس سے معاویہ کو یہ آئیڈیا ملا ہو۔" کیف نے منفرا کی بات کو ہی جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میرا نہیں خیال کہ اس وقت ہم مفروضے کی بنیاد پر بات کر سکتے ہیں اور وہ بھی اتنا بڑا الزام۔ تمہارے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں ہے۔ منفرا! آپ بھی اس کی بات سے متفق ہیں؟"

اسے یاد آیا کہ منفرا نے بھی آیو شمتی کو آئے کت قرار دیا تھا۔

کیف نے اس کی بات پر لاعلمی کے انداز میں کندھے اچکا دیے تھے۔

"دیکھو، میرے پاس کوئی بات ثابت کرنے کے لیے فی الحال کوئی ثبوت نہیں ہے۔ جہاں تک کسی کو اس بارے میں معلوم نہ ہونے کا ذکر ہے تو یقیناً ایسے حالات پیدا کیے گئے تھے کہ کسی کا دھیان اس طرف جاتا ہی نہیں۔ شہر بانو کے قتل کے بعد اس کا چہرہ بگاڑ دیا گیا تھا اور اس کے جسم پر آئے کت کے کپڑے تھے سو کسی کا اس طرف جانا ناممکن ہے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوتے ہوئے اپنے حساب کتاب بیان کر رہا تھا۔

"جہاں تک منفرا کی لاعلمی کا تعلق ہے تو یہ تو منفرا ہی بتا سکتی ہیں کہ انہیں معلوم کیوں نہیں ہو سکا۔ عین ممکن ہے انہیں اس سے پہلے یہاں اس طرح اکیلے رہنے کا موقع نہ ملا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس بارے میں پہلے سے جانتی تھیں اور اس کھیل میں برابر کی شریک تھیں۔" کیف منفرا کے چہرے کو دیکھتے ہوئے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کر رہا تھا۔

"اوہ پلیز......" منفرا نے ناگواری سے سر جھٹکا۔ "مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا اور...... اور تمہارا پہلا اندازہ ٹھیک ہے۔ میں یہاں کبھی اکیلی نہیں رہی۔" وہ بے بس سے لہجے میں بتا رہی تھی۔

"مگر پھر بھی...... یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ یہ لڑکی آئے کت ہے جبکہ وہ اپنے منہ سے خود کو آیو شمتی بتا رہی ہے۔" خوش نصیب نے کہا۔

''ہاں صرف یہ ایک پوائنٹ ہے جس پر مجھے بھی حیرت ہو رہی ہے۔'' کیف نے پرسوچ انداز میں کہا۔

''شاید...... شاید وہ ڈری ہوئی ہے اس لیے اپنی اصلیت چھپا رہی ہے۔'' منفرا جھجکتے ہوئے بولی۔

''ہاں یہ بھی ممکن ہے۔ اب سچ کیا ہے اس بارے میں تو صرف دو ہی لوگ بتا سکتے ہیں۔ معاویہ اردشیرازی یا پھر وہ انسان جو سب کو یہاں داخل ہونے سے روکتا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے بابا کبیر؟'' خوش نصیب نے پوچھا۔

''بالکل...... اور مجھے یقین ہے کہ اس سے سب کچھ اگلوانا، معاویہ اردشیرازی سے پوچھنے سے زیادہ آسان ہے۔''

کیف نے دروازے کی جانب مڑتے ہوئے کہا تھا۔ خوش نصیب تھک کر دوبارہ سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ جو کچھ بھی نظر آ رہا تھا اس پر یقین کرنا بے حد مشکل تھا۔

''اجازت ہے مسز معاویہ؟'' کیف نے دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔

منفرا نے ایک لمحے سوچا اور پھر تھکن بھرے انداز میں اثبات میں سر ہلا دیا۔ کیف بابا کبیر کو بلانے کے لیے باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

کیف کچھ ہی دیر میں بابا کبیر کو ساتھ لے کر آ گیا تھا۔

گھما پھرا کر پوچھنے کا نہ وقت تھا نہ ہی اب اس کی ضرورت تھی سو منفرا نے سیدھے سبھاؤ اسے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کا کہہ کر اس سے فلک بوس میں رہنے والی لڑکی کے بارے میں پوچھا تھا۔

کبیر کو اس کے سوال سے جھٹکا سا لگا۔ وہ فوراً سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور بازو کرسی کے ہتھوں پر جما لیے۔ اسے ذرا بھی امید نہیں تھی کہ وہ لوگ آئے کت تک جا پہنچیں گے۔

اگلے چند لمحے اس نے صرف یہ سوچنے میں صرف کیے کہ اسے اب کیا کرنا چاہیے۔ یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ لوگ اتنا ڈرانے کے باوجود رات گئے فلک بوس کی تلاشی لے ڈالیں گے ورنہ یقیناً وہ منفرا کو مطمئن کرنے کے لیے کوئی جواب سوچ کر رکھتا۔ اسے یقین تھا کہ آئے کت کی فلک بوس میں موجودگی کی دریافت کا سہرا کیف کے سر جاتا ہے۔ اس نے کھا جانے والی نظروں سے کیف کو گھورا۔

کیف کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ ابھی بھی منفرا کے سوال کے جواب کا منتظر اس پر نظر جمائے بیٹھا رہا۔

''بی بی...... آپ...... کیا بات کر رہی ہیں؟ یہاں فلک بوس میں کوئی لڑکی کیسے رہ سکتی ہے؟'' اس نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بات کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنے ہی بچھائے جال میں جا پھنسا تھا۔ اگر یہ کہتا کہ یہاں کوئی نہیں ہے تو آیو شمتی کی پھیلائی ہوئی اس کی اپنی کہانی جھوٹ ثابت ہو جاتی اور اگر اس بات پر ہی قائم رہتا تو منفرا کو کیا صفائی پیش کرتا۔ معاویہ نے سختی سے منع کیا تھا کہ منفرا کے سامنے ایسی کوئی بات نہ کی جائے۔

''ایک منٹ کبیر بابا!'' منفرا نے ہاتھ اٹھا کر ان کی بات کاٹی۔ ''مجھے صرف سچ سننا ہے۔ کوئی جھوٹ نہیں، کوئی بہانہ نہیں، نہ ہی کوئی سنی سنائی داستان۔ صرف ایک چیز جو میں فی الحال سننا چاہتی ہوں، وہ سچ ہے۔''

منفرا کا کرخت، حتمی لب و لہجہ کبیر کو چپ کرا گیا۔ اس کے پاس منفرا کے سوالوں کے جواب موجود تھے لیکن کیا وہ جواب دے دینے پر معاویہ اسے بخش دیتا۔ وہ جھرجھری لے کر رہ گیا۔

''میری بات سنو کبیر خان!'' کیف اپنی جگہ سے اٹھ کر عین اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ہاتھ کرسی کے بازوؤں پر جما کر وہ نیچے جھکا اور بغور اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر اور اس کی آنکھوں میں بھی بے تحاشا سرد مہری تھی۔

اپنے سے آدھی عمر سے بھی کم لڑکے کی ٹھنڈی ٹھار آواز جانے کیوں کبیر خان کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑا گئی۔ وہ اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی لمحہ بھر میں اس سے خوف زدہ ہوا تھا۔

''میں اپنی بات دہراؤں گا نہیں۔ اگر تم نے ہمیں سب سچ نہ بتایا تو میں ابھی پولیس کو بلا کر تمہیں اس کے حوالے کر دوں گا۔ مجھے یہ بات ثابت کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا کہ تم نے اپنے مالکان کی غیر موجودگی میں ایک لڑکی کو قید کر کے یہاں رکھا ہوا تھا۔''

کیف نے سرد مہری سے کہا اور اپنی بات جاری رکھی۔

''اور ہاں۔ صرف پولیس ہی نہیں، میں یہ بات میڈیا تک پہنچاؤں گا۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں خود صحافی ہوں اور یہ کام میرے لیے زیادہ مشکل نہیں ہے کہ تمہیں مجرم کے طور پر ساری دنیا کے سامنے لے آؤں۔ پھر پولیس تم سے کیسے سارا اقرار کروائے گی یہ اس کی مرضی۔ ویسے میرا نہیں خیال کہ تمہاری بوڑھی ہڈیاں پولیس کی مار برداشت کر پائیں گی۔ اب تمہیں خود کو بچانا ہے یا اصل مجرم کو۔ یہ فیصلہ کرنے کے لیے تمہارے پاس صرف ایک منٹ ہے۔''

اپنی بات مکمل کر کے وہ سیدھا ہوا اور واپس اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔

''میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ تم معاویہ اردشیرازی یا اس کے باپ سے کسی طرح کی امید نہ رکھنا۔ وہ اس معاملے کے سامنے آنے کے بعد تم سے ایسے قطع تعلق کریں گے جیسے تم کبھی موجود ہی نہیں تھے۔ یقیناً وہ ایک معمولی ملازم کے لیے اپنی ساکھ کو نقصان نہیں پہنچانا چاہیں گے اور ممکن تو یہ بھی ہے کہ وہ خود بھی تمہارے خلاف کارروائی کریں کیونکہ...... تم نے ایک لڑکی کو انہیں بتائے بغیر یہاں قید کر رکھا تھا۔ عین ممکن ہے اس میں تمہارا بیٹا بھی تمہارے ساتھ شامل ہو۔''

کبیر خان نہ چاہتے ہوئے بھی خوف زدہ ہو چکا تھا۔ اس کے سامنے دو ہی راستے تھے یا خود کو بچاتا یا معاویہ کو اور ایک عام انسان کی طرح اسے فی الحال اپنی اور اپنے بیٹے کی فکر، معاویہ سے کچھ زیادہ تھی۔

ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اس لڑکی سے کس حد تک واقف ہیں۔ آیا انہوں نے صرف اسے دیکھا ہے یا اس سے بات بھی کر چکے ہیں۔۔۔ اور یہ جانے بغیر وہ یقیناً سچ بتانے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔

وہ آخری حربے کے طور پر منفرا کی جانب متوجہ ہوا۔

''بی بی! یہ سب کیا ہے؟ معاویہ صاحب کی ہدایات سے ہٹ کر ہم پہلے ہی اسے یہاں پناہ دے چکے ہیں۔ وہ یقیناً اس بات پر بھی بہت خفا ہوں گے۔ اب یہ لڑکا الٹے سیدھے الزام لگا رہا ہے۔ یہ یقیناً معاویہ صاحب کے دشمنوں میں سے ہے جو ان کی ساکھ کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ یہ ایک بار چھپ کر فلک بوس میں داخل ہونے کی کوشش بھی کر چکا ہے۔ بی بی! میری بات کا یقین کریں میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ معاویہ صاحب کے آنے کا انتظار کر لیں۔ وہ آپ کو بہتر جواب دے سکیں گے۔''

منفرا نے بغور اس کی بات سنی اور پھر ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر کیف سے کہا۔

''کیف! تم پولیس کو انفارم کر دو۔ میرا نہیں خیال کہ وقت ضائع کرنے کی کوئی ضرورت ہے۔''

کبیر خان بھونچکا رہ گیا۔ ترپ کا پتا ضائع گیا تھا۔ معاویہ کا نام بھی منفرا کے ارادے کو بدل نہیں پایا تھا۔ کبیر خان نے جب کیف کو اپنی جگہ سے اٹھتے دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ اب کوئی اور چارہ نہیں۔ اگر پولیس یہاں آتی تو آیو شمتی کے ساتھ ساتھ وہ باتیں بھی سامنے آتیں جو معاویہ کے ساتھ اسے اور اس کے بیٹے کو بھی سلاخوں کے پیچھے لے جاتیں۔

"معاویہ امیر باپ کا بیٹا ہے۔ خود کفیل ہے اور سر پھرا ہونے کے باوجود اتنا قابل تو ہے کہ اس مسئلے کو اپنے طور پر سلجھا سکے لیکن اگر تجھ پر اور پاشا پر کوئی الزام آیا تو ہم کچھ بھی نہ کر پائیں گے۔"

کبیر خان نے دل ہی دل میں حساب کتاب مکمل کیا اور اپنی اور پاشا کی خیریت کی دعا مانگتے ہوئے وہ ان کے سوالوں کا جواب دینے پر راضی ہو گیا۔

"وہ...... وہ لڑکی آئے کت ہے۔ معاویہ صاحب کے بھائی وسامہ طالب کی بیوہ۔" کبیر خان نے اٹکتے ہوئے بات مکمل کی تھی۔

منفرا نے سختی سے آنکھیں میچ کر کھولی تھیں۔

دل ہی دل میں اپنے اندازے غلط ہونے کی مانگی ہوئی ساری دعائیں مٹی کا ڈھیر بن گئی تھیں۔

آنکھ سے ٹپکنے والے واحد آنسو کو اس نے غیر محسوس انداز میں صاف کیا۔

"بولتے جائیں کبیر خان!" اس نے بابا کا اضافہ کرنا ضروری خیال نہیں کیا تھا۔

"مجھے ایک ایک بات تفصیل سے سننی ہے۔ ابتدا ہم آئے کت سے سن چکے ہیں، اختتام آپ بتائیں۔ شہر بانو کے قتل کے آپ واحد چشم دید گواہ تھے۔ اس کے قتل کے بعد کیا ہوا تھا۔ آپ اب تک کن فوائد کو حاصل کرنے کے لیے فلک بوس اور آئے کت کی نگرانی کر رہے ہیں اور جن کی خاطر آپ نے تمام حقائق سے نگاہ چرا کر اپنا منہ سی لیا تھا۔ سب سے بڑھ کر آئے کت خود کو آیوشمتی کیوں سمجھتی ہے؟" منفرا نے سختی سے کہا۔

کبیر کا بدترین شک صحیح ثابت ہوا تھا۔ وہ لوگ نہ صرف آئے کت کو دیکھ چکے تھے بلکہ اس سے کچھ نہ کچھ حقیقت بھی جان چکے تھے۔ اسے اندازہ تھا کہ آئے کت انہیں کیا کچھ بتا چکی ہے۔ کیونکہ اس کی اپنی کہانی وہ بہت بار اس کے ہی منہ سے خود بھی سن چکا تھا۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولنا شروع کیا۔

"تین چیزوں کو فتنہ کہا گیا ہے بی بی! زر...... زن...... اور اولاد۔ آئے کت کو زر کی چاہ لے ڈوبی۔ معاویہ اور وسامہ صاحب کا بیڑہ زن نے ڈبو دیا اور مجھے...... مجھے...... میری اولاد کی محبت نے اپنا منہ بند رکھنے پر مجبور کر دیا۔"

وہ بہت مجبور دکھائی دے رہا تھا۔

سڑیل، بدمزاج اور غصیلا بوڑھا، جس کے ہاتھ میں ہر وقت لاٹھی اور ماتھے پر تیوریاں رہتی تھیں، فی الوقت غائب تھا۔ اس کی جگہ ایک مجبور اور بے بس باپ نے لے لی تھی۔

"جس رات آئے کت بظاہر فلک بوس سے غائب ہوئی تھی، رات گئے میں اور معاویہ صاحب چھپ چھپا کر پاشا کی تلاش میں نکلے تھے کیونکہ صرف آئے کت ہی نہیں پاشا بھی فلک بوس سے غائب تھا۔ میرا دل پاشا کی جانب سے صاف نہیں تھا۔ وہ بے وقوف ایک بار پہلے بھی آئے کت کی باتوں میں آ کر اپنا نقصان کر چکا تھا۔ مجھے شک تھا کہ اس بار بھی آئے کت خود فلک بوس سے گئی ہے اور اس کو بھگانے میں پاشا کا ہاتھ ہے۔"

وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔ وہ تینوں بہت غور سے اس کی بات سن رہے تھے۔

"فلک بوس میں اس وقت تھوڑے سے لوگ ہی موجود تھے۔ زیادہ تر مہمان دلہن کے غائب ہونے کے بعد افسوس کرتے ہوئے واپس چلے گئے تھے۔ معاویہ کے بہت زور لگانے کے باوجود اردشیرازی پولیس کو اس معاملے میں شامل کرنے پر راضی نہیں ہوئے تھے۔

ان کے اپنے کمرے میں جانے کے بعد میں نے بہت ہمت کر کے معاویہ صاحب سے اس بارے میں بات کی اور میرے لیے بڑی حیرت کی بات تھی کہ معاویہ صاحب بغیر کسی پس و پیش میرے ساتھ چل پڑے۔ مجھے لگا، وہ خود بھی شاید اسی نہج پر سوچ رہے تھے۔ لیکن جو سچ تھا، وہ بہت بعد میں میرے سامنے آیا تھا۔

ہم دونوں رات گئے پاشا کو ڈھونڈنے نکلے تھے اور آئے کت کو بھی۔ ہم جنگل میں تھے جب ہم نے ایک نسوانی چیخ سنی۔ وہ جو کوئی بھی تھی، بہت اذیت سے چیخی تھی اور ہمارے کہیں آس پاس ہی موجود تھی۔ ہم دونوں اس طرف بھاگے۔ آپ نے کہا نا بی بی کہ میں واحد گواہ تھا شہر بانو کے قتل کا تو ایسا نہیں ہے۔ معاویہ اردشیرازی بھی اس واقعے کا گواہ ہے اور اسی چیز نے مجھے آج تک خاموش رکھا ہے۔"

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا تھا۔

منفرا نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ معاویہ کے حوالے سے کچھ اور ظالمانہ انکشافات سننے والی ہے۔

☆☆☆

وہ دونوں بھاگتے ہوئے اس طرف آئے جہاں سے چیخ کی آواز سنائی دی تھی۔

اگلے چند ہی لمحوں میں وہ اس جگہ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جھاڑیاں ہٹاتے ہوئے جب وہ وہاں پہنچے تو پاشا شہر بانو کو قتل کر چکا تھا اور اب انتہائی بے دردی سے اس کے چہرے کو بگاڑ رہا تھا۔

کبیر شاک سے نکل کر تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور اسے گریبان سے پکڑ کر پیچھے کی جانب کھینچا تھا۔

اس عمل سے پاشا جیسے ہوش میں آ گیا تھا۔

اب وہ خود بھی ہکا بکا سا سامنے پڑی لاش کو تک رہا تھا۔

یہ کیا کر دیا تھا اس نے۔

کیسا غصہ تھا...... کیسی دیوانگی تھی...... جو سب بہا کر لے گئی تھی۔ وہ کانپ کر رہ گیا۔

"یہ...... یہ......" اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی مگر اس کی بات منہ میں ہی رہ گئی تھی۔ کبیر خان کا اٹھتا ہوا ہاتھ پاشا کے چہرے پر نشان چھوڑ گیا تھا۔

اسی وقت معاویہ بھی، جو بہت دیر سے پیچھے کھڑا سارا تماشا دیکھ رہا تھا، آگے آ گیا۔

"یہ تم نے کیا کیا پاشا خان؟"

اس کے لہجے میں مصنوعی افسوس تھا۔ ملامت تھی۔ پاشا اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا۔ وہ یہ بھی نہ کہہ سکا کہ مجھے بدلہ لینے کی ترغیب تم نے ہی تو دلائی تھی۔

پاشا کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی تھی۔ وہ سر پکڑے کھڑا تھا۔

"تم...... کسی کی جان کیسے لے سکتے ہو؟" کبیر خان کانپتی ہوئی آواز میں بولا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس وقت کرے تو کیا کرے۔ وہ اپنے عمل سے خود بھی اتنا شاکڈ تھا کہ فی الحال سب باتیں اس کے سر پر سے گزر رہی تھیں۔

"واپس چلو۔ اسے یہاں ہی چھوڑ دو۔" معاویہ نے سرد آواز میں کہا۔

"مگر صاحب......!" کبیر خان نے کہنا چاہا۔

"کبیر بابا! آپ کو آپ کا بیٹا عزیز ہے یا نہیں؟ اگر کوئی اور چیخ سن کر یہاں آ گیا تو پاشا کو کوئی نہیں بچا پائے گا۔"

کبیر خان نے تقریباً کانپتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور واپس جانے کے لیے مڑ گیا۔ معاویہ نے پاشا کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ وہ واپس جانے سے پہلے آخری کام کرنا نہیں بھولے تھے۔ اس اندھیری رات میں، چند درختوں، سرد ہوا اور ان تینوں کے علاوہ کوئی نہیں جان سکا کہ اس رات جنگل سے ملنے والی لاش شہر بانو کی تھی۔ نہ کہ آئے کت کی۔ کبیر بابا کو ڈرا دھمکا کر ساتھ ملانا معاویہ کے لیے کچھ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ معاویہ نے اپنے وعدے کے مطابق پاشا کو باہر بھجوا دیا۔ بدلے میں کبیر خان کو ساری زندگی کے لیے فلک بوس اور آئے کت کی

نگرانی کا کام سونپ دیا گیا۔

☆☆☆

''میری اولاد میرے لیے فتنہ ثابت ہوئی۔ پاشا کو بچانے کے لیے میں نے ان کاموں کی بھی حامی بھر لی جو شاید میں کرنے کا سوچتا بھی نہیں۔ جب میں نے پاشا کو، معاویہ کو آئے کت کی حقیقت بتانے پر مجبور کیا تھا۔ تب میں جانتا تھا کہ معاویہ غصہ کرے گا لیکن پاشا کو معاف کر دے گا لیکن جب میں نے معاویہ کو آئے کت کو وہاں قید کرتے دیکھا تو میں نے جان لیا کہ اگر میں نے اپنی زبان بند رکھ کر اس کی بات نہ مانی تو اس زمین پر میری داد رسی کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔''

وہ اپنی بات مکمل کر کے ہانپنے لگا۔ بڑی لمبی مسافت طے کی تھی اس نے اس ایک گھنٹے میں۔

کیف نے دیکھا کہ منفرا بے چینی سے اپنے دونوں ہاتھوں کو مل رہی تھی۔ کیف کو بے ساختہ اس پر ترس آیا لیکن یہ وقت ہمدردی جتانے کا نہیں تھا۔

وہ ایک بار پھر کبیر کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''کیا تم لوگوں کے علاوہ بھی کوئی آئے کت کی حقیقت سے واقف ہے؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''نہیں۔ آئے کت کو فلک بوس میں آیوشمتی کی حیثیت سے بند کیا گیا تھا اور آیوشمتی کی موجودگی کو وادی کے لوگوں میں، میں نے اس طرح پھیلا دیا کہ لوگ فلک بوس کے قریب سے گزرتے ہوئے بھی ڈرنے لگے۔'' کبیر نے جواب دیا۔

''تم لوگوں نے آیوشمتی کی فلک بوس میں موجودگی کو تو ثابت کر دیا۔ مگر آئے کت کو خود کو آیوشمتی کہنے پر کیسے مجبور کیا؟'' اب کی بار سوال خوش نصیب کی جانب سے آیا تھا۔

کبیر نے لمحہ بھر کے لیے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا اور پھر سے سر جھکا لیا۔

''میں نہیں جانتا۔ فلک بوس میں قید کیے جانے کے کچھ عرصے بعد اس نے خود کو آیوشمتی کہنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے ایسا کئی کئی دن کے بعد ہوتا تھا پھر ایک وقت آیا جب اس دورے کا درمیانی وقفہ کم ہوتے ہوتے بالکل ہی ختم ہوگیا اور وہ خود بھی بھول گئی کہ وہ آیوشمتی نہیں بلکہ آئے کت ہے۔''

''کیا تم لوگوں نے اسے کسی ذہنی یا جسمانی ایذا سے بھی گزارا تھا جس نے اس کی ذہنی حالت کو اس حد تک خراب کر دیا؟'' منفرا نے تھوک نگل کر سوال کیا تھا۔

''نہیں بی بی! بالکل بھی نہیں......'' کبیر نے فوراً نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''آئے کت کی گمشدگی والی رات کے بعد وہ لوگ صرف ایک دن یہاں رکے تھے۔ اس دوران بھی معاویہ صاحب صرف ایک بار آئے کت سے ملے تھے۔ آئے کت سے ان کی کیا بات ہوئی میں نہیں جانتا لیکن جانے سے پہلے انہوں نے ہمیں ہدایت کی تھی کہ آئے کت کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچنا چاہیے سوائے اس کے کہ وہ فلک بوس سے باہر کی دنیا کو اب کبھی نہ دیکھ پائے۔ اس کا مکمل خیال رکھنے کی ہدایت دی گئی تھی۔

شروع میں آئے کت نے بہت شور مچایا۔ اس سے ہمیں یہ فائدہ ہوا کہ وادی والوں میں سے جس نے بھی اس کی چیخیں سنیں ان کا ایمان آیوشمتی پر مزید پکا ہوگیا۔ آئے کت نے کھانا پینا تک چھوڑ دیا مگر کب تک...... چند دن تک تنگ کرنے کے بعد وہ خود ہی ٹھیک ہوگئی۔ شاید اس نے اس بات کا یقین کر لیا تھا کہ اسے اب ساری زندگی اسی قلعہ میں قید ہو کر گزارنی ہے۔

اس کے بعد معاویہ پورے ایک مہینے کے بعد آیا اور اس نے آئے کت کو اس دوران آیوشمتی کہہ کر ہی مخاطب کیا۔ یہی ہدایت مجھے کی گئی تھی کہ اسے اب اسی نام سے پکارا جائے۔ وہ آیوشمتی بن کر وسامہ صاحب کو

اراتی رہی تو معاویہ نے اسے ہمیشہ کے لیے آیوشمتی کا درجہ دے دیا۔ وہ جب بھی آتے اس کے سامنے آیوشمتی کی کہانی کو دہراتے۔ اسے یہی بتاتے کہ آیوشمتی نے کیسے ان کے بھائی کی جان لی تھی کہ میں نے اسے کئی بار آئے کت کے سامنے اس کے اغوا کی کہانی کو بھی دہراتے سنا تھا جواب آئے کت آیوشمتی کے طور پر دہراتی ہے۔''

خوش نصیب جھرجھری لے کر رہ گئی۔ اسے معاویہ کی ذات سے عجب خوف محسوس ہوا تھا۔

کیف نے منفرا کی جانب دیکھا تو وہ بولی۔

''شاید شدید ڈپریشن یا کسی اور ذہنی بیماری نے اسے ایسا کر دیا۔''

''ہاں......شاید......'' کیف اس کے علاوہ کچھ کہہ نہیں پایا۔

اس کے بعد کبیر کو وہاں سے جانے کی اجازت مل گئی لیکن اسے واپس بھیجنے سے پہلے کیف نے اسے مزید ڈرانا دھمکانا ضروری سمجھا تاکہ وہ کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش نہ کرے۔

☆☆☆

کبیر کے جانے کے بعد وہ تینوں چپ چاپ سر جھکائے بیٹھے رہے۔

تینوں ہی اپنی اپنی جگہ سوچ میں گم تھے۔ بات کہاں سے شروع کی جائے، تینوں ہی سمجھنے سے قاصر تھے۔ کمرے میں گہری خاموشی کا راج تھا جس میں کبھی کبھار باہر سے آنے والی پرندوں کی آوازیں خلل ڈال رہی تھیں۔

بالآخر خوش نصیب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے کیف کو بھی اٹھنے کا اشارہ کیا۔

''آپ کچھ دیر آرام کر لیں منفرا!'' وہ نرمی سے بولی اور باہر کی جانب بڑھ گئی۔

کیف نے بھی اس کی پیروی کی۔ باہر نکلنے سے پہلے اس کے کانوں میں منفرا کے موبائل کی بیل گونجی۔

اس نے اکتائے ہوئے انداز میں سیل فون اٹھایا۔ شاید سگنلز بحال ہوگئے تھے۔

معاویہ کا نام اسکرین پر جگمگا رہا تھا۔ وہ جو اس نام کو اپنے موبائل کی اسکرین پر دیکھنے کے لیے اتنے دن میں ترس گئی تھی، اس وقت شدید کوفت کا شکار ہوئی۔ وہ کم از کم اس وقت، اپنی موجودہ ذہنی حالت کے ساتھ معاویہ سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

کال بند ہوئی اور چند ہی لمحوں میں پھر سے سیل فون بج اٹھا۔ معاویہ بات کیے بغیر جان چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

منفرا نے اکتا کر یس کا بٹن پریس کیا اور سیل فون کان سے لگا لیا۔

''ہیلو......منفرا!'' معاویہ نے پکارا۔

منفرا کو اس کی آواز سے بھی وحشت ہوئی تھی۔

''منفرا! آواز آرہی ہے؟'' معاویہ نے دوبارہ سے پکارا تھا۔

''آ......ہاں......ہاں......'' منفرا نے چونک کر بے ربط سے چند الفاظ بولے تھے۔

''کیسی ہو میری جان؟ میرے بچے کیسے ہیں؟ تم لوگ ٹھیک تو ہو؟'' معاویہ نے بے چینی سے پوچھا۔

وہ کبھی ہمارے بچے نہیں کہتا تھا۔ ان کے بچے صرف ''اس کے'' بچے تھے۔

''سب ٹھیک ہے۔'' منفرا نے سرد مہری سے جواب دیا۔ معاویہ ایک لمحے کے لیے خاموش سا ہوگیا۔

''کیا بات ہے منفرا؟ مجھے تم ٹھیک نہیں لگ رہیں۔'' معاویہ نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''میں جانتا ہوں تم بہت خفا ہو۔ مگر یار میرا کیا قصور ہے۔ تم یقین کرو میں پوری کوشش کر رہا تھا تم لوگوں تک پہنچنے کی مگر سب راستے بند تھے یار! میں بہت پریشان ہو گیا تھا۔ نہ تم لوگوں تک پہنچ پا رہا تھا، نہ کانٹیکٹ کر پا رہا تھا۔''

منفرا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ معاویہ کا محبت بھرا لہجہ اسے رلانے لگا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ معاویہ اس سے جو اتنی محبت جتا رہا ہے وہ سچ ہے یا نظر کا کوئی دھوکا۔

''بہت ناراض ہو؟'' معاویہ نے پھر سے پچکارا۔

''نن...... نہیں تو......'' منفرا نے بمشکل جواب دیا۔

''پوچھو گی نہیں میں کیسا ہوں؟''

''نہیں...... کیوں کہ میں جان چکی ہوں کہ تم کیسے ہو؟'' منفرا سپاٹ سے انداز میں بولی۔

''کیا مطلب؟'' معاویہ ٹھٹکا۔ ''منفرا! سب ٹھیک تو ہے نا؟ کچھ ہوا ہے کیا وہاں پر؟''

''نہیں...... ہونا کیا تھا۔ سب ٹھیک ہے۔ تم بتاؤ واپس کب آ رہے ہو؟'' اب کی بار منفرا نے خود پر قابو پایا۔ وہ فون پر معاویہ کو کٹہرے میں نہیں کھڑا کرنا چاہتی تھی اور نہ ہی وہ چاہتی تھی کہ معاویہ کسی بھی طرح ٹھٹکے اور جب وہ اس کے سامنے آئے تو کچھ مزید کہانیاں تیار کر چکا ہو۔

''دراصل ایک مسئلہ ہے۔ میں یہاں پھنس کر رہ گیا ہوں۔ یہاں فیکٹری میں مزدوروں نے اسٹرائیک کر دی ہے اور میں ان سے معاملات طے کیے بغیر یہاں سے نکل نہیں سکتا۔ میں نے بابا سے بات کی ہے وہ ایک دو دن میں یہاں پہنچ جائیں گے اور پھر ہم اکٹھے ہی بشام آئیں گے۔ تم بتاؤ تم وہاں مینج کر لو گی؟'' اس نے اپنی مجبوری کی پوری داستان سنا کر پوچھا۔

اور منفرا...... اس نے سکون کا سانس لیا۔ اگر معاویہ اتنی جلدی واپس نہیں آ رہا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اس مسئلے کو سلجھانے کا اس کے پاس مزید کچھ وقت موجود ہے۔

''اٹس...... اٹس اوکے۔ میں سنبھال لوں گی سب۔ تم ٹینشن مت لو اور آرام سے اپنا کام مکمل کر لو۔''

''مجھے بتاؤ وہاں سب ٹھیک ٹھاک ہے؟ تم لوگوں کو کوئی ایشو تو نہیں ہوا؟ اگر کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ۔ میں خود نہ بھی آ سکا تو پاشا کو بھیج دوں گا۔'' معاویہ نے پوچھا۔

''ایشو کیا ہونا تھا۔ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔'' منفرا اب کی بار لاپروائی سے بولی تھی۔

''چلو اچھی بات ہے۔ تم ایک کام کرنا۔ جب کبیر بابا آئیں تو میری ان سے بات کروا دینا۔ میں انہیں کال کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں مگر ان سے بھی رابطہ نہیں ہو سکا۔ ان کا سیل بھی آف آ رہا ہے۔ تم یاد سے میری بات کروا دینا۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔ میں کروا دوں گی بات۔''

وہ لوگ نہ صرف کبیر بابا کا موبائل اپنے قبضے میں لے چکے تھے بلکہ ان کے فلک بوس سے باہر جانے پر بھی پابندی لگا دی تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ معاویہ اور کبیر کا رابطہ کسی بھی طرح بحال ہو اور کبیر موقع پاتے ہی معاویہ کو یہاں کی صورت حال سے آگاہ کر دے۔

کچھ دیر مزید بات کرنے کے بعد منفرا نے وسامہ کے رونے کا بہانا کر کے کال بند کر دی تھی۔

صوفے کی پشت سے سر ٹکائے وہ اس وقت آئے کت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

خوش نصیب آہستہ آہستہ چلتی برآمدے کی سیڑھیوں میں آ بیٹھی۔

کیف نے بھی اس کی پیروی کی۔

''کیف! اب کیا ہو گا؟ ہم اب کیا کریں گے؟'' خوش نصیب نے پریشان سے انداز میں پوچھا تھا۔ انداز ایسا جیسے کوئی چھوٹا بچہ شرارت کے بعد ماں سے مسئلے کا حل پوچھ رہا ہو۔ کیف کے چہرے پر نہ چاہتے ہوئے بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اس وقت کرنا تو ہمیں ناشتہ چاہیے مگر اگر تم کچھ اور کرنا چاہ رہی ہو تو بتا دو...... سیر کرنے وادی میں بھی جا سکتے ہیں۔''

خوش نصیب جھنجھلا گئی۔ اسے اس وقت بھی مسخرہ پن سوجھ رہا تھا۔

''تم تھوڑی دیر کے لیے سیریس ہو سکتے ہو پلیز۔'' وہ عاجزی سے بولی تو مجبوراً کیف کو بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔

''اصولاً تو ہمیں پہلی فرصت میں پولیس کو آئے کت کی موجودگی سے آگاہ کرنا چاہیے اور اس کے بعد آئے کت کو کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہیے۔'' وہ سنجیدگی سے بول رہا تھا۔

''مگر کیا ہے نا کہ یہ پاکستان ہے اور یہاں کوئی کام اصولوں کے تحت کم ہی کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ ہمارا پالا بھی پاکستان کی کریم سے تعلق رکھنے والے انسان سے پڑا ہے سو ہمیں اصولوں سے ہٹ کر کچھ سوچنا پڑے گا۔''

''کیف تمہیں یہ کہانی کچھ عجیب سی نہیں لگی۔ سچ کہوں تو معاویہ اردشیرازی ایسا بندہ نہیں لگتا مجھے...... مجھے لگتا ہے کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ جھول ہے۔ ایک بندہ انتقام میں اتنا پاگل نہیں ہو سکتا کہ کسی کو دس بارہ سال تک قید کر کے رکھے اور پھر وہ اتنا بے وقوف تو نہیں ہو سکتا نا کہ اپنی بیوی بچوں کو بھی یہاں لے کر آئے۔''

''میں ایک صحافی ہوں خوش نصیب۔ میں نے اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب کہانیاں سن رکھی ہیں۔ انتقام اچھے اچھوں کو پاگل کر دیتا ہے۔ دنیا میں دو ہی تو چیزیں ہیں جو انسان کو پاگل بنانے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔ ایک محبت اور دوسرا یہ انتقام۔ آئے کت اور کبیر خان کا بیان قریباً قریباً ایک جیسا ہے۔ دو لوگ ایک ہی بات تو نہیں کہیں گے نا۔ پھر معاویہ اپنے بھائی سے جس طرح محبت کرتا تھا۔ اس کا انتقام میں پاگل ہو جانا کچھ عجیب نہیں لگتا مجھے...... لیکن میں تمہاری بات سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ عین ممکن ہے کہانی کچھ اور ہو اور جو ہمیں معلوم ہو سکا، وہ صرف معاویہ کو پھنسانے کی سازش ہو۔''

''تو اب...... ہم کیا کریں گے؟ سچ کیسے جانیں گے؟'' خوش نصیب نے پوچھا۔

''سوچنا پڑے گا اس بارے میں تو...... پھر میں اکیلا کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ مسز معاویہ اس کیس کی ایک مضبوط گواہ ہیں۔ ان سے مشورہ کیے بغیر تو ہم پولیس کو بھی انفارم نہیں کر سکتے کیوں کہ یہ سارا معاملہ جس ایک شخص کے خلاف جاتا ہے وہ ان کا شوہر اور ان کے بچوں کا باپ بھی ہے۔''

''آئے کت کے بعد اگر کسی کے ساتھ برا ہوا ہے تو وہ منفرا ہی ہیں۔ وہ خود اتنی اچھی ہیں اور ان کے ساتھ اس قدر برا ہو رہا ہے۔ جب کہ ان کا تو اس سب سے کوئی ڈائریکٹ تعلق بھی نہیں تھا۔'' خوش نصیب نے افسردگی سے کہا۔

''اس دنیا میں برا ان ہی کے ساتھ ہوتا ہے جو اچھے ہوتے ہیں۔'' کیف نے ایک ہی جملے میں بات سمیٹی تھی۔

''اب تو مجھے لگ رہا ہے کہ میری بدنصیبی اور نحوست کا سایہ میرے ساتھ ساتھ منفرا پر بھی پڑ گیا ہے۔''

کیف کو اس کی بات سے دکھ پہنچا۔

''فضول باتیں مت کرو خوش نصیب۔ تم بدنصیب نہیں ہو۔ بالکل بھی نہیں۔''

''دل رکھنے کے لیے ایسا بول رہے ہو نا؟'' خوش نصیب نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

''اچھا مجھے ایک بات بتاؤ۔ تم بدنصیب ہونا یا منحوس ہونا کسے کہتی ہو؟''

''میری اپنی ذات ان الفاظ کی جامع تعریف ہے کیف! میرے پیدا ہوتے ہی میرے ابو کی ڈیتھ ہو گئی۔ روشن امی کی وفات کی وجہ بھی کہیں نہ کہیں میری ذات بنی۔ میرے منہ سے نکلنے والی بددعائیں اکثر قبول ہو جاتی ہیں۔ میں صرف اپنے لیے ہی نہیں دوسروں کے لیے بھی بدنصیبی لاتی ہوں۔ تمہیں یاد ہے میں نے کیسے تمہیں صیام کے ساتھ نتھی کر دیا تھا اور کچھ نہیں تم یہی دیکھ لو کہ میرے منفرا کی زندگی میں آتے ہی چند ہی دنوں میں اس

کی زندگی عجیب بے چینی کا شکار ہوگئی ہے۔"

خوش نصیب کے پاس اپنی ہی ذات سے متعلق بے شمار گلے شکوے تھے۔ کیف چپ کر کے اس کی بات سنتا رہا۔

"یہ تو تم عجیب سی بات کر رہی ہو خوش نصیب! ایسا تو ہر انسان کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ تمہارے منہ سے نکلنے والے برے لفظ قبول ہو جاتے ہیں لیکن تم یہ نہیں کہہ سکتیں کہ تمہاری دعائیں کبھی قبول نہیں ہوئیں۔ یہ تو کوئی ٹھوس دلیل نہ ہوئی تمہارے منحوس ہونے کی۔ جیسے تمہارے برے لفظ قبول ہوتے ہیں ویسے ہی اچھے لفظ بھی قبول ہوتے ہیں۔ بس مانگنے کا معیار تمہاری نیت اور جذبہ ہے۔ جہاں تک چچا اور چچی کی وفات کا سوال ہے تو کیا مسلمان ہونے کے ناتے ہمارا اس بات پر ایمان نہیں ہے کہ موت کا ایک دن مقرر ہے اور کم از کم اس مقررہ وقت میں ردوبدل انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ ان دونوں کی وفات اس وقت اسی طرح ہونا ازل سے طے تھی۔ وجہ چاہے کچھ بھی بنتی لیکن انہیں اسی وقت جانا تھا۔ تم مثبت انداز میں سوچنے کی کوشش کرو۔۔۔ ممکن ہے اگر وہ لوگ ابھی حیات ہوتے تو کسی بڑے مسئلے یا تکلیف کا شکار ہوتے۔ اگر تم اس فیملی کا حصہ بن کر یہاں نہ آتیں تو عین ممکن تھا کہ میں بھی یہاں نہ آتا اور آئے کت کی سچائی ایسے ہی چھپی رہتی اور وہ کبھی آزاد نہ ہو پاتی۔ اس لحاظ سے تو تم آئے کت کے لیے خوش قسمتی بن کر آئی ہو۔ بالکل ایسے ہی جیسے تم صیام کو میرے ساتھ نتھی نہ کرتیں تو ممکن تھا۔ وہ اب شامیر کی بیوی ہوتی۔ تم نے اس وقت جو بھی کیا وہ وقت کا تقاضا تھا اور اسے ایسے ہی ہونا تھا۔"

خوش نصیب غائب دماغی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

"ہم سب کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی کام کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ وہ کام ہمارے ذریعے طے ہونا لکھا گیا تھا۔ لیکن اس میں نہ ہمارا کوئی کمال ہوتا ہے نہ ہی کوئی غلطی...... کیونکہ ذریعہ تو کوئی بھی بن سکتا ہے نا۔ سمجھ رہی ہو میری بات؟ یہ جو تم کہہ رہی ہو نا کہ تم اپنے لیے اور دوسروں کے لیے بدنصیب ہو تو میں ایسی کسی بدنصیبی جیسی چیز پر یقین ہی نہیں رکھتا۔ تم نے جتنی بھی باتیں کہی ہیں نا اس سے کہیں بڑی بدنصیبی میرے نزدیک اچھا اور عملی مسلمان نہ ہونا ہے۔ اور اگر تم گھر والوں کی باتیں سن کر ابھی تک خود کو منحوس سمجھتی رہی ہو تو تم منحوس نہیں صرف اور صرف بے وقوف ہو۔ کیا تم بے وقوف ہو خوش نصیب؟" کیف نے بات مکمل کر کے گہری سانس بھر کر پوچھا۔ ظاہر ہے اسے اس سوال کے جواب کی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ خوش نصیب بے وقوف ہے۔

"میں بہت تھک گئی ہوں کیف! ان تین سالوں میں اتنا بھاگی ہوں کہ تھک گئی ہوں۔ اب میری سمجھ میں آتا ہے کہ روشن امی مجھے کیوں شکر ادا کرنے کا کہتی تھیں۔ وہ کیوں اس کبوتروں والے کمرے میں رہ کر بھی مطمئن تھیں، کیوں کہ وہ جانتی تھیں کہ اگر ہم وہاں سے نکلے تو ہمارا کوئی پرسان حال نہ ہوگا۔ کبھی کبھی تو مجھے لگنے لگتا ہے کہ یہ سب روشن امی کا دل دکھانے کی ہی سزا ہے۔ وہ خفا ہیں مجھ سے۔" خوش نصیب بے چارگی سے بولی۔

"یار! یہ سب بے وقوفی کی باتیں ہیں۔" کیف جھنجلا کر بولا۔ "تمہیں کیا لگتا ہے کہ دنیا سے جانے والوں کے پاس اور کوئی کام نہیں ہوتا کہ وہاں جا کر بھی دنیا والوں سے خفا رہیں؟ اللہ کی بندی ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ جو دنیا سے چلے جاتے ہیں انہیں صرف وہاں ہماری دعاؤں کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کے سفر کو آسان کرے۔ یار یہ سب باتیں تو ہم بچپن میں کہانیوں کی کتابوں میں بھی پڑھ چکے ہیں۔ تمہارے دل میں ایسے الٹے خیالات کہاں سے آتے ہیں؟"

خوش نصیب نے مزید کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا کہ کیف کی باتیں دل کو لگتی تھیں۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کیف نے دور پہاڑوں پر نظر جما ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا تھا۔

"میرے ساتھ چلو خوش نصیب۔ ہم واپس اپنے گھر چلتے ہیں۔"

"نہیں کیف!" وہ جھنجلا کر بولی۔ "میرے لیے فلک بوس اور فضل منزل اب ایک برابر ہی ہیں اور و

بھی تمہیں اتنی خوش فہمی کیوں ہے کہ مجھے وہاں قبول کر لیا جائے گا؟"

"اور تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے کہ تمہیں وہاں قبول نہیں کیا جائے گا؟"

"میری ماں مجھ سے ناراض دنیا سے چلی گئی، میری بہن مجھ سے قطع تعلق کر چکی ہے اور میں جس حال میں اس گھر سے نکالی گئی تھی۔ تم اچھی طرح سے واقف ہو۔ پتا ہے کیف! پہلے اپنے لیے منحوس کا لفظ سننا اتنا مشکل نہیں لگتا تھا۔ اب لگتا ہے کہ اگر دوبارہ مجھے ایسی باتیں سننے کو ملیں تو میں برداشت نہیں کر پاؤں گی۔" اس نے اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

کیف چپ رہ گیا۔ جو کچھ فضل منزل میں اس کے ساتھ ہوا تھا، اس کا بے یقین ہونا کچھ غلط نہیں تھا۔

"تمہارا ماہ نور سے کوئی رابطہ ہے کیف؟ کبھی بات ہوئی اس سے؟" کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔

کیف نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بے چین ہو اٹھی۔ "کیسی ہے وہ؟ ٹھیک تو ہے نا؟"

کیف کے لیے اسے ایک دم سب بتانا بہت مشکل تھا۔ اسے لگا اگر خوش نصیب کو اس ذہنی کیفیت کے ساتھ وہ ماہ نور کے بارے میں بتائے گا تو وہ برداشت نہیں کر پائے گی۔

"ہاں۔ وہ ٹھیک ہے۔ خوش نصیب اگر میں...... اگر میں تمہیں گارنٹی دوں کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا...... تو......؟"

"تو بھی میرا جواب انکار میں ہی ہوگا۔" خوش نصیب نے حتمی لہجے میں کہا۔ "تم جانتے ہو کیف! ایسا کچھ نہیں ہو پائے گا۔ اس گھر میں اب میرے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ کوئی بھی نہیں۔"

"تو پھر کیا کرو گی؟ کہاں جاؤ گی؟" کیف جیسے تھک کر بولا۔

"تم اسلام آباد جاؤ گے نا؟"

"ہاں! میرا دوست...... وہ راستے کلیئر ہوتے ہی مجھے لینے آجائے گا اور یہاں سے کب نکلیں گے یہ تو حالات پر منحصر ہے۔"

"تم مجھے اسلام آباد چھوڑ سکتے ہو؟" اس نے فوراً پوچھا تھا۔

"وہاں کس کے پاس جانا ہے؟" کیف نے ناسمجھی سے پوچھا۔

"ویمن ہوسٹل میں۔ میرے پاس کچھ سیونگز ہیں، جب تک نئی جاب نہیں ملتی، اس میں گزارا ہو جائے گا اور پھر......"

"اوہ کم آن۔ تم ایسا کچھ نہیں کرنے والی۔ تم پاگل ہو؟ پہلے کی بات اور تھی...... جن کے پاس تم اسلام آباد میں رہ رہی تھیں وہ عرفات ماموں کے بھروسے کی فیملی تھی۔۔۔ لیکن گرلز ہاسٹل میں بالکل نہیں۔" کیف قطعیت سے بولا۔

"کیف ایموشنل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" خوش نصیب کو غصہ آ گیا تب ہی چیخ کر بولی۔ "آج نہیں تو کل۔ مجھے خود اکیلے سروائیو کرنا تو سیکھنا ہی ہے تو پھر ابھی سے کیوں نہیں۔"

وہ اتنی ہٹ دھرمی سے بولی کہ کیف ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

"تم میری بات نہیں مانو گی نا۔" کیف نے بچے کی طرح منہ بنا کر پوچھا۔

خوش نصیب نے جواب دینے کی زحمت نہیں کی۔

"تمہیں پتا ہے، میں کتنے عرصے سے تمہاری تلاش میں مارا، مارا پھر رہا ہوں۔"

"میں ایموشنل نہیں ہو رہی۔ ویسے بھی تم وہی ہو جو مجھے اکیلا چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔" خوش نصیب نے جوابی طعنہ منہ پر مارا۔

''بھاگنے سے پہلے تمہیں ساتھ بھاگنے کی دعوت بھی دی تھی۔ یاد ہے؟''
''وہ دعوت ہی اس سارے مسئلے کی جڑ بن گئی۔ یہ یاد ہے؟'' وہ دوبدو جواب دے رہی تھی۔ کیف لاجواب ہوا۔
''ٹھیک ہے۔ دیکھو کچھ باتیں ہیں جو میں تمہیں بتانا چاہتا تھا مگر ایسے نہیں۔ سوچا تھا تمہیں آرام سے سمجھاؤں گا۔ سکون کے ساتھ...... مگر تم...... اب میری بات ذرا غور سے سنو اور تحمل کے ساتھ۔''
کیف بہت سنجیدگی سے بول رہا تھا۔ خوش نصیب نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔
کیف نے چند لمحے لفظ جوڑنے توڑنے میں صرف کیے تھے۔
''خوش نصیب! ماہ نور فضل منزل میں ہی ہے۔'' اس نے بہت آہستہ آہستہ بات شروع کی۔
''کک...... کیا...... کیوں؟'' خوش نصیب کو لگا اسے بات سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ پھر اس کی چھٹی حس نے کہا کہ کچھ غلط ہے۔
''ہاں ماہ نور فضل منزل میں ہے اور...... شامیر بھی......''
''اوہ! اچھا...... ملنے آئے ہوں گے؟'' اس کی آواز پل بھر میں ہر طرح کے جذبات سے عاری ہو گئی۔
''نہیں...... وہ ہمیشہ کے لیے آئے ہیں اور تمہاری تلاش میں ہیں۔ تم سے معافی مانگنے کے لیے۔''
''کیف؟'' وہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اس کا ردعمل کیا ہونا چاہیے۔
''فضل منزل میں سب سچ جان چکے ہیں۔ وہ سچ جو تم سب کو بتاتی رہی اور کسی نے یقین نہیں کیا۔'' کیف نے کہا۔
''تم مذاق کر رہے ہو؟''
''تمہارے جانے کے بعد...... بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ عرفات ماموں کے جانے کے بعد فضل منزل میں بہت کچھ بدل گیا تھا خوش نصیب! شفیق چچا فضل منزل میں دیوار کھڑی کروا چکے ہیں۔ انہوں نے ہمارے...... سوری! میرے کیے کی سزا ابا کو دی۔ ابا سے قطع تعلق کر لیا۔ اپنا حصہ لے کر الگ ہو گئے۔ شاید تمہیں معلوم ہو کہ صیام کی شادی ہو گئی تھی۔ عرفات ماموں کی ڈیتھ کے چھ دن بعد وہ واپس آ گئی۔ طلاق کے کاغذات کے ساتھ۔ اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی وہ لوگ نہیں بدلے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ماموں کے جس دوست کے پاس تم رہ رہی تھیں وہ ابو سے ملنے آئے تھے تاکہ تم گھر واپس آ سکو۔ وہ ابو سے نہیں مل سکے بلکہ ان کی ملاقات شفیق چچا سے ہوئی تھی اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں، انہوں نے ان کو بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا تھا۔ ہمیں بہت دیر میں اس بارے میں پتا چلا تھا۔'' کیف اتنا بتا کر چپ ہو گیا۔
خوش نصیب چپ چاپ اس کی شکل دیکھتی رہی۔
''کیف! آئی ایم سوری، بٹ مجھے صرف ماہ نور میں انٹرسٹ ہے۔ کیا وہ ٹھیک ہے؟ وہ پاکستان میں کیوں ہے؟ کیا شامیر نے اس کے ساتھ......'' اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا تھا مگر بات مکمل نہیں کر سکی۔
''اوہ...... ہاں...... میں سمجھ سکتا ہوں۔ ماہ نور ٹھیک ہے۔'' کیف نے مسکرا کر بتایا۔ خوش نصیب نے منہ سے تو کچھ نہ کہا لیکن کیف نے اس کی آنکھوں میں اطمینان پھیلتے دیکھا۔
''مجھے پوری بات بتاؤ...... پلیز۔''
''ماموں کی ڈیتھ کے بعد ہمیں ایک فون آیا تھا جو ماہ نور کی طرف سے تھا۔ اس کال میں اس نے صرف یہ بتایا کہ ماہ نور اور شامیر پاکستان آ رہے ہیں۔ جب میں انہیں ریسیو کرنے گیا تو ماہ نور کے ساتھ شامیر نہیں تھا۔ میرا مطلب ہے...... وہ شامیر تھا...... مگر...... شامیر جیسا نہیں تھا۔''
''کیف! تم کیا کہہ رہے ہو میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی۔'' خوش نصیب جھنجھلا کر بولی تھی۔

کیف کے لیے اسے تفصیل بتانا مشکل ہو رہا تھا۔
''خوش نصیب! تم ٹھیک کہتی تھیں۔ شامیر کالے علم میں ملوث تھا۔ تمہاری کہی ہوئی سب باتیں سچ ثابت ہو چکی ہیں۔ شامیر کسی حادثے کا شکار ہو کر اپنی ایک آنکھ گنوا چکا ہے۔ اس کا چہرہ تباہ ہو گیا۔ اس کی ایک ٹانگ کٹ چکی ہے اور فی الحال اس کا انحصار مکمل طور پر ماہ نور پر ہے۔ جب سے وہ آیا ہے، سارا دن چپ رہتا ہے، پھر رونے پر آتا ہے تو روتا ہی رہتا ہے۔ اس کی چیخیں فضل منزل میں گونجتی ہیں اور ان سب باتوں کا اقرار بھی کہ اس نے تمہارے ساتھ کیا کیا تھا۔''
''یا اللہ۔'' خوش نصیب نے پہلی بار جانا کہ مکافات عمل کسے کہتے ہیں۔
''وہ اپنے تمام گناہ قبول کر چکا ہے اور وہ ابھی بھی تم لوگوں کی زندگی کا حصہ ہے؟'' خوش نصیب نے سرد سے انداز میں پوچھا۔
''ہاں، کیونکہ ماہ نور ایسا چاہتی تھی۔ اس نے بس ہمیں تمہارا سچ بتا کر منت کی کہ وہ فضل منزل میں رہنا چاہتی ہے اور شامیر کو بھی وہاں رکھنا چاہتی ہے۔ ابا تمہارے حوالے سے بہت شرمندہ تھے سو انہوں نے ماہ نور کو بخوشی وہاں رہنے کی اجازت دے دی۔ میں نے ماہ نور کو شامیر سے الگ ہونے کا کہا بھی تو اس نے بات ٹال دی اور ظاہر ہے میں اسے فورس نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں تمہیں ڈھونڈوں اور یہ کام تو میں پہلے سے ہی کر رہا تھا اور دیکھو۔ میں نے تمہیں ڈھونڈ لیا۔'' وہ آنکھوں میں ڈھیر ساری محبت سموئے اسے دیکھتا رہا جبکہ خوش نصیب سر جھکائے سوچ میں گم تھی۔ اب کی بار اس کی سوچ کا مرکز ماہ نور تھی۔

☆☆☆

اس نے آہستہ سے کروٹ بدلی۔ بند آنکھوں کے ساتھ اس کے چہرے پر سجی اس پیاری سی مسکراہٹ نے جیسے کمرے میں پھیلی ہلکی سی روشنی کو بڑھا دیا تھا۔ یقیناً وہ کوئی بہت خوبصورت خواب تھا جس نے اسے ایک مسکراہٹ کا تحفہ دے کر گہری نیند سے ہوش کی دنیا کی جانب دھکیل دیا تھا۔
اگلے چند ہی لمحوں میں اس نے نیند کی دنیا کو خیرباد کہا اور کسمساتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ کھڑکیوں پر پڑے دبیز پردوں نے چڑھتے ہوئے دن کی روشنی کو بھرپور کوشش کے باوجود اندر آنے کی اجازت نہ دی۔
آنکھیں کھولتے ہی نظروں نے جو چہرہ سب سے پہلے گرفت میں لیا، وہ اس کے شوہر کا تھا۔ اور یہ وہ واحد چہرہ تھا جو اس کی مسکراہٹ کو ہمیشہ جلا بخشتا تھا اور ابھی بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کی مسکراہٹ کچھ اس طرح بڑھی کہ ہونٹوں کے پیچھے سے سفید دانتوں کی قطار دکھائی دینے لگی۔ پھر کتنی ہی دیر وہ چپ چاپ اس ایک چہرے کو تکتی رہی۔
وہ اوندھے منہ کچھ اس طرح سو رہا تھا کہ اس کے ایک بازو نے اس کے آدھے چہرے کو چھپا رکھا تھا۔ کشادہ پیشانی، اونچی ناک، چہرے پر سجی ہلکی سی داڑھی، بے حد صاف رنگت اور گھنے بال۔ وہ خوب صورت تھا۔ بے حد خوب صورت۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسی کشش تھی جو دیکھنے والوں کو متوجہ کرتی تھی۔ گوروں کے شہر میں رہتے ہوئے اس نے کتنی ہی بار لڑکیوں کو اس کی جانب مڑ مڑ کر دیکھتے پایا تھا اور وہ جو ایک دنیا کو اپنا دیوانہ بنائے رکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا، خود اس کا دیوانہ تھا۔
اس کا دل تفاخر سے بھر گیا۔
ہاتھ بڑھا کر اس نے اس کی پیشانی پر بکھرے بالوں کو نرمی سے پیچھے ہٹا دیا۔
وہ اچھی طرح سے جانتی تھی کہ کب، کس دن اور کس لمحے وہ اس کی محبت میں مبتلا ہوئی تھی لیکن یہ محبت

کب عشق میں بدلی، وہ کبھی جان نہ سکی۔ اگر وہ کچھ جانتی تھی تو یہ کہ یہ عشق دن بہ دن بڑھتا ہی جا رہا تھا۔
مگر ایک اعتراف جو وہ پوری سچائی سے کرتی تھی وہ یہ تھا کہ یہ دو سال اس کی زندگی کے بہترین سال تھے۔
اس نے گردن موڑ کر دیوار پر ٹنگی گھڑی کی جانب دیکھا۔
رومانیہ میں اس وقت صبح کے نو بج رہے تھے اور نومبر کی آخری تاریخوں میں سے کوئی تاریخ تھی۔
وہ بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کھڑکی کے پاس چلی گئی۔
اس نے ہاتھ بڑھا کر پردے کو پیچھے کھسکایا تو لمحہ بھر کے لیے مبہوت رہ گئی۔
رات بھر برسنے والے روئی کے گولے ابھی بھی مدھم رفتار کے ساتھ زمین پر برس رہے تھے اور سیبیو (sibiu) کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے چکے تھے۔ حدِ نگاہ تک برف ہی برف تھی۔
ان دو سالوں میں اس نے بہت سے ایسے نظارے دیکھے تھے لیکن برف ہمیشہ اسے پہلی بار کی طرح ہی مبہوت کر دیتی تھی۔
اس نے کسی چھوٹے بچے کی طرح اپنی سرخ ہوتی ناک کو کھڑکی کے شیشے سے ٹکا لیا اور گرم کمرے میں بیٹھ کر ٹھنڈے پڑتے شہر کو غور سے دیکھنے لگی۔
وہ پہلی بار رومانیہ آئی تھی اور اس وقت وہ دونوں سیبیو میں اس کے شوہر کے دوست کے فلیٹ میں موجود تھے۔ یہاں آنے کا پلان اس کی خواہش پر ہی سیٹ کیا گیا تھا۔ وہ اپنے شوہر سے اس شہر کی خوب صورتی کے بارے میں بہت کچھ سن چکی تھی اور اس جگہ کو دیکھنا اس کی دوسری بڑی خواہش تھی۔
پہلی بڑی خواہش اپنی اولاد کا ہونا تھا۔
پچھلے دو سالوں میں اسے دوبار مس کیرج کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ دونوں بار ہی کوئی بھی احتیاط کام نہ آسکی۔ انہیں خوش خبری ملتی تھی اور پھر اگلے کچھ ہی دنوں میں ریت کی طرح ان کی مٹھیوں سے پھسل جاتی اور وہ بے چارگی سے دیکھنے کے علاوہ کچھ نہ کر پاتے تھے۔
وہ دونوں اپنی لائف سے پوری طرح مطمئن تھے۔ خوش تھے۔ بس ایک کمی تھی تو اولاد کی۔
چھ ماہ پہلے تک اس خواہش میں اس کی ساس بھی حصے دار تھیں لیکن پھر ایک رات انہیں ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ جانبر نہ ہو سکیں۔ ان کے جانے کے بعد اسے تنہائی کا احساس اور بھی زیادہ ستانے لگا تھا۔
ہر طرح کا علاج، دعا، تعویذ، ٹوٹکے...... کیا کیا نہیں کیا تھا ان لوگوں نے اس ایک خواہش کو پورا کرنے کے لیے۔
بالآخر اللہ نے کرم کیا۔ یہ تیسری بار تھا کہ وہ امید سے تھی اور اب کی بار وہ لوگ اپنی اولاد کے لیے پہلے سے بہت زیادہ پرامید تھے۔ آج اس کی پریگنینسی کو تین مہینے پورے ہو گئے تھے اور وہ دونوں ہی بے حد خوش تھے۔
اس کے شوہر نے اسے ہتھیلی کا چھالا بنا لیا تھا۔ اسے خوش رکھنے کے لیے وہ سب کام بھی کر رہا تھا جو پہلے اس کی مصروفیت کی نذر ہو جاتے تھے۔ ان میں سے ہی ایک کام اسے ڈاکٹر کی اجازت سے رومانیہ لے کر آنا تھا۔
اللہ نے اس کی دو خواہشات کو آگے پیچھے مکمل کیا تھا۔ شکر اس پر واجب تھا۔ اس نے دل ہی دل میں تہیہ کیا کہ وہ فرصت کے لمحات میں شکرانے کے نفل ضرور ادا کرے گی۔ اللہ جانے کہ یہ فرصت ملنی بھی تھی یا نہیں۔ اسے تو اب نماز تک کے لیے فرصت نہ مل پاتی تھی، جس کی وہ ایک وقت پر عادی تھی لیکن اب اس کی یہ عادت بے قاعدگی کا شکار ہو چکی تھی۔ اسے شرمندگی نے گھیر لیا۔ اس نے تہیہ کیا کہ اب دوبارہ سے اس عادت کو قائم کرنا ہے۔
اس بارے میں سوچتے سوچتے ہی اس کی ذہنی رو بھٹک کر پاکستان میں اپنے گھر اور میکے کی جانب مڑ گئی۔
برائے نام میکہ جس سے اس کا رابطہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں کچھ ایسے مگن ہوئی تھی کہ پیچھے موجود بہت سے لوگوں کو بھلا بیٹھی تھی مگر آج اس جگہ کھڑے ہو کر اسے وہ سب لوگ یاد آنے لگے تھے۔
وہ ان ہی سوچوں میں گم تھی جب اسے چونک کر خیالات کی دنیا سے واپس آنا پڑا تھا۔ دو مضبوط ہاتھوں نے گرم شال اس کے کندھوں پر پھیلا کر اسے بازوؤں کے حلقے میں سمیٹ لیا تھا۔ اس کا شوہر کس لمحے اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا، اسے احساس تک نہ ہوا تھا۔
اسے بازوؤں میں لیے، اپنی ٹھوڑی کو اس کے سر پر ٹکائے وہ بھی باہر کی جانب دیکھنے لگا۔
''یہ سب کتنا خوب صورت ہے نا؟''
یہ سوال نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ رائے تھی۔ وہ عادی تھا ان لفظوں کا...... کیوں کہ وہ یہ الفاظ ہر اس جگہ دہراتی تھی جہاں اسے برف دیکھنے کو ملتی تھی۔
''تم سے زیادہ نہیں۔'' مسکرا کر جواب دیا گیا۔
''اتنی سردی میں بغیر شال کے یہاں کھڑی تھیں۔ اگر تمہیں ٹھنڈ لگ گئی تو؟'' اپنی پہلی بات کا جواب نہ ملنے پر اس نے سرزنش کرنے والے انداز میں پوچھا تھا۔
''اب اتنی بھی نازک مزاج نہیں ہوں میں۔'' چھوٹی سی ناک کو سکیڑ کر اس نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔
''بالکل۔'' اس کے شوہر نے طنزیہ سے انداز میں کہا تھا۔ ''تم تو بالکل بھی نازک مزاج نہیں ہو بلکہ مجھے تو لگتا ہے تمہارا نام ماہ نور نہیں۔ کوہ نور ہونا چاہیے تھا۔''
شامیر کی آواز میں شرارت ہی شرارت بھری تھی۔
''اچھا۔'' ماہ نور نے کھینچ کر لفظ کو ادا کیا۔ ''اور ایسا کیوں؟''
شامیر نے اسے بازوؤں کے حلقے سے آزاد کرتے ہوئے اس کا رخ اپنی جانب موڑ لیا تھا۔
''وہ اس لیے مائی ڈیئر وائف کیوں کہ آپ نازک مزاج نہیں ہیں بلکہ ایک اسٹون کی طرح ہی مضبوط ہیں۔''
وہ چند لمحے نرمی سے اسے تکتا رہا اور پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔
''تم کبھی نہیں سمجھ سکتیں۔ تم کوہ نور کی طرح ہی تو قیمتی ہو میرے لیے۔ تمہاری قدر و قیمت کا اندازہ میرے علاوہ کوئی نہیں لگا سکتا۔ تم انمول ہو ماہ نور اور یہ بات صرف میں جانتا ہوں۔''
اس کے ہونٹ کے نیچے موجود کالے سیاہ تل کو شامیر نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے چھوا تھا۔
ماہ نور ہنس دی۔ اس نے شامیر کی بات کو مذاق سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ ایسی باتیں کرتا ہی رہتا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ اگر وہ انمول ہے تو اسے ماہ نور سے انمول اس کے ساتھ نے ہی تو کیا تھا۔ وہ پھر سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔
دوسری طرف شامیر آنکھوں میں عجیب سی حیوانیت لیے اسے تکتا رہا۔
''ماہ نور!'' کچھ دیر بعد اس نے پکارا۔
ماہ نور نے جواب دینے کے بجائے مڑ کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
''شام کو میرے دوست نے انوائیٹ کر رکھا ہے، جن کا یہ فلیٹ ہے۔ تم تیار رہنا میں تمہیں ان سے ملوانا چاہتا ہوں۔'' شامیر نے اسے بتایا تو وہ اثبات میں سر ہلا گئی۔
''تم فریش ہو جاؤ۔ میں ناشتہ تیار کرتی ہوں۔''
ماہ نور اپنی بات کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئی لیکن شامیر وہاں کھڑا ہو کر اگلا لائحہ عمل طے کرنے میں لگ گیا تھا۔ اس کی خواہش پوری ہونے میں بس ایک دن کا وقت باقی تھا۔

☆☆☆

شام چھ بجے کے قریب شامیر اسے لے کر فلیٹ سے نکلا تھا۔ ان کا استقبال کرنے کے لیے شامیر کے دوست رزوان رودوتو کا آدمی آیا اور وہ رومانیہ کا ہی مقامی باشندہ تھا۔

اور آدھے گھنٹے بعد وہ جس گھر کے سامنے کھڑے تھے وہ گھر سے زیادہ محل لگ رہا تھا۔ ماہ نور نے سر اٹھا کر اس کوٹھی کا جائزہ لیا۔ بیرونی لائٹس کی روشنی میں وہ گھر چمک رہا تھا۔ ماہ نور نے مین گیٹ پر لگی نیم پلیٹ کو بغور پڑھا۔ اس پر رومانوی زبان میں لفظ درج تھے۔ اس کی سمجھ میں مطلب نہیں آیا تھا سو اس نے کوئی خاص دھیان بھی نہیں دیا۔

گاڑی مین گیٹ عبور کر گئی اور تیزی سے روش پر چلتی ہوئی داخلی دروازے پر جا کر رکی تھی۔ ماہ نور اس جگہ کی خوب صورتی سے دل ہی دل میں متاثر ہوئی تھی۔

داخلی دروازے پر انہیں ریسیو کرنے کے لیے رزوان رودوتو خود موجود تھا۔

''ویلکم ٹو رودوتو پیلس۔''

وہ خوش اخلاقی سے شستہ انگریزی میں کہتا ہوا آگے بڑھا اور شامیر سے گلے ملنے لگا۔ اس نے ماہ نور سے ہاتھ ملایا۔ وہ بغور ماہ نور کو دیکھ رہا تھا۔ ماہ نور کو عجیب سا احساس ہوا۔

وہ لمبا تھا اور اس کے شانے کافی چوڑے تھے۔ اس کی جسامت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بندہ باقاعدہ ورزش کرنے کا عادی ہے۔ اس کا رنگ مقامی لوگوں کی طرح سرخ و سفید تھا اور چہرے پر فرنچ کٹ داڑھی موجود تھی۔ اس نے اپنے بالوں کو پیچھے کر کے جیل کی مدد سے خوب جما کر بنایا ہوا تھا۔ مجموعی طور پر وہ بندہ کافی ہینڈسم تھا لیکن اس کی آنکھیں سرخ سی تھیں۔

ماہ نور کو اس کی آنکھوں سے خوف آیا تھا۔ اس نے دوبارہ براہ راست اس کی جانب دیکھنے کی غلطی نہیں کی۔

وہ انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ وہ گھر باہر سے جتنا متاثر کن تھا، اندر سے اس سے بھی زیادہ حسین تھا۔ ماہ نور وہاں کی خوبصورتی میں کھو سی گئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ملازم نے چائے پیش کر دی۔

رزوان اور شامیر کسی اور زبان میں بات کر رہے تھے۔ شاید وہ رومانوی زبان تھی لیکن ماہ نور اس زبان سے مکمل طور پر نابلد تھی۔ اس کے لیے تو یہ بھی نئی بات تھی کہ شامیر رومانیہ کی زبان بول سکتا ہے۔

جلد ہی وہ اکتا سی گئی۔ شامیر اور رزوان اس کی موجودگی کو یکسر فراموش کیے اپنی باتوں میں مصروف تھے۔

اس نے اپنا چائے کا کپ خالی کر کے میز پر رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد اسے اپنا سر بوجھل ہوتا محسوس ہوا تھا۔ اس نے شامیر کو پکارا۔

''کیا بات ہے؟'' شامیر نے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی کتنا ٹائم رکنے کا پلان ہے؟ میں اچھا فیل نہیں کر رہی ہوں۔'' ماہ نور نے پریشانی سے بتایا۔

''اوہو...... کیا ہو گیا؟'' شامیر نے پریشانی سے پوچھا۔

''گھٹن محسوس ہو رہی ہے۔ کیا میں کچھ دیر کے لیے باہر جا سکتی ہوں؟''

شامیر نے فوراً رزوان کی طرف دیکھ کر اسے کچھ کہا۔ لفظ ناقابلِ فہم تھے۔

رزوان نے ایک ملازمہ کو بلایا اور اسے ماہ نور کے ساتھ جانے کی ہدایت کی۔ شامیر نے اسے بتایا کہ رزوان اپنی والدہ کے ساتھ رہتا ہے اور اس کی والدہ بیمار ہیں۔ اس لیے وہ ان سے ملاقات کے لیے نہیں آئی تھیں۔

وہ ملازمہ ماہ نور کو لے کر اندرونی حصے کی طرف بڑھی۔ رزوان کی ہدایت پر وہ اسے گھر دکھانے لے گئی۔ ملازمہ اسے لے کر کوٹھی کے مختلف حصوں میں پھرتی رہی۔ اسے انگلش آتی تھی لیکن اس نے ماہ نور کی باتوں کا جواب ہوں ہاں سے زیادہ نہیں دیا تھا۔ اس لیے ماہ نور چپ چاپ اس کے ساتھ ادھر ادھر پھرتی رہی۔

پھر ماہ نور نے ایک خوب صورت جگہ دیکھی۔ اس کمرے کی چھت اور ایک پوری دیوار شیشے سے بنی ہوئی تھی اور اس دیوار سے باہر گھر کا لان اور بیمیو کے خوب صورت پہاڑ دکھائی دیتے تھے۔ ماہ نور کے قدم خود بخود اس جانب بڑھ گئے۔ دیوار کے ساتھ ہی دو خوبصورت کرسیاں اور ایک چھوٹا سا میز رکھا ہوا تھا۔ ماہ نور ان میں سے ایک کرسی پر ٹک گئی۔

''میں کچھ دیر یہاں بیٹھنا چاہوں گی۔ آپ جانا چاہیں تو جا سکتی ہیں۔'' اس نے ملازمہ سے کہا۔ ملازمہ نے کچھ تذبذب کا اظہار کیا تھا۔ وہ وہاں سے ہٹنا نہیں چاہ رہی تھی لیکن پھر اس نے ماہ نور کی بات مان لی تھی۔

کچھ دیر بعد وہی ملازمہ ماہ نور کو گلاس میں ایک مشروب اور کچھ خشک میوہ جات دے گئی۔ اس مشروب کا ذائقہ بے حد عجیب لیکن لذیذ تھا۔ ماہ نور نے اپنی حالت کو بہتر ہوتا محسوس کیا تھا۔ وہ اب تازگی محسوس کر رہی تھی۔

کرسی سے اٹھ کر وہ دوسری طرف رکھے فش ایکیوریم کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ رنگ برنگی مچھلیاں پانی میں تیزی سے ادھر ادھر تیر رہی تھیں۔ ماہ نور نے بغور دیکھا۔ ایک چھوٹی سی پیلے رنگ کی مچھلی ایک پچھلے کونے میں ایک جگہ ٹھہری ہوئی تھی۔ ماہ نور نے جھک کر غور سے دیکھا۔ وہ مچھلی قدرے دائیں جانب جھکی ہوئی تھی۔

وہ ابھی اسی مچھلی پر غور کرنے میں مصروف تھی کہ اسے کسی نے کندھوں سے پکڑ کر بے دردی سے اپنی جانب کھینچا۔ وہ جو اپنے ہی دھیان میں مگن تھی، چیختی ہی چلی گئی۔

وہ ایک بوڑھی عورت تھی۔ کھلے ہوئے سفید بال، جھریوں بھرا چہرہ، سفید رنگ اور بائیں گال پر کسی پرانے زخم کا گہرا نشان...... اس نے ماہ نور کو کہنیوں کے پاس سے دبوچ رکھا تھا اور چیخ چیخ کر مقامی زبان میں کچھ بول رہی تھی۔

ماہ نور بے تحاشہ خوف زدہ ہو کر خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اس عورت کی گرفت بے حد مضبوط تھی۔ وہ کب اور کس طرف سے وہاں آئی تھی ماہ نور کو معلوم بھی نہیں ہو سکا تھا۔ وہ عورت چیخ چیخ کر اس کے خوف میں اضافہ کر رہی تھی۔

''فوگی...... پراپادینیا...... ماگی نیاگرا...... فوگی فوگی...... وی آتا تا ایستی ان پریکول۔'' (بھاگو...... خطرہ...... کالا جادو...... بھاگو بھاگو کہ آپ کی زندگی کو خطرہ ہے۔)

وہ عورت اسے کچھ سمجھانا چاہ رہی تھی لیکن خوف کی شدت اور اس کی زبان ماہ نور کو کچھ سمجھنے نہیں دے رہی تھی۔

اس لمحے شامیر، رزوان اور کچھ ملازمائیں وہاں بھاگتی ہوئی آئی تھیں۔ رزوان نے کھینچ کر اس عورت کو ماہ نور سے علیحدہ کیا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور وہ اونچی آواز میں کچھ بول رہا تھا۔

شامیر نے آگے بڑھ کر ماہ نور کو تھام لیا۔ اس میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی ہمت نہیں تھی، وہ لڑکھڑا کر زمین پر ہی دوزانو بیٹھ گئی۔ شامیر اسے کندھوں سے تھام کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

اب وہ بوڑھی عورت ملازم عورتوں کے نرغے میں تھی۔ وہ اسے کھینچ کر باہر لے گئی تھیں۔ تب رزوان ان کی جانب پلٹا۔ وہ شامیر اور اس سے معذرت کر رہا تھا۔ وہ بوڑھی عورت اس کی ماں تھی اور ذہنی مریضہ تھی۔ آج بھی وہ اپنی ملازمہ کو دھوکہ دے کر کمرے سے باہر آ گئی تھی۔ رزوان کے چہرے پر معذرت کے رنگ بکھرے تھے۔

دوسری طرف ماہ نور کے لیے اپنے خوف پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہی۔ وہ شامیر کے بازوؤں میں جھول گئی۔

بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے سنا۔ رزوان نے شامیر سے انگریزی میں کہا۔

''وی ہیو ٹو کمپلیٹ دس ورک ٹو نائٹ۔'' (تمہاری بیوی کو شک ہو گیا ہے۔ ہمیں آج رات ہی یہ کام مکمل

کرنا ہوگا۔)

☆☆☆

اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کتنی دیر بے ہوش رہی تھی۔ سوئی جاگی سی کیفیت تھی جو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اسے نیند میں بھی احساس تھا کہ اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا گیا تھا اور یہ کام گاڑی میں بٹھا کر کیا گیا تھا۔ اسی نیند کی حالت میں اسے دو تین بار کچھ پلایا بھی گیا اور اس مشروب کا ذائقہ بھی ویسا ہی تھا جو اس سے پہلے وہ ملازمہ اس کے لیے لائی تھی۔

دوسرا احساس چبھن کا تھا۔ اسے کسی سخت پتھریلی جگہ پر لٹایا گیا تھا اور کوئی پتھر اس کی کمر میں مسلسل چبھن پیدا کر رہا تھا۔

پھر اس کے ذہن میں مسلسل رزوان کے آخری الفاظ گونجتے رہے تھے۔ وہ نیند کی حالت میں بھی خوف کا شکار تھی۔ وہ نیند کی حالت میں بھی جانتی تھی کہ جہاں وہ اسے لائے ہیں اس جگہ شامیر اور رزوان بھی موجود ہے۔ اس نے ان کی آوازیں سنی تھیں۔ اس نے مشروب پلائے جانے کے وقت شامیر کے لمس کو بھی محسوس کیا تھا۔

شامیر پر اندھے اعتماد کے باوجود اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس کے ساتھ کچھ غلط ہونے والا تھا۔ کچھ بہت برا۔

وہ مسلسل اپنی آنکھیں کھولنے کی کوشش میں ناکام رہی تھی۔

بالآخر ایک وقت آیا جب وہ اس کوشش میں کامیاب ہوگئی۔ اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ اس کا سر ابھی بھی چکرا رہا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اسے لگا کہ یہ کمزوری کی وجہ سے تھا لیکن جلد ہی اس کی غلط فہمی دور ہوگئی۔ اس کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کسی چیز سے بندھا ہوا تھا۔ وہ کسی کمرے میں نہیں بلکہ کسی غار نما جگہ پر موجود تھے۔ جہاں ہلکی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اسے اپنے ہاتھ پاؤں برف کی طرح ٹھنڈے محسوس ہوئے۔ اسے غار میں پھیلے دھویں کا بھی شدت سے احساس ہوا تھا جو اسے سانس لینے میں تکلیف دے رہا تھا۔ غار میں ایک عجیب سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

اپنی لاچاری کا احساس ہوتے ہی آنکھوں کے آگے چھایا اندھیرا خود ہی غائب ہوگیا۔ اس نے تڑپ کر ادھر ادھر دیکھ کر شامیر کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور پھر اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک بے حد عجیب منظر پایا تھا۔

غار میں دھواں پھیلا ہوا تھا اور اس دھویں کا منبع آگ کا وہ الاؤ تھا جو کچھ فاصلے پر جل رہا تھا۔ اس الاؤ سے کچھ فاصلے پر ایک کپ میں اگربتیوں جیسی کوئی چیز بھی جل رہی تھی جس میں سے خوشبو دھویں کی صورت اٹھتا تھا۔ غار کی دیواروں پر سرخ رنگ سے عجیب وغریب نقش بنے ہوئے تھے۔ آگ کے ایک طرف فریم میں ایک تصویر موجود تھی جس میں ایک بے حد خوفناک چہرہ نمایاں تھا۔ اس الاؤ کے ایک جانب شامیر اور دوسری طرف رزوان آنکھیں بند کیے یوگا کے انداز میں کوئی آسن جمائے بیٹھے تھے۔ رزوان کے آگے ایک انسانی کھوپڑی، کچھ ہڈیاں، تازہ گوشت، ناریل اور تیز خنجر پڑے دکھائی دے رہے تھے۔ شامیر کے آگے ایک پیالہ پڑا تھا جس میں سرخ رنگ کا سیال موجود تھا۔ وہ دونوں کالے رنگ کا عجیب وغریب وضع کا جبہ سا پہنے ہوئے تھے۔ گلے میں پتھروں کی مالائیں پہنی ہوئی تھیں اور چہرے پر کالے رنگ سے عمودی لکیریں کھینچی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں اونچی آواز میں کچھ ناقابلِ فہم الفاظ بول رہے تھے۔

ماہ نور کے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے یہ منظر دیکھ کر۔

اور پھر دو سال بعد اسے اپنی بہن یاد آئی تھی۔

خوش نصیب کا کہا ایک ایک لفظ یاد آیا تھا۔

اس کی شامیر کے متعلق کہی ہوئی باتیں جو ان لوگوں کے نزدیک الزام تھے، یاد آئی تھیں۔

اسے یاد آیا کہ خوش نصیب نے اسے شامیر کے عزائم بتائے تھے۔

اور پھر اسے یہ بھی یاد آیا تھا کہ اس نے خوش نصیب کی کسی بات پر یقین نہیں کیا۔

ماہ نور کو اللہ یاد آیا، پھر اسے احساس ہوا کہ اسے صرف خود کو ہی نہیں اپنے ہونے والے بچے کو بھی بچانا ہے۔ اللہ نے اس کی مدد کی تھی اور اس نے گردن کو موڑ کر ادھر کچھ ڈھونڈنا چاہا تھا جس سے وہ اپنا دفاع کر سکتی۔ کچھ فاصلے پر ایک پتھر دکھائی دیا تھا۔ تھوڑی کوشش کے بعد وہ اس پتھر کو اپنے آزاد ہاتھ میں پکڑنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ اس نے کروٹ کے بل لیٹ کر اپنے بازو کو پیچھے موڑ لیا تھا تاکہ وہ دونوں اس کے ہاتھ میں پکڑے پتھر کو دیکھ نہ سکیں۔ ویسے بھی ان دونوں کی آنکھیں بند تھیں اور تمام دھیان شاید اس عبادت کی جانب تھا جو وہ کر رہے تھے۔

ماہ نور کی آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔ جنونی محبت کا اظہار کرنے والا وہ انسان کیا کرنے والا تھا اس کے ساتھ، وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ اسے یاد آیا کہ ایک بار شامیر نے اسے کہا تھا کہ وہ اس دنیا کا سب سے طاقت ور انسان بننا چاہتا ہے۔ ماہ نور نے اس کی بات کو دیوانے کا خواب سمجھا تھا لیکن......

''شامیر!'' اس کے منہ سے سسکی کی طرح اس کا نام نکلا تھا۔

اس کی آواز سنتے ہی ان دونوں نے منتر پڑھنا بند کر دیا تھا۔ شامیر نے آنکھیں کھول کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور اس میں اتنی حیوانیت تھی کہ ماہ نور جھرجھری لینے پر مجبور ہوگئی۔

وہ دونوں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ رزوان نے ان خنجروں میں سے ایک اٹھا کر شامیر کے آگے پڑے پیالے میں سے اسے ڈبو کر نکالا۔ وہ سرخ سیال سے تر ہوگیا۔ سرخ قطرے اس میں سے ٹپکنے لگے۔ اس نے خنجر شامیر کی طرف بڑھایا جسے شامیر نے قدرے جھک کر تعظیم کے سے انداز میں پکڑ لیا تھا۔

رزوان اپنی جگہ جا کھڑا ہوا اور پھر سے پہلے والے الفاظ بولنے لگا۔ اس کی آواز میں عجب طیش تھا۔

شامیر خنجر لے کر ماہ نور کی جانب آگیا تھا۔ اس نے پہلے ماہ نور کے پاؤں کی رسی کو کاٹا تھا اور پھر ہاتھ کی رسی کو۔

''یہ سب کیا ہے شامیر! تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟'' وہ رو دی تھی۔

شامیر نے جواب نہیں دیا۔ اس نے اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا تھا۔

ماہ نور نے ابھی تک پتھر کو پیچھے ہاتھ میں چھپا رکھا تھا۔ شامیر نے اسے بالوں سے پکڑا اور قدرے گھسیٹ کر آگ کے الاؤ کی طرف بڑھا۔ ماہ نور مسلسل خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن ناکام رہی۔ اس کا سر ابھی بھی گھوم رہا تھا۔ یقیناً وہ لوگ اسے کوئی نشہ آور چیز پلاتے رہے تھے۔

شامیر خود بھی کوئی منتر پڑھ رہا تھا۔ لمحہ بھر کو اس کی نظر چوکی تھی اور ماہ نور نے پوری طاقت سے وہ پتھر اس کے چہرے پر دے مارا۔ چیخ مار کر اس نے ماہ نور کے بال چھوڑ دیے تھے اور اپنے چہرے کو ڈھانپ کر گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ پتھر شاید اس کی آنکھ پر لگا تھا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔

ماہ نور نے تیزی سے وہ خنجر اٹھا لیا اور رزوان کی طرف متوجہ ہوئی جو شامیر کی چیخ سن کر اس کی مدد کو آگے بڑھا تھا۔ کسے امید تھی کہ وہ دھان پان سی لڑکی ایسا کچھ بھی کر سکتی ہے۔ رزوان نے بھی شامیر کی غلطی کو دہرایا تھا۔ وہ ماہ نور کے ہاتھ میں پکڑے خنجر سے لاعلم تھا۔ ماہ نور نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر خنجر پوری طاقت سے اسے دے مارا۔ وہ بندہ الٹ کر پیچھے کی جانب گرا اور خون کا فوارہ تھا جو اس کے جسم سے پھوٹا تھا۔ ماہ نور نے لڑکھڑاتے قدموں سے غار کے کھلے دہانے کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ وہ شامیر کو زیادہ زخمی نہیں کر پائی تھی کیوں کہ وہ سنبھل کر

اس کے پیچھے بھاگا تھا۔

انسان کو ہرانا آسان ہے، ماں کو ہرانا آسان نہیں ہے۔ ماہ نور کو صرف خود کو ہی نہیں بلکہ اپنے بچے کو بھی بچانا تھا۔ غار سے نکلتے ہی وہ سمت کا تعین کیے بغیر ڈھلوان کی جانب بھاگ پڑی تھی۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے کچھ فاصلے پر دو تین ٹورسٹ مل گئے تھے جو اتفاقاً اس طرف آ نکلے تھے۔ ماہ نور نے ہانپتے ہوئے ان سے مدد کی درخواست کی تھی۔ اس کی بات سمجھنے سے بھی پہلے ان لوگوں نے ایک کان پھاڑ دھماکا سنا تھا۔ ان کی نظریں اوپر ایک غار پر جم سی گئی تھیں۔

ماہ نور نے پیچھے مڑ کر غار کی جانب دیکھا تھا اور اس کے بعد وہ ایک بار پھر ہوش کھو بیٹھی تھی۔

☆☆☆

اسے دوبارہ ہوش اسپتال میں آیا تھا۔ وہ ٹورسٹ اسے نہ صرف اسپتال لائے تھے بلکہ پولیس کو بھی اس بارے میں مطلع کر دیا تھا۔ شامیر کے بارے میں اسے بتایا گیا تھا کہ وہ اسی اسپتال میں زیرِ علاج ہے لیکن اس کی حالت کچھ اچھی نہیں ہے۔

دو دن بعد جب اس کی حالت کچھ سنبھلی، اس سے بیان لیا گیا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں بتا پائی تھی۔ سوائے اس کے کہ اسے وہاں بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا تھا اور جب اسے ہوش آیا تو وہ کسی طرح وہاں سے بھاگ نکلی تھی۔ وہ چاہ کر بھی شامیر کے خلاف کچھ نہیں بتا پائی تھی۔

اسے بتایا گیا تھا کہ اس غار میں ہونے والے دھماکے کے نتیجے میں ایک شخص کا انتقال ہوا ہے۔ اس کی جلی ہوئی لاش کے علاوہ انہیں وہاں سے کچھ ایسی چیزیں بھی ملی تھیں جس سے انہیں پتا چل گیا تھا کہ وہاں اس لڑکی کو کسی شیطانی عمل کے لیے لایا گیا تھا۔

جبکہ اس کے شوہر جو شاید اسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں تک پہنچ گئے تھے، اس دھماکے کے نتیجے میں کھائی میں جا گرے تھے۔ ان کی جان بچ گئی تھی۔ لیکن ان کو جسمانی طور پر بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ اس نقصان کی تفصیل اسے اگلے روز معلوم ہو سکی تھی جب اس کی خواہش پر نرس اسے سہارا دے کر آئی سی یو میں لے گئی تھی۔ ماہ نور نے دروازے میں لگے شیشے کی مدد سے اسے دور سے دیکھا تھا۔

شامیر کا پورا چہرہ پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔

"ان کی حالت ابھی بھی خطرے سے باہر نہیں۔ ایک آنکھ ضائع ہو چکی ہے۔ سر پر گہری چوٹیں ہیں۔ یہ نوکیلے پتھروں پر گرے تھے جس سے چہرہ بگڑ گیا ہے۔ پولیس انہیں تین دن بعد ڈھونڈنے میں کامیاب ہو سکی تھی۔ زخم خراب ہو گئے تھے۔ خاص طور پر ٹانگ کا زخم۔ انفیکشن پھیلنے کا خطرہ تھا اس لیے ڈاکٹرز کو مجبوراً ٹانگ کاٹنی پڑی۔ ان کی جان بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں۔"

ماہ نور کے استفسار پر اس نرس نے آسان لفظوں میں تفصیل سے جواب دیا تھا۔

"ایسے لوگوں کی جان اتنی آسانی سے نہیں نکلتی۔" وہ آہستہ سے بڑبڑائی تھی۔ نرس نے اس کے اردو بولنے پر سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور واپس جانے کو مڑ گئی۔

آگے کی کہانی مختصر تھی۔ وہ اور شامیر گرین کارڈ ہولڈر تھے۔ ایمبیسی سے رابطہ کیا گیا اور شامیر کو سفر کی اجازت ملتے ہی ماہ نور اسے لے کر رومانیہ سے امریکہ آ گئی۔ شامیر نے ہاتھ باندھ کر اس سے معافی مانگی تھی۔ وہ مکمل طور پر ماہ نور کے رحم و کرم پر تھا۔ اس کے جسم کا جو حال ہو چکا تھا، اسے خوف تھا کہ اگر ماہ نور اسے چھوڑ گئی تو وہ کیا کرے گا۔ اسے اپنے کیے کی کچھ سزا دنیا میں ہی مل گئی تھی اور وہ اس سے ہی بلبلا اٹھا تھا۔ وہ ڈپریشن کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کے بار بار معافی مانگنے پر ماہ نور نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ......

"میں تم سے محبت نہیں کر سکتی شامیر! وہ محبت مر چکی...... ہاں خدا ترسی کر سکتی ہوں۔ میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں کیونکہ تمہاری باتوں میں آ کر جو کچھ میں نے اپنی بہن کے ساتھ کیا تھا اس کی کچھ سزا تو مجھے ملنی ہی چاہیے۔"

ماہ نور خود بہت ڈپریس رہنے لگی تھی۔ خوش نصیب کا خیال اسے چین نہ لینے دیتا تھا۔ اس کے اپنے کہے الفاظ اسے جینے نہ دیتے تھے۔ اس نے شامیر کے ساتھ آنے سے پہلے خوش نصیب کو کہا تھا کہ......

"خوش نصیب! تم نے بہت برا کیا۔ جو کچھ تم نے کیا، میرا وعدہ ہے خود سے کہ تمہیں اس سب کے لیے کبھی معاف نہیں کروں گی۔ کبھی بھی نہیں۔ تم نے شامیر پر الزام لگایا۔ ہمارا رشتہ ختم کروانا چاہا اور جب یہ سب نہ کر سکیں تو روشن امی کی جان لے لی۔ میں تو کیا، اللہ بھی تمہیں ان سب کے لیے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ میں جا رہی ہوں خوش نصیب......! زندگی نے اگر کہیں دوبارہ ہمارا سامنا کروایا تو مجھے پہچاننے کی غلطی مت کرنا۔ میں نے پندرہ دن پہلے ہی ماں کے ساتھ بہن کو بھی دفنا دیا ہے۔"

اور اب وہ خود بہن سے معافی مانگنے، اسے دیکھنے کے لیے ترس رہی تھی۔ بالآخر اس نے پاکستان واپس جانے کا فیصلہ کیا اور شامیر کو بھی اس سے آگاہ کر دیا۔ شامیر کے لیے اس کے فیصلے سے انکار اب ممکن نہ رہا تھا۔ ناچار اس نے چپ چاپ اس کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیا تھا۔ جلد ہی وہ لوگ پاکستان آ گئے اور یہاں آ کر اسے خوش نصیب کی گمشدگی کی اطلاع ملی تھی۔ اس نے شامیر کے منہ سے ساری حقیقت گھر والوں کو بتلائی تھی۔ شامیر کے پاس اس کی بات ماننے کے سوا کیا چارہ تھا سو سب سچ اگل دیا تھا۔ تایا اسے دھکے دے کر باہر پھکوا دینا چاہتے تھے لیکن ماہ نور کی التجا پر اسے گھر میں رہنے کی اجازت مل گئی تھی۔ ویسے بھی وہ اپنے کمرے تک ہی محدود رہتا تھا۔ صبر اور اللہ سے معافی کے سوا ماہ نور اور کیا کر سکتی تھی۔ پاکستان آنے کے تین ماہ بعد اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا جو پیدائشی طور پر آنکھوں سے محروم تھا۔

"شامیر کی اولاد ایسی ہی ہو سکتی تھی۔" اس نے پہلی بار اپنے بیٹے کو گود میں لے کر سوچا تھا اور پھر بہتی آنکھوں کے ساتھ اسے سینے سے لگا لیا تھا۔

☆☆☆

یہ اگلے دن کی بات ہے۔ وہ لوگ آئے کت کو فلک بوس میں ڈھونڈتے رہے لیکن وہ نہیں ملی۔ امید تھی کہ وہ خود ہی سامنے آ جائے گی اس لیے وہ لوگ تھک ہار کر اس کا انتظار کرنے بیٹھ گئے۔

ان تینوں کے سامنے ہی "اب آگے کیا کرنا چاہیے؟" ایک بڑے سوالیہ نشان کی طرح موجود تھا جس کا جواب دینے سے وہ تینوں ہی قاصر تھے۔ پولیس کو ملوث کرنے کا خطرہ وہ مول لے تو لیتے لیکن سوال یہ تھا کہ کیا پولیس معاویہ اردشیرازی جیسے انسان پر ہاتھ ڈالنے کو تیار ہو گی۔ پھر وہ منفرا کا شوہر تھا اور منفرا کے لیے یہ فیصلہ کرنا بے حد مشکل تھا۔

آئے کت کی ذہنی حالت بھی ایک بڑا مسئلہ تھی۔

ایک ذہنی مریضہ کی بات پر کون یقین کرتا؟

منفرا نے ایک فیصلہ کر کے اگلے دن ڈاکٹر ریمنسن سے رابطہ کیا تھا۔ ڈاکٹر ریمنسن وہ واحد انسان تھے جو اس وقت آئے کت کی ذہنی حالت کو سمجھنے میں اس کی مدد کر سکتے تھے۔ مشکل سے ہی سہی لیکن پروفیسر میسر آ گئے تھے۔

"پروفیسر مجھے آپ سے کچھ ہیلپ چاہیے تھی۔ اگر آپ کے پاس کچھ فرصت ہو تو...... میں آپ سے ایک کیس ڈسکس کرنا چاہتی ہوں۔" منفرا نے ابتدائی کلمات کے بعد اصل مدعا پر آتے ہوئے کہا تھا۔ پروفیسر نے اسے باخوشی اجازت دے دی تھی۔

"پروفیسر میں آج کل پاکستان میں ہوں اور میں یہاں معاویہ کی فیملی میں ایک ایسی خاتون سے ملی ہوں

جنہیں اپنی اصل شناخت یاد نہیں۔"

"عمر کیا ہے خاتون کی؟" انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

"ان کی عمر بمشکل تیں پینتیس سال ہے۔" منفرا نے اندازے سے بتایا۔

"ٹھیک ہے آگے بتاؤ۔"

"مسئلہ صرف یہ نہیں کہ وہ اپنی اصل پہچان بھول چکی ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ وہ خود کو ایک ایسی مردہ عورت سمجھ رہی ہیں جو شاید حقیقت میں کبھی موجود ہی نہیں تھی۔ یہاں ایک عورت کی کہانی سنائی جاتی ہے جسے ڈیڑھ سو سال پہلے قتل کر دیا گیا تھا۔ اب معاویہ کی ان عزیزہ کا کہنا ہے کہ وہ اصل میں وہ عورت ہیں جسے قتل کیا گیا اور وہ ایک بدروح کے طور پر یہاں زندگی گزار رہی ہیں۔" منفرا تفصیل بتا کر خاموش ہو گئی تھی۔

"انٹرسٹنگ۔" ڈاکٹر ریمنسن نے ہنکارا بھرتے ہوئے کہا تھا۔ "کتنا عرصہ ہو چکا ہے ان کی اس حالت کو؟"

"کم از کم آٹھ سے دس سال۔ علاج بھی کرواتے رہے ہیں لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا اور مجھے پرسنلی یہ کوئی نارمل ذہنی بیماری نہیں لگتی۔" منفرا نے بے چارگی سے کہا تھا۔

"دیکھو میرے بچے! اس دنیا میں ایسا بہت کچھ ہوتا ہے جو ہماری سمجھ سے باہر ہے۔" پروفیسر نے کہنا شروع کیا۔ "جب دنیا میں پہلے انسان کو کینسر ہوا ہو گا تو یقیناً دنیا ہکا بکا رہ گئی ہو گی۔ جبکہ اب یہ ایک ایسی بیماری ہے جو اکثر سننے اور دیکھنے کو ملتی ہے اور اکثر ملکوں میں کامیابی سے اس کا علاج بھی کر لیا جاتا ہے۔"

پروفیسر سانس لینے کو رکے۔

"بالکل ایسے ہی دماغی بیماریوں میں بھی ہوتا ہے۔ عقل کو حیران کر دینے والی ایسی ایسی بیماریاں سننے اور دیکھنے کو ملتی ہیں کہ انسان حیران رہ جائے۔ ممکن ہے کہ تمہاری عزیزہ بھی ایسی ہی کسی بیماری کا شکار ہوں۔"

"آپ کو کیا لگتا ہے پروفیسر! کہ یہ کون سی بیماری ہو سکتی ہے؟ اسپلٹ پرسنیلٹی (یعنی دوہری شخصیت) ڈس آرڈر۔ کیا یہ ممکن ہے کہ انہیں یہ بیماری ہو؟"

"بالکل ممکن ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ وہ واکنگ کورپس سینڈروم کا شکار ہوں۔" پروفیسر لمحہ بھر کو رکے تھے پھر انہوں نے پوچھا تھا۔ "اس بارے میں کچھ یاد ہے؟"

"نہیں پروفیسر۔" شرمندہ سا جواب آیا۔

"اس بیماری کو کورٹڈ ڈیلیوژن بھی کہا جاتا ہے۔ اگر آسان لفظوں میں بیان کروں تو یہ ایک ایسی بیماری ہے جس میں انسان خود کو مردہ سمجھنے لگتا ہے یا اسے لگنے لگتا ہے کہ اس کے جسم کے کچھ اندرونی اعضا موجود نہیں ہیں۔ مثلاً دماغ، معدہ یا پھیپھڑے وغیرہ۔ اس صورت حال میں اگر وہ خود کو مردہ سمجھنے لگے تو وہ دنیا سے کٹ کر رہنے لگتا ہے۔ اسے مردہ خانوں اور قبرستانوں میں وقت گزارنا اچھا لگنے لگتا ہے۔ اور اگر اسے اپنے کسی جسمانی اعضا کی کمی کا احساس ہونے لگے تو وہ نارمل کام کرنا چھوڑ دے گا۔ مثال کے طور پر اگر کسی مریض کو لگے کہ اس کا معدہ نہیں ہے تو وہ کھانا چھوڑ دے گا اور اس کا نتیجہ خوراک کی کمی اور بعد میں موت کی صورت ہی نکلے گا۔ تم یوں سمجھو کہ انسان زومبی بن جاتا ہے اس بیماری میں۔

اسے سائے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ وہ قبرستانوں میں جا کر رہنا پسند کرنے لگتا ہے۔ زندہ انسانوں سے کٹنے لگتا ہے۔ ان کے دماغ انسانی چہروں کو پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ایسے بہت سے مسئلے ہیں جو اس بیماری کے ساتھ اٹھتے ہیں۔

یہ ایک نہایت بھیانک لیکن بہت کم پائی جانے والی بیماری ہے جس کی وجہ عموماً شدید ڈپریشن سمجھا جاتا ہے۔ کیا یہ خاتون کسی ڈپریشن کا شکار رہی ہیں۔۔۔؟" انہوں نے رک کر سوال کیا تھا۔

"شاید......" منفرا کے پاس صحیح جواب خود بھی موجود نہیں تھا تو انہیں کیا بتاتی۔

اس کا دل یہ سب سن کر مزید بوجھل ہو گیا تھا۔ ایک جیتے جاگتے انسان کو معاویہ نے کیا بنا دیا تھا۔

"حتمی طور پر تو ان خاتون کی بیماری بتا پانا مشکل ہے منفرا! لیکن تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خاتون کسی ایسے ہی مسئلے کا شکار ہو چکی ہیں۔ اگر تم انہیں اپنے ساتھ نیویارک لا سکتی ہو تو لے آؤ۔ ان کے مکمل چیک اپ کے بعد ضرور کوئی حتمی رائے دی جا سکتی ہے۔" پروفیسر نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"میں کوشش کروں گی پروفیسر کہ انہیں ساتھ لے کر آ سکوں۔ اگر ایسا کوئی سلسلہ بن سکا تو میں ضرور آپ کو انفارم کروں گی۔" منفرا نے کہا تھا۔

اختتامی جملوں کے بعد اس نے کال بند کر دی تھی۔

وہ اپنا اگلا لائحہ عمل طے کرنے میں مصروف تھی جب کیف دستک دے کر اندر داخل ہوا۔

"مسز معاویہ! اگر آپ فارغ ہیں تو میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے دروازے میں کھڑے ہو کر اجازت چاہی تھی۔

"ہاں ضرور...... اندر آ جاؤ۔ خوش نصیب کہاں ہے؟" اس نے اجازت دینے کے ساتھ ہی پوچھا۔

"وہ کچن میں کھانا تیار کر رہی ہے۔" کیف دروازہ کھلا چھوڑ کر اندر آ گیا تھا۔ منفرا نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ منفرا کے سامنے والے صوفے پر ٹک گیا۔

"مسز معاویہ! میں جانتا ہوں کہ جو کچھ پرسوں رات آپ کے سامنے آیا ہے اس پر یقین کرنا بہت مشکل ہے لیکن یقین کیے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔"

اس نے تمہید کے بغیر بات شروع کی تھی۔ وہ بہت نرم لہجے میں بول رہا تھا۔

"اس سارے معاملے کو اگر ایسا ہی چلنے دیا گیا تو یقیناً ہم بھی مجرم کہلائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں پولیس کو انفارم کر دینا چاہیے۔"

منفرا تڑپ کر اس کی جانب مڑی تھی۔

"کیف پلیز۔۔۔" وہ منت بھرے انداز میں بولی تھی۔

"پولیس کو انفارم کیے بغیر اس معاملے کا حل ہونا ناممکن ہے۔۔۔ اور کم از کم میں اس معاملے میں خاموش نہیں رہ سکتا۔" کیف نے ابھی بھی اپنے لہجے کو نرم ہی رکھا تھا۔

"تم مجھے کچھ وقت دو۔۔۔ میں کوئی بہتر سلوشن ڈھونڈ لوں گی۔" منفرا بولی۔

"وقت۔۔۔؟ وقت ہی تو نہیں ہے ہمارے پاس۔۔۔ اگر مسٹر معاویہ واپس آ گئے تو وہ کبھی بھی اس حقیقت کو سامنے آنے نہیں دیں گے۔۔۔ آپ جانتی ہیں نا مسز معاویہ! کہ آپ کے شوہر نے ایک غلط کام کیا ہے۔۔۔" کیف خفگی سے بولا۔

"مگر وہ حق پر تھا۔۔۔ اس کے بھائی کو قتل کیا گیا تھا۔"

"قتل نہیں خودکشی۔۔۔" کیف بدلحاظی سے بولا تھا۔ "اور دنیا کی کوئی عدالت انہیں قانون اپنے ہاتھ میں لینے کا حق نہیں دیتی ہے۔"

"اسے اس حد تک لانے والی آئے کت ہی تھی کہ اس نے خودکشی کر لی۔"

"اور میرا ذاتی خیال ہے کہ دس گیارہ سال کی قید تنہائی ورغلانے کی سزا کے طور پر کافی ہے۔۔۔"

"کیف تم میری بات سمجھ نہیں رہے ہو۔۔۔ ہمیں کم از کم ایک بار معاویہ کو اپنی بات کہنے کا موقع دینا چاہیے۔۔۔"

"سمجھنے کی ضرورت فی الحال مجھے نہیں آپ کو ہے۔۔۔ اگر یہ بات صرف آئے کت کہتی تو شاید میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا۔۔۔ لیکن نہیں۔۔۔ یہ بات صرف آئے کت نے ہی نہیں بلکہ کبیر خان نے بھی اس کے بیان کی تصدیق کی ہے۔۔۔ آپ آئے کت کی حالت دیکھ چکی ہیں۔ اس کی دماغی حالت آپ کے سامنے ہے۔ اور مزید اس معاملے کو لٹکانا معاویہ اردشیرازی کے جرم سے نظر چرانے کے مترادف ہے۔۔۔ اور میں ایسا نہیں کرسکتا۔۔۔" کیف حتمی لہجے میں بولا۔

"تمہیں لگتا ہے معاویہ تمہیں یہ سب کرنے دے گا؟ پولیس کو انوالو کر کے بھی کوئی فائدہ نہیں ہو گا کیف۔۔۔ معاویہ کے فادر اتنے اپروچ فل ہیں کہ وہ کبھی بھی اپنے بیٹے کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہونے دیں گے۔۔۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔۔۔ معاویہ کے لیے پولیس کو اپنے حق میں کرنا کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ اور اس کے بعد تمہارا کیا ہوگا؟ کیا یہ لوگ تمہیں ایسے ہی چھوڑ دیں گے؟ نہیں بالکل نہیں۔۔۔ تمہاری یہ غلطی تم پر ہی بھاری پڑے گی کیف۔۔۔ اور صرف تم ہی نہیں اس بات کا خمیازہ آئے کت کو بھی موت کی صورت بھگتنا پڑ سکتا ہے۔ سب سے بڑھ کر پاکستان کی عدالت کیا کسی ذہنی مریض کی چارہ جوئی کرے گی؟ یہاں تو نارمل لوگوں کو انصاف نہیں مل پاتا۔۔۔ آئے کت کو کیسے انصاف دلاؤ گے تم؟"

وہ پھٹ پڑی تھی۔ کیف نے خود کو لاچار محسوس کیا۔ اس ساری حقیقت سے وہ خود بھی واقف تھا لیکن دل میں موجود اس ہمدردی کا کیا کرتا جو اسے کچھ کرنے پر اکسا رہی تھی۔

"تو آپ چاہتی ہیں کہ جو جیسے چل رہا ہے چلنے دیں۔۔۔ مسز معاویہ۔۔۔! وہ لڑکی پچھلے دس سال سے یہاں بند ہے اور ایسی حالت میں کہ وہ اپنی اصل شناخت تک بھول چکی ہے۔ یہ ظلم ہے۔۔۔ بہت بڑا ظلم۔ دوسری بات یہ کہ آپ بھول رہی ہیں کہ میں صحافی ہوں۔۔۔ اور میڈیا کی طاقت کو آپ نظر انداز نہیں کرسکتیں۔"

اس نے جیسے بے بس ہو کر اپنا آخری ہتھیار نکالا تھا۔

منفرا نے سر تھام لیا۔ وہ کیف کو اپنا پوائنٹ سمجھا نہیں پا رہی تھی اور یہ بات سے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔

"کیف۔۔۔! اگر یہ بات سامنے آئی تو اور بہت سے کھاتے کھل جائیں گے۔ سب سے پہلے آئے کت خود سامہ کے قتل کے کیس میں قصور وار ٹھہرائی جائے گی۔۔۔ اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ جو کہانی وہ سناتی ہے اس میں قاتلہ وہ خود ہی ہے۔ میں ایسا نہیں چاہتی کیونکہ جو کچھ وہ بھگت چکی ہے وہ بہت زیادہ ہے۔۔۔ وہ ذہنی مریضہ بن چکی ہے۔ اسے اپنا کیا جرم خود بھی اپنے حوالے سے یاد نہیں۔ میں نہیں جانتی کہ یہ صحیح ہے یا غلط لیکن میں نیک نیتی سے اسے مزید کسی مشکل میں پھنسائے ان حالات سے نکالنا چاہتی ہوں۔ لیکن تمہاری جذباتیت ایسا نہیں ہونے دے گی۔" منفرا نے بے بسی سے کہا تھا۔

☆☆☆

خوش نصیب کچن میں کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کا ذہن اس وقت مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ایک طرف اسے آئے کت کی فکر ستا رہی تھی تو دوسری طرف اسے آئے کت سے زیادہ منفرا پر ترس آ رہا تھا۔ پھر سب سے بڑھ کر اس کا ذہن ماہ نور کی جانب سے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔

ہنڈیا بھوننے کے بعد وہ وہاں شیلف کے پاس ہی اپنی سوچ میں گم کھڑی رہی تھی۔

ایک انسان جسے آپ سب سے زیادہ چاہتے ہوں اور آپ کو لگتا ہو کہ آپ سے زیادہ اسے کوئی نہیں جانتا اور پھر اچانک آپ کو پتا چلے کہ وہ تو صرف ایک دھوکا ہے اور آپ تو کبھی اسے جان ہی نہیں پائے تو اعتبار کیسے مجروح ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ بات خوش نصیب اچھی طرح سے جانتی تھی۔ وہ منفرا کا دکھ محسوس کرسکتی تھی۔

آج سے کئی سال پہلے معاویہ اردشیرازی نے جب اسے شامیر کے چنگل سے نکلنے میں مدد دی تھی، خوش

...کو وہ بہت اچھا انسان لگا تھا۔ اس کے دل میں بہت عزت تھی معاویہ کے لیے۔

...حتیٰ کہ جب اس نے مدد کرنے سے منع کیا تب بھی خوش نصیب خود کو اسے عزت دینے سے روک نہیں ...سکی۔ لیکن آج پہلی بار اس کی عزت پر خوف اور نفرت کی دھند پھیل گئی تھی۔ اسے شامیر اور معاویہ میں کوئی ...فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ دونوں ہی بدلہ لینے میں کسی بھی حد تک جا سکتے تھے۔

وہ اپنی سوچ میں گم کھڑی تھی، جب کسی نے بہت آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ...یہ حد تھی۔۔۔ وہ اپنی جگہ سے بری طرح اچھلی اور کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ خوف کی شدت سے اسے اپنی ...رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اور پیچھے کھڑے انسان کو دیکھ کر بھی وہ اگلے چند سیکنڈ خود کو نارمل نہیں کر پائی ...کیوں کہ اس کے پیچھے آئے کت کھڑی تھی۔ وہ پرسوں صبح کے بعد اسے اب دکھائی دی تھی۔ اسی خوف زدہ کر ...دینے والے حلیے کے ساتھ۔

خوش نصیب کو خود کو یاد دلانا پڑا کہ وہ کوئی بدروح نہیں بلکہ جیتی جاگتی انسان ہے اور یہ بات ثابت ہو چکی ...

آئے کت نے اسے ڈرتے اور پھر ڈر کر اپنی جگہ سے ہٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی خوشی ...کی مسکراہٹ سمٹ آئی تھی جیسے کوئی معرکہ سرانجام دیا ہو۔

اور یہ مسکراہٹ اس کے چہرے کو مزید خوفناک بنا رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ مسکراہٹ ہنسی اور پھر قہقہے میں بدل گئی تھی۔

"ڈر گئی؟ ڈر گئی؟ ہاہاہا...... ڈرنا چاہیے۔ سب کو بدروح سے ڈرنا ہی چاہیے۔ سب کو آیوشمتی سے ڈرنا ...چاہیے۔ ہاہاہا...... ڈرتے ہو اور پھر وہ لڑکا کہتا ہے کہ میں روح نہیں ہوں۔ میں انسان ہوں۔"

خوش نصیب نے اس کے لفظ لفظ کو بغور سنا تھا۔

وہ خفگی سے سر جھٹک کر رہ گئی۔ اسے اپنے ڈرنے پر کچھ شرمندگی سی محسوس ہوئی۔

تب ہی خفگی سے بولی تھی۔ "وہ لڑکا بالکل ٹھیک کہتا ہے۔ تم انسان ہی ہو۔ کوئی بدروح نہیں۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم لوگ۔" وہ چیخی اور اس کے چیخ کر بولنے پر خوش نصیب احتیاطاً مزید پیچھے ہو گئی تھی۔ ...اس نے بات جاری رکھی۔

"بے وقوف ہو۔ میں آیوشمتی ہوں۔۔۔ ہمیشہ زندہ رہنے والی۔۔۔ ایک ایسا راز جسے کبھی کوئی جان ہی

نہیں پایا ہے۔۔۔بستی کے لوگ ڈرتے ہیں مجھ سے۔۔۔میرے حوالے دیتے ہیں ایک دوسرے کو۔۔۔
میرے قصے سناتے ہیں یہاں آنے والوں کو۔۔۔'' آئے کت وہ باتیں دہرانے کی کوشش کررہی تھی، جو
اکثراس کے سامنے کہتا تھا۔

''اور وہ سب قصے جھوٹ ہوتے ہیں۔۔۔'' اب کی باراس کے لہجے میں خفگی نہیں بلکہ سنجیدگی تھی۔

''تم انسان بہت بے وقوف ہو۔۔۔صرف اسی پر یقین کرتے ہو جو دکھائی دیتا ہے اور کبھی وہ دیکھنے
کی کوشش نہیں کرتے جو دکھائی نہیں دے رہا ہوتا۔''

وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولتی ہوئی یکدم جست لگا کر خوش نصیب کے قریب آ گئی تھی۔صرف یہاں تک
تو شاید خوش نصیب مزید بہادری کا مظاہرہ کر پاتی لیکن آئے کت نے اس کی کلائی کو پکڑ لیا تھا۔

''میں انسان نہیں ہوں۔میں آیو کمتی ہوں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

یہ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں دوسری بار تھا کہ ایک انسان اسے انسان ثابت کرنے کی کوشش کررہا تھا۔
غصہ آ رہا تھا اور اس کا غصہ اسے مزید چڑا رہا تھا۔

خوش نصیب نے بغور اس کی بات سنی، زور لگا کر اپنی کلائی چھڑوائی اور تیزی سے چند قدم دور ہوگئی۔

''صحیح کہہ رہی ہو لیکن تم وہ انسان ہو جو وہ دیکھنے کی کوشش کررہی ہو جو اصل میں موجود ہی نہیں ہے۔تم
بدروح نہیں ہو......تم آئے کت ہو۔''

ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولتی ہوئی وہ آہستہ آہستہ کچن کے دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی۔
کہ کیف اور منفرا کو بلائے تا کہ کیف اسے پھر سے کمرے میں بند کر دے۔کم از کم تب تک، جب تک
معاملے کا کوئی بہتر حل نہ نکال لیا جائے۔

''اور یہی سچ ہے......ہم تمہیں دیکھ سکتے ہیں...... تمہیں چھو سکتے ہیں...... ہے نا؟'' اس کا لہجہ بتدریج
ہوتا چلا گیا تھا۔

آئے کت کی آنکھوں میں غصہ بڑھتا چلا جا رہا تھا اور یہی چیز خوش نصیب کو کسی حد تک خوف زدہ کر رہی
تھی۔وہ وہاں اکیلی تھی اور اگر آئے کت اس پر حملہ کر دیتی تو وہ اکیلی کچھ بھی نہیں کر پاتی۔

''اچھا تو تمہیں لگتا ہے کہ میں انسان ہوں؟'' آئے کت نے اسٹینڈ میں پڑی ہوئی ایک بڑے سائز کی
چھری کو ہاتھ میں لیا اور اس کی جانب مڑی۔

خوش نصیب کو اسی بات کا خطرہ تھا لیکن اسے یہ اندازہ نہیں ہو پایا تھا کہ وہ کرنے کیا والی ہے۔اس
چھری پکڑی اور بے دردی سے اپنی کلائی پر کٹ لگا لیا۔خوش نصیب کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکلی تھی۔

''دیکھا تم نے مجھے تکلیف نہیں ہوئی کیوں کہ میں انسان نہیں ہوں۔تم کر سکتی ہو ایسا؟ بولو۔'' وہ چھری
کر اس کی جانب بڑھی تھی۔

''لو پکڑو اسے۔'' وہ قہقہے لگا رہی تھی۔

''تم کبھی ایسا نہیں کر سکتیں کیوں کہ تم کمزور انسان ہو۔۔۔میں نہیں۔۔۔ہاہاہا۔۔۔''

وہ خوش نصیب کے خوف زدہ ہونے پر قہقہے لگا رہی تھی۔

خوش نصیب باہر کی جانب بھاگی۔اس کا رخ منفرا کے کمرے کی جانب تھا۔

آخری قسط آئندہ







نمرہ احمد

حالم

تالیہ خواب میں فاتح کے سن باؤ والے گھر میں، خود کو ایڈم کے ساتھ خزانہ تلاش کرتے ہوئے دیکھتی ہے۔ تالیہ سے اپنی فائل کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے اور اسے اپنے گھر آنے سے منع کر دیتا ہے۔ تالیہ کو عصرہ سے پتا چلتا ہے سکہ ایڈم کے پاس ہے۔ ایڈم اسے ایک جیولر کو بیچ دیتا ہے۔ تالیہ اس کے حوالے سے اسے الجھا دیتی ہے اور جیولر کو بلیک کر کے سکہ نکلوا لیتی ہے، مگر سکہ اس کے ہاتھ میں دینے کے بجائے ایڈم اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔

فارض صاحب کے ذریعے فاتح کو حالم کا پتا چلتا ہے۔ فائل کی واپسی کے لیے حالم صبح تک کا وقت مانگتا ہے اور منصوبے میں فاتح کو بھی شامل کرتا ہے۔ فاتح اس کی باتوں سے متاثر ہو کر راضی ہو جاتا ہے۔ ایڈم پر سکے کا اسرار ہے۔ حالم پتا چلا لیتا ہے کہ فائل اشعر کے آفس میں ہے۔

سمیع، تالیہ کو بلیک میل کرنے آتا ہے۔ بازار میں داتن، سمیع کو خوف زدہ کر دیتی ہے۔ حالم جان پہ کھیل کے روز ہی فائل اشعر کے سیف سے چرا کر لا دیتا ہے۔ فاتح، حالم سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔

ایڈم کو تالیہ مشکوک لگتی ہے۔ وہ تالیہ کی گردن پہ نشان دیکھتا ہے تو اسے تاریخی کہانی یاد آ جاتی ہے اور وہ سمجھ جاتا ہے کہ تالیہ سکے کے پیچھے ہے جو ایڈم کے پاس ہے۔ عصرہ سے فاتح جھوٹ بولتا ہے۔ عصرہ کو فاتح اور اشعر دونوں پہ غصہ آتا ہے۔ فاتح گھر کو بیچنے سے پہلے وہاں ایک دن گزارنے جاتا ہے۔ عصرہ، تالیہ کی فرمائش پہ اسے بھی بلا لیتی ہے۔ فاتح سن باؤ کے گھر کی کہانی سناتا ہے۔ تالیہ اس گھر کے کنویں کو دیکھ کر سمجھ جاتی ہے کہ خزانہ کہاں ہے۔ وہ فاتح سے اس گھر کو خریدنے کی خواہش کا اظہار کرتی ہے۔



مگر وہ اسے بیچنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فاتح کو یاد آتا ہے کہ وہ عصرہ اور بچوں کے ساتھ پہاڑوں کی سیر کو جاتا ہے، جہاں آریانہ کو اس کی آیا دھوکے سے اغوا کر لیتی ہے۔ فاتح، آریانہ کے گرائے ہوئے پاپ کارن کے ذریعے آریانہ کی لاش تک پہنچ جاتا ہے۔ آریانہ مزاحمت کے دوران پہاڑ سے گر کر ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس کے اغوا کار بھی کھائی میں گر کر مر جاتے ہیں۔ فاتح آریانہ کی مسخ شدہ لاش دفنا دیتا ہے۔ اور اس کی موت کا کسی کو نہیں بتاتا، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ آریانہ کو صوفیہ رحمٰن نے اغوا کرایا تھا۔

ایڈم ملاکہ پہنچ جاتا ہے۔ ایڈم کو یقین دلانے کے لیے تالیہ بریسلیٹ اس کو دے دیتی ہے۔ ایڈم شک میں پڑ کر راستے میں فاتح کو بیچ بتاتا ہے۔

تالیہ فاتح کے گھر میں خزانے کا راستہ تلاش کر لیتی ہے۔ فاتح اور ایڈم بھی پہنچ جاتے ہیں۔ فاتح اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہتا ہے، مگر تالیہ خزانہ دیکھنے پر بضد ہوتی ہے۔ بالآخر تینوں بحث کے بعد ایک دروازے سے گزرتے ہیں۔ جہاں سے وہ ایک جنگل میں پہنچ جاتے ہیں۔ دروازہ غائب ہو جاتا ہے۔

راستے میں وہ ہی حالات پیش آتے ہیں جو تالیہ خواب میں دیکھ چکی ہے۔ اسے داتن کی باتوں میں سچائی نظر آنے لگتی ہے کہ وہ پندرہویں صدی کی لڑکی ہے جو وقت سے آگے نکل آئی تھی۔ خزانے کے لالچ میں، اور سچ کی تلاش میں تالیہ، فاتح اور ایڈم پرانے زمانے میں پہنچ جاتے ہیں۔

فاتح پر کھل جاتا ہے کہ تالیہ ہی حالم ہے۔ اب اس کا رویہ بدل جاتا ہے۔ وہ حالات سے گھبرانے کے بجائے جنگل سے نکلنے کا سوچتا ہے۔ اور از خود ان دونوں کا لیڈر بن جاتا ہے۔

جنگل میں تالیہ کو آگہی ملتی ہے۔ کہ شہزادی تاشہ اس کے گاؤں کے لوگوں پر ظلم ڈھا رہی ہے اور اس نے تالیہ کے بابا کو بھی قید کر لیا ہے۔ تالیہ کو شہزادی تاشہ سے نفرت محسوس ہوتی ہے۔ مگر ایڈم اور وان فاتح تاریخی کتابوں کے حوالے سے تاشہ کو جانتے ہیں۔ وہ دونوں تاشہ کی تعریف کرتے ہیں اور وان فاتح تاشہ کا فین ہے۔

وان فاتح کو اپنے ملک میں ہونے والے انتخابات کی بھی فکر ہے اس کا خیال ہے کہ مراد دوبارہ چابی بنا دے گا تو وہ واپس اپنے ملک چلے جائیں گے اس مقصد کے لیے قدیم ملاکہ جانا ضروری ہے۔

یہ لوگ رین فاریسٹ میں سے راستہ تلاش کر کے جنگل میں جاتے ہیں۔ جہاں تالیہ ہرن کا شکار کر کے اسے آگ پر بھونتی ہے۔ کھانے کی یہ خوشبو قدیم ملاکہ کے لوگوں کو متوجہ کر لیتی ہے۔ اور تین قدیم باشندے وان فاتح، ایڈم اور تالیہ کو زبردستی پکڑ کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایسے میں تالیہ کو دوبارہ آگہی ملتی ہے جب وہ ملاکہ کے ایک یتیم خانے میں جانے کیسے پہنچ گئی تھی۔ وہاں کی انچارج مسز ماریہ نے اس کا بریسلیٹ اتار لیا تھا اور ایک سنار کو بیچ دیا تھا مگر وہ سنار کے لیے بدبختی لایا تھا۔ وہ پھل پھول نہیں رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ دوسری مصیبتوں میں بھی مبتلا ہو گیا تھا۔ یتیم خانے کی میڈم ایگنیس تالیہ پر چوری کا غلط الزام لگاتی ہے۔ اور اسی ضد میں تالیہ چوری کرنا اور زبردستی اپنا حق چھیننا سیکھتی ہے۔

یتیم خانے میں مسٹر ذوالکفلی آتے ہیں جو تھوڑا وقت بچوں کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں تاکہ اپنا من پسند بچہ ایڈاپٹ کریں۔ ان کا زیادہ وقت تالیہ مراد کے ساتھ گزرتا ہے۔ جو ہمہ وقت کسی پہاڑی پر محل کا اسکیچ بناتی ہے۔ ذوالکفلی اسے پیلے گلاب اور سکے کا ایک شعبدہ دکھا کر متاثر کرتے ہیں۔

ذوالکفلی ایک کون آرٹسٹ اور اسکامر ہے۔ وہ یتیم خانے میں بچہ ایڈاپٹ کرنے نہیں آیا تھا، بلکہ کسی جگہ نظر رکھنے آیا تھا اور موقع ملتے ہی وہاں سے ہیرا لے اڑا۔ پولیس تالیہ سے اس کا اسکیچ بنواتی ہے۔ تو وہ غلط اسکیچ بنا کر اسے بچا لیتی ہے۔

تالیہ کو بار بار یتیم خانے میں اپنے ساتھ ہونے والا برا سلوک یاد آتا ہے۔ اسے لاہور کے ایک گھر میں لے جایا جاتا ہے، جہاں اس پر اس فیملی کے دادا جی کے قتل کا جھوٹا الزام لگایا جاتا ہے۔ وہ سچائی ثابت کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ وہ ملائیشیا کو یاد کرتی ہے۔ جہاں اس نے بالآخر ذوالکفلی کو ڈھونڈ نکالا تھا اور احسان مندی کے طور پر ذوالکفلی نے اسے اپنا سارا ہنر سکھا دیا تھا۔

تالیہ، ایڈم اور فاتح کو "ابوالخیر" نامی آدمی کے کارندے ایک پنجرے میں قید کر کے گھوڑا گاڑی کے ذریعے قدیم ملاکہ کے شہر لے جاتے ہیں۔ تالیہ خود کو اور ایڈم کو آزاد کرا لیتی ہے۔ مگر فاتح کو آزاد کرانے سے پہلے اغوا کاروں کو خبر ہو جاتی ہے۔ وہ دونوں فاتح کو چھوڑ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ فاتح کو ایک قید خانے میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ جہاں ایک "الہو" قیدی کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہے۔

قید میں فاتح کو ادراک ہوتا ہے، وہ ماضی میں کسی خاص مقصد سے بھیجا گیا ہے۔ وہ خود کو حالات کے رحم و کرم پہ چھوڑنے کے بجائے ان کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ تالیہ کی ذہانت سے وہ دونوں اپنے اغوا کاروں کو جل دے کر بھیس بدل کر شہر میں ہی پھرتے ہیں۔ جہاں تالیہ پہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ خود شہزادی تاشہ ہے اور بنداہارا کی بیٹی ہے۔ بنداہارا مراد اپنے ساتھیوں سے غداری کر کے انہیں پکڑوا دیتا ہے اور خود بادشاہ سے جو اس کا ماموں زاد ہے مل جاتا ہے۔ تالیہ صدمے سے چور ہو کر خزانے کی چابی حاصل کر لیتی ہے اور وقت کا دروازہ پار کر جاتی ہے۔ راجہ مراد، تالیہ کو اپنی بیٹی تاشہ کی حیثیت سے تسلیم کر لیتا ہے۔

ایڈم، وان فاتح کو ابوالخیر کی غلامی میں کام کرتے ہوئے، موقع پا کر تالیہ کے بارے میں بتاتا ہے فاتح اسے تالیہ کی کہانی سمجھتا ہے تالیہ یہ جان کر غصے میں آ جاتی ہے اور طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تین بے گناہ افراد جن میں ایڈم بھی شامل ہے گرفتار کروا کے مختلف سزائیں دیتی ہے ایڈم کو شاہی کتب خانے میں کام کرنے کی سزا ملتی ہے۔

تالیہ کو اپنے باپ مراد کے خیالات جان کر دھچکا لگتا ہے۔ وہ ہر صورت چابی حاصل کر کے ملائشیا واپس آنا چاہتی ہے۔ مگر راجہ مراد بے جا طاقت کا اور ظلم کا مظاہرہ کر کے تالیہ کو خوفزدہ کر دیتا ہے۔ راجہ کی خاص کنیز شریفہ اس کی جاسوسی کرتی ہے۔ مگر تالیہ اس کی کمزوری پتا چلا کر اس کی وفاداری خرید لیتی ہے۔

ملکہ یان سوفو چینی بادشاہ کی بیٹی اور بادشاہ مرسل کی بیوی ہے مگر وہ ایک ظالم عورت ہے اور اس کے مقابل بنداہارا مراد ہے۔ جو بادشاہ کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔

وان فاتح کو ابوالخیر اپنے باورچی خانے میں کام پر رکھ لیتا ہے۔ وہ اسے اچھی غذائیں کھانے کو دیتا ہے تاکہ نیلامی میں اس غلام کی اچھی قیمت ملے۔

تالیہ، فاتح سے ملاقات کا موقع نکال لیتی ہے۔ وہ جاننا چاہتی ہے کہ تاریخ میں اس نے کیا کارنامے انجام دیئے تھے مگر فاتح نہیں بتاتا۔ ایڈم "بنگارایا ملایو" کے رائٹر کا تھیلا چرا لیتا ہے۔ جس نے ابھی کتاب لکھنی شروع نہیں کی۔ تالیہ وہ تھیلا لیتی ہے۔

ابوالخیر شاہی خزانچی بننا چاہتا ہے، وہ بادشاہ کی دعوت کرتا ہے۔ جہاں ملکہ اور راجہ مراد بھی ہوتے ہیں۔ تالیہ بھی وہاں پہنچ جاتی ہے۔ بادشاہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔ ملکہ یان سوفو "وانگ لی" کو شاہی خزانچی بنانا چاہتی ہے۔ مراد، ابوالخیر کو۔ وان فاتح، سن باؤ کے وانگ لی سے متاثر ہے دعوت میں سن باؤ وانگ لی بھی موجود ہوتا ہے۔ ابوالخیر اس سے خطرہ محسوس کر کے فاتح کے ہاتھوں اسے زہر دلواتا ہے مگر فاتح وانگ لی کو خبردار کر دیتا ہے۔

فاتح، وانگ لی سے بے حد متاثر ہے اور اسے خزانچی دیکھنا چاہتا ہے مگر تالیہ ابوالخیر کو خزانچی بنانے کی سفارش کرتی ہے۔ فاتح کو یہ بات ناگوار گزرتی ہے، تالیہ، ایڈم کو شاہی مورخ تعینات کرتی ہے۔ فاتح تمام غلاموں میں آزادی کا جذبہ جگاتا ہے اور اپنے ساتھ کا یقین دلاتا ہے۔ راجہ مراد تمام اہم عہدوں پر بادشاہ کو قائل کر کے اپنے آدمی تعینات کر دیتا ہے اور ہر ادارے کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ تالیہ، شاہی مورخ سے اپنی جھوٹی تعریفیں لکھواتی ہے۔

تالیہ راجہ مراد کی غیر موجودگی میں اس کے خزانے کے کمرے کی تلاشی لیتی ہے تو اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ راجہ خفیہ طور پر کمائی گئی دولت، کسی خفیہ جگہ پر چھپا کر رکھتا ہے۔ تالیہ، مسجد کے نام پر پیسہ حاصل کرنے کے لیے ابوالخیر سے ساز باز کر لیتی ہے۔ فاتح کو پتا چل جاتا ہے، وہ ناراض ہوتا ہے اور نیلامی میں وانگ لی کا غلام بننے کو ترجیح دیتا ہے۔ فاتح مستقبل کی باتیں بتا کر وانگ لی کو متاثر کرتا ہے۔

یان سوفو کے والد کو بادشاہ مرسل کی نظر لگ جاتی ہے، وہ اس کے توڑ کے لیے بادشاہ کا مستعمل غسل کا پانی

چاہتی ہے مگر شاہی طبیب آنا کانی کرتا ہے۔ تالیہ مداخلت کرکے طبیب کو ملکہ کا حکم ماننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ملکہ، تالیہ کی جاسوسی کرواتی ہے مگر تالیہ باتوں باتوں میں اس کا دل اپنی طرف سے صاف کر دیتی ہے۔ بادشاہ کے حوالے سے اس کے خدشات بھی دور کرکے واضح کرتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کی خاطر ضرور واپس جائے گی۔

فاتح کے کہنے پر محمود مرفی، وانگ لی سے مدد چاہتا ہے مگر وہ انکار کر دیتا ہے۔ وانگ لی کے انکار سے اس کی شخصیت کا بت فاتح کے سامنے ٹوٹ جاتا ہے۔

راجہ مرسل تالیہ کے فن اور تالیہ سے متاثر ہو کر اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ایڈم کی زبانی یہ بات سن کر فاتح کا دماغ گھوم جاتا ہے۔ راجہ مراد کو شک ہو جاتا ہے کہ تالیہ اپنے ساتھ کسی مرد کو لائی ہے وہ اسے تلاش کرواتا ہے۔ تالیہ بھی یہ بات بھانپ لیتی ہے اور فاتح کو خبردار کرتی ہے۔ راجہ مرسل تالیہ کے باپ کو تالیہ کا رشتہ دیتا ہے۔

ملکہ یان سوفو کی کنیز یہ بات ملکہ کو بتاتی ہے۔

—۱۶—

سولہویں قسط

"کبھی تاریخ کی کتابیں پڑھو تو جانو گے کہ دنیا کے عظیم حکمران...... جو شاطر سے شاطر دشمن کے سامنے بھی سیسہ پلائی دیوار بن جاتے تھے جن کے پہاڑ جیسے ارادوں سے مکار دشمن مات کھا جاتا تھا.... اپنی ساری عقل و سمجھ کے باوجود.... ایک وقت آتا تھا جب وہ کسی عورت کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے تھے۔ عورتوں کے فریب سے کسی کو پناہ نہیں' ابوالخیر۔ ملکہ یان سوفو اور شہزادی تاشہ.... یہ دونوں مرسل شاہ کو اپنے اپنے فریب میں الجھا کے اسے ہمارے لیے ناکارہ بنا رہی ہیں۔"

"لیکن شہزادی کی تو شادی ہونے والی ہے سلطان سے۔" وہ متعجب ہوا۔

"اور اگر نہ ہو سکی تو مرسل میرے خون کا پیاسا ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں تم میری مدد کرو گے۔"

"میں آپ کے ساتھ ہوں' راجہ! لیکن......" وہ رکا اور سوچنے والے انداز میں داڑھی کھجائی۔

"لیکن مجھے کیا ملے گا' راجہ؟ میری آپ سے وفاداری کا انعام؟"

مراد راجہ اٹھا اور قبا کو ہلکا سا جھٹکا دے کے درست کیا۔ "جس دن میں سلطان بنا' تم میرے بنداہارا ہو گے اور وہ دن بہت سا خون بہانے کا دن ہوگا۔"

ابوالخیر زیرِ لب مسکرایا اور ساتھ ہی کھڑا ہوا۔

"میں آپ کے ساتھ ہوں' راجہ! بہت سے صوبوں کے گورنرز بھی میرے ساتھ ہوں گے۔ آپ جب حکم دیں گے' ساری فوجیں آپ کے ساتھ آ کھڑی ہوں گی۔"

اب وہ دونوں کھڑکی سے آتی روشنی کے ہالے میں کھڑے تھے۔

تیز چمکتی دھوپ کا ہالہ جو جہنم کی آگ جیسا دہک رہا تھا۔

☆☆☆

وانگ لی کا قہوہ خانہ "جیا" اس دوپہر کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وسیع ہال کمرے میں کرسیاں میزیں اور فرشی نشستیں لگی ہوئی تھیں اور غلام بیٹھے کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ وہ باتیں کرنے کے بجائے جلدی جلدی نوالے منہ میں ڈال رہے تھے۔

تب ہی قہوہ خانے کا دروازہ کھلا تو چوکھٹ سے بہت سی روشنی اندر آئی۔ چند ایک لوگوں نے سر اٹھا کے دیکھا تو وہاں چغہ پہنے' سر پہ ٹوپی جمائے ایک ہیولہ نظر آیا۔ چونکہ وہ دھوپ میں کھڑا تھا' اس لیے اس کا چہرہ واضح نہ تھا۔

پھر وہ شخص آگے بڑھنے لگا۔ میزوں کی قطار کے درمیانی راستے پہ قدم قدم چلنے لگا۔ چال سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی نسوانی وجود ہے۔

بہت سی گردنیں مڑیں مگر وہ سیدھ میں چلتی آگے آئی اور اس اونچے چبوترے پہ جا کھڑی ہوئی جہاں کبھی وان فاتح کھڑا ہو کے اپنی قوم کے لوگوں کو پکارا کرتا تھا۔

"کیا تم لوگوں نے اس شخص کو بھلا دیا ہے جو تمہیں اپنے لیے کھڑا ہونے کی تلقین کرتا تھا؟" چغے کی ٹوپی پیچھے گرائی تو سنہری بالوں کے ہالے میں دمکتا چہرہ سامنے آیا۔ ماتھے پہ بل تھے اور سیاہ آنکھیں ایک سے دوسرے کی طرف سفر کر رہی تھیں۔

لوگوں کی چہ مگوئیاں دم توڑ گئیں۔ سکوت سا چھا گیا۔ نوالوں والے ہاتھ —— رک گئے۔ نظریں چبوترے پہ کھڑی چغہ پوش سنہرے بالوں والی لڑکی پہ جم گئیں۔

"کیا تمہیں وہ بہادر غلام یاد ہے جو کسی انسان سے نفع نقصان کی امید نہیں رکھتا تھا؟ نہ وہ کسی سے ڈرتا تھا۔"

وہ ماتھے پہ بل ڈالے کہہ رہی تھی اور لوگ یک ٹک اسے دیکھ رہے تھے۔

(تین چاند والے جزیرے کے ساحل پہ ایڈم اور سارے سپاہی اب گروہ کی صورت بیٹھے تھے۔ سب کی نگاہیں بار بار سمندر سے خالی لوٹ آتیں تو بے اختیار ایڈم کی طرف اٹھتیں جو بہت امید سے پانی کو دیکھ رہا تھا۔)

"وہ دلیر غلام تمہارے حق کے لیے آواز اٹھانے بنداہارا کے پاس گیا تھا۔ اس نے بنداہارا سے کہا کہ مسلمان کو غلام نہیں بنایا جا سکتا اس لیے وہ تمام ناجائز غلاموں کو آزاد کر دے۔"

(مراد راجہ اور ابوالخیر ایک نیم روشن کمرے میں میز کے گرد کھڑے تھے۔ میز کی سطح پہ زرد کاغذ والا نقشہ پھیلا رکھا تھا۔ مراد انگلی جگہ جگہ رکھے نئی حکمت عملی سے اسے آگاہ کر رہا تھا۔)

"اور جانتے ہو اس کے ساتھ کیا ہوا؟ اس کو مراد راجہ نے قید کر دیا اور اس کو اتنا مارا کہ اس کی ہر رگ سے خون بہنے لگا۔"

(وان فاتح خاموش تاریک کوٹھڑی میں دیوار سے لگا بیٹھا' دیوار پہ لگی لکیروں کو دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اس نے پہرے دار کو آواز دے کر وقت پوچھا۔ جواب ملنے پہ اس نے ناخن سے ایک لکیر مزید کھینچی۔ وقت قریب آ پہنچا تھا۔)

"اب تم لوگ مفت کی وہ روٹی توڑ رہے ہو جو اس کی وجہ سے تمہیں ملی تھی۔ کیا تم نے اس کو ایک دفعہ بھی یاد نہیں کیا جو تمہارے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال بیٹھا ہے؟"

(غلام اور کنیزیں سلطنت محل کے ایک حصے کو از سرِ نو سجانے میں مشغول تھے۔ اپنے خاص مشیروں کے ہمراہ سلطان مرسل راہداری میں گھومتا' کمر پہ ہاتھ باندھے' خوش باش سا تیاریوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ حرم شہزادی تاشہ کے لیے آراستہ کیا جا رہا تھا۔)

"اگر وہ مر گیا تو کون تمہارے لیے دوبارہ کھڑا ہوگا؟ کون تمہارے لیے لڑے گا؟ ملاکہ کے لوگو! تم کب تک اپنے مالکوں سے ڈرتے رہو گے؟" چغہ پوش لڑکی کرب سے کہہ رہی تھی اور سب دم سادھے اس کو سن رہے تھے۔

(ساحل کی ریت پہ تھکے ماندے بیٹھے جرنیل نے شکایتی انداز میں ایڈم سے کچھ کہا مگر ایڈم جواب دینے کے بجائے ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ پانی کو دیکھ رہا تھا۔ ان سب نے بھی چونک کے اس طرف دیکھا۔ دور سمندر پہ ایک بحری جہاز کے خدوخال دکھائی دیے تھے۔)

"کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ تم اپنے خوف دور کر دو اور اس انسان کے لیے کھڑے ہو جاؤ جس کو تمہاری ضرورت ہے؟"

(ساحل پہ موجود سپاہیوں نے جھٹ سے

لکڑیوں کو آگ لگا دی۔ شعلے جل اٹھے۔ ڈھلتی شام میں اس جہاز کو اشارہ دیا جانے لگا۔ خود ایڈم سرخ رومال ہاتھ میں لیے لہرانے لگا۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ ملکہ نے وعدہ پورا کر دیا تھا۔ چینی بحری جہاز پہنچ چکا تھا۔)

''کیا احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ ہوتا ہے؟ کیا اپنے خیال رکھنے والے ساتھی کے لیے تم کوشش نہیں کر سکتے؟''

(جیا سے غلام نکل کے اپنے مالکوں کی حویلیوں کی طرف نہیں گئے تھے۔ وہ جوق در جوق بازاروں میں جا کے کھڑے ہو گئے تھے۔ سر ایک دوسرے کے قریب جوڑے وہ سرگوشیاں کر رہے تھے۔)

''کیا تم اس کے لیے کچھ نہیں کرو گے؟ کیا تم اس کے لیے ویسے جان نہیں مارو گے جیسے اس نے تمہارے لیے ماری؟ کیسے دوست ہو تم لوگ؟''

(غلاموں کی سرگوشیوں نے قدیم ملاکہ کی فضا میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ مفلوک الحال، چیتھڑوں میں ملبوس جھلسی ہوئی جلد اور سخت چہروں والے غلام دھیرے دھیرے دور دور سے اکٹھا ہو رہے تھے۔)

''دوستوں کے لیے تو جان تک دے دی جاتی ہے۔ اگر مشکل میں ایک دوسرے کے لیے وقت ہی نہیں نکالا تو پھر کیسے دوست ہوئے تم؟''

(بنداہارا کا محل پہاڑی پہ واقع تھا اور سامنے سڑک تھی جو اونچی ہو کے محل تک جاتی تھی۔ سڑک کے نشیب میں دھیرے دھیرے لوگ اکٹھے ہو رہے تھے۔ مگر وہ 'لوگ' نہیں تھے۔ وہ غلام تھے۔ مضبوط جسموں والے لخت جان غلام۔)

''اپنے کن مالکوں سے ڈرتے ہو تم؟ ان سے جنہوں نے تمہیں بھوک اور ظلم تلے پیس کے رکھا ہوا ہے؟ مسلمان ہونے کے باوجود غلام بنا رکھا ہے؟ جانتے ہو نا، مسلمان کو غلام نہیں بنایا جا سکتا۔ صرف غیر مسلم جنگی قیدی غلام بنتے ہیں۔''

(بنداہارا کے محل کے سامنے جمع لوگوں کے ہاتھوں میں کوئی ہتھیار نہ تھا۔ ان کے لب خاموش تھے۔ ان کی آنکھیں شکایتی تھیں۔ وہ بس چاروں سمت سے آتے اس مقام پہ بیٹھ رہے تھے جہاں سے سڑک اونچی ہو کے محل تک جاتی تھی۔ سپاہی مستعد ہو گئے مگر قدرے الجھ بھی گئے۔ سامنے سڑک پہ بیٹھے بے ضرر لوگوں پہ وہ حملہ کرتے بھی تو کیوں؟)

''اگر آج تم اپنے ساتھی کے لیے نہیں کھڑے ہوئے تو کل کو تم میں سے ایک ایک کو مراد راجہ اٹھا کے اپنے قید خانے میں ڈال دے گا۔ ڈرو اس وقت سے۔''

(غلام کسی سے کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔ وہ بس زمین پہ اکڑوں بیٹھے، گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے، خاموش نظروں سے اوپر محل کو دیکھ رہے تھے۔)

''اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کرو اور وان فاتح کے لیے آواز بلند کرو۔ میں مراد راجہ کی بیٹی تاشہ بنت مراد ہوں اور میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں کوئی سپاہی نقصان نہیں پہنچائے گا۔''

(مراد راجہ نے کھڑکی سے ان غلاموں کو وہاں بیٹھے دیکھا۔ ہر پل ان کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ جیا میں جس غلام نے ایک دفعہ بھی مفت کھانا کھایا تھا، وہ وان فاتح کے لیے ادھر آ کے بیٹھ گیا تھا۔)

''میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارے مالک بھی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ کیونکہ تم حق کے ساتھ ہو۔ حق کے لیے کھڑے ہونے والوں کا ساتھ ہمارا رب تعالیٰ دیتا ہے۔''

(سپاہی بے بسی سے کبھی دور بیٹھے اس خاموش ہجوم کو دیکھتے، کبھی گردنیں اوپر کر کے کھڑکی میں کھڑے راجہ کو جس کا چہرہ سرخ دہک رہا تھا۔ سپاہیوں کے ہاتھ میان پہ تھے مگر دونوں اطراف سے کوئی بھی حملے کا عندیہ نہیں دے رہا تھا۔ عجیب ہیجان سا ہیجان تھا۔)

''کیونکہ اگر آج تم نے مراد راجہ سے اس ظلم کا حساب نہ لیا تو اس کا ہاتھ نہیں رکے گا۔ خود کو کمزور سمجھنا چھوڑ دو۔''

(وہ مظلوم، کمزور لوگ چپ چاپ بیٹھے اوپر محل کی کھڑکیوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نہ نفرت تھی، نہ غصہ، نہ انتقام کی آگ۔ صرف شکوہ تھا۔ وہ بلی جیسی معصوم شاکی آنکھیں تھیں جو مراد راجہ کی کھڑکیوں پہ لگی تھیں۔ اس نے زور سے کھڑکی کے پردے برابر کیے اور مڑا تو پیچھے تالیہ کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہ سب تھا جو غلاموں کی آنکھوں میں نہ تھا۔)

''تم کمزور نہیں ہو۔ تم اس شہر کے سب سے طاقتور لوگ ہو۔ تمہیں اٹھنا ہے اپنے ساتھی کے حق کے لیے۔ تمہیں اٹھنا ہے ظلم کے خلاف۔''

(سرخ نشان والا بحری جہاز ساحل پہ لنگر انداز تھا۔ سپاہی صندوق اٹھا اٹھا کے اندر رکھ رہے تھے۔ ایڈم بن محمد عرشے پہ کھڑا، مسکراتا ہوا ان کو دیکھ رہا تھا۔ ہوا سے اس کے چغے کی ٹوپی گر گئی تھی اور بال ماتھے پہ بکھر گئے تھے۔ مگر اسے وہ تازگی بھری ہوا اچھی لگ رہی تھی۔)

''اور تم یہی سوچ رہے ہو نا کہ تم لوگ آخر کیا کر سکتے ہو؟ تو میں تمہیں بتاتی ہوں کہ کس طرح تم مراد راجہ کے سارے محل کو ہلا کے رکھ سکتے ہو۔ نہ کسی تیر سے نہ تلوار سے۔ صرف اپنی ایک چپ سے۔''

☆☆☆

مراد نے کھڑکی کا پردہ زور سے جھٹکا اور تیوریاں چڑھائے پلٹا تو سامنے تالیہ کھڑی تھی۔ سینے پہ بازو لپیٹے وہ سرد نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کیا خوب صورت منظر ہے بابا۔''

''تم نے.... تم نے کیا ہے یہ سب؟ تین دن شہر کے قہوہ خانوں میں جا کے میرے خلاف بولتی رہی ہو تم۔'' مراد دانت پیس کے غصے سے بولا تو تالیہ نے کندھے اچکائے۔

''اس سے فرق نہیں پڑتا کہ میں نے کیا کیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اب آگے کیا ہونے جا رہا ہے۔''

''ہٹاؤ ان لوگوں کو یہاں سے۔ ابھی اسی وقت۔'' وہ لال بھبھوکا چہرے کے ساتھ بولا۔

''میں تو ان کو نہیں ہٹا سکتی۔ یہ اپنی مرضی سے آئے ہیں، اپنی مرضی سے جائیں گے۔''

''ہٹاؤ ان کو ورنہ محل کی چھت پہ بیٹھے تیر انداز ان کو چھلنی کر دیں گے۔''

''کن کو چھلنی کر دیں گے؟ ان غلاموں کو جو شہر کے روسا اور امراء کے سارے کام کرتے ہیں؟ ایسی غلطی مت کیجیے گا بابا۔ کیونکہ آج دوپہر سے ملاکہ کی اکثر اونچی حویلیاں خالی ہو چکی ہیں۔ مالک پریشان ہیں اور غلام غائب ہیں۔'' وہ چبا چبا کے کہہ رہی تھی۔ ''غلام ہر معاشرے کا سب سے اہم رکن ہوتا ہے بابا! ارے آپ حکمران لوگ تو ہل کے پانی بھی نہیں پی سکتے۔ ایسے میں یہ لوگ اگر بنا بتائے اپنی حویلیاں چھوڑ دیں تو سارے امراء گھٹنے ٹیک دیں۔''

''میں ان بے وقوف نیچ لوگوں سے نہیں ڈرتا۔ کتنی دیر بیٹھ سکتے ہیں یہ یہاں؟ ہاں؟''

''آپ بھول گئے ہیں۔ یہ غلام ہیں۔ عام عوام نہیں۔ ان کو کئی کئی دن کھانا نہیں ملتا۔ ان سے سخت سے سخت موسم میں بھی کام کروایا جاتا ہے۔ بھوک اور موسم کی سختی ان پہ اثر نہیں کرتی۔ یہ تب تک یہاں بیٹھیں گے جب تک آپ وان فاتح کو کرسی پیش نہیں کرتے۔''

''میں... ان سے... نہیں ڈرتا۔'' وہ بے بسی بھرے غصے سے مٹھیاں بھینچ کے بولا۔ تالیہ نے پھر شانے اچکائے۔

''مگر آپ روسا اور امراء سے ڈرتے ہیں جو ابھی اپنے غلاموں کی خبر لینے یہاں پہنچ جائیں گے۔ سب پوچھیں گے کہ آخر وان فاتح کون ہے؟ سلطان تک بھی خبر جائے گی۔ وہ بھی شک میں پڑ جائے گا کہ اس غلام کو قید کیوں کیا گیا تھا آخر؟ کیا جواب دیں گے سب کو؟ یہی کہ اس نے شہزادی تاشہ سے نکاح کر لیا تھا، اس لیے؟''

''تم!'' مارے ضبط کے مراد نے مٹھیاں بھینچ لیں۔

''وقت کم ہے بابا! اور وقت ہی سارے مسئلوں کا حل ہے۔ وان فاتح کو کرسی پیش کریں اور اس سے پوچھیں کہ وہ کیا چاہتا ہے۔'' پھر بازو سینے سے ہٹائے اور سر جھکا کے تعظیم پیش کی۔ ''راجہ!'' اور مسکرا کے مڑ گئی۔

مراد راجہ خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔

کھڑکی تلے دور نیچے بیٹھے غلاموں کے ہجوم کی خاموشی اس کے کانوں میں صور کی صورت گونج رہی تھی۔

☆☆☆

ملاکہ کی بندرگاہ پہ سرخ جھنڈے والا بحری جہاز لنگر انداز ہو چکا تھا۔ سمندر دوپہر کے اس وقت پر سکون لگتا تھا۔ پانی دھوپ میں چمک رہا تھا اور بندرگاہ پہ روانہ ہوتے قافلوں کا شور معمول کے مطابق تھا۔

ایسے میں چینی بحری جہاز کے عرشے کے اوپر ایڈم بن محمد کھڑا تھا۔ دونوں ہاتھ پہلوؤں پہ جمائے' وہ گردن اٹھائے دور تک پھیلا ملاکہ شہر دیکھ رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا اس کے بالوں سے سرسراتی ہوئی گزر رہی تھی۔

اس کے سپاہی عقب میں مستعد سے کھڑے تھے۔ جب وہ ان کو اشارہ کرے گا تو وہ 'اپنے' صندوق نیچے اتاریں گے' مگر ایڈم کو پہلے خود ایک اشارے کی ضرورت تھی۔ اس کی کھوجتی نگاہیں ایک سے دوسرے سے ہوتیں ہجوم میں الجھی تھیں اور تب ہی وہ اسے نظر آ گئی۔

سادہ بھورے رنگ کی باجو کرنگ میں ملبوس' وہ سر پہ مفلر کی طرح دوپٹا لپیٹے' مسکراتی ہوئی بحری جہاز کے زینے چڑھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کے ایڈم بھی مسکرایا۔ اپنی راج دھانی میں ہونے کے باوجود وہ آج سادہ نظر آ رہی تھی۔

ایڈم نے پل بھر کو پلکیں موندیں اور سات دن پہلے کی وہ دوپہر یاد کی جب وہ تینوں جیا کی بالائی منزل کے ہال نما کمرے میں ملے تھے۔ کونے کی میز کے گرد بیٹھے انہوں نے سارا منصوبہ ترتیب دیا تھا۔

''تم دونوں تین چاند والا جزیرہ ڈھونڈو گے اور اس کی طرف جاؤ گے۔ تالیہ.... تم اپنے بہترین اور وفادار سپاہی ساتھ لے کر جاؤ گی جن کے خاندان تمہارے پاس محل میں ہوں گے تاکہ وہ خزانہ دیکھ کے تمہیں مارنے کے بجائے بحفاظت واپس لانے پہ مجبور رہیں۔'' سفید کرتے پاجامے میں ملبوس وان فاتح سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ درمیان میں نقشہ پھیلا رکھا تھا۔

''جزیرے پہ کچھ تو ہمارا منتظر ہوگا۔'' ایڈم کو تشویش ہوئی۔

''جو بھی ہو' تم اس سے لڑنا اور خزانے کو نکال لانا۔ ایڈم کشتی پہ واپس آ جائے گا اور تالیہ وہیں رہے گی۔ جہاز چین سے روانہ ہو چکا ہے' وہاں پہنچنے میں چند دن لگیں گے۔ تمہیں صبر سے اس کا انتظار کرنا ہے۔''

''پلان سی!'' تالیہ نے کسی شاگرد کی طرح ہاتھ اٹھا کے اجازت مانگی تو دونوں اسے دیکھنے لگے۔

''اگر وہاں جا کے مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا تو میں ایڈم کو چھوڑ کے واپس آ جاؤں گی۔''

''مجھے پہلے ہی آپ سے یہی امید تھی کہ آپ مجھے چھوڑ کے آنے کا بہانہ ڈھونڈ رہی ہیں۔'' ایڈم خفا ہوا تو تالیہ نے اسے گھورا۔

''میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ جلد یا بدیر راجہ کو وان فاتح کا علم ہو جائے گا۔ ملکہ بھی کوئی حرکت کر سکتی ہے۔ ایسی صورت میں میرا یہاں ہونا زیادہ ضروری ہے۔ ایک دفعہ خزانہ مل جائے تو تمہیں میری ضرورت نہیں ہوگی۔''

''میں اکیلا کیسے.....؟''

''ایڈم!'' وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔ ''کب تک تم لیڈ ہوتے رہو گے؟ اب وقت آ گیا ہے کہ تم اپنے فیصلے خود کرو اور بڑی بڑی مہمات پہ نکلنا خود سیکھو۔''

ایڈم نے بس ایک خفا نظر تالیہ پہ ڈالی اور پھر فاتح کو دیکھا۔

''اور اگر ملکہ نے جہاز نہ بھیجا تو؟''

''ایڈم ٹھیک کہہ رہا ہے' تو انکو۔ کیا ہمیں اس بات پہ یقین کر لینا چاہیے کہ ملکہ ہماری مدد کرے گی؟''

''بالکل نہیں کرنا چاہیے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔ ''ملکہ کا ہم سے کیا رشتہ ہے جو وہ ہماری مدد کرے گی۔'' وہ دونوں اس کی شکل دیکھنے لگے تو وہ توقف سے بولا۔

''مگر ہمیں اتنا یقین ہے کہ ملکہ مراد راجہ کو نقصان پہنچانے کا موقع نہیں گنوائے گی۔ ملکہ ہماری بھی دشمن ہے مگر ہمیں اس کے اوپر اپنے اعتبار کو نہیں ماپنا۔ ہم نے اس کی مراد راجہ سے نفرت کو ناپ کے فیصلے کرنے ہیں۔''

''دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔ میں سمجھ گئی۔'' تالیہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''ملکہ ضرور جہاز بھیجے گی اور ہم سارا سونا لے بھی آئیں گے۔ اس کے بعد؟''

''امید ہے تب تک مراد سے میرا تعارف ہو چکا ہوگا۔ اس وقت تک اس کی ساری طاقت ختم ہو چکی ہوگی۔ میں اس کو مجبور کروں گا کہ وہ ہمیں واپس جانے دے۔''

''اور وہ سونا۔'' ایڈم فوراً بولا تو تالیہ نے اسے دیکھا۔

''سونا ملاکہ کے لوگوں کی ملکیت ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں وہ شہر کے سارے غریب لوگوں میں بلا تفریق بانٹ دینا چاہیے تاکہ وہ اس سے اپنی زندگیاں سنوار سکیں۔ میں صحیح کہہ رہی ہوں نا تو انکو۔''

''سونا ملاکہ کے لوگوں کا ہے اور اس کا فائدہ لوگوں کو ہی ملنا چاہیے۔'' اس نے رسان سے کہا تو تالیہ مسکرا دی۔ ایڈم کو بھی سن کے بھلا معلوم ہوا۔

''لیکن سر.....'' پھر اسے خیال گزرا۔ ''آپ راجہ کو کیسے مجبور کریں گے کہ وہ ہمیں واپس جانے دیں۔''

''جس دن تم جہاز لے کر واپس آؤ گے' تم خود جان لو گے۔'' اس نے بھی مسکرا کے تسلی دی۔ اور جیا کی وہ اسرار بھری فضا میں ڈوبی دوپہر دھندلی ہوتی گئی۔

''امانت واپس لے آئے؟'' تالیہ کی بات پہ چونکا۔ وہ اب عرشے تک آ چکی تھی۔ ایڈم سنبھل کے مسکرایا۔ وہ بحری جہاز کے عرشے پہ کھڑا تھا اور تالیہ سیڑھیاں چڑھتی اوپر آ رہی تھی۔

''آپ تو شاید میرا تابوت دیکھنے کی دعا کر رہی تھیں۔''

''اگر تمہارے لیے میری دعائیں پوری ہوتیں تو آج تمہارے جنازے کو چار ماہ بیت چکے ہوتے۔'' وہ اس کے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔ عرشے کے کناروں پہ لوہے کی ریلنگ لگی تھی۔ تالیہ نے اسے تھام لیا اور سمندر کے پانی کو دیکھنے لگی۔

''حالات کیسے ہیں؟'' وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''جیسے ہم نے سوچے تھے۔ اب بہت جلد مراد راجہ گھٹنے ٹیک دے گا۔''

''شکر اور یہ سارا سونا ہم ملاکہ کے غریبوں میں بانٹ دیں گے۔ مجھے یہ سب کر کے بالکل رابن ہڈ والی فیلنگ آ رہی ہے۔ وہ بھی اسی طرح خوش ہوتا ہوگا۔''

تالیہ ہنس دی۔ ''رابن ہڈ ایک چور تھا۔''

''مگر وہ غریبوں میں اپنی چوری بانٹ دیتا تھا۔ چور چور میں فرق ہوتا ہے۔''

وہ دونوں عرشے کی ریلنگ کے ساتھ آمنے سامنے کھڑے تھے اور نیچے ایک طرف سمندر پھیلا تھا' دوسری طرف ساحل پہ کشتیوں' ملاحوں اور مسافروں کا ہجوم دکھائی دیتا تھا۔ وہ جواب میں پھر سے ہنسی تو ایڈم بولا۔

''آپ رابن ہڈ کو چھوڑیں' اپنے وان فاتح کی سنائیں۔ آپ کی ضرورت پڑی ان کو یا نہیں؟''

تالیہ نے جواباً بے نیازی سے شانے اچکائے۔ ''شہزادی جیسی تاشہ نے ایک غلام سے شادی کی تھی اور اسے آزاد کر دیا تھا۔ سو میں نے بھی انہیں آزاد کروا ہی دیا۔ تقریباً۔'' پھر چونکی۔ ''تاشہ کی نظم!'' کچھ یاد آیا۔ ''وہ تو میں نے لکھی ہی نہیں۔''

''وہ جو آپ نے خواب میں سن باؤ کے گھر لکھی دیکھی تھی۔''

''ہاں وہی۔ وہ تو مجھے ابھی لکھنا تھی۔''

''تو جا کے لکھ لیں۔''

تالیہ نے پھر گومگوں کیفیت سے اسے دیکھا۔ ''مگر ضروری تو نہیں کہ وہ نظم میں نے ہی لکھی ہو اور کیا ضرورت ہے مجھے اسے لکھنے کی۔''

''درست کہا۔ جو تاریخ میں ہو چکا ہے' وہ کسی وجہ سے ہوا ہے۔ آپ زبردستی حالات کا رخ نہیں موڑ سکتیں۔'' پھر وہ ساحل کی طرف دیکھنے لگا جہاں چینی فوجیوں کا قافلہ آتا دکھائی دے رہا تھا۔ ان کے ہمراہ گھوڑا گاڑیوں کی ایک قطار تھی۔ ایڈم نے گہری

سانس لی۔

''آخری مرحلہ شروع ہو چکا ہے۔'' تالیہ نے چونک کے اس طرف دیکھا۔

ایڈم اب سپاہیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اسے بہت سی ہدایات جاری کرنا تھیں۔

☆☆☆

عصر کا وقت ہوا تو بندا پارا کے محل پہ ٹھنڈی چھایا اتر آئی۔ دیوان خانے کی اونچی کھڑکیوں کے پردے ہٹے ہوئے تھے اور اندر ایک میز کے گرد دو کرسیاں رکھی دکھائی دیتی تھیں۔ دونوں خالی تھیں۔

مراد راجہ دیوار سے ٹیک لگائے، ہاتھ میں ننھا سا حقہ تھامے کھڑا تھا۔ وقفے وقفے سے وہ حقے کی نال لبوں میں دباتا اور گڑگڑاہٹ سے تمباکو اندر کھینچتا۔ پھر نال ہٹا کے منہ سے دھواں باہر نکالتا۔ دھوئیں کے مرغولے فضا میں تیرنے لگتے۔ وہ بظاہر پرسکون لگتا تھا مگر کبھی کبھی چہرے پہ اضطراب دکھائی دینے لگتا جسے وہ مسلسل چھپانے کی سعی کر رہا تھا۔

دفعتاً دروازہ کھلا اور دو سپاہی وان فاتح کے ہمراہ اندر داخل ہوئے۔ اس نے اب پاجامے پہ خاکی کرتا پہن رکھا تھا۔ جس کی لمبی آستینیں تھیں اور ہاتھ کی پٹیاں نظر آتی تھیں۔ کنپٹی کے زخم اور سر کے زخم پہ لیپ شدہ دوا سوکھ چکی تھی۔ کوئی زنجیر نہیں، کوئی ہتھکڑی نہیں۔

اس کے چہرے کے تاثرات ہموار تھے۔ پرسکون۔ ٹھنڈے۔ سپاہی چلے گئے تو اس نے بس نگاہیں گھما کے اس خالی خالی سے کمرے کو دیکھا، پھر نظر کرسی میز پہ ٹھہری۔ لب مسکراہٹ میں ڈھلے۔

''ہماری دنیا میں جب کوئی مذاکرات کرنے پہ راضی ہو جائے تو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فلاں میز پہ آمنے سامنے بیٹھنے کو تیار ہے۔''

وہ محظوظ سا بولا۔ مراد راجہ نے کھڑکی سے ٹیک لگائے، شکاری نظریں اس پہ جمائے، حقے کا کش لیا اور حقہ کھڑکی کی منڈیر پہ رکھا۔ پھر سر کے خم سے اشارہ کیا۔

''کرسی حاضر ہے۔ تم بیٹھو۔''

فاتح نے مدھم مسکراہٹ کے ساتھ پیشکش قبول کی اور کرسی کھینچ کے بیٹھا۔ پھر ٹانگ پہ ٹانگ جمالی۔

''تم بھی بیٹھو راجہ۔''

''تمہارے بیٹھنے کی بات ہوئی تھی، میرے نہیں۔'' وہ وہیں ٹیک لگائے کھڑا رہا۔

''اوہ۔ تم مجھے اپنے برابر کا نہیں سمجھتے۔ خیر۔'' اس نے سادگی سے شانے اچکائے۔ اس کی چھوٹی خوب صورت آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔

''اس ہجوم کے بارے میں تو سن لیا ہو گا تم نے۔'' مراد راجہ نے کھڑکی سے نیچے نظر آتے لوگوں کی طرف اشارہ کیا تو کرسی پہ بیٹھے فاتح نے سر کو خم دیا۔

''میں ایک عرصہ ان لوگوں کو ان کے اپنے لیے کھڑا ہونے کی ترغیب دیتا رہا، مگر کمزور لوگ شاید اپنے لیے کھڑے نہ بھی ہوں تو اس کے لیے ضرور ہو جاتے ہیں جس سے وہ محبت کرتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ کم از کم یہ لوگ کھڑے تو ہوئے۔''

مراد نے حقہ اٹھایا اور غور سے دور بیٹھے فاتح کی آنکھوں میں دیکھا۔

''ان لوگوں کو یہاں سے بھیجنے کا کیا لو گے؟''

''یقیناً ان کے مالک تمہیں تنگ کر رہے ہوں گے۔ جلد سلطان کو خبر ملنے والی ہو گی لیکن یہ لوگ تمہارا مسئلہ نہیں ہیں۔ تمہارا مسئلہ آج دوپہر ملاکہ کی بندرگاہ پہ لنگر انداز ہوا ہے۔''

مراد چونکا۔ ابرو تعجب سے اکٹھے ہوئے۔ ''کیا مطلب؟''

''ہم نے تین چاند والا جزیرہ ڈھونڈ لیا ہے اور تمہارا پالتو وحشی درندہ مار کے تمہارا خزانہ بحفاظت ملاکہ لے آئے ہیں۔''

مراد لمحے بھر کو ششدر رہ گیا۔ پلک تک نہ جھپک سکا۔

''وہ خزانہ چینی بحری جہاز پہ آیا ہے اور اسے چینی سفارت خانے بھیجا گیا ہے۔ بظاہر وہ چین سے آئے قرضے کے سکوں سے بھرے صندوق ہیں لیکن ان میں اکیس صندوق تمہارے ہیں۔''

مراد ایک دم تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا، مگر پھر رک گیا۔

''یہی سوچ کے رکے ہو نا کہ چینی سفارت خانے پہ حملہ نہیں کروا سکتے تم! میں نے بھی یہی سوچ کے چینی جہاز میں سامان لانے کو کہا تھا۔ بالفرض تم چینی سفارت خانے پہ حملہ کروا بھی دو تو اپنی فوج اور سلطان کو کیا وجہ بتاؤ گے؟ تم خزانے کی حقیقت کھولنے کے متحمل نہیں ہو۔''

مراد کے قدم زنجیر ہو گئے۔ وہ کمرے کے وسط میں مجسمے کی طرح کھڑا فاتح کو دیکھنے لگا، اس حالت میں کہ اس کی رنگت متغیر ہو رہی تھی۔

''ہاں سوفو! وہ تمہارے ساتھ شریک تھی۔ ہے نا!'' اس کی سمجھ میں سارا کھیل آنے لگا۔

''آگے کا سوچو راجہ۔ اگر تم ہر خطرہ مول لے کر چینی سفارت خانے پہ حملہ کر بھی دو تو جانتے ہو سفارت کاروں کو مارنا کتنا سنگین جرم ہے؟ وہ بھی اس دور میں جب کہ تمہاری ملکہ چینی ہے؟ نہیں مراد راجہ! تم چین سے جنگ چھیڑنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' اس کی آنکھیں سرخ پڑنے لگیں مگر آواز میں نہ کوئی غراہٹ تھی، نہ گرج۔ اس کے قدموں تلے سے زمین سرک چکی تھی۔

''تم جانتے ہو میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ شہزادی تاشہ جنوبی محل نہیں گئی تھی۔ وہ جزیرے پہ گئی تھی اور ملاکہ کے لوگوں کی امانت واپس لے آئی ہے۔''

چند لمحے کمرے میں ہولناک خاموشی چھائی رہی۔ مراد راجہ بت بنا کھڑا بے یقینی اور غیظ و غضب سے اسے دیکھے گیا جو مطمئن سا کرسی پہ بیٹھا تھا۔

''تم...... کیا چاہتے ہو؟''

''میں تمہیں چند راستے دکھانا چاہتا ہوں۔ اگر تم نے سفارت خانے پہ حملہ کروایا تو سلطان کو ناراض کر دو گے اور چین سے جنگ چھڑ جائے گی۔ اگر تم نے ان لوگوں کو محل کے سامنے سے نہ ہٹایا تو سلطان کو علم ہو جائے گا کہ تم نے کسی غلام کو قید کر رکھا ہے۔ بات کھلے گی اور میرے اور تالیہ کے نکاح کے بارے میں سب کو علم ہو جائے گا۔ اس نکاح کے گواہ بھی ہیں اور ثبوت بھی۔ اس کے بعد سلطان تمہیں جان سے مارنے کا حکم بھی دے سکتا ہے اور اگر اس سب سے پہلے تم نے مجھے مار دیا تو نہ صرف تمہاری بیٹی تم سے نفرت کرنے لگے گی بلکہ تمہارے پاس خزانے کے بارے میں مذاکرات کرنے کے لیے کوئی نہیں بچے گا۔''

''تم...... کیا چاہتے ہو؟''

''میں جانتا ہوں اب تک تم نے سلطان سے بغاوت کرنے کا سوچ لیا ہو گا۔ اپنی خفیہ فوجیں بھی تیار کر رکھی ہوں گی کیونکہ تم جانتے ہو اب تالیہ اور سلطان کی شادی ممکن نہیں ہے۔ تمہیں اس وقت 'خطرے' کو سامنے سے ہٹانا ہے اور میں سب سے بڑا خطرہ ہوں۔ اصولاً تمہیں میری جان لے لینی چاہیے مگر یہ ناممکن ہے اس لیے تم ایک کام کرو۔''

''تمہیں چابی دے دوں تا کہ تم واپس چلے جاؤ؟'' وہ طنز سے بولا۔

''صرف میں نہیں۔ تالیہ بھی میرے ساتھ جائے گی۔ جب ہم دونوں غائب ہو جائیں گے تو تم سلطان کو کوئی بھی وجہ بتا کے ٹال سکتے ہو۔ ملکہ نکاح والی بات دہرا بھی دے تو تم کہہ سکتے ہو کہ یہ جھوٹ ہے کیونکہ دونوں منکوح تو ملاکہ سے جا چکے ہوں گے۔ تالیہ چلی جائے تو ملکہ بھی مزید اس معاملے کو نہیں کریدے گی۔ تم بندا پارا رہو گے اور حکومت کرو گے۔ ہاں اگر ہمارے جاتے ہی سلطان تمہارے خلاف ہو گیا تو تم بغاوت کر کے تخت پہ قبضہ کر سکتے ہو۔ اس سارے مسئلے کا حل ہم دونوں کے یہاں سے چلے جانے میں ہے۔'' وہ روانی سے بتا رہا تھا۔

مراد کے وجود میں حرکت ہوئی۔ وہ قدم قدم چلتا فاتح کے سامنے آیا اور مقابل رکھی خالی کرسی کی پشت پہ ہاتھ رکھ کے جھکا۔

''تالیہ...... میری بیٹی ہے۔ میں اسے نہیں جانے دوں گا۔''

''وہ تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ اسے جلد

یا بدیر یہ دنیا چھوڑ کے جانا ہی ہے اور ہمارے یہ مذاکرات تب ہی کامیاب ہوں گے جب تم تالیہ کو میرے ساتھ بھیجو گے۔"

مراد خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھتا، ضبط سے گہرے سانس لیتا رہا۔

"اور خزانہ؟ اس کو غریبوں میں بانٹ دو گے کیا؟" انداز میں تحقیر اور استہزاء تھا۔

"تالیہ یہی چاہتی ہے کہ اسے غریبوں میں بانٹ دیا جائے۔" وہ ٹھہرا۔

مراد مزید اس کی طرف جھکا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "مگر تم تالیہ نہیں ہو۔ تم لامتناہی کھیل کھیلنے والے آدمی ہو اور تمہارے کھیل میں حدود و قیود اپنی مرضی سے بدلی جاسکتی ہیں۔ تم بتاؤ، خزانے کا کیا کرنا چاہتے ہو؟"

کرسی پہ بیٹھا وان فاتح بن رامزل مسکرایا۔

"ہاں میں تالیہ نہیں ہوں۔ اس لیے میں اور تم خزانے کے بارے میں ایک معاہدہ کر سکتے ہیں۔"

مراد کے لبوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ بکھری۔

"تم بالکل میرے جیسے ہو۔ وہی طاقت کی ہوس، وہی اپنی ذات کی پرستش۔"

"مراد راجہ!" اس نے مراد کی بات نظر انداز کی۔ "میں تمہارا سارا خزانہ واپس کر سکتا ہوں اگر تم ملاکہ کے تمام ناجائز غلاموں کو آزادی دلوا دو۔"

مراد کے ابرو تن گئے۔ "وہ کیسے؟"

"تم ملک میں قانون بنا دو کہ صرف غیر مسلم جنگی قیدی کو غلام بنایا جا سکے گا۔ ساری دنیا میں اسلام کا یہی اصول ہے۔ مسلمان کو غلام نہیں بنایا جاتا۔ اس وقت ملاکہ کے چند بڑے رئیسوں کے پاس بہت سے ایسے غلام ہیں جو مسلمان ہیں اور اغوا کر کے جبراً ان کو غلام بنایا گیا ہے۔ اب تم ان کے مالکوں کو ان کی قیمت ادا کرو یا ان کو ڈراؤ دھمکاؤ، جس وقت وہ غلام آزاد ہو جائیں گے میں تمہارا خزانہ واپس کر دوں گا۔ ملاکہ کے لوگوں کی دولت لوگوں کے ہی کام آنی چاہیے۔"

"اور پھر میں تمہیں چابی دے دوں اور تمہیں یہاں سے جانے دوں؟" وہ طنز سے بولا۔

"ہاں۔ ورنہ سلطان کو اس نکاح کی خبر ہو جائے گی اور تمہاری مشکلات بڑھ جائیں گی۔ لیکن اگر تم میری بات مان لو تو تم بدستور حکمرانی کرتے رہو گے اور مزید جزیروں پہ اپنا مال چھپاتے رہو گے۔ میں تمہیں بدعنوانی کرنے اور لوگوں کا مال لوٹنے سے نہیں روک سکتا، لیکن میں اپنی اور تالیہ کی بقا کا راستہ ڈھونڈ سکتا ہوں۔"

چند لمحے وہ اسے خاموشی سے دیکھتا رہا، جیسے ذہن میں جمع تفریق کر رہا ہو۔ پھر آہستہ سے بولا۔

"تم چلے جاؤ۔ میں تمہیں چابی دے دوں گا۔ لیکن تالیہ کو مت لے کر جاؤ۔ وہ گئی تو واپس نہیں آئے گی۔"

"تم نے اسے خود اپنے اعمال سے کھویا ہے۔ وہ تمہارے کردار سے نفرت کرتی ہے۔ تمہاری طاقت کی ہوس، تمہاری چالبازیاں....." پھر سر جھٹکا۔ "خیر، ان کے بغیر ہمارا کوئی معاہدہ مکمل نہیں ہوگا۔"

مراد نے گہرا ہنکارا ابھرا۔ "مجھے سوچنے دو۔"

"وقت کم ہے، مراد۔ اور یہ سارے کھیل وقت کے ہی ہیں۔"

"کچھ دیر..... مجھے کچھ دیر سوچنے دو۔" اس نے بے بسی بھری ناگواری سے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا اور پھر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

مراد سیدھا اپنے کمرے میں گیا تھا۔ سارے دروازے کھڑکیاں بند کر کے وہ زمین پہ بدھا کے انداز میں آلتی پالتی مار کے بیٹھا اور سرخ پٹی اتار پھینکی پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ساری آوازوں اور سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیا۔ دماغ کو ایک نکتے پہ مرکوز کیا۔

اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا اور لب بڑبڑا رہے تھے۔

"میں مراد راجہ ہوں۔ ملاکہ سلطنت کا بنداہارا۔ مجھے کوئی ایسے نہیں ہرا سکتا۔ کوئی مجھ سے میرا تخت اور میری بیٹی نہیں چھین سکتا۔"

مغرب ڈھل گئی اور باہر بیٹھے لوگ اسی طرح بھوکے پیاسے بیٹھے رہے۔ ان کو بلانے کے لیے آنے والے ان کے مالکوں کے وفادار غلام بھی گھوڑوں پہ آئے سامنے کھڑے تھے۔ انہوں نے بہت پکارا، غصہ کیا، آوازیں دیں، مگر وہ غلام ٹس سے مس نہ ہوئے۔ وہ بس محل کی اونچی کھڑکیوں کو دیکھتے رہے اور لبوں پہ چپ کی مہر لگی رہی۔

وان فاتح کرسی پہ بیٹھا کھڑکی کے باہر آسمان پہ چھاتی سیاہی دیکھ رہا تھا۔ کافی وقت بیت چکا تھا اور مراد واپس نہیں آیا تھا۔

اسے ذرا فکر ہوئی مگر اس نے اعصاب کو پرسکون رکھا۔

مغرب اُتر آئی تو دروازہ کھلا اور مراد اندر داخل ہوا۔ آتے کے ساتھ ہی اس نے دروازہ بند کیا اور کھڑکیوں کے آگے پردے جھٹک کے برابر کیے۔ پھر فاتح کے سامنے آیا۔ سرخ پٹی ماتھے سے غائب تھی اور ہاتھ میں ایک بوتل تھی۔ اس نے بوتل میز پہ رکھی تو فاتح نے دیکھا۔ اس کے پیندے میں سکہ اور ڈلی پڑی تھی۔ ٹوٹی ہوئی چابی۔

مراد کا چہرہ وہ نہیں تھا جو پہلے تھا۔ وہ پرسکون نظر آتا تھا۔ مسکرا بھی رہا تھا۔ پھر اس نے کرسی کھینچی اور سامنے بیٹھا۔ دونوں ہاتھ میز پہ جما کے اس کی طرف جھکا۔

"میں تمہاری دنیا کے باسیوں کی طرح میز پہ آنے کو تیار ہوں۔"

وان فاتح نہیں مسکرایا۔ کچھ عجیب سا تھا، مراد راجہ کی مسکان میں جو اسے بے چین کر رہا تھا۔

"کیا فیصلہ کیا تم نے؟" وہ بظاہر ٹھنڈا رہا۔

"میں نے ابو الخیر اور تمام روسا کو پیغام بھیج دیا ہے۔ چند ساعتیں پہلے انہوں نے تمام ناجائز غلام آزاد کر دیے ہیں۔ حکم نامے تحریری طور پہ تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔"

"تم نے ان کو رقم ادا کی؟"

"میں ان کا بنداہارا ہوں۔ میرے احسان ہیں ان پہ۔ اور تم جانتے ہو میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ ناجائز غلام آزاد ہیں۔ وہ کل صبح سے اپنی نئی زندگی شروع کریں گے۔"

"مجھے تمہاری بات پہ یقین ہے۔"

"اس کے علاوہ یہ رہی چابی۔ تم مجھے سونا واپس کر دو اور اپنی دنیا میں چلے جاؤ۔ تالیہ کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ مجھے تمہاری ہر بات منظور ہے۔"

"کیا واقعی!" اس نے آنکھیں سکیڑ کے بنداہارا کا چہرہ دیکھا۔

"ہاں۔ سونا میرے پاس آجائے گا۔ میں نے جان لیا ہے کہ میں تالیہ کو زبردستی یہاں نہیں رکھ سکتا۔ وہ بھی آزاد ہے۔ تم دونوں جا سکتے ہو۔"

"اور ابھی تم "مگر" کہنے والے ہو، ہے نا راجہ!" وہ غور سے اس کی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔

مراد راجہ مسکرایا۔ "مگر......" زور دے کے بولا۔ "مگر میری ایک شرط ہے۔"

فاتح نے گہری سانس لی۔ "شرط ماننے یا نہ ماننے کا فیصلہ میں کروں گا۔"

"نہ ماننے کی صورت میں، میں بغاوت کر دوں گا جب چینی ملکہ ملک بدر ہو جائے گی تو چینی سفارت خانے کا ڈر کس کو ہو گا۔ تم میرے قیدی رہو گے۔ تالیہ مجبوراً یہاں رہے گی پھر سونا اور تخت میرا ہوگا۔"

"راجہ تم اتنا خون خرابہ نہیں کرانا چاہتے، میں جانتا ہوں۔"

"میں یہ کر سکتا ہوں مگر واقعی کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے تم میری شرط مان لو اور یہ چابی اٹھا کے یہاں سے چلے جاؤ۔" مراد کی مسکراہٹ گہری ہو چکی تھی اور شکاری آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔

"کیا شرط ہے تمہاری؟" اس کے اعصاب تن رہے تھے۔ کچھ بہت عجیب سا تھا اس ماحول میں۔

راجہ نے حقہ اٹھا کے کش بھرا۔ پھر نال ہٹائی اور دھوئیں کا مرغولہ لبوں سے چھوڑا۔ مرغولے فضا میں اوپر کو اٹھتے گئے۔

تمباکو کی خوشبو اور سلگتے انگاروں کی مہک آپس میں مکمل مل گئی۔

پھر مراد راجہ نے کہنا شروع کیا۔

☆☆☆

چینی سفارت خانے کے نام پہ بنی حویلیاں سن باؤ کی حویلی کے دائیں بائیں واقع تھیں۔ آج وہاں بھاری چینی فوج تعینات تھی۔ اکثریت ان چینی افسران کی تھی جو ملکہ یان سوفو کی شادی کے وقت ساتھ آئے تھے اور یہیں بس گئے تھے۔

سونے سے بھرے صندوق اندر رکھوائے جا چکے تھے اور سن باؤ کے سرخ دروازے کے باہر ایڈم اور تالیہ متفکر سے کھڑے تھے۔ ابھی ابھی ایک چینی سفارت کار نے آ کے اطلاع دی تھی کہ بنداہارا کی حویلی کے سامنے اکٹھے ہوئے غلام وہاں سے اٹھ گئے ہیں۔

''کیا وہ تھک گئے تھے؟'' ایڈم نے پریشانی سے سوال کیا۔

''نہیں۔ راجہ نے اس قیدی فاتح کو باہر بھیجا اور اس نے ان کو اٹھنے کے لیے کہہ دیا۔ مگر وہ غلام اپنے مالکوں کے پاس نہیں گئے۔ راجہ نے نیا قانون نافذ کر دیا ہے جس کے تحت ناجائز مسلمان غلام آزاد ہیں۔ اب وہ غلام ملاکہ کی گلیوں میں خوشیاں مناتے پھر رہے ہیں اور ان کی زبان پہ ایک ہی نعرہ ہے کہ شہزادی تاشہ کی سفارش پہ ان کو آزاد کروایا گیا ہے۔''

سفارت کار یہ کہہ کے وہاں سے ہٹ گیا تو تالیہ نے گہری سانس لی۔

''یعنی وان فاتح نے غلاموں کو آزاد کروا دیا۔ مگر تم اپنی کتاب میں لکھنا کہ یہ سب شہزادی تاشہ نے کروایا ہے۔''

''جی میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں۔ جہاں اتنے جھوٹ بولے وہاں ایک اور سہی۔''

''اور یہ بھی لکھنا کہ......''

''شہزادی صاحبہ اب دیر ہو چکی ہے۔ میں اپنی کتاب مکمل کر کے شاہی کتب خانے کے منتظم کو دے آیا ہوں۔ اب اس میں ایک ہی صورت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اگر آپ دونوں مجھے ملاکہ میں چھوڑ جائیں۔'' وہ جل کے بولا تھا۔

چند ساعتیں گزریں تو تالیہ نے فکرمندی سے سڑک کو دیکھا جو اندھیری پڑی تھی۔

''وان فاتح کہاں رہ گئے؟ ان کو اس وقت یہاں ہونا چاہیے تھا۔ معلوم نہیں راجہ سے مذاکرات کامیاب ہوئے یا نہیں۔''

اس کی بات منہ میں رہ گئی۔ دور افق سے دھول اڑتی دکھائی دی تھی۔ وہ چونکی۔

آس پاس تعینات چینی سپاہی بھی چوکنے ہوئے۔

سڑک پہ تیز گھوڑے دوڑتے آ رہے تھے۔ گھوڑا گاڑیوں کے پہیوں کی آواز... چینی سپاہیوں نے تلواریں نکال لیں۔

قافلہ قریب آیا اور چاند کی روشنی میں نظر آیا.....

مراد راجہ سب سے آگے والے گھوڑے پہ تھا اور دوسرے گھوڑے پہ فاتح بیٹھا تھا۔

تالیہ اور ایڈم نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ یہ پلان کا حصہ نہیں تھا۔

''یہ یہاں کیوں آیا ہے؟'' سن باؤ ساتھ آ کھڑا ہوا اور پریشانی سے بولا۔ ہاتھ نیام کی تلوار پہ تھا۔

''وانگ لی'' گھوڑے پہ بیٹھے فاتح نے ہاتھ اٹھا کے ان کو تھم جانے کا اشارہ کیا' اور اپنا گھوڑا قریب لایا' پھر نیچے اترا۔ تالیہ نے گردن اٹھا کے شاکی نظروں سے مراد راجہ کو دیکھا۔ اس نے ماتھے پہ سرخ پٹی باندھ رکھی تھی اور لمبے بال کندھوں پہ گر رہے تھے۔ وہ بھی تالیہ کو ہی دیکھ رہا تھا۔ تالیہ نے نظریں پھیر لیں۔

''وانگ لی۔'' فاتح نے ان دونوں کو نظر انداز کر کے سن باؤ کو مخاطب کیا۔ ''مراد راجہ کے اکیس صندوق اس کے حوالے کر دو۔''

ایڈم کا منہ کھل گیا۔

تالیہ شل رہ گئی۔

سن باؤ بھی چونکا۔ ''مگر....''

''یہ میرا فیصلہ ہے اور تم سب کو ماننا ہو گا۔'' وہ قطعیت سے کہہ رہا تھا۔

''مگر وہ تو غرباء کے لیے....'' تالیہ نے بولنا چاہا تو فاتح نے ہاتھ اٹھا کے اسے خاموش کرا دیا۔

''اس کے بدلے میں تمام غلام آزاد ہو گئے ہیں۔ سونے کے چند سکے ہر شخص کے حصے میں آئیں' اس سے بہتر یہ نہیں کہ انہیں آزادی مل جائے؟ میں نے جو کیا ہے وہ ملاکہ کے لوگوں کی بہتری کے لیے کیا ہے۔ میں نے غلاموں سے آزادی اور تم دونوں سے واپسی کا وعدہ کیا تھا۔ کسی کی غربت مٹانے کا نہیں۔ اس لیے مجھے میرے وعدے نبھانے دو۔''

کچھ تھا جو اس کے انداز میں بدل گیا تھا۔ سختی' سنجیدگی۔ کوئی سایہ سا تھا جو چہرے پہ آن پڑا تھا۔

ایڈم یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا' البتہ تالیہ نے سر ہلا دیا۔ ''جو آپ کو مناسب لگے' تو انکو!''

''مگر...... ملکہ نے تو......'' سن باؤ نے سرگوشی میں احتجاجاً فاتح سے کچھ کہنا چاہا مگر اس نے سختی سے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا۔

''میں ملکہ کا غلام نہیں ہوں۔ سلطان کو دوسری ملکہ نہیں لانے دوں گا۔ یہ وعدہ کیا تھا میں نے۔ مراد راجہ کو تباہ کرنے کا نہیں۔ اس لیے...... راجہ کے صندوق واپس کر دو۔''

غلام حکم دے رہا تھا۔ پٹی بندھا ہاتھ اٹھا کے اشارہ کر کے کہہ رہا تھا۔ سن باؤ نے گہری سانس لی اور سپاہیوں کو اشارہ کیا۔

کچھ بعید نہیں یہ غلام سلطان کو جا کے کہہ دے کہ اس سازش میں ملکہ بھی شریک تھی۔ ایسی صورت میں سارا کھیل پلٹ جاتا۔

مراد کے ساتھ آئے سپاہی ان حویلیوں کی طرف چلے گئے۔ سن باؤ بھی ساتھ ہو لیا۔ البتہ بار بار ناخوشی سے پلٹ کے ان کو دیکھتا ضرور تھا۔

ایڈم گم صم کھڑا تھا۔ تالیہ خاموش تھی۔ فاتح حویلیوں کی سمت دیکھ رہا تھا۔ اور گھوڑے پہ بیٹھا راجہ ان تینوں کو۔

''تو یہ شاہی سونا بھی تمہارے ساتھ آیا تھا؟'' اس نے براہِ راست تالیہ کو مخاطب کیا تو اس نے خفا سی نظریں اٹھائیں۔

''ہمارا آنا آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہم لیے جائیں گے' کیوں نہ اس بارے میں بات کر لی جائے۔'' وہ برہمی سے بولی تو فاتح نے اس کو دیکھا۔

''راجہ نے مجھے چابی دے دی ہے۔'' ساتھ ہی کرتے کے گریبان کے اندر سے سنہری زنجیر نکال کے دکھائی جس میں ڈلی اور سکہ دونوں کو جوڑ کے بنی چابی پروئی تھی۔

تالیہ نے چونک کے باپ کو دیکھا جو دھیما سا مسکرا رہا تھا۔

''تم جاؤ تالیہ! یہ چابی تمہیں خود راستہ دکھا دے گی۔ تمہیں اسی جنگل میں جانا ہے جہاں سے تم آئے تھے۔''

''ہم تینوں.... جا سکتے ہیں؟'' وہ حیران تھی۔ بار بار فاتح کو دیکھتی۔ جیسے ابھی وہ کوئی ''مگر'' کہے گا لیکن وہ سنجیدہ رہا۔

''مراد راجہ درست کہہ رہا ہے۔ ہم ابھی یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔ سونا لینا اور سلطان سے بات کرنا' یہ سب مراد راجہ کا کام ہے۔ کیا تمہیں محل سے کچھ اٹھانا ہے؟'' عام سے انداز میں رک کے تالیہ کی طرف دیکھا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں لعنت بھیجتی ہوں بنداہارا کے اونچے محل پہ۔'' تنفر سے بولی تو فاتح نے سر ہلا دیا۔

''پھر آؤ۔ ہم تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' وہ گھوڑے کی طرف بڑھ گیا۔ ایڈم کو بھی اشارہ کیا تو وہ بھی گم صم سا ساتھ ہو لیا۔

ذرا فاصلے پہ فاتح کے گھوڑے کے ساتھ دو مزید تازہ دم گھوڑے تیار کھڑے تھے۔ ان پہ کھانے پینے کا مناسب سامان بھی لدا تھا۔ وہ اپنے گھوڑے پہ

سوار ہو رہا تھا جب ایڈم پیچھے سے شاہی انداز میں
بولا۔
"تو آپ نے وہی کیا جو سیاست دان کرتے
ہیں۔ آپ نے ڈیل کر لی۔" وہ ابھی تک سُن تھا۔
وان فاتح رکاب پہ پیر رکھ کے اوپر چڑھا اور
گھوڑے کی لگام تھامے سرسری سا ایڈم کو دیکھا۔
"میں نے اس سے زیادہ کا وعدہ نہیں کیا تھا۔" اور پھر
دل میں سوچا۔
(تم کیا جانو میں نے کیا قربان کیا ہے۔)
"مگر ہمیں ملاکہ کے لوگوں کے سامنے راجہ کی
بدعنوانی کا پول کھولنا تھا۔ ہمیں....."
"ہمیں صرف واپس جانا تھا' ایڈم۔ ہمیں اپنی
اصل زندگیاں واپس چاہیے تھیں۔ اس دنیا میں ہمارا
کوئی ہدف نہیں تھا۔ ہم لامتناہی کھلاڑی تھے۔ بس۔
اس لیے خوش ہونا سیکھو۔ تم واپس جا رہے ہو۔" وہ
رعب سے بولا تو ایڈم نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔ مگر
اس نے محسوس کیا کہ فاتح اس سے نظر نہیں ملا رہا تھا۔
ادھر مراد گھوڑے سے اترا اور تالیہ کے سامنے
آیا۔ وہ ہنوز سلوٹ زدہ پیشانی لیے کھڑی تھی۔
چہرے پہ خفگی اور الجھن تھی۔
"تم نے اس غلام سے نکاح کر کے میرے
پاس کوئی راستہ نہیں چھوڑا' تالیہ۔" وہ اس کے سامنے
کھڑا املال سے کہہ رہا تھا۔
"آپ اپنے ہی لوگوں سے دھوکا کرنے
والے ایک بدعنوان آدمی ہیں' بابا۔ آپ نے مجھے محل
میں قید کر رکھا تھا۔ آپ کی چابی نے مجھ سے میری دنیا
چھین لی۔ مجھے ابھی بھی آپ پہ شک ہے۔"
"کیا شک ہے؟" وہ پرسکون سا اس کی
آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔
"یہی کہ آپ مجھے کسی طرح اس دنیا میں
روکنے کی کوشش کریں گے۔"
"نہیں۔ میں تمہیں اپنی مرضی سے جانے دے
رہا ہوں کیونکہ....." وہ آگے بڑھا' اس کے کندھوں کو
نرمی سے تھاما اور اس کی سیاہ آنکھوں میں جھانکا۔
"کیونکہ مجھے یقین ہے' تم واپس ضرور آؤ گی۔"
تالیہ نے زور سے اس کے ہاتھ جھٹکے۔ اسے
مراد راجہ پہ بری طرح غصہ آیا تھا۔
"تالیہ واپس کبھی نہیں آئے گی۔ مجھے آپ کا
محل' آپ کی دولت اور آپ کی طاقت نہیں چاہیے۔
مجھے اپنی عام سی دنیا واپس چاہیے۔ میں اسی میں خوش
تھی' بابا۔"
اور اس کے پاس سے گزر کے آگے نکل گئی۔
اس کا گھوڑا تیار تھا۔ ایڈم اور فاتح گھوڑوں پہ بیٹھے اس
کے منتظر تھے۔ تالیہ اپنے گھوڑے پہ چڑھی اور تیزی
سے اس کا رخ موڑ دیا۔
"میں تمہارا انتظار کروں گا' تالیہ۔" عقب میں
کھڑا مراد کمر پہ ہاتھ باندھے' پرسکون سا گردن
اٹھائے ان تینوں کو اندھیری سڑک پہ آگے بڑھتے
دیکھ رہا تھا۔
تالیہ نے مڑ کے دیکھا تک نہیں۔
مڑ کے دیکھنے والے نمک کے مجسمے بن جاتے
ہیں۔
البتہ وان فاتح نے گردن موڑ کر ایک خاموش
نظر مراد پہ ڈالی اور سر کو ہلکا سا خم دیا۔ یہ تشکر تھا' یا کسی
سمجھوتے کا اشارہ۔ وہ غور سے اس کے تاثرات دیکھ
رہی تھی۔ وہ چپ چپ لگتا تھا اور اس کی امید بھری
چمک آنکھوں سے غائب تھی۔
"ہمیں اس طرف جانا ہے۔" فاتح اپنا گھوڑا
سب سے آگے لے گیا۔ وہ اب راستہ بتا رہا تھا اور وہ
دونوں اس کی پیروی کر رہے تھے۔
ایڈم اداس لگتا تھا کہ وہ ایک بدعنوان حکمران کا
پردہ فاش نہیں کر سکا۔
اوپر چمکتا چاند..... تارے..... اور اندھیری
سڑک پہ دوڑتے تین گھوڑے۔ بظاہر سب کچھ معمول
کے مطابق تھا۔ مگر فضا میں کچھ تھا جو بھاری اور مہلک
سا محسوس ہوتا تھا۔
سیسم سے زیادہ مہلک۔

☆☆☆

جس جنگل سے نکلنے میں ان کو چار دن لگے تھے'
راستہ معلوم ہونے کی وجہ سے وہ اس جنگل کے اندر
تین دن میں پہنچ گئے۔ فاتح اس دوران زیادہ تر
خاموش رہا۔ ایڈم کا موڈ بدستور بہتر ہوتا گیا اور تالیہ
بھی جلد نارمل ہو گئی۔ بلکہ جیسے جیسے سفر گزرتا جا رہا تھا'
وہ پرجوش ہوتی جا رہی تھی۔
"واؤ..... ہم بالآخر واپس جا رہے ہیں۔"
"ہم واقعی واپس جا رہے ہیں نا' سر؟" وہ
رات کو جنگل کے اندر اپنے اپنے بستر بنا رہے تھے
جب ایڈم نے پھر سے پوچھا۔
گھنے رین فاریسٹ کے اونچے درخت خاموشی
سے اس قطعے کو دیکھ رہے تھے جہاں خشک پتے گرے
تھے اور فاتح ایک درخت کے ساتھ کھڑا رسیوں کا
جھولا سا باندھ رہا تھا۔ آستین پیچھے کو چڑھائے وہ
سنجیدگی سے اپنا کام کر رہا تھا۔ ایڈم کے سوال پہ محض
اتنا بولا۔
"تمہیں مجھ پہ اعتبار نہیں ہے کیا؟"
"آپ پہ ہے۔ مگر اپنے بابا پہ نہیں ہے۔" وہ
جو مقابل درخت کے ساتھ اپنے بستر کو باندھ رہی تھی'
مداخلت کرتے ہوئے بولی۔
"وہ تمہارا باپ ہے' تالیہ۔ اس کو تم سے محبت
ہے۔" وہ کام جاری رکھے ہوئے تھا۔ دونوں کی ایک
دوسرے کی طرف پشت تھی اور وہ کام میں لگے
تھے۔ ایڈم درمیان میں پتھر پہ بیٹھا باری باری دونوں
کو دیکھتا تھا۔
"مگر مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں وہ آخر میں ہم میں
سے کسی کو روک نہ لیں۔ یا پتا نہیں کیا..... مگر بابا ایسا
ضرور کچھ نہ کر دیں گے جس سے ہمیں نقصان ہو۔"
پھر چونک کے اس کی طرف پلٹی۔
"انہوں نے اس ساری ڈیل میں کوئی "کیچ"
تو نہیں رکھا نا؟ کوئی شرط؟ کوئی..... کوئی ضرر دینے والی
بات۔" اس کی الجھن ختم نہیں ہو رہی تھی۔
فاتح کے رسیاں کستے ہاتھ تھمے۔ صرف ایک
پل کو۔ پھر اس نے کام جاری رکھا اور عام سے انداز
میں بولا۔ "میں نے کہا نا' ہم صحیح سلامت واپس پہنچ
جائیں گے تو تم اتنی وہمی کیوں ہو رہی ہو؟"
"تو آپ اتنے چپ چپ کیوں ہیں۔"
"کیونکہ میں آگے کا سوچ رہا ہوں۔ مجھے ایک
دنیا کو اپنی گمشدگی کے متعلق جواب دینے ہوں گے۔
چار ماہ کم عرصہ نہیں ہوتا۔" اس نے جھولا مکمل کر لیا
تھا۔ پھر ایک کپڑا سامان سے نکالا' اسے جھاڑا اور
رسیوں کے پنگھوڑے پہ ڈالا۔ اس بار جنگل میں پچھلی
دفعہ کی طرح کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی کیونکہ سامان
ان کے پاس تھا۔
"آپ فکر مت کریں' تو انکو۔ ہم آپ کے
ساتھ ہیں۔"
فاتح نے پلٹ کے ایک اچٹتی نگاہ اس پہ ڈالی۔
"وان فاتح کو کسی کے ساتھ کی ضرورت نہیں پڑی کبھی
تالیہ۔"
شاید وہ ویسا ہی بے نیاز تھا جیسا ہمیشہ ہوتا تھا۔
شاید یہ سب اس کا وہم تھا۔ اس نے بس شانے اچکا
دیے اور اپنا بستر بنانے لگی۔
"مراد راجہ اب کیا کرے گا' سر؟ سلطان کو بیٹی
کی گمشدگی کی خبر کیسے دے گا؟ کیا بہانہ کرے گا؟"
"ایڈم یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ ہمیں صرف اپنی
نجات کے بارے میں سوچنا ہے اور یہ تم ہی تھے جو
چار ماہ سے واپس جانے کے لیے شکایتیں کر رہے
تھے۔ اب جب تمہیں راستہ مل رہا ہے تو بہتر ہے کہ
ملاکہ کے ہیرو نہ بن سکنے کے غم کو بھول کے تم اپنے
ماں باپ اور اپنی منگیتر کا سوچو۔"
وہ ایک دم یوں جھڑک کے بولا تو ایڈم کے
چہرے کے سارے زاویے درست ہو گئے۔ اس نے
جلدی سے سر ہلایا۔ "جی سر۔"
فاتح اپنے بستر پہ لیٹ گیا۔ دو درختوں کے

درمیان فضا میں جھولتا رسیوں کا جھولا اور اس نے ان کی طرف سے کروٹ موڑ لی۔ وہ درختوں کے درمیان خالی جگہ تھی جہاں چاند کی روشنی مدھم سی پہنچ پا رہی تھی۔ جانوروں کے بولنے اور کیڑوں کے رینگنے کی آوازوں کے ساتھ ساتھ دور کسی جھرنے کے بہتے پانی کی آواز بھی آرہی تھی۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ تالیہ چپ چاپ کام کرتی رہی اور ایڈم پتھر پہ بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر اس نے تالیہ کو مخاطب کیا۔ ''آپ جاتے ہوئے اپنے بابا سے کیا کہہ رہی تھیں؟''

''یہی کہ میں ان کے محل اور دولت پہ لعنت بھیجتی ہوں۔''

''جی اور اسی لیے آپ نے اپنے کپڑوں میں جو پوٹلی چھپا رکھی ہے اس میں اچھے خاصے سونے' ہیرے اور جواہرات جڑے زیورات موجود ہیں۔''

وہ تین دن سے جس راز کو دبائے پھر رہا تھا' آج اگلے بنا رہ نہ سکا۔ تالیہ نے پلٹ کے کینہ توز نظروں سے اسے دیکھا۔

''جائز اور حلال زیورات ہیں وہ۔ شہزادیوں کا حق ہوتا ہے۔ چوری کر کے نہیں لے جا رہی۔'' کپڑا جھٹک کے بستر پہ بچھاتے ہوئے وہ بولی تو ہاتھ کی سرخ انگوٹھی چمکی۔

''میں کب کہہ رہا ہوں کہ ناجائز ہیں؟ صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ اتنی جلدی محل اور دولت پہ لعنت بھیجنے والی نہیں ہیں آپ۔''

تنک کے بولا اور اپنا بستر بنانے اٹھ کھڑا ہوا۔ تالیہ خفگی سے کچھ بڑبڑاتی ہوئی درخت کی طرف مڑ گئی۔

بالآخر ان کے درمیان تناؤ والی فضا ختم ہو رہی تھی۔ اور تالیہ کو یقین آنے لگا تھا کہ سب ٹھیک ہے اور فاتح اس سے کچھ نہیں چھپا رہا۔

ان کی طرف سے کروٹ موڑے فاتح کو اپنے سرہانے کھڑی اداس سی آریانہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھتی وہ فکرمندی سے اس کی طرف جھکی۔

''یہ آپ نے کیا کر دیا' ڈیڈ؟'' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''اتنا بڑا فیصلہ اکیلے کر لیا۔ ان دونوں کو بتایا ہی نہیں۔ جب ان کو معلوم ہوگا تو کیا ہوگا؟''

''آریانہ!'' وہ اس کو دیکھتے ہوئے اداسی سے بڑبڑایا۔ ''میں ان کے برابر کا نہیں ہوں۔ انہوں نے ہمیشہ مجھے اپنے سے اوپر رکھا ہے اور'' اٹس وری لونلی ایٹ دا ٹاپ۔''

پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ جنگل کی ساری سیاہی ان آنکھوں میں سمٹ گئی اور دل بھی اندر تک تاریک ہو گیا۔

☆☆☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب دو درختوں کے درمیان بندھے جھولے نما بستر پہ سوئی تالیہ کی آنکھ کھلی۔

نرم سا لحاف اس نے چہرے سے اتارا اور پلکیں چند بار جھپکائیں۔ وہ چت لیٹی تھی سو اونچے درختوں کے آسمان کو چھوتے سرے نظر آرہے تھے۔ مدھم چاندنی کہیں کہیں سے جھانک رہی تھی۔

پھر اس نے گردن چونکنے انداز میں موڑی۔

فاتح ایک پتھر زمین پہ کھینچتا اس کے جھولے کے قریب لا رہا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھنے لگی تو اس نے ہاتھ اٹھا کے روکا۔

''ششش...... ریلیکس!'' اور پتھر قریب لا کے سیدھا ہوا۔ پھر اس پہ بیٹھا' یوں کہ تالیہ کی طرف رخ تھا۔ وہ دھیرے سے اٹھ بیٹھی۔ گرم لحاف اپنے گرد لپیٹے رکھا۔ جھولا ذرا سا جھولنے لگا' پھر ساکن ہو گیا۔

''کیا ہوا' فاتح صاحب؟'' تالیہ نے بال کان کے پیچھے اڑستے ہوئے مندی مندی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ ہاتھ میں کچھ اٹھائے ہوئے تھا۔ ساتھ ہی مانوس سی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ چاکلیٹ!!

''مجھے نیند نہیں آرہی تھی تو جنگل میں آگے نکل گیا۔ وہاں کوکو کا درخت تھا۔ سوچا تمہارے لیے لے آؤں۔ یاد ہے تمہاری سالگرہ پہ تمہیں یہ بہت لذیذ لگا تھا۔'' وہ پتھر پہ بیٹھا مسکرا کے کہتا چاقو سے پھل کاٹ رہا تھا۔ وہ بھی دھیرے سے مسکرا دی۔

''آپ کو یاد تھا۔'' ہاتھ بڑھایا تو فاتح نے پھل اسے تھماتے ہوئے چہرہ اٹھایا۔ وہ قدرے تھکا تھکا لگ رہا تھا مگر لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔ تین دن کی خاموشی کے بعد آج وہ' وہ فاتح لگا جو اسی جنگل میں چار ماہ پہلے اس کو تسلی دیتا تھا اور ہمت دلاتا تھا۔

''ظاہر ہے مجھے یاد تھا'' وہ ہنوز مسکرا رہا تھا۔ آواز دھیمی تھی۔

''یہ اب بھی لذیذ ہے۔'' اس نے انگلی کٹے پھل کے پیالے میں ڈالی اور گودا منہ میں رکھا تو لذیذ رس اندر تک گھل گیا۔ وہ بس مسکرا کے اسے کھاتے ہوئے دیکھنے لگا۔

''تالیہ!'' پھر نرمی سے پکارا۔ ''ان چار ماہ میں تمہارے خیال میں تمہارے اندر کیا تبدیلی آئی ہے؟''

''چار پانچ کلو وزن بڑھا ہے میرا۔ اور ہاں چند جنگی امور کی تربیت لی ہے میں نے۔ شاہی آداب سیکھے ہیں۔ ہر روز ڈھیروں زیورات خود پہ لاد لینے کی مشق کی ہے اور......''

''تالیہ!'' اس نے نرمی سے ٹوکا۔ ''باہر نہیں' تمہارے اندر کیا تبدیلی آئی ہے؟ تم نے کیا سیکھا ہے؟''

اس نے گودے بھری انگلی لبوں پہ رکھ کے نکالی اور سوچا۔ ''پتا نہیں' تو انکو۔ شاید کچھ بھی نہیں سیکھا۔ اب بھی دولت کی وہی حرص ہے مجھے۔ اتنے زیورات ساتھ لائی ہوں۔ خزانہ اب بھی چاہیے مجھے۔ ہاں کوشش کروں گی کہ پرانی روش چھوڑ کے نئی زندگی شروع کروں۔''

''جب میں تمہیں چھوڑ دوں گا (تالیہ کی پلکیں جھکیں مگر پھر اس نے ان کو اٹھا لیا اور مسکراتی رہی) تو تم کیا کرو گی؟''

''میں شاید امریکہ چلی جاؤں۔ اپنے سارے جائز مال و دولت کے ساتھ اور بطور آرٹسٹ ایک نئی زندگی شروع کروں۔'' پھر ٹھہری۔ پھل والا ہاتھ پیچھے کر لیا۔

اندھیری رات میں وہ لحاف میں لپٹی جھولے پہ بیٹھی تھی اور وہ سامنے پتھر پہ بیٹھا اس کو دیکھ رہا تھا۔

''میں جانتی ہوں ہم نے یہ نکاح صرف مراد راجہ کو بلیک میل کرنے کے لیے کیا تھا' ورنہ وہ زبردستی میری شادی سلطان سے کر دیتا اور اب ہم اس کو ختم کر دیں گے۔ لیکن...... میں چاہوں گی کہ ہم اچھے دوست رہیں۔ میں چھٹیوں میں ملائیشیا آنا چاہوں گی اور بھلے آپ وزیراعظم بھی بن جائیں' آپ ایڈم اور میرے لیے ہمیشہ وقت نکالیں۔ سال میں ایک دو مرتبہ ہم تینوں مل بیٹھ کے ان دنوں کو یاد کیا کریں گے۔ ٹھیک ہے نا' تو انکو''

''میں بھی چاہتا ہوں کہ ایسا ہی ہو۔ مگر میں ایک اور بات اس سے زیادہ چاہتا ہوں۔'' وہ نرمی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

تالیہ نے ابرو بھینچ کے اسے حیرت سے دیکھا۔

''وہ کیا؟''

''تمہاری حقیقت جاننے سے قبل میں تمہیں تاشہ کہا کرتا تھا۔ اسی جنگل میں' میں نے تمہیں پہلی دفعہ تالیہ کہنا شروع کیا تھا۔ جس لڑکی کو میں تاشہ کہہ کے بلاتا تھا وہ میرے لیے ایک ناقابل بھروسا' بے ایمان اور اداکارہ قسم کی عام سوشلائیٹ تھی۔ مگر جب میں نے تمہیں جانا...... کہ تمہارا پیشہ کیا ہے اور تم ہی حالم ہو' تو میں نے تمہیں تمہارے اصل نام سے پکارنا شروع کیا۔ پھر بھی تاشہ نہیں کہا۔ کبھی تمہیں شہزادی نہیں سمجھا۔ کیونکہ اتنا زیور لاد کے' تاج اور زرتار لباس پہن کے بھی تم میرے لیے وہی تالیہ تھیں جو میری دنیا کی باسی تھی۔ لیکن اس روز......'' وہ ٹھہرا۔ وہ بنا پلک جھپکے اس کو دیکھ رہی تھی۔

''اس روز قید خانے میں جب تم سپاہیوں پہ غرائیں تو میں نے تمہاری وہ آواز سنی جو پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔''

وہ ذرا سی شرمندہ ہوئی۔ فوراً وضاحت دینا

چاہی۔ ”وہ تو میں غصے میں......“

”نہیں تالیہ! مجھے برا نہیں لگا تھا۔ بلکہ مجھے اچھا لگا تھا۔ جانتی ہو کیوں؟“

وہ تعجب سے اسے دیکھنے لگی۔ ”کیوں؟“

”کیونکہ بنا کسی تاج اور شاہی لباس کے..... اس دن تم مجھے شہزادی لگی تھیں۔ وہ تمہارا اصل روپ تھا۔ تمہارا رئیل سیلف۔ تم مجھے تو انکو کہتی ہو۔ ہماری دنیا میں اس لفظ کا مطلب ”مائی باس“ ہوتا ہے۔ لیکن اس وقت میں نے جانا تھا کہ تمہارا اصل مقام ایک باس کا مقام ہے۔

تم نے ان چار ماہ میں اپنے اصل روپ کو دریافت کر لیا ہے' تالیہ! تم ایک شہزادی ہو۔ ایک دانا شہزادی۔ تم روپ بدل بدل کے تنگو کاہل کی ملازمہ یا کوئی ویٹرس یا کوئی نقلی سوشلائیٹ بننے کے لیے پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ تم یہ بہروپ لیے پھرتی ہو' سچ اس لیے نہیں بول سکتیں کیونکہ تم نے اپنے اصل کو کبھی دریافت ہی نہیں کیا تھا۔“

وہ ٹکٹکی باندھ کے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میں یہ چاہتا ہوں کہ تم نے ان چار ماہ میں جو سیکھا ہے' اس کو ضائع مت کرو۔ واپس جا کے تم اس کو اپنی زندگی پہ لاگو کرنا۔ پھر تمہیں کسی چیز کا خوف سچ سے دور نہیں کرے گا۔ تم اپنے ساتھ سچی ہو جاؤ گی۔ تمہیں اپنے اوپر ملمع چڑھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ کیونکہ تمہیں اپنے اصل روپ پہ اعتماد آ جائے گا۔

میں اس تالیہ کو کے ایل میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں جو قید خانے کے سپاہیوں پہ غرا رہی تھی۔ ان کو ظلم کرنے سے روک رہی تھی۔ یہی چیز تمہاری سب سے بڑی طاقت ہو گی۔ تالیہ تمہیں کسی 'خزانے' کسی زیور کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں صرف وہی بننا ہے جو تم اس قدیم ملاکہ میں تھیں۔“

”میری سمجھ میں آپ کی باتیں نہیں آ رہیں۔ میں چوری کرنا چھوڑ کے نئی زندگی شروع......“ اس نے کہنا چاہا مگر.....

”ایک وقت آئے گا جب تمہیں میری باتیں یاد آئیں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس وقت اس رات کو یاد کرنا۔ تم یاد کرنا کہ میں تمہیں ایسی ہی تالیہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ شہزادی تاشہ جیسی تالیہ۔ صرف تاشہ جیسی نہیں۔ بلکہ کسی باس کی طرح۔ نڈر اور جرأت مند اور اس وقت اگر کوئی تمہارے اس روپ کو پسند نہ کرے تو تم اس کی پرواہ نہیں کرو گی۔ چاہے تمہیں ناپسند کرنے والوں میں' میں ہی کیوں نہ شامل ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے نیم رضامندی سے سر ہلایا۔ ”میں اپنے اصل سے نہیں بھاگوں گی۔“

”اور ایڈم......“ اس نے گردن موڑ کے دور سوتے ایڈم کو دیکھا۔ ”اس نے اس دنیا سے یہ سیکھا ہے کہ انسان کو اپنی خوشی اپنے اندر خود ڈھونڈنی ہوتی ہے۔ بجائے دوسروں کے پیچھے بھاگتے رہنے اور دوسروں کی رائے پہ انحصار کرنے کے' انسان کو اپنی ذات پہ اعتماد کرنا سیکھنا ہوتا ہے۔ ہم اپنے سب سے اچھے دوست اور سب سے اچھے جج خود ہوتے ہیں۔ کوشش کرنا کہ تم ایڈم سے رابطے میں رہو اور اس کو بیساکھیوں کے بغیر اپنے قدموں پہ چلنا سکھاتی رہو۔ تمہیں اور اسے اس دنیا سے سیکھے اسباق بھولنے نہیں چاہئیں۔“

پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا تو تالیہ نے نظریں اٹھا کے اسے دیکھا۔ ”ہم اچھے دوست تو رہیں گے نا' فاتح صاحب؟“ یوں ہی اس کو نام سے پکار دیا۔

”میں ایسا ہی چاہتا ہوں کہ ہم ہمیشہ اچھے دوست رہیں۔“ وہ مسکرا کے پلٹا تو وہ پکار اٹھی۔

”اور آپ نے کیا سیکھا؟“

اس اندھیری رات میں درختوں کے ساتھ کھڑا فاتح ٹھہر گیا۔

پھر آہستہ سے مڑا اور سادگی سے مسکرا کے تالیہ کو دیکھا۔

”کچھ بھی نہیں۔ میں جیسا تھا ویسا ہی رہوں گا۔“

”ظاہر ہے۔“ تالیہ نے گہری سانس لے کر شانے اچکائے۔ ”آپ سیلبرٹی ہیں' پرفیکٹ ہیں۔

آپ میں خامیاں کیسے ہو سکتی ہیں جن کو اصلاح کی ضرورت ہو؟“ زوٹھے پن سے بولی تو اس نے جواب نہیں دیا۔

”آپ کا والٹ میرے پاس ہے۔ اس میں وہ پاپ کارن بھی ہیں۔“

”وہ تم رکھ لو۔ اس وقت تک جب تک میں اسے واپس نہیں مانگتا۔“ وہ مبہم انداز میں کہتا ہوا اپنے بستر کی طرف بڑھ گیا۔ تالیہ بھی واپس لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔

کروٹ موڑ کے لیٹے ایڈم کی آنکھیں کھلی تھیں اور اس نے حرف حرف سنا تھا۔

”وان فاتح یہ سب مجھے ڈائریکٹ بھی کہہ سکتے تھے' پھر یہ تالیہ کو کیوں کہا کہ وہ مجھے کہیں۔ تین دن سے سر مجھے اگنور کر رہے ہیں۔ ہونہہ۔“ اس نے خفگی سے آنکھیں بند کی تھیں۔ اسے سو جانا چاہیے تھا۔

صبح انہوں نے ”دروازے“ کی طرف سفر کرنا تھا۔

☆☆☆

جنگل پہ صبح اتری تو گھنے درختوں نے دیکھا' تین مسافر قطار میں پیدل چلتے جا رہے تھے۔ سب سے آگے چلنے والے مرد کی گردن میں سنہری چابی لٹک رہی تھی جو اس کو راستہ دکھا رہی تھی۔ گھوڑے وہ جنگل کے باہر چھوڑ آئے تھے۔ چہروں پہ مٹی لگی تھی اور لباس میلا ہو رہا تھا مگر وہ چل رہے تھے۔

ہر اٹھتے قدم کے ساتھ تالیہ کو ان چار ماہ کا گزرا ایک ایک پل یاد آ رہا تھا۔

(چار ماہ قبل وہ کے ایل میں ان باؤ کے گھر کے صحن میں کھڑے تھے۔ زمین میں ڈھکن سا کھل گیا تھا اور نیچے سیڑھیاں جا رہی تھیں۔ فاتح مشکوک سا تالیہ کو برہمی سے دیکھ رہا تھا اور وہ خزانے کی طمع میں زینے اتر رہی تھی۔)

جنگل میں وہ تینوں اس مقام تک پہنچے تو فاتح نے گردن سے زنجیر اتاری اور سنہری چابی زمین پہ رکھی۔ ایک دم ہوا چلی اور سوکھے پتے اڑتے گئے۔

جگہ خالی ہوتی گئی۔ وہاں ایک لکڑی کا ڈھکن نظر آنے لگا۔

(وہ رین فاریسٹ کے غار میں کھڑی تھی۔ ساکن' ساکت۔ اس کے سر کے اوپر سانپ تھا جس کو فاتح چاقو سے مار رہا تھا۔ سانپ کی گردن کٹ کے گر گئی۔ وہ خوف سے اسے دیکھ رہی تھی۔)

پتے ہٹ گئے اور ڈھکن صاف نظر آنے لگا۔ وان فاتح نے تیزی سے ڈھکن کھولا۔ نیچے زینہ سا بنا تھا۔ ان تینوں نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا۔ تالیہ کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ خوشی اندر باہر بھرنے لگی۔

(وہ تینوں جنگل میں بیٹھے تھے۔ درختوں کی چھایا تلے اور وہ ہرن کی گردن پہ چاقو پھیر رہی تھی۔ خون کے چھینٹے وان فاتح کے اوپر آ گرے تھے۔)

وہ قدم بہ قدم زینے اترنے لگے۔ ایڈم بار بار دیواروں کو ہاتھ لگا کے ٹٹولتا۔ کیا وہ واقعی واپس جا رہے تھے؟ وہ بے یقین تھا۔

(وہ پنجرے میں بند تھے اور پنجرہ اٹھائے گھوڑا گاڑی سڑک پہ سرپٹ دوڑ رہی تھی۔ تالیہ کے سر پہ چوٹ لگی تھی اور درد ہو رہا تھا۔)

زینے اترتے وقت وان فاتح سب سے آگے تھا۔ دروازے پہ وہ پہلے پہنچا۔ تالیہ نے چابی مانگی مگر وہ خود آگے آیا اور تالے میں چابی ڈالی۔ پھر زنجیر ہٹا کے اسے کھولا۔ لکڑی کا قدیم دروازہ کھلتا چلا گیا۔

(وہ بندا ہارا کے محل میں کھڑی اپنے بابا سے پہلی دفعہ مل رہی تھی۔ اس نے جامنی لباس پہن رکھا تھا اور کان کے اوپر بڑا سا پھول لگا تھا۔)

دروازے کے پار وہی سب تھا جو پہلے نظر آیا تھا۔ طویل راہداری جو پتھریلی تھی۔ وہ تینوں تیزی سے اس پہ چلنے لگے۔ تالیہ کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ ایڈم اب بھی دیواروں کو بے یقینی سے ٹٹول رہا تھا۔

(وان فاتح ابوالخیر کی حویلی کی رسوئی میں کھڑا صراحی سے پیالیوں میں قہوہ انڈیل رہا تھا۔ دھار کی صورت میں گرتا قہوہ پیالی کو بھر رہا تھا۔ بالوں کے

کڑھنے کی خوشبو سارے میں پھیلی تھی۔)

ان کے پیر پانی میں ڈوب رہے تھے اور اوپر سے قطرے بھی برس رہے تھے مگر وہ چلتے گئے... چلتے گئے... چلتے گئے...

(ایڈم کتب خانے میں کتابیں اور قلم کاغذ پھیلائے بیٹھا تھا۔ ہاتھ میں پکڑے کاغذ کو وہ شعلہ دکھا چکا تھا اور کاغذ دھیرے دھیرے جل رہا تھا۔)

راہداری ایک دوسری پانی بھری راہداری کے ساتھ آملی۔ دو دریاؤں کا سنگم۔

تالیہ کی آنکھیں فرط مسرت سے بھیگنے لگیں۔

صرف فاتح تھا جو سنجیدہ تھا۔ بے تاثر۔ سرد۔

(وہ دونوں ابوالخیر کی حویلی کی چھت پہ اکڑوں بیٹھے باتیں کرتے ہوئے دور تک پھیلے اندھیرے میں ڈوبے ملاکہ کو دیکھ رہے تھے۔)

دو دریاؤں کے سنگم پہ تالیہ نے سر اٹھا کے دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا مگر وہ نئی زندگی کی شروعات تھیں۔ وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگی، یہاں تک کہ سب سے آگے نکل گئی۔

(وہ ملکہ یان سوفو کے محل میں اس کے سامنے کھڑی تھی اور طبیب کو ڈانٹ رہی تھی۔ اس کا تاج سنہری دھوپ میں چمک رہا تھا اور ملکہ دنگ کھڑی اس کو اپنی حمایت کرتے دیکھ رہی تھی۔)

فاتح اب سست روی سے چل رہا تھا۔ اسے اب واپس پہنچنے کی جلدی نہ تھی۔ ایڈم کا چہرہ اب جیسے پرسکون ہونے لگا تھا۔ اسے یقین آنے لگا تھا۔



(ایڈم دربار میں رکھی سنہری میز پہ موجود اپنے نام کی تختی پہ مسحور سا ہاتھ پھیر رہا تھا۔ ساتھ ہی دستے رکھے تھے جن کے اوپر لکھا بنگارا یا ملایو جگمگا رہا تھا۔)

دوسرے دریا کے پار وہی زینہ تھا۔ تالیہ بھاگ کے اس پہ چڑھی۔ سامان کی پوٹلی سنبھالے، وہ تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی۔ فاتح بن رامزل کے قدم اتنے ہی بھاری ہو رہے تھے۔

(مراد راجہ تختی سے اس کا بازو پکڑے اس کے ساتھی کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ میز پہ رکھی اس کی ننھی سی لکڑی کی کشتی خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔)

لکڑی کا ڈھکن اس نے ہٹایا تو سیاہ رات دکھائی دی۔ وہ باہر نکلی تو خود کو سن باؤ کے صحن میں پایا۔ تاروں بھرا آسمان اور.... اس نے گردن موڑی.... نئے ملاکہ میں جدید تراش خراش سے آراستہ سن باؤ کا گھر۔

(وہ جیا کے چبوترے پہ کھڑا بلند آواز میں لوگوں سے مخاطب تھا، مگر وہ گردنیں افسوس سے ہلاتے کھانا کھانے میں مصروف تھے۔)

ایڈم باہر نکلا تو بالکل دنگ رہ گیا۔ پھر بالآخر کھل کے مسکرایا۔ پیروں پہ گول گول گھوم گیا۔ وہ جدید ملاکہ ہی تھا۔ وہ جدید گھر ہی تھا۔

(وہ تینوں سن باؤ کے برآمدے میں زمین پہ بیٹھے تھے اور چینی قاضی ان سے ان کی رضامندی لے رہا تھا۔ گواہ بنا ایڈم خالی دل اور خالی نظروں سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔)

فاتح نے اوپر قدم رکھے اور سیدھا کھڑا ہوا تو ڈھکن خود بخود بند ہو گیا۔ زمین برابر ہو گئی۔ کنویں کا پانی بھر آیا۔

ایسے جیسے وہاں کوئی ڈھکن تھا ہی نہیں۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

(وہ دونوں مجسمے کی جگہ کے نیچے زمین میں سامان بھر رہے تھے۔ سن باؤ کے قدیم صحن میں تالیہ اور ایڈم تنہا تھے اور ان کے ہاتھ تیز تیز کام کر رہے تھے۔)

''سلطان ساز''

اس نے خواب میں دیکھا کہ...
وہ راہداری میں کھڑی ہے...
سامنے چند آفسز بنے ہیں...
جن کی دیواریں شیشے کی ہیں...
ایک آفس کے اندر کا منظر وہ صاف دیکھ سکتی ہے۔
اس میں ایک سیاہ کوٹ والا آدمی کھڑا ہے...
میز سے ٹیک لگائے، سینے پہ بازو لپیٹے
وہ تالیہ کی طرف دیکھ رہا ہے۔
اور تالیہ...
وہ راہداری میں کھڑی ہے۔
ہاتھ میں ایک بڑا سا زرد پلے کارڈ ہے،
جسے وہ شیشے کے دروازے پہ چسپاں کر رہی ہے!
آفس کاریڈور میں نیم اندھیرا ہے۔
جیسے اکثر لوگ جا چکے ہوں...
کارڈ چسپاں کر کے وہ مڑتی ہے...
اور ایک چبھتی ہوئی نظر اس آدمی پہ ڈالتی ہے...

☆☆☆

تاریخ تھی سولہ جولائی۔ شہر تھا جدید ملاکہ۔ سن تھا دو ہزار سولہ اور وقت تھا رات کے ساڑھے گیارہ بجے، جب وہ تینوں سن باؤ کی حویلی میں کھڑے تھے۔

زمین اپنے خفیہ راستوں کو چھپائے برابر ہو چکی تھی۔ ایڈم ٹی وی چلا کے تاریخ معلوم کر رہا تھا اور تالیہ بے یقینی سے گول گول گھوم کے اطراف میں دیکھ رہی تھی۔

صرف وان فاتح دونوں پہلوؤں پہ ہاتھ رکھے بے تاثر سا کھڑا تھا۔ صرف اسے معلوم تھا کہ کیا ہونے جا رہا ہے۔ گردن میں پڑی زنجیر ہر گزرتے لمحے بھاری ہوتی جا رہی تھی۔

(''تم اس کو اپنی جیب میں نہیں ڈالو گے۔ اس کو ہاتھ یا گردن میں پہنے رکھنا۔'' راجہ مراد کی آواز ذہن میں گونج رہی تھی۔ ''اس کو اپنی جلد کے ساتھ لگائے رکھنا ورنہ یہ راکھ بن جائے گی۔ اگلے دن کا سورج طلوع ہوتے ہی یہ ٹوٹ جائے گی۔ اور تمہارے ذہن سے سب کچھ محو ہو جائے گا جو دو امر لمحوں کے درمیان میں ہوا تھا۔''

''اور میری یادداشت واپس کیسے آئے گی؟''
خالی بوتل دونوں کے درمیان میز پہ رکھی تھی۔ اس کو دیکھ کے فاتح نے پوچھا تھا۔

''نہیں آئے گی۔ کبھی نہیں آئے گی۔ واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے، غلام فاتح!'' وہ ایک دم غصے سے بولا تھا۔)

پولیس کے سائرن سنائی دینے لگے تو ایڈم دروازے پہ جانے لگا۔ فاتح نے اسے روک دیا۔ ان دونوں کو صحن میں چھوڑ کے اس نے راہداری عبور کی اور باہر کا سرخ دروازہ کھولا۔

باہر چھوٹی صاف ستھری سڑک تھی جس کے دونوں اطراف میں ایسے ہی تاریخی گھر اور ریستوران بنے تھے۔ دکانوں کے باہر چھپر تلے لوگ کرسیوں پہ بیٹھے تھے۔

سن باؤ کے گھر کے سامنے پولیس کی کار کھڑی تھی اور دو آفیسرز گھر کے دروازے پہ منتظر کھڑے تھے۔ فاتح نے دروازہ بند کیا اور باہر نکل آیا۔

''السلام علیکم فاتح صاحب!'' ایک افسر نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ ''آپ کے گارڈ کی کال آئی تھی کہ چور گھس آئے ہیں۔ خیریت ہے؟ ہم اندر آ جائیں۔'' ساتھ ہی ایک نظر اس کے کرتے پاجامے پہ ڈالی۔

''نہیں، گھر میں نہیں۔ باہر سڑک پہ لوٹا ہے انہوں نے۔'' وہ گہری سانس لے کر بتانے لگا۔ ''میں ابھی تھانے آ کے پورا واقعہ بتاتا ہوں۔ فی الحال گھر میں کچھ میڈیا والے موجود ہیں۔ ان کے جاتے ہی میں آتا ہوں۔''

''مگر سر......!''

''کیا تم مجھے نہیں جانتے آفیسر؟ تمہارا اپنی کمشنر میرا کلاس فیلو ہے۔ اس سے کہو کہ میرا انتظار کرے۔ میں خود آ کے رپورٹ لکھواؤں گا۔'' وہ

ٹوک انداز میں بولا۔ "مجھے لباس بدل کے منہ ہاتھ دھونے دو۔" ایک افسر بے چین ہوا تو دوسرے نے فوراً اشارہ کیا۔

"جی سر' ڈی سی پی صاحب نے ذکر کیا تھا۔ ٹھیک ہے ہم آپ کا انتظار کریں گے۔"

فاتح نے ہاتھ سے اشارہ کیا (اب جاؤ) اور واپس مڑ گیا۔

تالیہ اور ایڈم کو وہاں سے بھیجنے میں اسے چند منٹ لگے تھے۔ جیسے ہی وہ گھر سے نکلے' وہ تیزی سے برآمدے کی طرف لپکا۔ چار ماہ پہلے ایڈم کے ساتھ گھر میں داخل ہوتے ہی عادتاً اس نے کار کی چابی دروازے کے ساتھ بنی کھونٹی پہ لٹکائی تھی۔ وہ وہیں تھی۔ اس کا لوہا اب بھی ٹھنڈا تھا۔

وہ باہر سڑک پہ آیا تو تالیہ اور ایڈم جا چکے تھے۔ اس نے کار سے اپنا بیگ نکالا اور واپس برآمدے میں آ کر اسے کھولا۔ گردن میں جھولتی چابی ہر گزرتے پل بوجھل ہوتی جا رہی تھی۔

"پلان کیا ہے' ڈیڈ؟" کونے میں کھڑی آریانہ کی آواز نے اسے چونکایا۔ اس نے سر اٹھا کے دیکھا۔ وہ بازو سینے پہ لپیٹے تنقیدی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میرے پاس صبح تک کا وقت ہے' اور مجھے چند اہم کام کرنے ہیں۔" لیپ ٹاپ نکالتے ہوئے وہ برآمدے میں بچھی مسہری تک آیا اور وہاں بیٹھا۔ اسکرین روشن ہوئی۔ نیلی روشنی میں اس کا چہرہ دمکتا ہوا دکھائی دینے لگا۔

"کیا کر رہے ہیں' ڈیڈ؟" وہ ابھی تک فاصلے پہ کھڑی تھی۔ فاتح جلدی جلدی کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔

"ایڈم کو ای میل لکھ رہا ہوں۔ جو نہیں بتایا وہ بتا رہا ہوں۔"

"اور تالیہ؟ اس کو چھوڑ دیں گے آپ؟"

ٹائپ کرتی اس کی انگلیاں تھمیں۔ گلہ آمیز نگاہ اٹھا کے اسے دیکھا۔ "چھوڑنا اتنا آسان ہوتا ہے کیا؟"

"تو پھر اسے کہا کیوں تھا کہ چھوڑ دیں گے؟"

"چھوڑ تو دوں گا۔ یہی بتانے کے لئے میل لکھ رہا ہوں۔" وہ اب سرعت سے ٹائپ کر رہا تھا۔ "یہ الگ بات ہے کہ ایسا لگ رہا ہے جیسے....."

"جیسے؟"

"جیسے مراد راجہ نے چند گھنٹے دیے ہوں کہ وان فاتح..... یہ اتنا وقت ہے تمہارے پاس' اس کے بعد تم مر جاؤ گے۔ سو جو کرنا ہے اس دوران کر لو۔ اب تم بتاؤ آریانہ...... کیا مرنے سے پہلے کوئی کسی کو چھوڑنے کی خواہش کر سکتا ہے؟"

سن باؤ کے قدیم برآمدے میں خاموشی چھا گئی۔ کنویں کے اندر جیسی خاموشی۔ آریانہ دکھ سے اسے دیکھے گئی۔

"ڈیڈ..... اس کو چھوڑ دیں۔ جب سب بھولنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اس کو خود سے کیوں باندھ کے رکھتے ہیں؟"

وہ ٹائپ کرتے ہوئے رکا تو وہ جلدی سے بولی۔

"واپس آ کے میل مکمل کرتا ہوں۔ ابھی ہمت نہیں ہو رہی۔" اس نے آدھی میل چھوڑ کے اسکرین فولڈ کر دی۔ پھر وہ اٹھا اور اوپر کی طرف چلا گیا۔

چند منٹ بعد وہ سیڑھیاں اترتا دکھائی دیا تو زینوں کے اختتام پہ بیٹھی آریانہ نے گردن اس کی جانب موڑی۔

"ان چار ماہ کی ساری نشانیاں مٹا آئے ہیں آپ؟" وہ حیران ہوئی تھی۔

اس نے سیاہ شرٹ اور پینٹ پہن رکھی تھی۔ شیو بن چکی تھی۔ بالوں کو قدرے تراش کے پرانی حالت میں لے آیا تھا۔ قلموں سے بال سفید تھے' باقی دائیں طرف مانگ نکال کے گیلے کر کے جما رکھے تھے۔ گردن میں زنجیر اب بھی نظر آ رہی تھی۔ ہاتھ میں شاپر تھا جس میں ملاکہ والے کپڑے اور جوتے تھے۔ اپنے تمام زخموں پہ اس نے نئے زمانے کے بینڈ ایج ایڈ لگا دیے تھے۔

"نشانیاں مٹانے کے سوا چارا ہے کیا؟ کل جو فاتح نیند سے جاگے گا' اس کو کسی بھی چیز پہ شک نہیں ہونا چاہیے ورنہ وہ شدید ذہنی پریشانیوں میں گھر جائے گا۔ اس کے لیے ہر چیز نارمل ہونی چاہیے۔" وہ تیز زینے پھلانگ رہا تھا۔ آخری زینہ عبور کر کے آگے بڑھ گیا تو آریانہ نے پکارا۔ "اور جسم پہ لگے ان گنت زخموں کا کیا؟"

"ان ہی کا بندوبست کرنے جا رہا ہوں۔"

کار کی چابی اٹھائے وہ تیز قدموں سے گھر سے باہر نکل آیا۔ سڑک کنارے لگے کوڑے دان میں سیاہ شاپر میں مقید چیزیں پھینکیں اور ڈھکن بند کیا۔ گویا زندگی کا ایک باب بند کیا۔

چند لمحوں کے لیے اندر تک سب خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر بعد وہ پولیس اسٹیشن کے ایک کشادہ کمرے میں موجود تھا۔ آفس کرسی پہ ڈپٹی کمشنر براجمان تھا اور اس کے سامنے بیٹھا فاتح کندھے اچکا کے کہہ رہا تھا۔ سامنے ہی اسٹینڈ پہ کیمرہ نصب تھا جو اس کا بیان ریکارڈ کر رہا تھا۔

"میں ملاکہ تین دن کے لیے آیا تھا مگر تین گھنٹے بھی نہ رک سکا۔ میں ملاکہ سے واپس جا رہا تھا کہ میرا باڈی گارڈ میرے پاس آیا۔ یہ ریکارڈ ہو رہا ہے نا؟" اس نے اپنے دوست کو اشارہ کیا تو اس نے سر کو خم دیا۔

"گڈ۔ مجھے یہ ویڈیو ای میل کر دینا۔ میرا دماغ اس وقت سب چیزوں کو مکس اپ کر رہا ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ صبح جب میں یہ ویڈیو دیکھوں تو مجھے یاد رہے کہ ان تین گھنٹوں میں میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔" اس نے تین انگلیوں سے کنپٹی مسلی۔

"آپ کہہ رہے تھے.....؟"

"ہاں..... میرا باڈی گارڈ آیا تھا میرے پاس۔ وہ میرے ساتھ گاڑی میں ہی تھا جب تین آدمی آئے اور انہوں نے ہم پہ پستول تان لیے۔ پھر ہمیں باہر نکالا۔ وہ مجھ سے والٹ' پیسے اور فون مانگ رہے تھے۔ وہ تین چیزیں جو ہم سارے پورا رکھتے ہیں۔ مگر....." کندھے اچکا کے کیمرے میں دیکھتے ہوئے گہری سانس لی۔ "اتنی آسانی سے وان فاتح ہار کب مانتا ہے؟ میں بحث اور سوال و جواب کرنے لگا۔ ان کو میرے سوال برے لگے تو انہوں نے جارحیت کا مظاہرہ کیا۔"

"کیسے؟" آفیسر نے تشویش سے اسے دیکھا۔

"ہاتھا پائی ہوئی۔ اور وہ موبائل' بٹوہ سب چھین کے لے گئے۔ مجھے بے ہوش کرنے کے لیے کوئی سرنج بھی لگائی۔" اس نے اپنے بازو کی طرف اشارہ کیا جو قمیص کی آستین سے ڈھکا تھا۔ "اس کے بعد سے میرا دماغ غنودگی کی سی کیفیت میں ہے۔ میرا باڈی مین..(صبح کی) باڈی گارڈ مجھے گھر لایا۔ ہم وہاں تماشہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو خبر ہو کہ مجھے یوں لوٹا گیا ہے۔ اب بھی میں رپورٹ نہیں کروانا چاہتا۔ اس سب کو صیغہ راز میں رہنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے سر۔ جیسے آپ کی مرضی۔ میں اس بات کو کور کر دوں گا۔" پھر آفیسر نے غور سے اسے دیکھا۔ "میں ایک بات نہیں سمجھ سکا۔ وہ مسلح تھے اور انہوں نے آپ پہ تشدد بھی کیا لیکن..... انہوں نے آپ سے گاڑی نہیں چھینی؟"

وان فاتح کی گردن میں گلٹی سی ڈوب کے ابھرتی دکھائی دی مگر چہرہ پرسکون رہا.....

"میں نے ان سے یہ سوال نہیں پوچھا۔ ہر سوال کا جواب مل جائے' یہ ضروری نہیں ہوتا قمر الزمان!"

"خیر..... ہم اپنے طور سے تفتیش کریں گے' جو بھی سامنے آیا آپ کو مطلع کیا جائے گا۔"

وان فاتح اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک نظر کیمرے کو دیکھا۔ "مجھے یہ ویڈیو بھیج دینا۔ لازمی۔ تین منٹ سے زیادہ مت لینا۔ مجھے بار بار تم سے سوال کرنا اچھا نہیں لگے گا۔" زور دیا۔

"جی سر۔ اور آپ کا میڈیکل چیک اپ....."

''اس کی ضرورت نہیں' میں ٹھیک ہوں۔ بس یوں لگتا ہے کہ سارا واقعہ ذہن سے پھسل رہا ہو۔'' اس نے مصنوعی نقاہت سے کہتے ہوئے کنپٹی کو چھوا۔ افسر نے کیمرہ آف کیا تو فاتح نے ہاتھ نیچے کرلیے۔ وہ ایک دم بہتر نظر آنے لگا۔ بس عجلت میں مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور خدا حافظ کہہ کے باہر نکل گیا۔ کمشنر اس کو ابھی سوچتی نگاہوں سے جاتے دیکھنے لگا۔

وان فاتح کو اتنی جلدی کیوں تھی؟ جیسے وقت کم ہو اور اسے بہت کچھ کرنا ہو۔ جیسے اسے کسی جگہ پہنچنا ہو۔ اتنی رات میں؟

صبح ہونے میں ابھی گھنٹہ بھر باقی تھا' جب سن باؤ کے گھر کا دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہوا۔ آہستہ سے دروازہ بند کر کے وہ مڑا تو چہرے پہ شدید تھکن کے آثار تھے۔

رات کے اس پہر راہ داری سنسان پڑی تھی۔ وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتا آگے آیا۔ برآمدے کی مدھم بتی جل رہی تھی اور لکھائی کی میز پہ لیپ ٹاپ فولڈ شدہ دکھائی دے رہا تھا اور چارجنگ پہ تھا۔ وہ پژمردہ سا کرسی تک آیا اور اسکرین اوپر اٹھائی۔ آدھی لکھی ای میل سامنے جگمگا رہی تھی۔

کیا اب وہ ''چھوڑ دینے'' کی باتیں لکھ سکے گا؟ بالخصوص ان گزشتہ چند گھنٹوں کی 'دوڑ دھوپ' کے بعد علم میں آنے والی 'باتوں' کے بعد..... کیا اب بھی وہ اس کو چھوڑ سکے گا؟

وہ کرسی پہ گر سا گیا اور سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔ اس نے بھول جانے کا فیصلہ تب کیا تھا جب راجہ مراد نے اس کے سامنے کوئی راہ نہیں چھوڑی تھی۔ تب نہیں لگا تھا کہ تالیہ کو چھوڑنا اتنا کٹھن ہوگا۔ اور اب بھی وہ چھوڑ دیتا اگر یہ چند گھنٹے درمیان میں نہ آئے ہوتے۔

مگر اب نہیں۔

اس نے چہرہ اوپر اٹھایا اور لیپ ٹاپ قریب کھسکایا۔ آنکھیں سپاٹ ہو گئیں اور انگلیاں کی بورڈ پہ حرکت کرنے لگیں۔

''اس کو چھوڑ دیں' ڈیڈ۔ اس کو آزاد کر دیں۔ اپنا نہ سوچیں۔ اس کا سوچیں۔''

آریانہ اس کے کندھے کے پیچھے آکھڑی ہوئی اور التجا کرنے لگی۔ وہ کی بورڈ سے نظریں ہٹائے بغیر ٹائپ کرتے ہوئے بولا۔

''پہلے اسے بھول جانے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کیوں کہ تب مجھے اپنی یہ جدید دنیا واپس چاہیے تھی اور ان دونوں کو بھی۔ لیکن اب اسے ساتھ رکھنے کا فیصلہ اس لیے کیا ہے کہ مجھے اپنی ''امید'' بھی واپس چاہیے۔ ملکہ درست کہتی تھی' میں واقعی خود غرض ہوں۔'' آواز میں آنچ سی تھی۔

ای میل مکمل کر کے اس نے اسے شیڈول کیا۔ رات پونے بارہ شروع کی گئی' میل صبح چار بجے کے قریب مکمل ہوئی تھی۔ اختتام آغاز سے مختلف تھا۔ میل بھیج کے وہ رکا اور ایک دوسری میل کی۔

''یہ ایڈم کو بیس جولائی کی صبح ملے گی۔ اور تب ہی ملنی چاہیے۔'' ایسے دہرایا جیسے بالآخر اس نے اپنے مقصد کو جان لیا ہو۔ آریانہ خاموشی سے اسے کام کرتے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اپنی ذاتی ای میل کھولی تو سامنے پولیس ڈیپارٹمنٹ کی ای میل جگمگا رہی تھی۔ اس نے اس کو ان چھوا رہنے دیا اور اسکرین فولڈ کردی۔

پھر گلے کی زنجیر اٹھا کے آریانہ کو دکھائی۔ ''اب اس سے نجات حاصل کرنی ہے۔ اس کے ٹوٹتے ہی مجھے نیند آجائے گی اور صبح میرے ذہن کی سلیٹ خالی ہو چکی ہوگی۔ اور میں خود بھی بھول چکا ہوں گا کہ وہ چابی..... کہاں گئی!''

یہ کہہ کے وہ زینے کی طرف بڑھ گیا۔ گردن میں پڑی زنجیر کو ابھی تک ہاتھ میں مروڑ رکھا تھا۔ قدم من من بھر کے ہو رہے تھے اور وہ اوپر چڑھتا جا رہا تھا۔

ایک نئی زندگی کی طرف۔

☆☆☆

سترہ جولائی کی صبح ملاکہ کے باسیوں کو جگانے کے لیے روشنی نے ہر کھڑکی پہ دستک دی تو سن باؤ کے گھر کا وہ کمرہ بھی منور ہونے لگا۔ بیڈ پہ آڑے ترچھے لیٹے وان فاتح کی آنکھ تیز روشنی سے کھلی تو وہ جیسے چونکا۔ پھر اٹھنا چاہا تو جسم میں شدید ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ وہ واپس لیٹ گیا اور آنکھیں بار بار جھپکیں۔ ذہن بالکل خالی تھا۔ وہ کہاں تھا' کیوں تھا' کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

پھر دھیرے سے وہ اٹھا اور اطراف میں دیکھا۔

وہ اپنے ملاکہ والے گھر کے کمرے میں تھا۔ نیند اتنی گہری آئی تھی کہ یوں لگتا تھا عرصے بعد جاگا ہو۔

سوچوں کو مجتمع ہونے میں چند لمحے لگے تھے۔ وہ اٹھ کے بیٹھا اور تعجب سے کمرے کو دیکھا۔

آہستہ آہستہ یادداشت واپس آنے لگی۔

وہ تو رات کے ایل واپس جا رہا تھا۔ پھر رک کیوں گیا؟ یاد کیوں نہیں آرہا تھا؟

سکندر، جولیانہ اور عصرہ شام سے پہلے چلے گئے تھے۔ پھر وہ سمندر پہ گیا تھا۔ پھر وہ بیگ سمیت کے جا رہا تھا۔ پھر؟ وہ کیوں رک گیا؟

سیل فون کی تلاش میں ہاتھ مارا تو سائیڈ ٹیبل خالی تھا۔ وہ اچنبھے سے اٹھا۔ جسم بے حد درد کر رہا تھا۔ وہ آنکھیں مسلنے کو ہاتھ اوپر لایا تو چونکا۔ ہاتھ پہ پٹی بندھی تھی۔ فاتح کی آنکھوں میں بے یقینی امڈ آئی۔ ہاتھ الٹ پلٹ کر کے دیکھا۔ پھر بازو اٹھا کے اوپر نیچے گھمایا۔ وہاں بھی بینڈ لگی تھی۔

وہ قدم قدم چلتا دیوار پہ آویزاں آئینے تک آیا اور پھر بالکل منجمد ہو گیا۔

شیشے میں دکھائی دیتی اس کی شکل تو وہی تھی مگر..... کچھ مختلف تھا۔ اس نے بے یقینی سے خود کو دیکھا۔ پھر مزید قریب آیا۔ آنکھ اور کنپٹی کے قریب زخم تھا۔ گردن پہ خراشیں۔ اس نے قمیص گریبان سے نیچے کی' بٹن کھولے اور شرٹ اتاری۔ پھر گھوم کے دیکھا۔ کمر اور کندھوں پہ زخموں کے نشان تھے۔ سینے پہ بھی ضربیں لگی تھیں۔

اس نے پیشانی چھوئی اور آنکھیں موندیں۔

آخری چیز کیا ہوئی تھی؟

ہاں وہ ایڈم کے ساتھ کار میں بیٹھا تھا۔

ایک جھماکے سے اسے یاد آیا۔

اور ایڈم کچھ کہہ رہا تھا۔ اسے کچھ دے رہا تھا۔

سنہری چیز۔ پھر کیا ہوا تھا۔

مگر ذہن بالکل صاف تھا۔ تختہ سیاہ کی طرح صاف۔ بلیک ہول کی طرح خالی۔

پھر وہ تیزی سے باہر نکلا۔ زینے پھلانگے اور نیچے آیا۔ برآمدے میں آکے وہ ٹھٹکا۔ لیپ ٹاپ سامنے رکھا تھا۔ اس نے تو کل سامان سمیت کے کار میں رکھا تھا اور وہ کے ایل واپس جا رہا تھا پھر اب؟

وہ قریب آیا اور اسکرین روشن کی۔ سامنے آفیسر کی ای میل جگمگا رہی تھی۔ وہیں میز کنارے جھکے جھکے فاتح نے بھنچی بھنوؤں کے ساتھ ای میل کھولی۔

''آپ کی درخواست کے مطابق آپ کے بیان کی ویڈیو بھیج رہا ہوں۔''

ویڈیو چلائی تو جو منظر سامنے آیا اس نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔ تعجب اور بے یقینی سے وہ خود کو اسکرین پہ بولتے دیکھ رہا تھا۔ تھکا ماندہ' زخمی سا فاتح اسی لباس میں بیٹھا لوٹے جانے کا واقعہ بتا رہا تھا..... پھر اس نے کہا کہ لٹیروں نے اسے انجکشن لگایا تھا جس سے اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا..... ایسے جیسے وہ بار بار بھول رہا ہو۔

''تو یہ ہوا تھا رات کو؟'' وہ بے یقین تھا۔ ''مگر مجھے کچھ یاد نہیں۔ کیا میں بوڑھا ہو رہا ہوں؟ یا شاید..... کوئی غنودگی کی دوا انہوں نے مجھے دی تھی؟ یا اللہ!''

اس نے کراہ کے سر جھٹکا۔ یہ پستول دکھا کے لوٹ لینے والا واقعہ اسے کیوں نہیں یاد تھا؟ عجیب بات تھی..... ایسا کبھی پہلے نہیں ہوا تھا۔

اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا کہ موبائل نکال کر

آفیسر کو کال کرے مگر.... موبائل کہاں گیا....

اچھا ہاں' ویڈیو کے مطابق وہ چور لے گئے تھے۔ عجیب بات تھی۔ بہت عجیب بات تھی۔

پھر اس نے برآمدے کی دیوار پہ آویزاں گھڑی دیکھی۔ آج پارلیمان کا اجلاس تھا۔ اور وہ ناغہ کر چکا تھا۔ اُف۔ ساری باتیں ذہن سے نکلنے لگیں۔ شدید غصہ اور فرسٹریشن چھانے لگی۔ اسے جلد از جلد واپس پہنچنا تھا۔

دوپہر تک وہ واپس گھر پہنچا تو عصرہ اور بچے لاؤنج میں ہی بیٹھے تھے۔ وہ اندر داخل ہوا تو سکندر اسے دیکھتے ہی بھاگتا آیا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ کسی زخم پہ سکندر کا ہاتھ لگ گیا اور اسے شدید درد ہوا مگر وہ ضبط کر گیا اور جھک کے اسے پیار کیا۔

"ڈیڈ....! مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ آپ واپس نہیں آئیں گے۔ کھو جائیں گے۔" وہ اس سے لپٹے لپٹے کہہ رہا تھا۔ فاتح نے مسکرا کے اس کے بالوں کو ہاتھ سے سنوارا۔ "بڑے بھی کبھی کھو سکتے ہیں کیا؟"

"آریانہ بھی تو کھو گئی تھی۔ وہ تو ہم سے بڑی تھی۔"

فاتح کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ ایک دم جیب میں ہاتھ ڈالا۔ بٹوہ غائب تھا۔ وہ پاپ کارن۔ وہ کھو چکے تھے۔

اس کے اندر ابال سا اٹھا مگر وہ ضبط کر کے رہ گیا۔

وہ چور یقیناً بٹوہ بھی لے گئے تھے۔ اف۔ اف۔

سکندر الگ ہوا تو فاتح نے چہرہ اٹھایا۔ عصرہ تعجب سے اسے دیکھتی قریب آ رہی تھی۔ "آنکھ پہ کیا ہوا؟ اور ہاتھ پہ؟"

"رات باتھ روم کے لیے اٹھا تو ٹھوکر لگ گئی۔ بے فکر رہو' کچھ نہیں ہوا۔ چند چوٹوں کے ساتھ بھی میں الیکشن لڑ سکتا ہوں۔"

مسکرا کے بات کرتا وہ اندر کی طرف بڑھا۔ جھوٹ بولنا اس کی فطرت نہیں تھی لیکن لوٹے جانے کا بتانا باعث توہین تھا۔ عصرہ نے الجھ کے اسے جاتے دیکھا' پھر کندھے اچکا دیے۔ وہ ایک ہی دن میں اتنا کمزور لگ رہا تھا۔ رنگت کملائی ہوئی تھی۔ شاید زیادہ ساحل پہ بیٹھ گیا ہو اس لیے رنگ سنولا ہو گیا ہو۔

"یہ تمہاری گردن پہ کیسا نشان ہے۔" کمرے کے دروازے پہ اس کے قدم رک گئے۔ گردن کی پشت کو ہاتھ سے چھوا۔ کچھ ابھرا اکھڑا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔

"کہا نا' گر گیا تھا۔"

"یہ گرنے کا نشان تو نہیں لگتا۔" عصرہ قریب آنے لگی تو وہ بے زاری سے "مجھے آرام کرنے دو" کے اندر کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ عصرہ کے منہ پہ بند دیا تو اس کے ابرو تن گئے۔ ہونہہ کہہ کر سر جھٹکا اور مڑ گئی۔

اندر آتے ہی اس نے بتی جلائی۔ پھر سنگھار میز تک آیا۔ دراز سے پاکٹ مرر نکالا اور آئینے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ننھا آئینہ گردن کی پشت پہ لے کے اور بڑے آئینے میں عکس دیکھا۔

وہاں گول سا جلنے کا نشان تھا جو بھورا پڑ چکا تھا۔

یہ چوٹ اسے کب لگی؟ اتنا صاف گول نشان؟

اس نے آئینہ پرے پھینکا اور نڈھال سا بیڈ پہ بیٹھ گیا۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟

شام کو وہ کے ایل میں واقع ایک پرائیویٹ کلینک میں بیٹھا تھا۔ ماتھے پہ بل تھے اور چہرے سے ناخوش لگتا تھا۔ سخت بے زار۔

سامنے بیٹھا ادھیڑ عمر ڈاکٹر دونوں ہاتھ اٹھائے اس کو سمجھا رہا تھا۔

"میں نے آپ کے سارے زخم دیکھے ہیں' اور میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے واضح بتائیں کہ یہ آپ کو کب آئے؟"

"میں بتا رہا ہوں اتنی دیر سے کہ کل رات تین لوگوں نے چوری کی کوشش کی تو میں نے مزاحمت کی۔ اس پہ انہوں نے مجھے مارا۔" اس نے پولیس کو دیا بیان دہرا دیا۔

"حیرت انگیز۔" ڈاکٹر نے گہری سانس لی۔ "ڈریسنگ ہو گئی ہے' دوا بھی دے دی ہے میں نے آپ کو۔ مرہم کا بھی سمجھا دیا ہے' مگر...." اس نے توقف کیا۔ "یہ زخم کل کے نہیں ہیں۔"

"تو پھر کب کے ہیں؟"

"کم از کم بھی چار سے پانچ دن پرانے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کسی نے آپ کو لوہے کی زنجیروں سے مارا ہو۔ آپ کے ہاتھ باندھے گئے ہوں۔ کمر پہ چمڑے کے کوڑے یا ہنٹر سے مارے جانے کے نشان ہیں لیکن...." ڈاکٹر نے پھر توقف کیا۔ "مجھے آپ کی کمر پہ پرانے نشان بھی ملے ہیں۔ کم از کم تین سے چھ ماہ پرانے نشان۔ وہ بھی مار پیٹ کے ہیں اور یہ گردن کا زخم' اس کو بھی کافی عرصہ بیت چکا ہے۔ یہ تو صاف گرم چیز سے داغے جانے کا نشان ہے۔"

وہ جواب میں ذرا جھنجھلایا۔ "میں نہیں جانتا کہ آپ کو ایسا کیوں لگ رہا ہے مگر یہ کل کے ہی ہیں۔"

"مگر اتنی جلدی کھرنڈ کیسے بن سکتے ہیں' فاتح صاحب؟" پھر فاتح کا ناخوش چہرہ دیکھ کے بات بدل دی۔ "خیر آپ فکر نہ کریں' دوا لیتے رہیں' مرہم لگاتے رہیں' یہ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

اسے لگا شاید فاتح چھپا رہا ہے سو مزید زور نہیں دیا۔ وان فاتح ڈاکٹر کے پاس سے آنے کے بعد پہلے سے زیادہ الجھ گیا تھا۔

کلینک سے نکل کے وہ پارکنگ تک آیا تو رک گیا۔ ایک نظر سامنے سڑک پہ دوڑتی گاڑیوں کو دیکھا۔ پھر رک کے کچھ محسوس کرنا چاہا۔

کیا تھا جو طبیعت پہ ناگوار گزرتا تھا؟ یہ زن سے بھاگتی دوڑتی گاڑیاں؟ یہ شور؟ یہ اس لباس میں ملبوس آگے پیچھے جاتے مصروف سے لوگ؟ سب ویسا ہی تھا جیسے ہمیشہ ہوا کرتا تھا۔ پھر سب اتنا اجنبی اجنبی کیوں لگ رہا تھا؟

سوال بہت سے تھے' مگر جواب کوئی نہیں تھا۔

عصرہ کی نیلامی کے پہلے روز تک وہ کافی حد تک نارمل ہو چکا تھا۔ بڑھتی عمر' دماغ پہ چوٹ' یا ڈرگ انجیکٹ کرنے کے باعث یقیناً وہ اس رات کے واقعات بھول چکا تھا۔ ایسا ہوتا ہے۔ ٹراما کے باعث انجری سے ذرا دیر پہلے کے واقعات بھول جایا کرتے ہیں۔ اس نے سوچوں کو اس واقعے سے ہٹا کر کام کی طرف مبذول کر دیا۔ البتہ رات میں آریانہ اکثر آ جاتی اور بیڈ کے کنارے کھڑے ہوئے کھوئے کھوئے سے انداز میں پوچھا کرتی۔

"ڈیڈ.... ذہن اتنا خالی خالی سا کیوں ہے؟ جیسے کچھ ہوا ہو۔ جیسے بہت کچھ ہوا ہو مگر یاد نہ آ رہا ہو۔"

"ایک رات میں کتنا کچھ ہو سکتا ہے آخر؟" وہ سر جھٹک کے کہتا اور کروٹ لے لیتا۔ نرم بستر نامانوس کیوں لگتا تھا؟ اسے سخت بچھونے کی عادت بھی نہیں تھی نہ زمین پہ سونے کی۔ پھر اب....؟ لیکن وہ بار بار سر جھٹک دیتا۔

نیلامی کے پہلے روز پارٹی ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ اسے وہ نظر آ گئی۔ سرخ ساڑھی میں ملبوس سنہرے بالوں والی سوشلائیٹ جس کو اس روز عصرہ نے ملاکہ والے گھر بلوا کے اس کی چھٹی بدمزہ کر دی تھی۔ فاتح جانتا تھا کہ وہ اس کے گھر کے پیچھے ہے اس لیے اسے دوٹوک انداز میں منع کر کے وہ دوسرے مہمانوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔ البتہ اسے یوں لگا جیسے وہ شل ہو گئی ہو۔ طبیعت کے برخلاف کوئی تیکھا جواب بھی نہیں دیا۔ خیر.... وہ آگے بڑھا تو ایڈم نظر آیا۔ ایک جھماکے سے اسے یاد آیا۔ ایڈم اس رات کچھ کہنے آیا تھا۔

فاتح نے رک کے اس سے سوال کیا مگر وہ ہمیشہ کی طرح کم اعتماد نظر آنے لگا۔ جیسے الجھ گیا ہو۔ شاید اسے اس رات کے واقعات کا پیچھا چھوڑ دینا چاہیے۔ ایک باڈی مین کے سامنے یہ بات نہیں کھلنی چاہیے کہ وہ ذہنی طور پہ اتنا کمزور بھی ہو سکتا ہے کہ لوٹے جانے کے اس واقعے کو بھول جائے۔ اونہوں۔ اسے اپنے استفسار پہ پچھتاوا ہوا سو بات ختم کر کے آگے بڑھ گیا۔

پارٹی کی رونق اپنے عروج پہ تھی۔ دو روزہ نیلامی میں آج آدھے آئٹمز رکھے گئے تھے۔ باقی آدھی اور زیادہ قیمتی چیزیں عصرہ نے کل کے لیے بچا رکھی تھیں۔ وہ کال سننے مہمانوں سے ذرا الگ ہوا تو سیکرٹری عثمان قریب آیا اور سرگوشی کی۔

''سر وہ پیسے میں اب ادا کر دوں ایڈم کو؟''
وان فاتح نے چونک کے اسے دیکھا۔ ''کون سے پیسے؟''

''سر! جو آپ نے میرے اکاؤنٹ میں آن لائن بھجوائے تھے۔ اس رات جب آپ ملاکہ میں تھے اور آپ نے مجھے کال کر کے کہا تھا کہ سیل فون کھو گیا ہے تو میں آپ کے لیے نیا فون اور نئی سم لے لوں۔'' وہ وضاحت دیتے دیتے خود بھی حیران نظر آنے لگا۔

''ہاں ہاں.... رائٹ۔'' وہ سنبھل کے مسکرایا۔
''تو تم وہ پیسے ایڈم کو کیا کہہ کے دو گے؟ کیوں دے رہے ہو اسے یہ؟''

''سر وہی جو آپ نے کہا تھا کہ اس کو معلوم ہے یہ کس چیز کے ہیں۔ آپ نے اصل میں صبح سے پہلے ٹرانسفر کا کہا تھا مگر مجھے اس کا اکاؤنٹ نمبر نہیں معلوم تھا اس لیے دیر ہو گئی۔''

''ہاں' ابھی دے دو پھر۔'' وہ سرسری انداز میں کہہ کے گلاس سے گھونٹ بھرتا مڑ گیا البتہ ذہن میں بہت سے سوالیہ نشان پھر سے ابھرنے لگے تھے۔

سوموار کو اس کی واپسی پہ عثمان نیا فون اور سم کارڈ لے کر جب آیا تو اس نے یہ بتایا تھا کہ یہ حکم آدھی رات کو اسے فون کر کے فاتح نے ہی دیا تھا' مگر عصرہ سامنے تھی تو عثمان نے اس بات کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

وہیں کھڑے کھڑے فاتح نے فون نکالا اور اپنا بینک اکاؤنٹ پورٹل کھولا۔ پھر آخری ٹرانزیکشن چیک کی۔ بیس ہزار رنگٹ۔ اس کی آنکھیں تعجب سے کھل گئیں۔ اس نے بیس ہزار کیوں بھیجے ایڈم کو؟ ٹرانزیکشن کرتے وقت یادداشت کے لیے جو نوٹ لکھا جاتا ہے' فاتح نے وہ نوٹ کھولا۔ وہاں ایک سطر لکھی تھی۔

فار چاکلیٹس

کیا یہ ٹرانزیکشن میں نے ہی کی ہے؟ مگر کسی اور کو میرا پاس ورڈ نہیں معلوم۔ اور عثمان کو جب میں نے خود فون کر کے کہا ہے تو.... اوہ خدایا۔ اس نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔ وہ سخت کبیدہ خاطر ہو رہا تھا۔

گلاس ایک قریبی میز پہ رکھا اور لوگوں کے درمیان سے گھاس پہ راستہ بناتا آگے بڑھنے لگا۔ اسے شدید گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟

اندر لاؤنج میں بھی چند لوگ آ جا رہے تھے جو کسی ضرورت سے اندر آئے تھے یا ملازم تھے۔ وہ سب کو نظر انداز کرتا لاؤنج کے پرلے کونے پہ بنے پاؤڈر روم کی طرف بڑھا۔ (یہ ایسا کمرہ تھا جس میں بڑا سا آئینہ دیوار پہ لگا کے سامنے سنک بنے تھے۔ یہ صرف مہمانوں کے ہاتھ دھونے کے لیے تھا۔ باتھ روم کے طور پہ استعمال کرنے کے لیے نہیں۔)

دروازے کا ناب گھمایا اور اسے دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اندر تیز زرد بتیاں جلی تھیں۔ دیوار گیر آئینے کے سامنے ماربل کا بڑا سا سلیب تھا جس میں فاصلے پہ دو سنک بنے تھے۔

ایک سلیب پہ ہتھیلیاں جمائے وہ جھکی کھڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ سرخ ساڑھی اور سنہری بالوں والی تالیہ۔

''سوری۔ میں باہر جا رہا ہوں۔'' وہ واپس ہونے لگا تو تالیہ نے چونک کے چہرہ اٹھایا۔ آئینے میں اپنے عکس کے عقب میں چوکھٹ پہ دروازہ پکڑے فاتح کو دیکھا اور فاتح نے بھی آئینے میں اس کا چہرہ دیکھا تو ٹھٹکا۔

اس کے گال آنسوؤں سے بھیگے تھے اور رنگت زرد ہو رہی تھی۔ جیسے جسم میں خون کا قطرہ بھی نہ رہا ہو۔ وہ نڈھال سی لگ رہی تھی۔ شاید کافی دیر سے رو رہی تھی۔ کاجل بہہ گیا تھا۔ اسے عکس میں دیکھ کے بالکل ٹھہر گئی۔ فاتح نے ابرو تعجب سے اکٹھے کیے۔

''تم ٹھیک ہو' تاشہ؟'' رسمی سا پوچھا۔

تالیہ نے ٹشو رول سے لمبا سا ٹشو کھینچا' اور اس کے قریب آئی۔ فاتح نے دروازہ چھوڑ کے راستہ دیا۔ تالیہ نے بے دردی سے آنکھیں رگڑیں اور ایک دکھ بھری نظر اس پہ ڈالی۔

''میرا نام.... تالیہ ہے۔ تالیہ بنتِ مراد۔''

تکلیف سے چبا چبا کے بولی۔

''ہاں' واٹ ایور' تاشہ! تم آرام سے منہ دھو لو۔ میں اپنے باتھ روم کی طرف جا رہا ہوں۔'' وہ پیچھے ہٹنے لگا تو وہ گلوگیر آواز میں چیخ کے بولی۔

''آپ یہیں رہیں۔ آپ اپنی صحیح جگہ پہ کھڑے ہیں۔ میں ہی غلط جگہ پہ کھڑی تھی۔ مجھے جانا چاہیے۔ آپ کو آپ کا گھر اور یہ زندگی مبارک ہو۔''

دکھ اور تنفر بھری نظروں سے اسے دیکھتی وہ پیر پٹختی آگے بڑھ گئی تو فاتح نے اچنبھے سے اسے جاتے دیکھا۔

''ہاورڈ!'' پھر سر جھٹک کے آگے چل دیا۔

ایڈم لان کے سرے پہ کھڑا عثمان سے بات کر رہا تھا جب وہ اندر سے آتی دکھائی دی۔ عثمان نے اسے ایک پھولا ہوا لفافہ تھمایا اور بے زاری سے چند جملے کہہ کے پلٹ گیا۔ تالیہ قریب آئی تو نڈھال لگتی تھی۔

''عجیب بات ہے۔ وان فاتح نے یہ پیسے مجھے کیوں بھجوائے ہیں؟'' وہ حیران سا اس سے پوچھنے لگا۔ ''میں نے پوچھا یہ کب بھیجے ہیں انہوں نے تو وہ بولا کہ اتوار کی رات کو کہا تھا' یعنی جب ہم واپس آئے تھے یعنی ان کی یادداشت جانے سے پہلے انہوں نے....''

''ایڈم.... پلیز.... مجھے گھر چھوڑ آؤ۔'' وہ اس کو نہیں سن رہی تھی۔ ایڈم نے بے اختیار اسے دیکھا۔ اس کا میک اپ منہ دھونے کے باعث ہلکا ہو گیا تھا۔ کاجل کچھ بہہ گیا تھا۔ اور آنکھوں کے کٹورے بار بار پانی سے بھر رہے تھے۔

''چے تالیہ.... خود کو سنبھالیں۔'' اس کے دل کو کچھ ہوا۔

''مجھے اس وقت کسی چیز کا ہوش نہیں ہے۔ بس تم کار اسٹارٹ کرو۔'' اس نے چابی اس کی طرف بڑھائی۔ ''میں عصرہ کو الوداع کہہ دوں۔''

ایڈم کو وہیں چھوڑ کر وہ عصرہ کی طرف جانے لگی۔ وہ لان کے دوسرے دہانے پہ کھڑی مہمانوں سے خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ چند گز کا فاصلہ بھی اس کے لیے دو بھر ہو گیا۔ قدم بھاری بھاری سے ہونے لگے۔ وہ بدقت چلتی قریب آئی۔ جسم اتنا نڈھال تھا کہ لگتا تھا ابھی گر پڑے گی۔

''عصرہ......'' اس کے پکارنے پہ مسکراتی ہوئی عصرہ مڑی تو اس کی شکل دیکھ کے مسکراہٹ غائب ہوئی۔

''تالیہ تم ٹھیک ہو؟'' اسے تشویش ہوئی۔

''نہیں۔ میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ مجھے جانا ہو گا۔ بہت معذرت۔'' وہ بدقت اپنے وجود کو مجتمع کیے بول رہی تھی۔

''اوہ.... ابھی تو تمہارے بنائے میرے پورٹریٹ کی نیلامی بھی ہونا تھی۔''

''میں نہیں رک سکتی۔ پلیز۔''

''اٹس او کے۔ کل آ جانا۔ ویسے بھی گھائل غزال تو کل ہی لگے گی۔''

مگر اس کی بلا سے اب گھائل غزال اور عصرہ کے ساتھ جو بھی ہو۔ اسے اب کسی چیز کی پرواہ نہ تھی۔ بس ایک دل تھا جو رک رک کے دھڑک رہا تھا۔ سارے مسئلے اس دل کے ہی تو تھے۔

راستے میں ایڈم خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا اور وہ چپ چاپ بیٹھی کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ آنسو بنا آواز کے بہہ رہے تھے۔ ایڈم بار بار ونڈ اسکرین سے نظر ہٹا کے اسے دیکھتا' مگر کچھ کہہ نہ پاتا۔ پھر اس نے کوشش کی۔

''مجھے نہیں معلوم ان کا زیادہ بڑا جرم کیا ہے۔'' اسٹیئرنگ وہیل گھماتے ہوئے وہ کہنے لگا۔ ''وہ پانی پی لینا' ہمیں بے خبر رکھنا یا آپ کو آزاد نہ کرنا۔ پتا نہیں وہ یہ سب کیوں کر رہے ہیں لیکن اگر وہ ہمیں اس طرح اپنی زندگی سے نکالنا چاہتے ہیں تو نکالنے دیجیے۔ دکھ مجھے بھی ہے اور دماغ شل ہے لیکن میں نے کبھی ان سے لمبی امیدیں نہیں باندھی تھیں۔ اس لیے اب ہمیں بھی اپنی عام زندگیوں میں واپس چلے جانا چاہیے۔''

''ایڈم گاڑی روکو۔'' وہ ایک دم بلند آواز سے رونے لگی تو ایڈم نے جلدی سے کار آہستہ کی پھر اسے

سڑک کنارے کھڑا کیا۔ وہ مصروف شاہراہ تھی اور کنارے پہ فٹ پاتھ بنے تھے جن کے ساتھ کھجور کے درخت قطار میں لگے تھے۔ وہ درخت کے سائے تلے رک گئے جہاں شاخوں کے جھروکوں سے ڈوبتا سورج دکھائی دے رہا تھا۔

''وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟'' وہ بچوں کی طرح رونے لگی۔ ''وہ مجھے یوں اکیلا کیسے کر سکتے ہیں؟ وہ مجھے پہچان کیوں نہیں رہے؟ وہ مجھ سے پہلے کی طرح بات کیوں نہیں کر رہے۔''

''چے تالیہ.....ان کو کچھ یاد نہیں ہے۔''

''مگر میں نے ان کو خود بتایا تھا۔ جنگل میں ساری کہانی سنائی تھی ان کو۔ اور تم نے ان کو خزانے کا بتایا تھا' جب تم ان کو میرے پاس سن باؤ کے گھر لائے تھے۔ مجھے پکڑنے کے لیے۔ پھر ان کو کیوں نہیں یاد؟'' وہ روتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''وہ سب چابی جوڑنے کے بعد ہوا تھا۔ جب میں کار میں ان کے ساتھ بیٹھا تو بات شروع کرنے سے قبل میں نے ان کو چابی دے دی تھی جس کو انہوں نے فوراً جوڑ دیا تھا۔ آپ کا خزانے کی تلاش میں آنا' اور ہمارا دروازہ پار کرنا' یہ سب بعد میں ہوا تھا۔''

''میں نے ان کو سب بتایا تھا جنگل میں۔'' وہ نفی میں سر ہلاتی آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔ ''اپنے بارے میں' حالم کے بارے میں' اشعر کی گھائل غزال سے متعلق سازش' عصرہ کا فائل چرانا' سب بتایا تھا۔''

''مگر ان کو یہ سب نہیں یاد۔ ان کی یادداشت میں آپ صرف ایک بگڑی امیر زادی ہیں جس نے ان کی فائل چرائی تھی۔''

''اور ان کے احساسات کا کیا؟ کیا یادداشت جانے سے وہ بھی ختم ہو گئے؟'' وہ بے یقینی بھری گیلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''مجھے نہیں پتا' چے تالیہ۔ مگر احساسات تو یادوں سے مشروط ہوتے ہیں۔ آپ کو بھی تو مراد راجہ سے بھی وہ انسیت محسوس نہیں ہوئی جو وقت کا سفر کرنے سے قبل چھوٹی تالیہ کو تھی۔''

''نہیں۔'' اس نے سر سیٹ کی پشت سے لگا دیا اور نفی میں گردن ہلائی۔ ''یہ سب ان کا کوئی پلان ہے۔ وہ صرف اداکاری کر رہے ہیں۔ ان کو سب یاد ہے۔''

''وہ جھوٹ نہیں بولتے۔''

''نہیں۔ میں نہیں مانتی۔ زندگی مجھے اتنی بڑی سزا نہیں دے سکتی۔ قسمت میرے ساتھ اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتی۔''

''آپ denial میں ہیں۔'' اس نے افسوس سے تالیہ کو دیکھا۔ وہ روتے ہوئے نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

''میں نہیں مانتی۔ میں اتنی بری تو نہیں تھی کہ میرے ساتھ یہ سب ہوتا۔ میں ان کی بیوی ہوں۔ سنا تم نے۔ میں ان کی بیوی ہوں۔ وہ مجھے یوں پہچاننے سے انکاری نہیں ہو سکتے۔''

''چے تالیہ.....''

''وہ صرف اداکاری کر رہے ہیں۔ وہ عصرہ سے ڈرتے ہیں۔ میں ان کو دیکھ لوں گی۔ میں سب کو دیکھ لوں گی۔ میں ان سے بات کروں گی۔'' پھر اس نے ہتھیلی سے آنکھیں رگڑیں۔ ''ابھی لوگ تھے نا سامنے۔ کل میں ان سے اکیلے میں بات کروں گی۔ دیکھنا' وہ تب وضاحت کریں گے کہ ان کا رویہ ایسا کیوں تھا۔''

''شاک ملنے کے بعد پہلا فیز denial (نہ ماننے) کا ہوتا ہے۔'' وہ گہری سانس لے کر کار اسٹارٹ کرنے لگا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



عمر بھر کا مان ٹوٹا اور کیا
موڑ آیا، ساتھ چھوٹا اور کیا

کون سچ کہتا ہے، سچ سنتا ہے کون
میں بھی جھوٹا، تو بھی جھوٹا اور کیا

جان سے جانا ضروری تو نہیں
عاشقی میں سر تو پھوٹا اور کیا

رہ گیا تھا یاد کا رشتہ فقط
آخرش یہ پل بھی ٹوٹا اور کیا

غیر تو تھے غیر، اپنے آپ کو
سب سے بڑھ کر ہم نے لوٹا اور کیا

احمد فراز

رئیس صاحب یہ اپنے غم کا عجب فسانہ سنایا تم نے
کہ خود بھی روئے کسی کی خاطر، ہمیں بھی شب بھر رلایا تم نے

نہ دل نوازی، نہ ہم نوائی، نہ کوئی اندیشۂ جدائی
جو اس کی فطرت تھی بے وفائی، تو اس سے دل کیوں لگایا تم نے

تمہیں وفا کی اگر طلب تھی تو بے وفائی نہ بے سبب تھی
جسے بھی چاہا ہدف بنایا، نہ دیکھا اپنا پرایا تم نے

یہ بہکے بہکے قدم تمہارے، یہ ہر نظر درد کے اشارے
وہ راز سب پر عیاں ہے پیارے جو راز سب سے چھپایا تم نے

ہے جن کی بخشش غم مسلسل، وفا کی ان سے امید ہر پل
رئیس تم بھی ہو کتنے پاگل، دیا ہوا میں جلایا تم نے

رئیس وارثی

کئی برس ہوئے
منظر تبدیل نہیں ہوتا
اب چاند کسی چھت پر اُترے یا دُور کہیں
سے للچائے
خوشیوں کی دلیل نہیں ہوتا
تم کہتے ہو تمہیں آن ملیں
اس موسم میں اب تم ہی کہو
کیا وعدے اور وعید کریں
ہم دید کریں یا عید کریں
جس کاغذ پر ہمیں لکھنا تھا، اب وہ کاغذ
اخبار ہوا
اب دلوں کی حالت نازک ہے، ہر شخص
یہاں بیمار ہوا
ہاں ابھی نہیں
ابھی رات بھر کی اس بستی میں ہمیں اور چراغ
جلانے ہیں
کوئی کتنا بے تعبیر کرے ہمیں تازہ خواب
جگانے ہیں
ابھی اور بھی نظمیں لکھنی ہیں، ابھی اور بھی
شہر بسانے ہیں
تم دُعا کرو
ملنے کی آس نہیں ٹوٹے
مرے ہونٹوں سے
کتنے ہی دریا آن ملیں
مری پلکوں پہ
کتنے ہی سمندر لہرائیں
اندر کی پیاس نہیں ٹوٹے

سلیم کوثر

کتنے خواب جگا دیتے ہیں بچّے، پھول، پرندے
گھر گلزار بنا دیتے ہیں بچّے، پھول، پرندے

وقت کی تپتی دُھوپ بے کل آنکھوں کے صحرا میں
رنگ کئی لہرا دیتے ہیں بچّے، پھول اور پرندے

اپنی ذات کی تنہائی کے افسردہ سناٹوں میں
کیا کیا سُر بکھرا دیتے ہیں بچّے، پھول، پرندے

ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بن کر آنکھوں کے موسم میں
ساون رُت کا پتا دیتے ہیں بچّے، پھول، پرندے

اپنی مہک چہک سے اکثر پہلی کرن کے ساتھ
نیند سے مجھ کو اُٹھا دیتے ہیں بچّے، پھول، پرندے

شبی غموں کے بوجھ سے تھک کے ہمت ہارنے والوں کی
ٹوٹی آس بندھا دیتے ہیں بچّے، پھول، پرندے

شبی فاروقی



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا،

حضرت شداد بن اوس (بن ثابت) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ عزوجل نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کیا ہے، لہٰذا جب تم قتل کرو تو اچھے انداز سے قتل کرو اور جب تم ذبح کرو تو اچھے انداز سے ذبح کرو۔ آدمی کو چاہیے کہ اپنی چھری تیز کرے اور ذبح ہونے والے جانور کو آرام پہنچائے۔"

فوائد و مسائل :۔

1۔ اللہ تعالیٰ نے موذی جانوروں اور بعض جرائم کا ارتکاب کرنے والے انسان کو قتل کرنے کی اجازت دی ہے۔ اس میں بہت سی حکمتیں ہیں۔

2۔ قتل اور ذبح میں بھی رحم کو پیش نظر رکھا جاسکتا ہے۔ اور رکھا جانا چاہیے۔

3۔ اچھے طریقے سے قتل یہ ہے کہ ایک ضرب سے قتل کیا جائے۔ یا اگر ایک ضرب سے ممکن نہ ہو تو ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے جلد روح پرواز کر جائے۔

4۔ موذی جانور کو قتل کرنے کے لیے پانی میں ڈبونے یا آگ میں ڈالنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

5۔ اچھے طریقے سے ذبح کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ذبح کرنے سے پہلے زخمی نہ کیا جائے۔ اور کند چھری سے ذبح نہ کیا جائے۔ نیز پوری طرح روح پرواز کرنے سے پہلے کھال اتارنا شروع نہ کی جائے۔

6۔ جانور کو آرام پہنچانے کا مطلب کم سے کم تکلیف پہنچانا ہے۔

مثبت سوچ،

بائبل میں حضرت داؤد علیہ السلام اور گولائتھ کی لڑائی کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

گولائتھ ایک دیو نما شخص تھا۔ ہر کوئی اس سے خوف کھاتا تھا۔ ایک دن ایک پندرہ سالہ چرواہا بچہ اپنے بھائیوں سے ملنے کے لیے آیا۔ اس بچے نے اپنے بھائیوں سے کہا۔

"تم اس دیو سے لڑنے کے لیے کیوں نہیں اُٹھتے؟" بھائی گولائتھ سے خوف زدہ تھے۔ انہوں نے کہا۔ "تمہیں دکھائی نہیں دیتا، وہ اتنا لحیم و شحیم ہے کہ اسے مارا نہیں جاسکتا۔"

حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا۔ "نہیں وہ اتنا بڑا نہیں ہے کہ اس کو مارا نہ جاسکے۔ اس کے لحیم شحیم ہونے کا فائدہ تو یہ ہے کہ ہمارا کوئی وار خالی نہیں جا سکتا۔"

پھر حضرت داؤد علیہ السلام نے اس کو غلیل سے مار ڈالا تھا۔ دیو ایک ہی تھا۔ فرق صرف سوچ کا تھا۔ مثبت سوچ ہمیں کامیاب کر سکتی ہے جبکہ منفی سوچ ہماری کامیابی کے راستے میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔

عمل،

- خواب تو بہت دیکھے جاتے ہیں۔ اصل قدر و قیمت اس بات کی ہے تم انہیں کس طرح حقیقت میں ڈھالتے ہو۔ (روز ویلٹ)
- کامیابی کا سنہرا اصول۔ کام ابھی کرنا ہے۔ تم جو کام آج کر سکتے ہو اسے کل پر مت ٹالو۔ (بنجامن فرینکلن)

کنجی

بل گو بی کا کہنا ہے۔
"مجھے علم نہیں کہ کامیابی کی کنجی کیا ہے لیکن مجھے یہ پتا ہے کہ ناکامی کی کنجی ہے "ہر کسی کو خوش رکھنے کی کوشش کرنا۔"

موتی مالا

- ہر انسان سب سے اونچے اور بلند مقام تک پہنچنا چاہتا ہے اور جب یہ ممکن نہیں ہوتا تو اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے بھی اونچے مقام تک نہ پہنچیں۔
- میں نے دو طرح کے لوگوں سے دھوکا کھایا۔ ایک وہ جو میرے اپنے نہیں تھے اور ایک وہ جو میرے اپنے تھے۔

- اعتبار عمل میں ہوتا ہے لفظوں میں نہیں۔
- رشتے جب اذیت کے سوا کچھ نہ دیں تو ان سے کنارہ کشی ہی بہتر ہے۔ خواہ وقتی ہی سہی۔
- منزل کے تعین کے بغیر سفر شروع کر دیا جائے تو ہر اٹھتا قدم تھکن بڑھانے اور حوصلہ پست کرنے لگتا ہے
- خواہشیں سرد زندگی میں حرارت کا کام کرتی ہیں۔
- خواہشوں کا وجود اگر بالکل مٹ جائے تو زندگی بے رنگ، بے جان اور پھیکی ہو جاتی ہے۔ ایسے میں پھر کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

انجل - ڈہرکی

احتیاط

ایک سرکاری ملازم کو ایک اہم مقدمے میں گواہی کے لیے طلب کیا جا رہا تھا مگر وہ کوئی نہ کوئی حربہ استعمال کر کے عدالت میں حاضر ہونے سے جان چھڑا لیتا تھا۔
کئی بار سمن جاری ہونے کے بعد آخر وہ ایک روز حاضر ہوا اور اس روز بھی جج صاحب سے درخواست کرنے لگا کہ اسے جلدی فارغ کر دیا جائے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے یہ بھی جتانے کی کوشش کی۔
"سر! آپ کو تو معلوم ہی ہے سرکاری دفتروں میں ہم جیسے لوگوں پر کتنی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ ہماری کتنی زیادہ مصروفیات ہوتی ہیں۔"
"اوہ... تم یہ بتانا چاہتے ہو کہ تم جیسے لوگوں کے بغیر سرکاری دفتروں کا نظام نہیں چل سکتا۔" جج صاحب نے طنزیہ انداز میں کہا۔
"سر... چل تو سکتا ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ بات افسروں کو نہ معلوم ہو جائے۔" ملازم نے جواب دیا۔

ثمرہ عاقب - گرین سٹی

بہتر جواب

جب کوئی آپ کا دل دکھائے تو خاموش رہنا چاہیے کیونکہ جسے ہم جواب نہیں دیتے، اسے وقت جواب دیتا ہے اور جسے وقت جواب دیتا ہے، وہ سب سے بہتر جواب ہوتا ہے۔

کبریٰ خان بلوچ - سٹی سرور

مدعی

یہ کیسی منصفی تھی کہ منصف کے روبرو
جھوٹی شہادتوں کو بھی سچا لکھا گیا
ہم چپ رہے کہ فیصلہ سارا ضابطے شدہ
یعنی جو مدعی نے لکھایا، لکھا گیا

سنہری حرف

جس برتن میں جو چیز ہوتی ہے وہی اس سے چھلکتی ہے لہٰذا جو کچھ تیرے قلب میں ہو گا وہی تیرے اعضاء پر چھلکے گا۔
(شیخ عبدالقادر جیلانیؒ)

ثمرہ جاوید - بسم اللہ پور

بچے ہمارے عہد کے

بچے نے ماں سے پوچھا۔
"ممی! میرا چھوٹا بھائی کس طرح پیدا ہوا؟"
بے چاری ماں اس سوال پر پریشان ہو گئی پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا۔
"ایک دن میں سو کر اٹھی تو میں نے دیکھا، وہ میرے برابر لیٹا ہوا تھا۔"
"اور اس سے چھوٹا بھائی کس طرح پیدا ہوا؟"
اس نے پھر سوال کیا۔ ماں نے کہا۔
"ایک دن میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک خوبصورت بچہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ میری آنکھ کھلی تو یہ بچہ میری گود میں تھا۔"
اس پر بچے نے اپنے دوسرے بہن بھائیوں کے بارے میں بھی یہی سوال کیا۔ ماں نے ہر دفعہ ایک نئی کہانی گھڑ کر سنا دی۔ بالآخر بچے نے اپنی ماں سے کہا۔
"اس کا مطلب ہے کہ ہمارے ہاں کوئی بچہ بھی نارمل طریقے سے پیدا نہیں ہوا۔"

ندا طارق - فضہ یوسف - کراچی

ہری مرچیں

- ہر عورت خوبصورت ہوتی ہے سوائے گھر کی عورت کے۔
- یاد رکھیے ناجائز اخراجات ناجائز آمدنی سے ہی پورے ہو سکتے ہیں۔
- عورت کے نزدیک سب سے حسین عورت وہ ہے جو اسے آئینے کے سامنے دکھائی دے۔
- آپ سینما دیکھ کر اتنے خوش نہیں ہو سکتے جتنا ایک عورت پڑوس کے گھر جھانک کر خوش ہوتی ہے۔

تبسم سحر حسین - محلہ مغل پورہ

جوکر

ایک عورت نے ناشتے کے وقت اپنے شوہر سے پوچھا۔
"کل رات کلب میں کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی؟"
شوہر نے جواب دیا۔ "کوئی خاص بات نہیں ہوئی بس یہ ذکر چل نکلا کہ کتنے مرد بیوی کے وفادار ہوتے ہیں۔ سیکرٹری نے جوش میں آ کر یہ اعلان کیا کہ جو شخص کھڑا ہو کر سچ سچ یہ بات بتائے گا کہ اپنی شادی شدہ زندگی میں اس نے اپنی بیوی کے علاوہ کسی عورت سے ایسے ویسے تعلقات نہیں رکھے ہیں اسے ایک خوبصورت پل اوور انعام میں دیا جائے گا اور تمہیں یہ جان کر حیرت ہو گی کہ ایک آدمی بھی کھڑا نہ ہوا۔"
عورت نے پوچھا۔
"مگر تم کیوں کھڑے نہ ہوئے؟"
شوہر نے چکچاتے ہوئے صفائی پیش کی۔
"تم تو جانتی ہو سرخ رنگ میں، میں بالکل جوکر معلوم ہوتا ہوں۔"

اقصیٰ ناصر - گلستان جوہر

اقوال زریں

- کسی چیز کے حصول کا متمنی ہونا اور اس کے لیے محنت اور سختی اٹھانے کے لیے تیار نہ ہونا کمزوری اور سستی کی نشانی ہے۔
- جس سے مل کر خوشی نہ ہو، اس سے بچھڑ کر غم نہیں ہوتا۔
- انسانی عظمت اور مسرت کے لیے "شخصی آزادی" بہت ضروری ہے۔
- تصوف اپنی پسند کو ترک کر دینے کا نام ہے۔
- کمزور لمحے ہر ایک پر آتے ہیں۔ اگر آپ ان سے نکل جاتے ہیں تو انسانیت کی معراج کو چھو لیتے ہیں۔

نادیہ اشرف - والٹن وانڈ

برابر کے حقوق

نوجوان (ہونے والی دلہن سے)
"میں خود چاہتا ہوں کہ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق حاصل ہوں۔ اب تم بھی مجھے ہیرے کی ایک انگوٹھی پیش کرو۔"

اقراء، ثمرہ - کراچی



امت الصبور

خاموں کی ڈائری

حمدہ خان کی ڈائری سے

اس غزل میں جو ایک کلاسیکی رومانیت اور تخیل کی رنگینی ہے، اس نے اس غزل کو منفرد رنگ دے دیا ہے۔ ظفر اقبال کی یہ غزل قارئین کی نذر۔

جیتے ہیں تیرے ساتھ نہ مرتے ہیں تیرے ساتھ
اک طرح سے گزارہ ہی کرتے ہیں تیرے ساتھ

آتے جہاں کہیں سے ہوں، جاتے کہیں نہیں
ایسے بھی راستوں سے گزرتے ہیں تیرے ساتھ

آخر میں جا نکلتے ہیں اک دوسرے سے دور
کن گہرے پانیوں میں اترتے ہیں تیرے ساتھ

دنیا ہماری راہ میں پڑتی نہیں کہ تو
دنیا ہے آپ، تجھ سے ہی ڈرتے ہیں تیرے ساتھ

اپنی تو کوئی شکل و شباہت نہیں رہی
اب تو یہاں بگڑتے سنورتے ہیں تیرے ساتھ

کیسا یہ آنسوؤں کا سمندر ہے اے ظفر
ہم جس میں ڈوبتے نہ ابھرتے ہیں تیرے ساتھ

عائشہ فاطمہ کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر غلام جیلانی کی یہ غزل زندگی کی تلخ حقیقتوں کی بڑی خوبصورتی سے ترجمانی کرتی ہے۔

اجنبی لوگ تھے کیا ان سے وضاحت کرتے
اپنی بستی کے اگر ہوتے، شکایت کرتے

ہم کو معلوم تھا انجام تہی دستی کا
ہاتھ پھیلاتے تو اک اور حماقت کرتے

اتنے چہرے تھے کہ تاروں سے فروزاں لگتے تھے
یوں ہی دو چار جو ہوتے تو شناخت کرتے

لوگ بھی سارے وہی، طرزِ تعلق بھی وہی
کس بھروسے پہ ترے شہر کو ہجرت کرتے

عاشقی کارِ زیاں، کارِ عبث ہے لیکن
عمر ہوتی تو یہی کارِ محبت کرتے

واصفہ سہیل کی ڈائری سے

گزرے زمانوں کی یاد، اداسی، جدائی اور ہجرت۔ ن م دانش کی یہ غزل ان ہی کیفیات کی ترجمان ہے۔

یہ دل اب بھی خواب جوانی میں ہے
اثر اب تک اس کی کہانی میں ہے

کسی نہ کسی شے میں موجود ہے
وہ خود اپنی چھوڑی نشانی میں ہے

کہاں پر لیے جا رہا ہے مجھے
یہ دریا کہ اپنی روانی میں ہے

کہیں ذکر تک اس کا آتا نہیں
جو دراصل ساری کہانی میں ہے

ہوا مضطرب، بچے خاموش ہیں
عجب درد نقل مکانی میں ہے

کبھی یاد کرنا تو چپ بیٹھنا
سوائے کیا اس کے جوانی میں ہے

ترا غم مجھے بھولتا ہی نہیں
یہ کیا غم ہے جو زندگانی میں ہے

کنول شاہین کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر افتخار عارف کی یہ غزل تمام قارئین بہنوں کے لیے۔

سرِ بام ہجر کا دیا بجھا تو خبر ہوئی
سرِ شام کوئی جدا ہوا تو خبر ہوئی

مرا خوش خرام بلا کا تیز خرام تھا
مری زندگی سے چلا گیا تو خبر ہوئی

کوئی بات بگڑ گئی تو پتا چلا
مرے بے وفا نے کرم کیا تو خبر ہوئی

مرے قصہ گو نے کہاں کہاں سے بڑھائی بات
مجھے داستان کا سرا ملا تو خبر ہوئی

اقصیٰ ناصر کی ڈائری سے

میری ڈائری میں محسن نقوی کی یہ غزل آپ سب بہنوں کے لیے۔

وہی تھا رنگ اداسی کا رہگزر جیسا
رہا ہے گھر میں بھی عالم وہی سفر جیسا

دعائیں دے مرے اشکوں کو شامِ ہجر کے چاند
دمک گیا ترا چہرہ مری سحر جیسا

رلا گیا مجھے تنہائیوں کی منزل پر
خلوص موجِ ہوا کا وہ ہم سفر جیسا

کسے بتاؤں کہ اس سے بچھڑ کے کیا گزری
کہاں گیا وہ مرے غم سے بے خبر جیسا

تو اجنبی ہے تو شاید تجھے نہ راس آئے
اجاڑ دشت کا انداز میرے گھر جیسا

بدل گیا نہ ہو پردیس جا کے وہ محسن
کہ اس کا خط بھی ملا اب کے مختصر جیسا

مسرت الطاف احمد کی ڈائری سے

ادریس بابر نے اس غزل میں زندگی کی بے چینی، کرب اور بلبل کے ساتھ محبت کے جذبوں کو اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ زندگی کی تصویر بن گئی ہے۔

جس کو جاگنے کی آزادی ہوتی تھی
شہرِ خواب میں اک شہزادی ہوتی تھی

دریاؤں کی نیند بہت کچی تھی پہلے
صرف کناروں پر آبادی ہوتی تھی

پہلے لوگ محبت میں مر جاتے تھے
اور یہ حرکت غیر ارادی ہوتی تھی

دنیا کو اس کے حال پر چھوڑ آیا ہوں
کچھ بھی نہیں دل کی بربادی ہوتی تھی

اس کے ہاتھ میں پنجرہ خالی دیکھ کے بابر
سینے میں ایک تنے فریادی ہوتی تھی

مسرت الطاف کی ڈائری سے

زندگی کے صحرا میں حالات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے ہمیں ہر قدم پر دُھندلے راستے، لہو رنگ مناظر اور ڈوبتے ستارے نظر آتے ہیں تو ایک تھکن کا احساس رگ و پے میں اُترتا چلا جاتا ہے۔ امان اللہ امان بھی یہ سب کچھ دیکھ اور محسوس کر رہے ہیں۔

نہیں رہا ہے تمہاری بستی سے اب لگاؤ، میں تھک گیا ہوں
مجھے یہ اپنی کہانیاں اب نہ تم سناؤ، میں تھک گیا ہوں

خزاں رُتوں کے اُجاڑ منظر مرے لیے کیا پیغام دیں گے
نئی رُتوں کو کوئی خبر اس طرف بھی لاؤ، میں تھک گیا ہوں

طویل راتوں میں صبح کی روشنی کا میں منتظر ہوں کب سے
اے موسموں کو بدلنے والی نئی ہواؤ، میں تھک گیا ہوں

مجھے بھی سرد موسم نے شل کیا تو میں کیا کروں گا
بدلتے موسم میں تم نہ مجھ سے بچھڑ کے جاؤ، میں تھک گیا ہوں

کسی طرح تیرگی کے جنگل میں روشنی کی نوید آئے
چراغ میں کچھ نہیں تو میرا لہو جلاؤ، میں تھک گیا ہوں

ملائکہ کوثر کی ڈائری سے

کچھ کہانیاں، کچھ حروف ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں پڑھ کر پرانے زخم تازہ ہو جاتے ہیں۔ شمیم فاطمہ کی یہ نظم

71ء کا دسمبر

یہی ظالم مہینہ تھا
چٹانیں برف اوڑھے تھیں
بڑی سفاک سردی تھی
ہماری سرحدوں پہ
دشمنوں سے جنگ جاری تھی
فتح کے خواب دل میں تھے
لبوں پر بھی دُعائیں تھیں
دُعائیں رنگ نہ لائیں
مشقت کام نہ آئی
خبر آئی کہ سب کچھ ہار بیٹھے ہیں
مقدر کے قلم نے اک شکستِ فاش
لکھ دی ہے...!
اُبلتا خون رگوں میں
برف بن کر رہ گیا
نگاہوں میں تحیر جم گیا تھا
ہمارا جسم دو حصوں میں
یکدم بٹ گیا تھا
ہمارا ایک بازو کٹ گیا تھا

نغمانہ بٹ کی ڈائری سے

"صنم" قتیل شفائی کی شاعری پہ مبنی عمدہ کتاب جو شعری ذوق رکھنے والوں کے لیے باعث تسکین ہے۔ یہ کلام اس لیے انتخاب کا باعث بنا کہ اس میں بہت نازک احساسات کا ذکر کیا گیا ہے۔

شبنم نہیں کہتا اُسے شعلہ نہیں کہتا
وہ کوئی بھی ہو میں اُسے تجھ سا نہیں کہتا

اس ڈر سے کہ تو مجھ کو شفایاب نہ کر دے
قاتل تجھے کہتا ہوں، مسیحا نہیں کہتا

بستی ہے خیالوں میں سدا کوئی رفاقت
تنہا ہوں مگر خود کو میں تنہا نہیں کہتا

گہرائی جو دی تو نے میرے زخمِ جگر کو
میں اتنا سمندر کو بھی گہرا نہیں کہتا

کس کس کی تمنا میں کروں پیار کو تقسیم
ہر شخص کو میں جانِ تمنا نہیں کہتا

کرتا ہوں قتیل اپنے گناہوں پہ بہت ناز
انساں ہوں میں خود کو فرشتہ نہیں کہتا

خالدہ جیلانی



شازیہ عارف ———— ٹوبہ ٹیک سنگھ
دھجیاں دامن کی پہلے ہی نمایاں تھیں بہت
کچھ نئے الزام بھی اب میرے سر آنے لگے

کرن مہک ———— فیصل آباد
یہ اور بات کہ بازی اسی کے ہاتھ رہی
وگرنہ فرق تو لے دے کے ایک چال کا تھا

بشریٰ قریشی ———— پدھراڑ
وہ کریں بھی تو کن الفاظ میں تیرا شکوہ
جن کو تیری نگہ لطف نے برباد کیا

مدیحہ نورین ———— گجرات
جانے میں چلا گیا ہوں کہاں
میں تو خود سے کہیں گیا بھی نہیں

یاسمین خان ———— بورے والا
بجھتے ہوئے اس دیپ کا تم حوصلہ دیکھو
جو صبح تلک تیز ہواؤں سے لڑا ہے

مسرت بشیر ———— کراچی
میں سوچتا ہوں کہیں تو خفا نہ ہو جائے
تری انا مری زنجیرِ پا نہ ہو جائے

نازیہ فہد ———— کراچی
دل اجنبی دیس میں لگا ہے
آندھی سے دیے کا رابطہ ہے
اشفاق ہر ایک لمحۂ زیست
جینے کا مزاج مانگتا ہے

امبر نادی ———— ہری پور
شاہ کے نام پہ کھیلے ہے پیادہ بازی
یہ تماشا سرِ دربار بہت ہوتا ہے

ایشال فاطمہ ———— کراچی
ہوا کے دوش پہ اڑنے کا ہنر جانتا ہے
وہ بات کر کے مکرنے کا ہنر جانتا ہے

خالدہ خان ———— بہاولپور
عشق میں تہمت و رسوائی بھی لازم ہے مگر
یہ تماشا سرِ بازار نہیں ہو سکتا
جیسے ہم تیرے لیے جان کی بازی کھیلے
کوئی یوں برسرِ پیکار نہیں ہو سکتا

طاہرہ جاوید ———— کراچی
عہدِ الفت کی کچھ تو سزا ہو
اچھا یوں کرو کہ مجھے بھلا دو
دفن کر دو وہ سارے خط
میری تصویر تک جلا دو

روبی عامر ———— بورے والا
مجھے ہجر کی کالی رات ڈسے
کب ہو گی اس کی سحر پیا

ارم طاہر ———— گوجرانوالہ
دشتِ تنہائی میں پکارتا کوئی نہیں
بگڑے خال و خد سنوارتا کوئی نہیں

حافظہ اقرا جاوید ———— پدھراڑ
خدایا تیرے دم سے اپنا گھر اب تک سلامت ہے
وگرنہ دوست اور دشمن ہمارے ایک جیسے ہیں
میں کس امید پہ دامن کسی کا تھام لوں اختر
کہ سب سے دوستی میں اب خسارے ایک جیسے ہیں







خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

ناظمہ زیدی.........چوک اعظم

ٹائٹل خوبصورت تھا۔

انشا جی کو پڑھ کر مزہ آگیا۔ انٹرویو اب بورنگ ہوگیا ہے۔ وہی سوالات ——— قیصرہ حیات سے ملاقات اچھی لگی۔ ان کا اس قدر عاجزانہ رویہ اللہ موشی کو بیاں ملے، پڑھ کر اچھا لگا۔

فاخرہ کا نام ہو اور کہانی مزے دار نہ ہو۔ ناممکن سبق اچھا مگر اینڈ تشنہ، کیا کریں برا کرنے والوں کا انجام دیکھنے کی تمناسب کو ہوتی ہے۔

فرزانہ کھرل۔ دلچسپ ناول کے ساتھ تشریف فرما تھیں۔

''کاشفہ حسین'' چھوٹے سے پیغام کے ساتھ نمبر ون رہیں۔ مبارک ہو ''نعیمہ ناز'' آپ کا ناول میں چٹخارے لے کر تھوڑا تھوڑا پڑھ رہی ہوں' تجسس اور دلچسپی کا عنصر برابری کا ہے۔ مزہ آگیا۔

حالم کیا کہوں کہ بس۔ ''ریشم کہانی'' کا آغاز تو اچھا ہے اب آگے دیکھئے کہ پورا پڑھنے کی فرصت کہاں ''باورچی خانہ'' روایتی جوابات سے ہٹ کر اچھا لگا۔ اینڈ پران بہن کا ایسا کہنا دکھی کر گیا۔ اللہ آپ کو لمبی عمر عطا کرے تندرستی والی۔

اور یہ کیا جناب کہ شعاع کے اشتہار میں ہمارا نام غلط ،فاطمہ زیدی، چلیں کوئی نہیں لاکھ پڑھنے پر بھی یاد نہ آیا کہ کون سی کہانی بھیجی تھی۔ شعاع ملے تو ہم بھی پڑھیں اور سچ ہے اپنی کہانیاں بھیج کر بھول جاتی ہوں۔ یادِ ماضی عذاب ہے یارب.........ہاہاہا باقی بس میری چھوٹی سی ''آیت فاطمہ'' کے لئے دعا کیجیے اور دونوں بڑوں کے لیے بھی۔ زندگی بہت مصروف ہوگئی ہے۔

ج: ناظمہ! غیر حاضری کی وجہ تو آپ نے بتائی ہی نہیں۔ کہانیاں شائع ہونے کا انتظار کیے بغیر لکھتی رہا کریں۔ آپ میں صلاحیت ہے۔ اچھا لکھتی ہیں بہت اچھا بھی لکھ سکتی ہیں۔ بس تھوڑی محنت اور توجہ کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے بچوں کو بمع سرتاج کے ہمیشہ خوش وخرم اور صحت مند رکھے۔ آمین۔

روبی عامر.........بورے والا

اسلام علیکم! جولائی کے شمارہ کے حوالہ سے سب سے زبردست بات عمیرہ احمد کے ناول کی خوش خبری ہے۔ جو کہ اگست میں شروع ہوگا اور اس کے لیے خواتین ڈائجسٹ کی شکر گزار ہوں کیونکہ عمیرہ احمد میری پسندیدہ رائٹرز میں سے ایک ہیں۔ طاہرہ فردوس عبداللہ کا افسانہ ''ہمارے یہ رشتے'' مجھے بہت ہی حسب حال لگا۔ کیوں؟ یہ بات جانے دیتے ہیں (آہم) مکمل ناول میں ''پیپل کے پتوں پر'' مزا دے گیا۔

قیصرہ حیات سے ملاقات اچھی رہی۔ خامشی کو زباں ملے پڑھ کر مزہ آیا۔ کہی سنی میں انتخابات کے حوالے سے آپ نے جو لکھا دل کو چھو گیا۔ کاش ہمارے عوام ووٹ کی اہمیت سے آگاہ ہو جائیں اور اس کا صحیح استعمال کریں۔ (آمین)

ج: پیاری روبی! عوام کے ووٹ کی اہمیت مسلمہ ہے لیکن اس بار الیکشن کمیشن کی کارکردگی نے مسائل کھڑے کر دیے ہیں۔ اب تک صورت حال واضح نہیں ہو سکی ہے۔ یہی نہیں طے ہو پا رہا ہے، کون جیتا ہے کون ہارا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائے۔

مسرت الطاف احمد.........کراچی

ماڈل گرل کے ہیئر اسٹائل کے ساتھ ساتھ میک اپ اور جیولری بھی دل کو بھاگئی۔ ''دشت جنوں'' کو نہ پا کر دل تھوڑا بے چین سا ہوا۔ ''حالم'' کی یہ قسط بھی پر تجسس تھی لیکن ہاں.........! یہ فاتح اور تالیہ مراد کا نکاح کچھ ہضم نہیں ہو رہا ہے۔ نکاح کروانا ہی تھا تو ایڈم کے ساتھ ہی کر دیتے۔ فاخرہ جبیں کا نام دیکھ کر دل جھوم اٹھا۔

''یہ کوئی اور کہانی'' وریشہ ایک خود غرض لڑکی تھی۔ اسی لیے اس نے صرف اپنا مفاد سوچا لیکن حیرت تو فارس پر ہوئی۔ وریشہ نے ایکسچینج لے کر غلط بیانی ضرور کی تھی لیکن فارس کو ایک بار اپنی دل کی بات کہہ دینی چاہیے تھی۔ ''ریشم کہانی'' بہت متاثر کن تحریر تھی اور سبق آموز بھی۔ ''میں اور تم'' آؤٹ اسٹینڈنگ تحریر تھی۔ اسٹوری جان دار تھی میثم کا اسٹرونگ اور کیئرنگ کردار پسند آیا عنیزہ کا معصوم اور پیارا کردار دل کو بھا گیا، منصب اور سویرا کی جوڑی بھی لاجواب تھی۔ ''نسخہ ہائے وفا'' متاثر کن اور اثر انگیز تھی۔ میر بانو تو زہر ہی لگی۔ ''پیپل کے پتوں پر'' اسٹوری قابل تعریف تھی موضوع اثر انگیز تھا۔ طرز تحریر کچھ خاص انٹرسٹنگ نہیں لگی۔ ہر کردار لاجواب تھا۔

افسانوں میں ''آئینہ'' نمبر ون رہا۔ ''ہم کہاں جارہے ہیں'' سبق آموز تحریر تھی۔ ''سبق'' لاسٹ میں کچھ ادھورا سا لگا اظہار کو ماں کی حقیقت پتا ہی نہ چلا۔ ''رشتے'' بھی قابل تعریف اور لاجواب لگا۔

قیصرہ حیات سے ملاقات زبردست رہی۔ عمیرہ احمد کا نام پڑھ کر بے ساختہ خوشی سے چیخ نکل گئی۔ بے صبری سے ''الف'' کا شدت سے انتظار رہے گا۔

ج: پیاری مسرت آپ کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح بہت خوب ہے۔ ''الف'' کے لیے آپ کا انتظار ختم ہوا پہلی قسط پڑھیے ہمیں یقین ہے پڑھ کر آپ مایوس نہیں ہوں گی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نبیلہ ساجد.........عارف والا

کرن کرن روشنی پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ سب سے پہلے اپنی موسٹ فیورٹ حالم پڑھی۔ یہ کیا نمرہ جی ابھی پڑھنا شروع کی اور ختم بھی ہوگئی۔ اور آپی اس بار دشت جنوں کیوں غائب تھی آمنہ جی ٹھیک تو ہیں ناں۔

فاخرہ جبیں کی۔ یہ کوئی اور ہی کہانی ہے۔ اچھی تحریر تھی۔ ہمیں پہلے ہی پتا چل گیا تھا کہ فارس ماورا کو ہی پسند کرتا ہے۔ فرزانہ کھرل کی پیپل کے پتوں پر اور صدف ریحان گیلانی کی میں اور تم بھی اچھی تحریریں تھیں۔ منصب کا کردار پسند آیا۔

شازیہ جمال کا سبق اچھا سبق تھا۔ بھئی سسرال میں دل جیتنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔

نعمان سمیع اور قیصرہ حیات کا انٹرویو اچھا تھا۔ پلیز نمرہ جی کا انٹرویو بھی ضرور شائع کریں۔

ج: پیاری نبیلہ! عمرہ کی سعادت حاصل کرنے پر مبارک باد نمرہ کے صفحات کم نہیں تھے۔ آپ کو حالم بہت پسند ہے اس لیے صفحات کم محسوس ہوئے۔

نمرہ نے انٹرویو دیا تو ضرور شائع کریں ہماری بہت سی قارئین نمرہ کا انٹرویو پڑھنا چاہتی ہیں۔

اقراء الیاس......مرید کے ضلع شیخوپورہ

السلام علیکم! اس بار تین، چار ماہ بعد خط لکھا فقط ناراضی کی وجہ سے لیکن خیر اتنی سخت ناراضی نہیں تھی کہ کافی عرصہ قائم رہتی کیونکہ اتنی دیر رکھ ہی نہیں سکتی۔ ٹائٹل پر ماڈل کی زبردستی کی مسکراہٹ اچھی لگی جو بھی تھی مسکرا تو رہی تھی۔ فہرست میں ''دشت جنوں'' کو نہ پا کر جھٹکا لگا۔ 'آخر آیو کھمتی' کی حقیقت جو کھلنے والی تھی اور کچھ شاہ میر اور ماہ نور کا حال احوال معلوم ہوتا تھا مگر ساری امیدوں پر ٹکا کر پانی پھیرا مگر ''عمیرہ احمد'' کا ناول آنے کی خوشی میں دل بہل گیا۔ ''تھینک یو عمیرہ احمد'' یہ کوئی اور کہانی فاخرہ جبیں صاحبہ کرداروں کی طرح آہستہ آہستہ ہمیں بھی اداسی اپنی لپیٹ میں لینے لگتی ہے۔ ''ماورا'' کا کردار خوب صورت لگا۔ ''پیپل کے پتوں پر'' پڑھتے پڑھتے لائٹ چلی گئی بے اختیار منہ سے نکلا ہائے لائٹ چلی گئی۔'' فرزانہ کھرل صاحبہ'' نے اس بار ہمیں مشکل میں نہیں ڈالا لفظوں میں بھلے وہی پیچ وخم تھا مگر با آسانی سمجھ میں آگئے ورنہ پہلے دو تین ناولز میں پتا ہی نہیں چلتا تھا ہو کیا رہا ہے؟ لفظوں سے کھیلتے۔ موضوع اور کردار ہی ذہن سے محو ہو جاتے اس بار ان کا ہر کردار منفرد تھا۔ ''ریشم کہانی'' افراح سکندر

آخر کار۔ موضوع میں چینج لے ہی آئیں۔ جس پر بارہا لکھا جاچکا ہے۔ ''میں اور تم'' عنیزہ بے چاری ہی رہی اور میثم بھی آخر تک ہٹلر کا جانشین بلکہ ہٹلر کا ابا ہی رہا۔ ''حالم'' نمرہ احمد صاحبہ کی تعریف میں کیا کہا جائے جن میں اللہ تعالیٰ نے ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور اسے استعمال کرنا بھی سکھایا۔

ج: اقرا اتنا اچھا تبصرہ کرنے پر ہماری طرف سے شاباش، ہم اپنی قارئین کی ذہانت کی یوں ہی تو تعریف نہیں کرتے۔

یہ بہت اچھی بات ہے کہ آپ کا غصہ جلدی اتر جاتا ہے اور ناراضی دیر تک نہیں رہتی۔ چھوٹی سی زندگی میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنوں سے کیا ناراض ہونا۔ جبکہ آپ ہماری مجبوری بھی جانتی ہیں۔

آیو ممتی کی حقیقت تو اس ماہ آپ جان لیں گی شاہ میر اور ماہ نور کا حال جاننے کے لیے ایک ماہ انتظار کرنا پڑے گا۔

میمونہ سعید......شورکوٹ شہر

جس کہانی نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا ''حالم'' ہے۔ خیر قلم اٹھانے پر مجبور تو بہت سی کہانیوں نے کیا مگر ہم ہی ڈھیٹ بنے رہے۔ ''ہاہاہا'' سکس، سیون کلاس سے رسالے پڑھتے تھے۔ 8th کلاس سے باقاعدہ شعاع اور خواتین لینا شروع کیا۔ زندگی کے ہر موڑ پر اس نے رہنمائی کی ہے۔ اب تو خیر سے شادی شدہ بچیوں والی ہیں ہم سب لیکن شعاع اور خواتین کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

حالم تو کچھ ایسا سحر میں جکڑ لیتی ہے۔ رات کو سوتے میں مجھے لگتا ہے۔ میں تالیہ ہوں اور تالیہ کی کاپی کرتی رہتی ہوں خواب میں۔

حسن المآب، مصحف، سنہری دھوپ، نمل، پارس بہت سبق آموز تھیں۔ دشت جنوں، شب تاب، شہر زاد، خواب شیشے کا بہت اچھی جارہی ہیں۔ میں شعاع کے سلسلے جب تجھ سے ناتا جوڑا میں شرکت کرنا چاہتی ہوں۔ کتاب کہانی سمیرا حمید بہت انٹرسٹنگ۔ فرزانہ کھرل کی کہانیوں کے نام ہی بہت دلچسپ ہوتے ہیں تھوڑا مشکل لکھتی ہیں پر بہت زبردست۔ پسندیدہ رائٹرز کی فہرست بہت طویل ہے کچھ نام سمیرا حمید، سائرہ رضا، فائزہ افتخار۔ نایاب جیلانی موسٹ فیورٹ آمنہ ریاض آسیہ رزاقی، ایمل رضا، صائمہ اکرم چوہدری، عفت سحر، طاہر، نمرہ احمد' فرزانہ کھرل، مصباح وغیرہ۔ میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ مشہور زمانہ ناول ہیں آگ کا دریا، مراۃ العروس، راجہ گدھ وغیرہ یہ ناول کیسے منگوائے جاسکتے ہیں۔ ان کی قیمت کتنی ہوگی۔

ج: پیاری میمونہ: آپ جو کتابیں منگوانا چاہتی ہیں ان کی قیمت اور دیگر معلومات کے لئے **021-32735021** پر فون کرلیں۔ شعاع یا خواتین کے ہر سلسلے میں آپ شرکت کرسکتی ہیں۔ یہ سلسلے ہم نے قارئین کے لیے ہی شروع کیے ہیں۔

ہما فاروق......گوجرانوالہ

آپی مئی اور جون کے خواتین ڈائجسٹ میں سمیرا حمید کا ناولٹ ''ٹیولپ'' اور مہر میراں پڑھا۔

ناولٹ ''ٹیولپ'' فینٹسی پر مبنی تھا مگر پھر بھی یہ تحریر اچھی لگی۔ ''مہر میران'' مکمل ناول بھی کافی اچھی تحریر تھی۔ جو پہلے پہل تو ہمیں تاریخی دور میں لے گئی۔ جس کو پڑھنے کا اپنا ہی لطف آرہا تھا۔ مگر بعد میں اپنے اس دور میں واپس لے آئی۔

آپی آپ سے کہنا تھا کہ کچھ سال پہلے ''خواتین ڈائجسٹ'' کا اگست کا شمارہ ''ناولٹ نمبر'' ہوتا تھا۔ مگر پھر آپ نے اس سلسلے کو بند کردیا۔ پلیز اسے دوبارہ شروع کریں۔

آپی سائرہ حنا سے کہیں کہ وہ ''خواتین ڈائجسٹ'' میں مکمل ناول لکھیں۔ ان کی تحریر کا بہت انتظار ہوتا ہے۔

ج: پیاری ہما! آپ نے درست فرمایا اگست کا شمارہ ناولٹ نمبر ہوتا تھا۔ اب پچھلے کئی سالوں سے ہم ناولٹ نمبر نہیں دے پائے۔ پتا نہیں کیوں ہماری مصنفین نے ناولٹ لکھنا بند کردیے ہیں۔ مکمل ناول جو ایک قسط میں مکمل ہوں، وہ بھی بہت کم موصول ہوتے ہیں۔ زیادہ تر مصنفین کا اصرار ہوتا ہے کہ ان کے قسط وار ناول شائع کیے جائیں۔ ہمیں جو تحریریں موصول ہوتی ہیں، وہ بھی اتنی طویل ہوتی ہیں کہ انہیں ایک قسط میں شائع کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہوتا۔

سائرہ رضا خواتین کے لیے ناول لکھ رہی ہیں۔ یہ نہیں کہہ سکتے وہ ایک ہی قسط میں مکمل ہوگا یا ایک سے زیادہ قسطیں ہوں گی۔

مہناز رانی رمشا......مانانوالہ

سب سے پہلے کرن کرن روشنی پڑھا پھر بھائی عدنان کے مشورے۔ بھائی ہم تو پڑھ کر چکرا جاتے ہیں۔ پھر آپ کیسے سہہ جاتے ہیں اتنی ظالم داستانیں جبکہ آپ نے تو مشورہ بھی دینا ہوتا ہے۔ آپ کا باورچی خانہ میں فرزانہ انصاری کے جوابات پڑھ کر اچھا لگا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وتندرستی عطا کرے (آمین)

نعمان سمیع کو جان کر اچھا لگا۔ سچ میں اگر میں پاس ہوتی یا مجھے انٹرویو لینے کا موقع ملتا تو بہت سر کھاتی۔ ایسے انوکھے جوابات پر جسے عشق اور محبت میں فرق کا کوئی علم نہیں اور اتنا علم ہے کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ عجیب وغریب خواہش بھی نہیں بتاتے اور خواب بھی (مگر ہائے رے قسمت میری حسرت ہی رہ گئی اور نعمان سمیع صاحب نے جان کی امان پائی)

اب آتے ہیں ناولوں کی طرف تو چار مکمل ناول دیکھ کر پھر فرزانہ کھرل کا نام پڑھ کر تو عید ہی ہوگئی۔ نمرہ احمد تو ہمیں پتا نہیں انگلی سے پکڑ کر کس دنیا کی سیر کروالاتی ہیں۔ ''نسخہ ہائے وفا'' نعیمہ ناز بھی بہت پیارا لکھ رہی ہیں۔ ثانیہ جی ہر دفعہ کال کرکے عاطف کا انٹرویو لینا ضروری ہے کیا؟ حمیرا اور مہربانو پر بہت غصہ آتا ہے کوئی اتنا بددماغ اور خودغرض بھی ہوسکتا ہے۔

''یہ کوئی اور کہانی'' وریشہ سطوت بہت بری لگی منہ پھٹ، اور جل ککڑی۔ ماورا نے تو ہمیں رلا ہی دیا۔ فارس پر بے حد غصہ بھی آیا کہ پسند ماورا اور شادی وریشہ سے کرلی۔

صدف ریحان کا تعلق پٹھان برادری سے تو نہیں میثم اور منصب کی لڑائی پر بہت ہنسی آئی۔ ہیپی اینڈ رہا اس اسٹوری کا بھی۔

''پیپل کے پتوں پر'' فرزانہ جی تھینک یو ویری مچ۔ شعاع میں آپ کو غائب پا کے موڈ خراب ہوگیا تھا، خواتین میں دیکھ کر سکون ہوگیا۔ باقی تمام سلسلے بھی ہر بار کی طرح اچھے رہے۔ پورا شمارہ بہت زبردست رہا۔

ج: مہناز رانی اور رمشا شکر ہے نعمان سمیع کی جان بچ گئی، اس بے چارے کا کیا قصور ہے۔ محبت اور عشق میں کیا فرق ہے۔ یہ تو بہت سے لوگوں کو نہیں پتا ہوگا یہاں تو لوگ محض پسندیدگی کو سچی محبت سمجھ بیٹھتے ہیں۔ پہلی نظر میں عشق ہوجاتا ہے۔ نعمان سمیع نے سادگی سے اپنی کم علمی کا اعتراف کرلیا تو اس میں کیا انوکھی بات ہے۔ محبت اندھی ہوتی ہے محاورہ ہے۔ نعمان سمیع نے ایک سنی سنائی بات دہرادی۔

ام ربانی......سویدرہ

جب تک زندہ ہیں زندگی ہر روز ایک نئی تمنا لے کر آتی ہے۔ شاید یہی تمنا آپ کا اور ہمارا ساتھ لکھ رہی ہے اور اسی لیے ہم ہر ماہ آپ کے روبرو ہونے لگے ہیں۔

بے شک حالم ایک بہترین تخلیق ہے۔ کہانی پڑھنے میں کہیں کوئی جھول نظر نہیں آتا۔ جو بات میری کم فہمی میں نہیں آرہی وہ یوں ہے کہ جب تاشہ چھ سال کی عمر میں وقت کا دروازہ پار کرگئی قبل 580 سال بقول ایڈم، اب 2018 میں سب ملائیشین تاریخ سے واقف ہیں۔ بمعہ فاتح اور ایڈم جو تاریخ کی کتب کا مطالعہ کرچکے ہیں۔ تاشہ کے کارنامے بھی تاریخ میں لکھے جاچکے ہیں۔ دنیا ان کرداروں کو جانتی ہے (اچھا یابرا) تو اب وقت کے دروازے سے واپس جاکر تالیہ وہی کام دوبارہ سرانجام دے رہی ہے اور فاتح سے بار بار پوچھنا کہ کتابوں میں ایسا لکھا ہے جو میں کررہی ہوں یا کتب میں جو تحریر ہے وہ کروں۔

سوال یہ ہے کہ جب تاشہ چھ سال کی عمر میں سے آؤٹ ہوگئی تو پھر تاریخ میں پیچھے کس تاشہ نے یہ کارنامے انجام دیے یا پھر حالم کے بیک گراؤنڈ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ''قید میں فاتح کو ادراک ہوتا ہے، وہ ماضی میں کسی خاص مقصد کے لیے بھیجا گیا ہے۔'' جب تاریخ رقم ہوچکی تو کیا تالیہ اب دوبارہ تاریخ دہرا رہی ہے۔

ج: عزیز بہن! تالیہ نے ملاکہ میں جو کام کیے وہ ماضی میں سرانجام دیے جاچکے ہیں۔ تالیہ اس وقت ماضی میں جاکر ایک تاریخ دان کی طرح انہیں دیکھ رہی ہے۔ وہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتی۔ تبدیلی صرف حال میں آئے گی۔ جو گزر چکا اور جو آنے والا ہے انسان اس پر قادر ہی نہیں ہے۔

زندگی تو نام ہی تمنا اور آرزوؤں کا ہے۔ اگر زندگی سے خواہش کو نکال دیا جائے تو زندگی میں کوئی کشش بھی نہیں رہتی بس انسان لاحاصل اور ناممکن کی جستجو خواہش نہ کرے دیوانگی کی طرف لے جاتی ہیں۔

تبسم بشیر حسین......ڈنگہ

ٹائٹل خوب صورت تھا کبھی کبھی نمل علی کا ٹائٹل دیں۔

کہنی سنی......بہت خوب، کئی دنوں سے دعا کررہی تھی کہ عمیرہ احمد کچھ لکھیں۔ شکر ہے عمیرہ تک میرے دل کی دعا

پہنچی۔ ''کرن کرن خوشبو'' بہت خوب صورت ''حالم'' ایک زبردست کہانی ہے۔ ''یہ کوئی اور کہانی ہے۔'' فاخرہ جبیں شکر ہے کہ آپ کو ہماری یاد آئی کہانی۔ بہت مزے کی تھی۔ پیپل کے پتوں پر از فرزانہ کھرل مجھے ان کی یہ تحریر پچھلی تحریروں کے مقابلے میں تھوڑی لائٹ لگی اور آسانی سے سمجھ میں آ گئی۔ نعیمہ ناز کی کہانی کی دوسری قسط بھی اچھی تھی۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ میں اور تم صدف کی تحریر شروع میں بورنگ لگی بعد میں کچھ دیر بعد مزہ آنے لگا۔ ناولٹ بھی اچھا تھا ''ریشم کہانی'' افراح سکندر ویل ڈن، افسانے ہمارے رشتے،

سبق ٹاپ کلاس رہے۔ جبکہ سنیعہ اور کاشفہ نے بھی اچھا لکھا۔ خط سب کے اچھے تھے۔ سب سے مزے دار سلسلہ ہے۔ ایمان کنول کے لیے دعا کی۔ آپ کا باورچی خانہ میں فرزانہ انصاری نے اچھے جوابات دیے۔ نفسیاتی الجھنیں پڑھ کر اکثر اداس ہو جاتی ہوں۔

بیوٹی بکس میں میک اپ کرنے کا طریقہ بتانے کا شکریہ۔

ج: پیاری تبسم! ہمیں آپ کے پانچ خط موصول نہیں ہوئے ورنہ ہم ضرور شامل کرتے۔ سب نہ سہی ایک دو تو ضرور ہی شامل ہو جاتے۔ مریم عزیز کا ناول دل کے موسم شائع ہو چکا ہے، اس کی قیمت 250 روپے ہے۔ صدف آصف کا کوئی ناول کتابی شکل میں نہیں آیا۔ آپ کو جو ناول درکار ہیں۔ ان کی قیمت اور دیگر معلومات کے لیے اس نمبر پر فون کر لیں 021-2735021۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے ممنون ہیں۔

تنزیلہ یوسف ...... لاہور

بیٹا میگزین لے کر آیا تو جھٹ کھول کر فہرست دیکھی۔ یہ کیا؟ دشت جنوں، ختم ہو گیا، گویا آیو شمتی جی کا بھید کھل چکا۔ دو صفحات بے دلی سے پڑھنے کے لیے صفحہ پلٹا تو صفحہ 275 پر اختتام نے پھر سے وہی جوش بھر دیا۔ سچ اتنی خوشی ہوئی جان کر کہ ابھی آخری قسط رہتی ہے۔ عمیرہ احمد کا نیا ناول ''الف'' شروع ہو رہا ہے۔ میرے لیے تو بہت خوشی کی خبر ہے۔ ایک شکوہ ہے کہ پچھلے سال آب حیات کے اختتام پر اس کا اگلا حصہ شروع کرنے کا اعلان ہوا تھا اس کا کیا ہوا؟

میں سب سے پہلے خطوط اور پھر افسانے پڑھتی ہوں۔ آئینہ سنیعہ عمیر نے کمال لکھا۔ 'ہم کہاں جا رہے ہیں'

کاشفہ حسین کا افسانہ سوگوار کر گیا۔ شازیہ جمال طارق کا افسانہ سبق یوں لگا جانی پہچانی کہانی ہے۔ طاہرہ فردوس عبداللہ کا ہمارے یہ رشتے ہیں فرح تو کمال کی مشاہدہ کار نکلی اوپر سے مقررہ بھی۔ مجھ سے ملیے میں نعمان سمیع کے بارے میں جان کر اچھا لگا قیصرہ حیات سے ملاقات بھی بہت خوب رہی۔ ان سے ناول ضرور لکھوائیں ڈائجسٹ کے لیے۔ نمرہ احمد کے حالم میں پندرہویں صدی کے ملائیشیا کی سیر کی آپ یقین جانیں میں نے نمرہ کو پہلی بار پڑھا ہے اور یہ میری پسندیدہ رائٹر بن گئی ہیں۔ فاخرہ جبیں کا مکمل ناول بھی خوب تھا۔ فرزانہ کھرل کا ناول پیپل کے پتوں پر میں دل پیپل

کے پتوں پر دھڑکتا ہی رہا۔ بہت خوب انداز بیان ہے۔ نعیمہ ناز کا نسخہ ہائے وفا بھی، دلچسپ لگا۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا کہ صدف ریحان گیلانی کے میں اور تم میں میثم نے تو عنیزہ کی جان ہی نکال دی تھی۔ شکر ہے آخری سطروں میں عنیزہ نے بھی ہمت پکڑی افراح سکندر کا ریشم کہانی اپنے اندر سبق سموئے تھا۔ اچھا لگا۔ نظمیں اور غزلیں سب ہی عمدہ تھیں۔ آپ کا باورچی خانہ میں فرزانہ انصاری کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ اللہ پاک فرزانہ انصاری کو صحت و تن درستی عطا کرے اور ان کی عمر دراز کرے آمین۔ نفسیاتی ازدواجی الجھنیں میں نادیہ کے بارے میں پڑھا۔ ''س، کاف'' اور آسیہ خان کے مسائل پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔

قسم توڑ دی کہ اس ماہ خط نہیں لکھنا (لاہور میں ہوتی ہوں اس لیے کراچی دلی کی مانند دور ہی محسوس ہوتا ہے)

ج۔ پیاری تنزیلہ! زمینی فاصلے اہمیت نہیں رکھتے۔ ہاں دلوں میں دوری نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں تو اپنی ہر قاری بہن اپنے دل کے قریب ہی لگتی ہے خواہ وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں ہو۔

خواتین لیٹ آنے کی شکایت ہماری بہت سی قارئین کو ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ خواتین آپ کو جلد مل جایا کرے۔

فضہ یوسف ...... بہاولپور

ایک بار پھر اس لیے کیونکہ پہلی بار ردی کی ٹوکری کو میرا خط پسند آ گیا تھا۔ پلیز پرانی لکھنے والی تھوڑا سرک کر میری جگہ بنائیں ورنہ میں دو منٹ کے لیے ناراض ہو جاؤں گی۔ خط ضرور شائع کیجیے گا اتنی محنت سے عبداللہ کا قلم چوری کیا ہے۔ رائٹر بننے کا خواب نازیہ کنول کو پڑھ

کے دیکھنا شروع کیا، میں نے دو ناول اور بہت ساری غزلیں لکھ رکھی ہیں لیکن شائع کرانے کے لیے نہیں بھیجوں گی۔ سنا ہے معاوضہ بھی ملتا ہے اگر شائع ہو گئے (امید تو ہے شائع ہوں گے) اور ڈاکیہ میرے گھر تک پہنچ گیا تو ابو جی ہوں گے امی ہوں گی فضہ ہو گی اور قیامت کا سماں (اتنے بھی جلاد نہیں، ایک بیٹی ہوں پیار کرتے ہیں مگر رسالوں کے مخالف ہیں)۔ پڑھنے کا شوق تو چھپ کر پورا ہو جاتا ہے۔ مطالعے کا ذوق ماما سے وراثت میں ملا اس شوق کی تسکین بھی ماما کرا دیتی ہیں مگر ابو سے چھپ کر سو لکھنے کا شوق اپنے حد تک ٹھیک ہے خط نے کون سا واپس گھر آنا ہے۔

نسخہ ہائے وفا، نعیمہ جی کا ناول مکمل سمجھ کر بہت ہی دل چسپی سے شروع کیا تھا مگر باقی آئندہ ماہ دیکھ کر جو حالت ہوئی بالکل ویسی تھی جیسے ڈرامے کا ڈراپ سین ہونے والا ہو اور لائٹ چلی جائے۔ شاہین آپی کو ساحر لودھی کے انٹرویو کی یاد دہانی کروادوں۔ شاہین آپی پلیز پلیز معصوم پاری بچی کی ریکویسٹ پہ نگاہ کرم ڈالیے گا۔

ج۔ پیاری سی معصوم بچی اگر خط آپ ذرا جلدی بھجوا دیا کریں تو آپ کا خط بھی شامل ہو جائے اور ہماری ردی کی ٹوکری کو بھی آپ کی باتیں نہ سننی پڑیں۔ پہلی بار خط تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر شامل نہ ہو سکا۔ ساحر لودھی کا انٹرویو شائع ہو چکا ہے شاید آپ کی نظر سے نہیں گزرا۔ دوبارہ کے لیے شاہین رشید تک آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں۔

ایس این شہزادی کھرل ...... چک نمبر 357 جڑانوالہ

کیا حال چال ہیں آپ کے ہاہاہا گرمی جو بڑھ رہی ہے کراچی والوں کا تو زیادہ ہی برا حال ہوتا ہے۔ سب سے پہلے بتاؤں آپ کا شمارہ ایک دم پرفیکٹ ہے۔ کچھ عرصے پہلے یہی کوئی پانچ چھ مہینے ہو گئے ہیں دو بہنوں نے ایک ناول کا پوچھا کہ وہ کس شمارے میں شائع ہوا ان کے کرداروں کے نام فجر اور اشر تھے اور نانی اور دادی بھی تھیں۔ تو میں بتا دیتی ہوں کہ اس ناول کا نام تھا ''پہلی بار'' اور یہ ناول آسیہ رزاقی کا اپریل 2015ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ آپی میں نے آپ کا

ڈائجسٹ شعاع اینڈ خواتین مارچ 2014ء سے پڑھنا شروع کیا ہے۔ شروع میں تو اپنی جیب خرچ سے لیے تھے لیکن کبھی کبھی ابو بھی لا دیتے تھے۔ آپی آپ لوگوں سے درخواست ہے کہ میرے ابو کی تندرستی کے لیے دعا کریں اللہ ان کو صحت یابی عطا کرے۔ آپی میں چھ سالہ عالمہ کے کورس میں ایڈمشن لے چکی تو اب کم ہی فرصت ملتی ہے کوئی کام کروں۔ اس دفعہ بھاگتے دوڑتے جب ڈائجسٹ پڑھنے کے لیے نکالا ہے تو لسٹ میں افراح سکندر خان کا نام دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

اور ایک ہی سانس میں ختم کیا۔ ہاہاہا سچی کہہ رہی ہوں مکمل ناول سارے ہی اچھے تھے۔ اور افسانے تو تھے ہی لاجواب۔ آپی طاہرہ فردوس ہماری امی تو ڈائجسٹ کو دیکھتے ہی کہتی ہیں اس کو دل کرتا ہے آگ میں ڈال دوں ورنہ انہیں افسانہ ضرور پڑھواتی۔ انٹرویو اتنے شوق سے نہیں پڑھتی لیکن آپی شاہین رشید سے گزارش ہے نیلم منیر کا ایک تفصیلی انٹرویو لیں۔ جس میں اس کی فیملی کا تذکرہ ہو۔ ''خامشی کو زباں ملے'' بڑے عرصے بعد دیکھا ہے۔ آپی جی! یہ آپی ام ایمان قاضی اور آپی مصباح علی سید کہاں گئیں۔ سائرہ رضا نوال ضمیر اور آفشاں انعام کو کب لے کر ہمارے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرنے آ رہی ہیں اور یہ بنت سحر کہاں ہیں کچھ عرصہ آتی اور غائب ہو جاتی ہیں۔

ج: شہزادی! اتنی ہی ہی ہی ہاہاہا۔ ہمیشہ اسی طرح ہنستی کھلکھلاتی رہیں۔ آپ کے ابو کو اللہ تعالیٰ صحت دے۔ ہم ان کے لیے دعا گو ہیں ام ایمان قاضی کا ناولٹ اس ماہ شعاع میں شامل ہے۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل	فریحہ اعجاز
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی	موسیٰ رضا

خامشی کو بیاں ملے

ادارہ

جمیلہ شاہ کھگہ ...... کھگے والا ملتان

1- میرا نام جمیلہ شاہ کھگہ ہے۔ سب جمیا کہتے ہیں۔ چار بہن بھائی ہیں، دو بڑی بہنیں، تیسرے نمبر پر میں پھر بھائی، جو مجھے سب سے پیارا ہے۔ وہ دبئی میں ہوتا ہے۔ بہت مس کرتی ہوں۔ گھر میں امی، میں اور میری نانی ہوتی ہیں۔ ابو کی چار سال پہلے وفات ہوگئی ان کو کینسر تھا۔ پڑھنے کا شوق مجھے ابو سے ملا۔ بچپن سے ہمارے گھر پانچ اخبار باقاعدگی سے آتے تھے۔ میرے، رسالے اور ناول جمع کرنے کے شوق کو دیکھ کر ابو کہتے، یہ مجھ پر گئی ہے۔ تعلیم میری زیادہ نہیں ہے۔ میٹرک کے پیپرز نہیں دیئے۔ کوکنگ کا بہت شوق ہے۔ سب رشتے دار ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ اس لیے ہر وقت کچھ نہ کچھ بنا کر سب کو کھلاتی رہتی ہوں۔ رسالے پڑھنے اور ٹی وی دیکھنے کے ساتھ ساتھ واٹس اپ پر اپنی بہن بھائی اور کزنز سے گپ شپ کرتی ہوں۔

2- کیا پوچھ لیا، خامیاں خوبیاں کسی سے نہیں پوچھتی ورنہ صرف خامیاں آہم ہم...... خود اپنے بارے میں بتاتی ہوں، جذباتی ہوں، غصہ آتا ہے تو بس خود ہی رو رو کر اپنا حشر کر لیتی ہوں۔ کسی کو سنا نہیں سکتی، لوگوں پر جلد اعتبار کر لیتی ہوں۔ میری بہن نیلم کہتی ہے، میری ربڑ کی ناک ہے۔ بڑے بڑے دعوے فلاں سے ناراض ہوں، اب کبھی نہیں بولوں گی مگر جس سے ناراض تھی۔ اس نے ایک بار بلایا۔ میں سب بھول گئی، خوبی ثمرین، چھوٹی اور نانی سے پوچھا انہوں نے کہا۔

" نماز پابندی سے پڑھتی ہو، اچھی باتیں کرتی ہو۔ میں کسی کو روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ کسی نے حسد نہیں کرتی، دل میں کینہ نہیں رکھتی جس کو معاف کر دیا تو کر دیا۔

3- یہ سب سے اچھا سوال۔ خواتین شعاع سے وابستگی، دس سال کی تھی میں۔ آج بھی وہ گرم دوپہر یاد ہے، جب میری کزن شبانہ نے مجھے کہانی پڑھ کر سنائی۔ ہیرو، ہیروئن کے نام بھی یاد ہیں، جویریہ حسان اور ولید بخت، اس کے بعد تو بس میں تھی اور کردار۔ رفعت سراج کے غصیلے ہیرو۔ ماہا ملک کے عالم شاہ اور زینب شاہ جن کی موت پر میں اب بھی اداس ہو جاتی ہوں۔ راحت اور فاخرہ جبیں کے ساتھ گاؤں اور ساون کا مزا لیا۔ رخسانہ نگار اور عالیہ بخاری کے ساتھ گلیوں محلوں کی سیر کی۔ فرحت نے پیارے رشتوں سے محبت کرنا سکھایا تو عمیرہ احمد اور نمرہ احمد کو پڑھ کر اللہ یاد آیا۔ فائزہ افتخار کے ساتھ کبھی کیلاش تو کبھی اندرون لاہور گئے۔ ثمرہ بخاری اور آسیہ رزاقی کی دادی نانی، جوادی شبلی کے چٹخارے۔ عنیزہ سید اور نگہت سیما، سعدیہ عزیز کے فلسفے۔ سائرہ رضا کے اچھوتے موضوں۔ نبیلہ عزیز، مریم عزیز، نبیلہ ابر راجہ، شازیہ چوہدری مرحومہ، میمونہ خورشید کے رومانٹک ہیرو۔ آسیہ رزاقی کی سمجھ دار باتیں اور بھی بہت سے نام جو یاد آ رہے ہیں۔ راشدہ رفعت اور بشریٰ احمد کی گھریلو اسٹوری میں مجھتی تھی۔ اب اکتیس سال کی ہو چکی ہوں، مجبور ہوں مگر رسالے اور کہانیوں کے لیے اب ہی پندرہ سال کی جمیا بن جاتی ہوں۔ پہلی تاریخ کا انتظار کوئی ملتان جا رہا ہو، میں نے رسالے کا کہا اور وہ نہیں ملا تو بس میرا منہ سوج کر کپا ہو جاتا ہے۔ میری بہن نیلم اور کزن نوشی سے، آنے والے سے کہتی ہوں، اگر رسالا نہیں آیا تو کراچی کی ٹرین پکڑ کر وہاں سے لے آتے، طنز سنیں، آپ نے ایسے دیوانے ہیں ہم۔

4- برتھ ڈے میں نہیں مناتی مگر انتظار رہتا ہے، کوئی وش کرے۔ سب سے پہلے میرا بھائی فراز وش کرتا ہے۔ اس کے بعد میرا منگیتر اسد وش کرتا ہے پھر بڑی باجی طاہرہ۔

5- شاعری سے بہت لگاؤ ہے، شعر منہ زبانی یاد رہتے ہیں۔ فیض احمد فیض، محسن نقوی، فرحت عباس شاہ بہت فیورٹ ہیں۔ شعر ویسے تو بہت پسند ہیں، مگر ایک لکھتی ہوں۔

کبھی چپ رہوں کبھی بلاوجہ ہنس پڑوں محسن
اسے گنوا کر عجب حوصلے تلاش کروں

6- آخری سوال اقتباس کوئی ایک نہیں بہت سارے ہیں، جگہ کم پڑ جائے گی۔ عمیرہ احمد کے ناول من وسلویٰ سے۔

" اللہ کوئی چیز نہ دے' اسے انسانوں سے نہیں مانگتے زینب!"

نمرہ احمد کے " جنت کے پتے" سے......

" اللہ جنت کے پتے تھامنے والوں کو کبھی رسوا نہیں کرتا۔"

اور نمل کی پندرہویں قسط میں سعدی کی باتیں دل میں اتر گئیں۔

آخر میں بس یہی کہوں گی چھوٹی سی زندگی ہے، اسے پیار محبت سے بسر کریں، لوگوں کو معاف کرنے کا وصف اپنائیں، اپنے بچوں کو دینی تعلیم پہلے دیں۔

بریرہ راجپوت ...... نوکوٹ

1- گھر میں تو میرا نام بریرہ ہے، پر باہر سب طرح طرح کے نام لیتے ہیں۔ بری، برو، بیا...... جس کا جو دل چاہے لیتا ہے۔ ننھیال میں سب سے بڑی لڑکی ہوں۔ اسی لیے سب کی آپی ہوں۔ ددھیال میں سیکنڈ لاسٹ، اسی لیے بریرہ۔ چار بہن بھائیوں میں بھائی سے چھوٹی باقی بہنوں سے بڑی۔ جی تعلیم کی کیا بات کرتے ہیں، تعلیم ماشاءاللہ سے جاری و ساری ہے۔ میٹرک کیا ہے بابدولت نے۔ رزلٹ آ چکا ہے۔ فرسٹ ایر میں ایڈمیشن بھی ہو چکا ہے۔ مجھے ہاسٹل لائف بہت اچھی لگتی ہے، پر میرے پاپا کہتے ہیں کہ چوہا دیکھ کر ڈر لگتا ہے، ہاسٹل میں کیا رہوگی۔ کہتے ہیں کہ بہن بھائیوں میں نوک جھونک ہوتی رہتی ہے، پر ہمارا گھر جنگ کا منظر پیش کرتا ہے۔

میری خواہش ہے کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ اللہ کرے میری خواہش پوری ہو جائے۔

2- خوبیاں اور خامیاں جاننے کے لیے میں نے دوستوں سے رجوع نہیں کیا کیونکہ میری ایک ہی بیسٹ فرینڈ ہے۔ ممتا جو کہ گاؤں میں رہتی ہے۔

چلیں میں خود ہی بتا دیتی ہوں، لوگ کہتے ہیں کہ ہر انسان کے اندر کوئی نہ کوئی خامی ضرور ہے تو میرے اندر بھی ہے۔ دوسروں کی مدد کرتی ہوں، غصہ بہت جلدی آتا ہے، جتنی جلدی آتا ہے اتنی جلدی اتر جاتا ہے۔ ہنستی بہت ہوں، پتا نہیں یہ خامی ہے یا خوبی۔

3- خواتین ڈائجسٹ تین مہینے ہو گئے خریدتے ہوئے، پر پڑھا آٹھویں کلاس سے۔ مما سے چھپ کر پڑھتے تھے۔ اب مما نے خود لگا کر دیا ہے بقول بابدولت کے کہ میٹرک کر لیا۔ کیا اب بھی ڈائجسٹ نہیں پڑھ سکتے۔ پہلے مفت کا پڑھتے تھے، اب خریدنا شروع ہو گئے ہیں۔

4- ہمارے گھر میں صرف میری سالگرہ منائی جاتی تھی۔ اب سب کی منائی جاتی ہے۔ میں تو سب سے گفٹ نکلوا لیتی ہوں۔ میں صرف ایک دن یعنی اپنی سال گرہ کے دن کا انتظار کرتی ہوں۔ کیونکہ گفٹ جو ملتے ہیں، اس بار مما کو کہا ہے کہ ناول گفٹ کریں۔

5- شاعری سے لگاؤ ہے ایک حد تک اچھی لگتی ہے، پر اتنی نہیں مگر علامہ اقبال کی بہت زبردست ہوتی ہے۔ وصی شاہ کی بس باتی زیادہ نہیں پڑھی۔ یہ شعر میں میری مما کے نام لکھنا چاہوں گی۔ اس شعر کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔

یارب میری ماں کو لازوال رکھنا
میں رہوں نہ رہوں میری ماں کا خیال رکھنا
میری خوشیاں بھی لے لے، میری سانسیں بھی لے لے
پر میری ماں کے گرد خوشیوں کا جال رکھنا

خواتین ڈائجسٹ 279 اگست 2018

خبریں وربیں

واصفہ سہیل



اتحاد

اداکارہ صائمہ جواب فلم کے ساتھ ساتھ ٹی وی پر بھی اداکاری کررہی ہیں (بلکہ اب تو صرف ٹی وی پر ہی۔) کہتی ہیں کہ آپس میں اتحاد واتفاق کے بغیر کسی بھی شعبے میں کامیابی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ (بالکل صائمہ! ہمارے یہاں تو ابھی کراچی کی فلم انڈسٹری اور لاہور کی انڈسٹری سے باہر نہیں نکلے) فلم میں کام کرنا فنکار کی ذمہ داری ہے۔ تاہم اس میں سرمایہ کاری کرنا فلم سازوں کا کام ہے۔ (فلم ساز اسی صورت سرمایہ کاری کریں گے جب انہیں فلم بنانے والوں پر اعتماد ہوگا)

طریقہ

اداکارہ سارہ لورین (ارے بھئی وہی اپنی مونا لیزا...... جو مونا لیزا کے نام سے تو اچھا کام کرگئی لیکن سارہ لورین بننے کے بعد تو......؟ بھئی انڈین فلمیں کیں، ہمیشہ ریشمیا وغیرہ کے ساتھ تو......؟) کہتی ہیں کہ ”اگر فلموں میں منفرد اور مشکل ڈانس دکھائے جائیں تو شائقین سے بہتر رسپانس مل سکتا ہے۔ (ہیں مشکل ڈانس کامیابی کی ضمانت؟) سارہ مزید کہتی ہیں کہ ”بھارتی فلموں میں موسیقی اور ڈانس پر خاص توجہ دی جاتی ہے (ان کا کلچر جو ہے محترمہ) جس کی بدولت ان کی فلموں کا بزنس کروڑوں ہوتا ہے۔ (سارہ انڈین فلموں میں کام مانگنے کا اچھا طریقہ ہے) ویسے انڈین فلموں کی کامیابی کی وجہ ان کی غریب آبادی ہے جس کے پاس ٹی وی اور نیٹ کی سہولت نہیں۔ وہ فلم دیکھنے سینما ہال میں ہی جاسکتے ہیں۔

عشق

زیب بنگش کی اصل شہرت تو کوک اسٹوڈیو ہے۔ لیکن موسیقی کی دنیا میں اپنے خاص انداز کی وجہ سے بھی ان کی شہرت پڑوسی ممالک تک جا پہنچی ہے۔

زیب بنگش اپنے بارے میں بتاتی ہیں کہ ”میں نے اپنے گھر میں جس ماحول میں پرورش پائی ہے۔ اس میں ڈسپلن کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ اس لیے میں



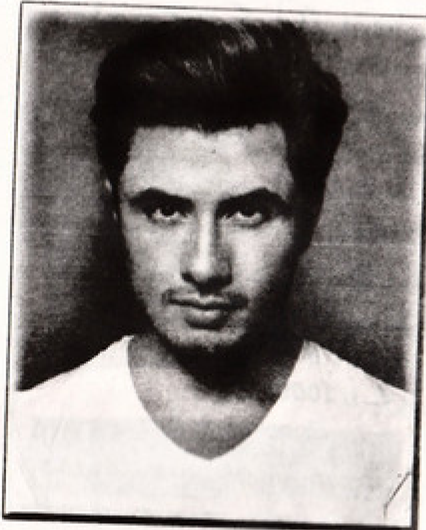


ایک خاص نظم وضبط کے ساتھ زندگی گزارنے کی عادی ہوں۔ میں صبح ساڑھے چار بجے اٹھتی ہوں اور کافی دیر تک ریاض کرتی ہوں۔ مجھے صبح کی تازہ ہوا اور پرندوں کی چہکار بہت اچھی لگتی ہے اور اگر اس وقت بارش بھی ہوجائے تو کیا ہی بات ہے۔ (ہائیں بارش کا ڈسپلن سے کیا تعلق ہے بھئی) علی الصبح روشنی اور اندھیرے کا خوب صورت امتزاج اور پھر دھیرے دھیرے دن کے اجالے کا پھیلنا مجھے سحر زدہ کردیتا ہے۔

زیب اپنے کیریئر کے متعلق کہتی ہیں کہ ”اس کام کو بطور کیریئر اختیار کرنا بہت مشکل ہے۔ تاہم ٹی وی سے آپ کو شہرت زیادہ ملتی ہے۔ اور آپ کا نام بڑا ہوتا ہے۔ (اور صرف نام کے سہارے زندگی نہیں گزرتی۔ ہے ناں......؟)

خواہش

علی ظفر شاعری بھی کرتے ہیں۔ اپنے زیادہ تر گانے وہ خود لکھتے ہیں۔ اس بارے میں علی ظفر کا کہنا ہے کہ ”سب سے پہلے تو یہ کہ میری عادت ہے کہ مجھے لکھنا اچھا لگتا ہے اور خاص طور پر صبح کے وقت، کیوں کہ اس وقت کوئی بدحواسی نہیں ہوتی (بدحواسی! مطلب......؟) میں اپنے خیالات کاغذ پر منتقل کرتا ہوں۔ یہ سب کرنے سے پہلے میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اگر میری کوئی خواہش ہو یا میں کوئی اظہار کرنا چاہتا ہوں تو میں اسے ڈائری میں لکھتا ہوں۔



شعر وشاعری کے متعلق علی ظفر کا کہنا ہے کہ گانے کچھ الہامی کیفیت میں لکھے جاتے ہیں، آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں۔ تو شاعری کا سلسلہ مختلف ہوتا ہے۔ علی ظفر پسندیدہ گلوکار کے بارے میں کہتے ہیں کہ مجھے استاد بڑے غلام علی خان صاحب، مہدی حسن خان صاحب، کشور کمار، لتا اور آشا جی کے علاوہ فرینک سناترا اور پریسلے بہت پسند ہیں۔

کچھ ادھر ادھر سے

کچھ نیم پڑھے لکھے خواہش مند ہیں کہ انقلاب فرانس کی طرح ہر چوک میں گلوٹین لگا کر اہل سیاست کے سرتن سے جدا کردیے جائیں مگر یہ سارے انتقام پسند، جنونی اور کم ظرف یہ بھول جاتے ہیں کہ گلوٹین چلانے والے خود بھی اسی گلوٹین کا شکار بنے تھے۔ (سہیل وڑائچ۔ فیض عام)

☆ سید ظفر علی شاہ نے نواز شریف سے

27 سالہ دیرینہ رفاقت ختم کرنے کے بعد ان کی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں دلچسپ تبصرہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ نواز شریف کی خوبیاں یہ ہیں کہ وہ نماز پنجگانہ بڑی باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں اور والدین کا حد درجہ احترام کرنے والے شخص ہیں اور خامی یہ ہے کہ وہ جمہوریت پر یقین نہیں رکھتے۔

☆ نور بخاری نے خاور مانیکا سے اپنی شادی کی خبر کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے میں کیوں خاور مانیکا سے شادی کروں گی اور میں بشریٰ بی بی کی بات کیوں مانوں، وہ کیوں میری شادی کرائیں گی۔ نور بخاری نے کہا اگر کسی کو میری شادی کرانے کا شوق ہے تو اتنی عمر کے شخص سے کیوں؟ وہ شخص میرے باپ کی عمر کا ہے۔ (اخبار جہاں)

☆ مفتی عبدالقوی کی شہرت قندیل بلوچ سے رابطوں اور اس کے قتل کے الزام میں ملوث ہونے کے باعث اخلاقی طور پر تو متنازعہ ہو ہی چکی ہے۔ مقتولہ ماڈل گرل قندیل بلوچ بشریٰ مانیکا اور عمران خان کی دیرینہ رفاقت کے حوالے سے کچھ دعوے کیا کرتی تھیں۔

☆ نگراں حکومت نے جو کردار ادا کیا، اس سے کیسے کیسے "معزز" نگراں بے نقاب ہو کر سامنے آ گئے۔ ان کی وجہ سے نجم سیٹھی بہت یاد آیا جن کی نگرانی میں 2013 کے انتخاب شفاف ہونے کی گواہی غیر ملکی میڈیا نے دی تھی۔ آخر میں افتخار عارف کا ایک شعر

شکست و فتح کے سبب فیصلے ہوئے کہیں اور
مثال مال غنیمت لٹا دیے ہم لوگ

(عطاء الحق قاسمی، روزن دیوار سے)

☆ چونکہ ہر شعبے میں ہم "انتہا پسند" ہیں اور ہم میانہ روی پر یقین نہیں رکھتے لہٰذا انتخابی پروسس میں بھی ہم نے کچھ زیادہ ہی "میٹھا" ڈال دیا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے بچے بچونگڑے بھی چیخ اٹھے ہیں کہ یہ ان کے ساتھ کیا کر دیا ہے۔ (طارق بٹ، کڑوا سچ)

☆ عامر لیاقت کے مقدمے میں بابر اعوان وکیل کے طور پر پیش ہوئے تو عدالت کے باہر میڈیا کے نمائندوں نے آپس میں گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

"جیسا موکل ہے، ویسا وکیل ہے۔ دونوں ڈاکٹر ہیں، ایک ایگزیکٹ دوسرا ٹرینٹی کالج اسپین سے آن لائن ڈگری یافتہ ہیں۔"

(اے۔ وحید مراد سپریم کورٹ سے)

☆ نظام عدل سے متعلق ساری دنیا اس اصول پر عمل پیرا ہے کہ جج کے بجائے جج کے فیصلے کو بولنا چاہیے۔ جج بول پڑے تو فیصلہ، فیصلہ کن مرحلے میں داخل نہیں ہو سکتا اور پھر...... یہ فیصلہ کرنا محال ہو جاتا ہے کہ فیصلہ آئین کے مطابق ہوا ہے یا مفاد سے ہم آہنگ ہوا ہے۔

(ناصر حسنی...... جسارت)



آپ کا باورچی خانہ

ماہم عرفان

میرا بہت دل تھا کہ میں بھی کسی سلسلے میں شرکت کروں سو آج ہمت کر ہی لی گو کہ میں بہت سگھڑ یا ماہر امور خانہ دار خاتون نہیں ہوں لیکن پھر بھی اس سلسلے میں اس امید کے ساتھ کہ حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ موجود ہوں۔

سوال:- کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟

ج:- صاف سی بات ہے صرف اور صرف پسند نا پسند کا خیال رکھا جاتا ہے۔ الحمد للہ سسرال میں تو سب کچھ ہی پکتا ہے صرف مرغی پر زور نہیں ہے۔ ہاں مگر ہر قسم کی سبزی بھی ہمارے مردوں کے حلق سے نیچے نہیں اترتی اس لیے چند مخصوص سبزیاں، دالیں بھی دو قسم کی اور ہر سبزی میں مرغی لازمی ورنہ کوئی نہیں کھاتا۔

س:- کھانے کا وقت ہے...... اچانک مہمان آ گئے تو؟

ج:- تو جناب کوئی مسئلہ نہیں۔ ویسے تو مہمان اطلاع کے ساتھ ہی آتے ہیں۔ پھر بھی اگر اتفاق ہو جائے تو فریج میں ہمیشہ چکن تو ہوتا ہی ہے۔ فٹافٹ چکن کڑاہی اور چکن پلاؤ بنا لیتی ہوں۔ میرے خیال میں کم ترین وقت میں بننے والی یہی دو ڈشیں ہیں اور ان کی ترکیب کس کو نہیں آتی۔

س:- کچن کی صفائی کا کتنا خیال رکھتی ہیں؟

ج:- اس معاملے میں، میں اور میری جیٹھانی دونوں ہی نفسیاتی ہیں۔ گندگی بالکل پسند نہیں سو صفائی ہفتہ وار ہوتی رہتی ہے۔ روٹین میں بھی جب ٹائم ملے ہم شروع ہو جاتے ہیں۔ کام کے دوران چیزیں سمیٹتی رہتی ہوں، پھیلاوا بالکل برداشت نہیں۔ ہمارا کچن اوپن ہے تو آتے جاتے پہلی نظر کچن پر ہی پڑتی ہے اور خاندان کے علاوہ اہل کالونی گواہ ہے کہ ہمارا کچن ہر وقت صاف ہی رہتا ہے اور یہ بات مذاق نہیں حقیقت ہے کہ اکثر کچن دیکھ کر ہماری ساس پوچھتی ہیں کھانا نہیں بنایا گیا، میں جواب میں کہتی ہوں بن گیا ہے تو کہتی ہیں اچھا کچن دیکھ کر لگا کہ نہیں بنا۔ (اتنا صاف)

س:- صبح ناشتے میں آپ کیا بناتی ہیں؟

ج:- ناشتہ ہمارا بہت ہلکا پھلکا ہوتا ہے۔ سب اپنی روٹین کے حساب سے اٹھتے ہیں تو کوئی سلائس لیتا ہے چائے کے ساتھ تو کوئی صرف رسکٹ کھانا پسند کرتا ہے۔ چھٹی والے دن نان چنے یا حلوہ پوری یا پائے گھر کے بنے کے ساتھ ناشتہ ہوتا ہے۔ میں خود تو صرف چائے کے ساتھ سلائس وغیرہ لے لیتی ہوں۔

س:- مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھانے جاتی ہیں؟

ج:- سچ بات تو یہ ہے کہ یہ صرف فیشن بن کے رہ گیا ہے اور دکھاوا۔ میرے سسرال کا ماحول ایسا ہے کہ باہر کھانا برا نہیں سمجھا جاتا۔ ہر دوسرے دن یا چھٹی والے دن یا جب بھی موڈ ہو میاں صاحب کا تو پلان بن جاتا ہے۔ کبھی گھر پر منگوا لیتے ہیں۔ میں باہر کھانے کی اتنی شوقین نہیں ہوں۔ اللہ بھلا کرے ٹی وی شوز کا جنہوں نے گوشت مرغی کی حقیقت دکھا کر کھانے سے دل ہی اچاٹ کر دیا ہے۔ میں تو کھانے سے پہلے دس بار سوچتی ہوں۔

س:- ڈش کا انتخاب کرتے وقت موسم کا خیال رکھتی ہیں؟

ج:- جی بالکل موسم کا خیال رکھا جاتا ہے۔ لسی کا جو مزہ گرمیوں کی دوپہر میں ہے وہ سرد شاموں میں کہاں اور گاجر کا حلوہ لحاف میں بیٹھ کر کھانے کا جو

لطف ہے وہ اے۔ سی کی ٹھنڈک میں نہیں ہوسکتا۔ کبھی کبھار بے موسمی بھی کھانے بن جاتے ہیں لیکن وہ لذت محسوس نہیں ہوتی جو اسی موسم میں ہوتی ہے۔
اب تو ساگ، پائے اور سوپ تک میں نے لوگوں کو گرمیوں میں کھاتے دیکھا ہے۔ گرمیوں میں ایسی گرم غذائیں صرف نقصان کا باعث بنتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے غذائیں اگر موسم کی مناسبت سے اتاری ہیں تو یقیناً اس میں کوئی حکمت ہے۔

س:- کھانا پکانے میں کتنی محنت کی قائل ہیں؟

ج:- کھانا محنت سے پکانا چاہیے۔ اچھا کھانا پکتا ہی محنت سے ہے۔ بے دلی اور لاپروائی سے بنا ہوا کھانا کھانے کے قابل تو ہوسکتا ہے مگر ذائقے دار نہیں۔ تو جب ہم کچن میں کھڑے ہو ہی گئے ہیں تو پانچ دس منٹ زیادہ لگا کر مزے دار، ذائقے دار ڈش کیوں نہ بنائیں جو گھر والوں کو بھی پسند آئے اور آپ کو بھی دلی سکون محسوس ہو۔ میں نے ایسا بھی دیکھا ہے کہ خواتین کھانا چولہے پر چڑھا کر ٹی وی یا رسالے میں گم ہو جاتی ہیں اور ہنڈیا جل جاتی ہے اور وہی سالن گھر والوں کے سامنے رکھ دیتی ہیں۔ جب آپ وقت اور چیزیں استعمال میں لا رہی ہیں تو انہیں ضائع نہ کریں تھوڑی سی محنت سے خوش ذائقہ چیز بن سکتی ہے۔

س:- کچن کی ٹپ؟

ج:- اگر کچن میں لال بیگ ہیں تو کچن کیبنٹ میں نیم کے پتے رکھ دیں۔ لال بیگ بھاگ جائیں گے اور ہر تین مہینے بعد پتے تبدیل کرتی رہیں۔
پائے پکانے کے بعد برف کی کیوب ڈالنے سے پائے لیس دار بنتے ہیں۔



موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

فرائیڈ کلیجی مسالا

ضروری اشیاء:-

کلیجی	آدھا کلو
لال مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
ہری مرچیں	ایک چائے کا چمچہ
لہسن ادرک پسا ہوا	دو چائے کے چمچے
دہی	آدھا کپ
کھٹائی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	حسب پسند
چاٹ مسالا	حسب پسند
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:-
تیل گرم کر کے اس میں پسی ہوئی ہری مرچیں، کلیجی، نمک اور لہسن ۔ ادرک (پسا ہوا) ڈال کر بھونیں۔
اس میں لال مرچ، زیرہ، دہی اور کھٹائی پاؤڈر ڈال کر ڈھک کر درمیانی آنچ پر بیس منٹ تک پکائیں۔
لیموں کا رس اور چاٹ مسالا چھڑک کر ڈش میں نکال کر گرما گرم پیش کریں۔

روغن مسالا گوشت

ضروری اشیاء:-

بکرے کا گوشت	آدھا کلو
پیاز	دو عدد
لہسن ادرک (پسا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ
دہی	ایک کپ
لال مرچ (پسی ہوئی)	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	چوتھائی چائے کا چمچہ
دھنیا (پسا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالا (پسا ہوا)	آدھا چائے کا چمچہ
ہری مرچیں	سجاوٹ کے لیے
ہرا دھنیا	سجاوٹ کے لیے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت
پانی	حسب ضرورت

ترکیب:-
دیگچی میں گوشت، پیاز، لہسن ادرک پسا ہوا، نمک، لال مرچ پسی ہوئی، دھنیا، گرم مسالا، تیل اور پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ گوشت گل جائے تو دہی شامل کر کے اچھی طرح بھون لیں۔
ڈش میں نکال کر، ہری مرچ اور ہرا دھنیا سے سجا کر کے گرم گرم نان، چپاتی کے ساتھ پیش کریں۔

بادامی سیخ کباب

ضروری اشیاء:-

قیمہ	آدھا کلو
پیاز	ایک عدد
لہسن، ادرک	ایک چائے کا چمچہ (باریک کٹا ہوا)
ثابت دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
زیرہ (پسا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ
کالی مرچ (پسی ہوئی)	ایک چائے کا چمچہ
بڑی الائچی	چار عدد
نمک	حسب ذائقہ
انڈے	دو عدد
بریڈ کرمز	دو کھانے کے چمچے
بادام (پسے ہوئے)	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب:-
چوپر میں قیمہ، پیاز، لہسن ادرک، ثابت دھنیا، زیرہ، سیاہ مرچ، بڑی الائچی، نمک، انڈے، بریڈ کرمز اور بادام ڈال کر خوب باریک پیس کر ہاتھوں کی مدد سے

سیخ پر قیمے کے سیخ کباب بنائیں۔
چاہیں تو انگیٹھی پر سینک لیں یا 180c پر اوون میں بیک کریں۔
مزے دار سیخ کباب تیار ہیں۔
ڈش میں نکال کر رائتے یا چلی گارلک سوس کے ساتھ پیش کریں۔

شاہی ٹماٹر گوشت

ضروری اشیاء:۔

گوشت (بغیر ہڈی والا)	آدھا کلو
ٹماٹر	آدھا کلو
بڑی ہری مرچ	دس عدد
پیاز (کٹی ہوئی)	دس عدد
ادرک لہسن (پسا ہوا)	دو چائے کے چمچے
گھی	آدھا کپ
لال مرچ	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
ہلدی	چوتھائی چائے کا چمچہ
بادام (پسے ہوئے)	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب:۔
گھی گرم کریں اور پیاز کو سنہرا کرلیں۔ اس میں ادرک لہسن، لال مرچ، ہلدی، نمک اور تھوڑا سا پانی ڈال کر بھون لیں۔ اس کے بعد گوشت ڈال کر بھونیں۔ اس میں ٹماٹر ڈال کر اس وقت تک پکائیں کہ ٹماٹر گل جائیں۔ اس کے بعد ہری مرچیں ڈال کر پانچ سے دس منٹ پکائیں۔ گوشت گل جائے تو چولہے سے اتار کر گرم گرم پیش کریں۔

نلی نہاری

ضروری اشیاء:۔

نہاری کا گوشت	ایک کلو
نلی والی ہڈی	دو عدد
لہسن ادرک (پسا ہوا)	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
پیاز	تین عدد (کاٹ لیں)
لال مرچ	دو چائے کے چمچے
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
جائفل، جاوتری (پسی ہوئی)	آدھا چائے کا چمچہ
گرم مسالا (پسا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ
کالا زیرہ (کٹا ہوا)	چوتھائی چائے کا چمچہ
سیاہ مرچ (پسی ہوئی)	چوتھائی چائے کا چمچہ
دار چینی (پسی ہوئی)	ایک چٹکی
آٹا	آدھا کپ
سونف (پسی ہوئی)	ایک چمچہ
سونٹھ (پسی ہوئی)	آدھا چائے کا چمچہ
گھی/تیل	ایک کپ

ترکیب:۔
پتیلی میں گھی گرم کرکے اس میں پیاز ڈال کر اس کی رنگت گلابی ہونے تک تلیں۔ اس کے بعد اس میں گوشت، نلی، لہسن، ادرک، لال مرچ، ہلدی، دھنیا، گرم مسالا، کالا زیرہ، سیاہ مرچ، دار چینی، پسی ہوئی سونف، سونٹھ پاؤڈر اور نمک ڈال کر بھون لیں۔ چھ سے آٹھ گلاس پانی ڈال کر ابالیں۔
گوشت گل جائے تو نلی نکال کر گودا الگ رکھ لیں، اس کے بعد سالن سے گھی نتھار کر الگ کرلیں اور گوشت بھون لیں۔
جائفل، جاوتری اور آٹا پانی میں گھول کر ڈالیں۔ سالن میں نلی اور گودا شامل کریں۔ نہاری حسب پسند گاڑھی ہوجائے تو الگ کیا سالن کا گھی اس میں ڈالیں، تھوڑی دیر پکانے کے بعد ڈش میں نکال لیں۔ لیموں، ادرک، ہرا دھنیا اور ہری مرچوں سے سجا کر پیش کریں۔

افغانی کباب

ضروری اشیاء:۔

گوشت	ایک کلو
کالی مرچ (پسی ہوئی)	دو چائے کے چمچے
کچری پاؤڈر	چوتھائی چائے کا چمچہ
ادرک (پسا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ
لہسن (پسا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ
پیاز	ایک کپ
ہری مرچیں	تین سے چار عدد
چربی	حسب ذائقہ
ٹماٹر	آدھا کلو
مکھن	چار کھانے کے چمچے

ترکیب:۔
گوشت کو اچھی طرح صاف کرلیں اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرلیں۔ نمک، کالی مرچ، کچری پاؤڈر، ادرک، لہسن، پیاز، ہری مرچ، چربی ملا کر گوشت میں اچھی طرح مکس کردیں اور گوشت کو پیس لیں۔
ہر ٹماٹر کے آٹھ ٹکڑے کرلیں۔ قیمہ مکسچر کے گول کباب سیخوں پر لگادیں۔ کبابوں کے درمیان میں ٹماٹر کا ٹکڑا لگاتے جائیں۔ اسے کوئلے پر اچھی طرح سینک لیں۔ کباب تیار ہوجائیں تو چٹنی اور سلاد کے ساتھ پیش کریں۔ اسے کم گھی میں توے پر بھی بنایا جاسکتا ہے۔

اسپیشل کھیر

ضروری اشیاء:۔

چاول	ایک کپ
چینی	حسب ذائقہ
دودھ	پانچ کلو
پستہ	حسب پسند
بادام	حسب ضرورت
چھوٹی الائچی	چار عدد
بناسپتی گھی	تھوڑا سا
ناریل	حسب پسند

ترکیب:۔
چاول صاف کرکے دھو کر بھگودیں۔ ایک دیگچی میں گھی گرم کرکے اس میں چاول بھون لیں۔ ہلکی سی چاولوں کی رنگت تبدیل ہونے پر اس میں چار گلاس پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ چاول اچھی طرح گل جائیں تو اس میں دودھ ڈال دیں۔ چھلکوں سمیت بادام پیس لیں (زیادہ باریک نہیں بلکہ ذرا موٹے ہی ہوں) دودھ ڈالنے کے بعد اس میں مسلسل چمچہ چلاتے رہیں تاکہ نیچے نہ لگے۔
جب دودھ گاڑھا ہوجائے تو الائچی باریک پیس کر شامل کریں اور ساتھ ہی چینی بھی ڈال دیں اور آخر میں بادام ڈال دیں، باریک کٹا ہوا پستہ اور باریک کٹا ہوا ناریل اوپر چھڑک کر سجادیں۔ مزے دار اسپیشل کھیر تیار ہے۔

ناریل والی سویاں

ضروری اشیاء:۔

ناریل (پسا ہوا)	ایک پاؤ
سویاں	ایک پیالی
پانی	ایک پیالی
چینی	ایک پیالی
گھی	چار کھانے کے چمچے
کھویا	ایک پاؤ
سبز الائچی (پسی ہوئی)	چار عدد
بادام، پستے	حسب پسند (باریک کٹے ہوئے)

ترکیب:۔
گھی گرم کریں اور سویاں تیل میں ڈال کر ایک منٹ تک فرائی کرلیں اور نکال لیں۔ دیگچی میں پانی، چینی، الائچی ڈال کر پکائیں۔ چینی اچھی طرح حل ہوجائے تو سویاں ڈال کر پکالیں۔ پانی خشک ہونے پر دو منٹ تک پکالیں۔ اب ڈش میں ایک تہہ ناریل، ایک سویوں کی، ایک کھوئے کی اس طرح ڈش کو تیار کریں۔ آخر میں بادام، پستے اور چاندی کے ورق سے سجائیں۔

عدنان

نفسیاتی و ازدواجی الجھنیں

ماہر نفسیات کہتے ہیں۔

خود اعتمادی ہم سب کا حق ہے، ہم اسے استعمال کریں یا نہ کریں۔ اس سے فائدہ اٹھائیں یا نہ اٹھائیں۔ اس کا انحصار ہم پر ہے، کیونکہ ہر کام کے لیے دو قسم کے خیالات ہو سکتے ہیں۔

1۔ میں یہ کام کر سکتا ہوں۔

2۔ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔

وہ لوگ جو کام کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں۔ وہ بڑی بڑی دشواریوں کی پروا نہیں کرتے، لیکن اہم بات یہ ہے کہ...... ہم اپنی تمام تر ذہنی قوتوں کو بروئے کار لائیں۔

اپنے جذبات پر قابو پانا سیکھیں۔

اپنی شخصیت کی کمزوریوں دور کر کے اسے مضبوط بنائیں۔

فیصلے کرنے سے پہلے غور و فکر کریں اور اس کے مثبت اور منفی نتائج پر غور کر لیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارا کوئی غلط فیصلہ ہمیں تاریکی میں دھکیل دے۔

ہم خود کو بہتر مشورہ دے سکتے ہیں، اپنی راہیں بنا سکتے ہیں۔ البتہ انجان۔ پن میں ہم اپنی زندگی کو تباہ بھی کر سکتے ہیں۔ میرا کام تو کسی بات کے اچھے برے پہلو سمجھانا ہے۔ اب اس پر عمل کرنا نہ کرنا آپ کا کام ہے۔ میں تو آپ کی وہاں وہاں رہنمائی کر سکتا ہوں جہاں جہاں آپ راستہ بھٹک رہی ہوں یا آپ کی زندگی میں کہیں تاریکی آ چلی ہو یا بعض ایسی باتیں جو آپ سے دیدہ دانستہ یا نادانستہ طور پر سرزد ہو گئی ہوں اور ناواقفیت یا علم کی کمی کی وجہ سے کسی الجھن یا پریشانی کا باعث بن رہی ہوں۔ روشن راہیں دکھانے کے لیے آپ کی رہنمائی کی جا سکے، ورنہ عام صورتوں میں تو سچی بات یہ ہے کہ آپ خود غور و فکر سے کام لیں تو شاید کسی کے مشوروں کی ضرورت بھی نہیں۔

☆☆☆

ایک بات اور کہنی ہے۔ جو خطوط موصول ہوتے ہیں، ان میں اکثر لڑکیاں لکھتی ہیں یہ نہ ہوا تو مر جاؤں گی، وہ نہ ہوا تو مر جاؤں گی۔ ارے بھئی! زندگی اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے۔ جو صرف ایک بار ملتی ہے، اس نعمت سے منہ موڑنا اور پھر ایک ایسی چیز کو جو دوبارہ حاصل نہ ہو سکتی ہو، کھو دینا حماقت نہیں تو کیا ہے۔ کیا ایسی حماقت کا سوچا جا سکتا ہے؟

اگر زندگی بہت آرام اور چین کے ساتھ گزارنی ہے تو اپنی ضروریات اور خواہشات کو محدود کرنے کی کوشش کیجیے۔ خواہشات ایک ایسا سمندر ہے جس کی گہرائی اور کنارے کا پتا لگانا ناممکن ہے۔ دلی سکون کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے دل میں ہر دم نئی تمنائیں، خواہشیں نہ ابھریں کیونکہ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے اور اگر وہ خواہش پوری نہ ہوا یا پورا ہونے کے امکانات نہ ہوں تو آپ کا چین اور سکون خاک میں مل جائے گا۔

کسی عالم کا قول ہے ”گزرا ہوا کل ایک کینسل کیا ہوا چیک ہے۔ آنے والا کل چیک کی شکل میں محض ایک وعدہ ہے۔ اس کا کیش ہونا ضروری نہیں ہے۔ صرف حال وہ نقدی ہے جو آپ کے ہاتھ میں ہے اور جسے حسب منشاء خرچ کیا جا سکتا ہے۔ آنے والے وقت کے لیے پہلے سے سوچ سوچ کر اپنے ذہن کو پراگندہ نہ کیجیے۔ کل کے مسائل کل پر چھوڑ دیجیے۔ مستقبل پر مکمل طور پر بھروسا نہ کیجیے۔ خواہ وہ کتنا ہی دلکش اور دیدہ زیب کیوں نہ ہو۔

ماضی کو یاد کر کے خود کو زیادہ غمگین نہ بنائیے۔ وقت کے دھارے پلٹ کر نہیں آتے، لکیر کو پیٹتے رہنا حماقت ہے۔

م۔ علی

س۔ ایک بہن کا خط ہے، ان کا مسئلہ بے اولادی ہے۔ شادی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن علاج معالجہ سے لے کر وظیفے وظائف تک کوئی کوشش نہیں چھوڑی۔ اس صورت حال نے انہیں شدید ڈسٹرب کر دیا ہے۔ ان کے دل میں حسد، جلن جیسے منفی جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔

انہوں نے قاری بہنوں سے دعا کی درخواست کی ہے۔

ج۔ آپ کا پورا خط پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کی مایوسی اور ڈپریشن کی وجہ اولاد کا نہ ہونا نہیں ہے بلکہ شدت پسندی، عدم برداشت، بے صبری اور منفی جذبات ہیں۔ مذہب کی طرف رجحان اور عالم دین سے درس آپ کو سکون دے سکتا ہے لیکن ضروری ہے کہ آپ کسی سائیکاٹرسٹ سے بھی مشورہ کریں۔ دعا کے ساتھ دوا بھی ضروری ہے۔

آپ کے لیے سب سے اچھی بات یہ ہے کہ ابھی آپ کی عمر بہت کم ہے۔ اولاد ہونے کے لیے آپ کے پاس بہت وقت ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ آپ اللہ سے بہت دعا مانگتی ہیں۔ آپ دعا کے ساتھ ساتھ اللہ پر توکل بھی کریں۔ دعا مانگنا اور اللہ پر توکل کرنا دو مختلف چیزیں ہیں۔ دعا مانگنے کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ فوراً اس دعا کو قبول کر لے۔ وہ بہتر جانتا ہے کہ ہمارے حق میں کیا بہتر ہے، اس کا اپنا ایک نظام ہے۔ اس کے نظام میں ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ دعا کی قبولیت کے لیے جلدی نہیں کرنا چاہیے۔ آپ یہ سوچ رکھیں کہ آپ کے ہاں اولاد ضرور ہوگی اور نہ بھی ہو تو آپ کے حق میں یہی بہتر ہوگا۔

محلے میں، آپ کے جاننے والوں میں یقیناً کچھ لوگ ہوں گے جو کثیر الاولاد ہوں گے۔ آپ ان کے کسی بچے کے تعلیمی اخراجات اٹھالیں۔ بچوں سے محبت کریں، ضروری نہیں کہ بچہ اڈاپٹ کیا جائے۔ آپ شام کو ایک دو گھنٹے کے لیے بچوں کو ٹیوشن دینا شروع کر دیں۔ ایک تو اس سے آپ کا دل بہلے گا، دوسرے آپ کی ممتا کی تسکین بھی ہوگی اور ایک عجیب بات جس کی سائنسی توجیہہ نہیں پیش کی جا سکتی، جو لوگ بچوں سے محبت کرتے ہیں، وہ عموماً کثیر الاولاد ہوتے ہیں۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جنہوں نے بچہ اڈاپٹ کیا، ان کے ہاں اپنی اولاد ہو گئی۔ آپ محبت کریں اور بلاتفریق کریں، اس سے آپ کے دل کو سکون ملے گا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ذہن میں منفی جذبات نہیں پیدا ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو نیک اور صالح اولاد سے نوازے آمین۔

ثمینہ

☆ اچھی بہن ثمینہ! آپ کے حالات جان کر دکھ کی ساتھ ساتھ حیرانی بھی ہوئی۔ والدین اتنے بے خبر بھی ہو سکتے ہیں۔ آپ نے خود لکھا ہے کہ آپ کو حیرت ہوتی ہے کہ گھر میں آپ کے ساتھ آٹھ دس سال زیادتی ہوتی رہی اور بڑی بہن، بھائی یا ماں کسی کو بھی پتا نہیں چلا۔

ظاہر ہے ان حالات میں آپ کی ذہنی کیفیت یہی ہونا تھی۔ بہنوئی کو آپ نے بتا دیا تھا، انہیں چاہیے تھا کہ پہلے آپ کا علاج کراتے لیکن اس کے بجائے انہوں نے شادی کر دی۔ شادی کے بعد سسرال والوں اور شوہر کے رویہ نے آپ کے ذہن پر مزید اثر ڈالا۔

آپ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ بہت سلجھا ہوا ذہن رکھتی ہیں۔ ذہین ہیں، اعلا تعلیم یافتہ ہیں۔ آپ فوری طور پر کسی اچھے سائیکاٹرسٹ سے رابطہ کریں اور اس سے کچھ بھی نہ چھپائیں۔ اپنے بچپن کے حالات، شادی شدہ زندگی میں اپنے شوہر کا رویہ اور سسرال کے بارے میں سب کچھ بتائیں۔ بچپن میں اتنے برے حالات سے گزرنے کے باوجود آپ نے اعلا تعلیم حاصل کی۔ شادی سے پہلے اپنے بہنوئی کو تمام حالات خود بتائے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ایک مضبوط شخصیت کی مالک ہیں۔

آپ زندگی میں بہت کچھ کر سکتی ہیں، بس تھوڑی ہمت اور حوصلہ کی ضرورت ہے۔

اپنے علاج پر ضرور توجہ دیں، یہ بہت ضروری ہے۔ ☆

امتہ الصبور

بیوٹی بکس

فرزانہ اعظم ...... کراچی

س: میری عمر 30 سال ہے لیکن ابھی سے بال سفید ہو رہے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ مہندی لگانے سے بال زیادہ سفید ہو جاتے ہیں۔ کوئی ایسا نسخہ بتائیں کہ بال سفید ہونا رک جائیں۔ سفید بالوں کو کالا کرنے کے لیے بھی نسخہ بتائیں؟

ج: بالوں کے سفید ہونے کی وجہ اکثر تو موروثی ہی ہوتی ہے لیکن اس کے علاوہ ذہنی تناؤ، صابن اور خوشبودار تیلوں کے استعمال اور جسمانی کمزوری سے بھی بال سفید ہو جاتے ہیں۔

اگر آپ کی جسمانی صحت کمزور ہے تو آپ ڈاکٹر سے مشورہ کر کے آئرن یا وٹامن بی کی ٹیبلٹ استعمال کریں۔ اس سے فرق پڑے گا اور بال سفید ہونا رک جائیں گے۔

سفید بالوں کو چھپانے کے لیے سب سے اچھا طریقہ مہندی ہے اگر خالص مہندی ہو اور اس میں کیمیکل نہ ہو۔ تو یہ بالوں کے لیے بہترین ہے۔ اس سے کس نقصان کا احتمال نہیں ہوتا۔

بالوں میں مہندی لگانے کے لیے آپ کو مندرجہ ذیل اشیاء کی ضرورت ہوگی۔

مہندی	ایک کپ
گرم پانی	آدھا کپ
انڈہ	ایک عدد
سرسوں یا ارنڈ کا تیل	ایک چمچہ

ایک کپ مہندی میں آدھا کپ ابلتا ہوا پانی ڈال کر اچھی طرح پیسٹ بنالیں۔ اگر رنگ گہرا کرنا چاہتی ہیں تو ایک کپ چائے کا پانی یا کافی بھی ڈال سکتی ہیں۔ اس کو رات بھر پڑا رہنے دیں۔ صبح اسے ہلکی آنچ پر ہلکا سا گرم کریں پھر اس میں ایک انڈا اور ایک چمچہ تیل ملائیں اور اس مرکب کو برش سے اپنے بالوں میں لگائیں۔ برش سے لگانے سے ہاتھوں پر رنگ نہیں آتا اور رنگ بالوں کی جڑوں تک پہنچ جاتا ہے۔ بالوں میں مہندی کو آدھے گھنٹے سے لے کر تین گھنٹے تک لگا رہنے دیں، اس کے بعد بالوں کو اچھی طرح دھو لیں۔

بالوں میں مہندی لگانے سے پہلے اپنے بالوں کو اچھی طرح صابن یا شیمپو سے دھو کر خشک کر لیں کیونکہ آپ کے بال جتنے صاف اور خشک ہوں گے اتنا ہی اچھا اور گہرا رنگ آئے گا۔

سیما ...... کراچی

س: بالوں کی خشکی کا کیا علاج ہے؟

ج: سرسوں کا تیل، انڈہ، دہی ان تمام اشیاء کو یکجا کر کے بالوں میں لگائیں۔ اب سر پر اسکارف باندھ لیں، ایک گھنٹے کے بعد بال دھو ڈالیں۔

خالدہ جبیں ...... کوئٹہ

س: ماسک استعمال کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

ج: ماسک ہمیشہ غسل کرنے سے پہلے لگائیں تاکہ جب آپ ماسک کے بعد غسل کر کے نکلیں تو آپ کا جسم اور چہرہ دونوں ترو تازہ ہوں۔ ماسک لینے سے دس منٹ پہلے چہرے پر دودھ لگائیں۔ دس منٹ کے بعد روئی کے پھاہے کو نیم گرم پانی میں بھگو کر اس سے چہرے کو صاف کریں۔ تولیے یا ٹشو پیپر سے چہرہ خشک کریں۔ اب آئینے کے سامنے ماسک کو اپنے چہرے کے تمام حصوں پر لگائیں۔

